بہنوں کا اپنا ماہنامہ
شعاع
مئی 2013
عنیزہ سید
کا مکمل ناول

انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

نظمیں غزلیں

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔
رضیہ جمیل نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا - مقام [illegible] سوسائٹی، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

رضیہ جمیل

پہلی بات

شعاع کا مئی کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔
وقت کے چڑھتے اُترتے سمندر میں سب ایک پل کی حقیقت، سب ایک پل کا سراب۔ بلاشبہ قائم رہنے والی ذات رب کی ہے۔ وہی عزت و شرف سے نوازتا ہے اور وہی ذلت و رسوائی کی پستیوں میں دھکیل دیتا ہے لیکن انسان اختیار و اقتدار پاکر سامنے نظر آتی اس سب سے بڑی حقیقت کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ کرسی کو دائمی سمجھ کر ہر ظلم و زیادتی کو روا سمجھتا ہے۔ پھر حالات کی ایک ہی کروٹ اسے منہ کے بل زمین پر لا گراتی ہے۔
اپنے وقت کے بڑے بڑے فرعون اور نمرود جب رب کی پکڑ میں آئے تو دُنیا کے لیے عبرت بن گئے۔
بے شک انسان خسارے میں ہے۔
ایک بار پھر انتخاب آپ کے ہاتھ میں ہے۔ آپ کا آج کا فیصلہ کل تاریخ کا حصہ ہو گا۔ ماضی کے تمام ادوار کو، پچھلے سالوں کی کارکردگی کو سامنے رکھتے ہوئے فیصلہ کریں۔ اپنے آج کے لیے، آنے والے کل کے لیے اور آنے والی نسلوں کی بقا کے لیے مخلص، دیانت دار، نیک اور صالح قیادت کا انتخاب کریں۔

محمود ریاض صاحب،

مئی کا مہینہ آیا تو یادوں کے کتنے ہی منظر روشن ہو گئے۔
وقت کے بہت سارے لمحوں میں کوئی ایسا ایک روشن لمحہ ٹھہر جاتا ہے، جو تا دیر روشنی بکھیرتا رہتا ہے۔ تاریک زندگیوں میں اُجالا پھیلاتا رہتا ہے۔ ایسا ہی ایک لمحہ تھا جب محمود ریاض صاحب نے ایک نئے انداز کے پرچے کا خواب دیکھا، جو خواتین کو جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ کر سکے۔ مروجہ انداز سے ہٹ کر ایک پرچا جو ہماری تہذیب و روایات اور اقدار کی پاسداری کے ساتھ ساتھ ذہن میں زندگی کا شعور پیدا کر سکے۔ یہ آسان فیصلہ نہ تھا، خصوصاً اس صورت میں جب کہ وسائل بھی محدود ہوں۔ محمود ریاض صاحب نے کٹھن حالات کا بڑی ثابت قدمی سے سامنا کیا اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے کامیاب ٹھہرے۔
اور خوبی یہ ہے کہ اس سب سے گزرتے ریاض صاحب کے مزاج میں کوئی فرق نہ آیا۔ نہ مشکل حالات نے مزاج میں تلخی پیدا کی اور نہ کامیابی نے ان کے اندر بڑائی یا تکبر کا کوئی احساس بیدار کیا۔ وہ ہر ستائش اور صلے سے بے نیاز اپنا کام پوری دیانت داری سے کرنے کے قائل تھے۔
زندگی سب کو ایک ہی بار ملتی ہے لیکن جو لوگ اپنی ذات سے ہٹ کر دوسروں کے لیے سوچتے ہیں دُنیا سے رخصت ہو بھی جائیں تو ان کا کام انہیں زندہ رکھتا ہے۔
محمود ریاض صاحب کو دُنیا سے رخصت ہوئے ایک دہائی سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے لیکن جو شمعیں وہ روشن کر گئے تھے، ان کا اُجالا آج بھی دور دور تک پھیل رہا ہے۔
قارئین سے ان کے لیے دُعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

اس شمارے میں،

- علیزہ سید کا مکمل ناول۔ نان بائی کی بیٹی،
- نمرہ احمد کے مکمل ناول "جنت کے پتے" کی آخری قسط،
- سائرہ رضا اور صائمہ اکرم چوہدری کے ناولٹ،
- عالیہ بخاری اور رخسانہ نگار عدنان کے ناول،
- سلویٰ علی بٹ، سعدیہ رئیس، بنت حوا اور سمیرا حمید کے افسانے،
- ٹی وی فنکارہ مدیحہ زاہد سے ملاقات،
- معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ۔ دستک،
- پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں۔ احادیث کا سلسلہ،
- خط آپ کے، شاعری سچ بولتی ہے، شعاع کے ساتھ ساتھ اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

شعاع کا یہ شمارہ آپ کو کیسا لگا؟ ہمیں اپنی رائے سے آگاہ کیجیے گا۔ آپ کی رائے ہمارے لیے بہت اہم ہے۔

حمد باری تعالیٰ

یہ کہسار و دریا، یہ پیڑ اور پتھر
تمہاری ہی حمد و ثنا کر رہے ہیں

ہر شاخِ گل، طائران چمن بھی
بیان ذکر مولا! تیرا کر رہے ہیں

ہوا، ابر، سورج، فلک اور تارے
یہ تعمیلِ حکمِ خدا کر رہے ہیں

کبھی دے رہے ہیں طلب سے زیادہ
کبھی معاف ساری خطا کر رہے ہیں

انہیں حوصلہ بخش دیجیے خدایا
مصائب کا جو سامنا کر رہے ہیں

تیری بندگی ہم سے کیا ہو رہی ہے
تجھے نذر ہم لوگ کیا کر رہے ہیں

جھکا کر تیرے در پہ اپنی جبیں کو
خطا کار تجھ سے دُعا کر رہے ہیں

شمیم فاطمہ

نعت رسول مقبول

میں نے اس ذات پہ لکھنے کی جسارت کی ہے
جس کے دامن پہ فرشتوں نے عبادت کی ہے
جس نے ہم خاک نشینوں کو فلک بوس کیا
جس نے بونوں کو عطا خلعتِ قامت کی ہے
کس کی جرأت میرے آقا کے برابر آئے؟
میرے آقا نے تو نبیوں کی امامت کی ہے
زخم کھا کر بھی جو پھولوں کی روائیں بخشے
میرے آقا نے تو کانٹوں سے محبت کی ہے
اللہ اللہ وہ کیا لوگ تھے جن لوگوں نے
چلتے پھرتے میرے آقا کی زیارت کی ہے
آج یہ سوچوں تو مدینہ نظر آتا ہے مجھے
طے جو لمحات میں برسوں کی مسافت کی ہے
میں کہ اک ذرۂ ناچیز ہوں خورشید بکف
مجھ پہ اس ذاتِ گرامی نے عنایت کی ہے
میرے مولا کی رضا ہے میرے آقا کی رضا
میرے آقا نے تو بابر وہ ریاضت کی ہے
آسمانوں پہ زمینوں پہ حکومت کی ہے
جس نے بابر میرے آقا کی اطاعت کی ہے

غفار بابر

ادارہ

والدین کے ساتھ حسن سلوک اور رشتے داروں سے صلہ رحمی کرنے کا بیان

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک فرمایا ہے۔

"تم اللہ کی عبادت کرو اس کے ساتھ کسی کو شریک مت ٹھہراؤ اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو' نیز رشتے داروں' یتیموں' مسکینوں' رشتے دار (یا قریبی) پڑوسی اور اجنبی (یا دور کے) پڑوسی اور پہلو کے ساتھی (ساتھ بیٹھنے والے) اور مسافر اور اپنے مملوک (غلام' باندیوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو۔" (النساء 36)

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"اور ڈرو اللہ سے جس کے واسطے سے تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو اور ڈرو قرابت مندیوں (کے توڑنے) سے۔" (النساء' 1)

اور فرمایا۔

"اور وہ لوگ جو ملاتے ہیں انہیں جنہیں ملانے کا اللہ نے حکم دیا (یعنی صلہ رحمی کرتے ہیں)" (الرعد' 21)

اور فرمایا "ہم نے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ احسان کرنے کی تاکید کی ہے۔" (العنکبوت' 8)

اور فرمایا اللہ تعالیٰ نے۔

"تیرے رب نے فیصلہ کردیا ہے کہ عبادت صرف ایک رب کی کرو اور ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرو اگر ان میں سے ایک یا دونوں ہی تمہاری موجودگی میں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو انہیں اف (اونہہ) تک مت کہو اور نہ انہیں ڈانٹو اور (ہمیشہ) ان دونوں سے ادب کی بات کہو اور ان کے سامنے عاجزی کے بازو جھکا دو۔ نیاز مندی سے اور ان کے لیے کہو (یہ دعا کرو) اے رب! ان پر رحم فرما جس طرح بچپن میں انہوں نے (پیار و محبت سے) مجھے پالا۔"

اور فرمایا اللہ تبارک و تعالیٰ نے۔

"اور ہم نے تاکید کی انسان کو اس کے والدین کے بارے میں۔ پیٹ میں رکھا اسے اس کی ماں نے تھک تھک کر اور دودھ چھڑانا ہے اس کا دو سال میں' کہ حق مان میرا اور اپنے والدین کا (اور پھر اسے ادا کر۔" (سورۃ لقمان)

محبوب عمل

حضرت ابو عبدالرحمٰن عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا۔

"کون سا عمل اللہ کو زیادہ محبوب ہے۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اپنے وقت پر نماز پڑھنا۔"

میں نے کہا۔ "پھر کون سا؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "والدین کے ساتھ نیکی کرنا۔"

میں نے کہا "پھر کون سا؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اللہ کے راستے میں جہاد کرنا۔"

(بخاری و مسلم)

فائدہ : نماز کے اپنے وقت کا مطلب ہے' اول وقت یا کم از کم پابندی کے ساتھ اسے اس کے وقت پر پڑھنا۔ یہ نہیں کہ کاروباری اور دیگر دنیوی مصروفیات میں اسے تاخیر سے یا بے وقت پڑھا جائے' نماز اور جہاد افضل ترین اعمال میں سے ہیں۔ ان کے ساتھ والدین سے حسن سلوک کے حکم کو بیان کرنے سے اس کی اہمیت واضح ہے۔

والدین کا احسان

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"کوئی اولاد' اپنے والد کے احسان کا بدلہ نہیں چکا سکتی' مگر یہ کہ وہ اپنے باپ کو غلام پائے اور وہ اسے خرید کر آزاد کردے۔" (مسلم)

فائدہ : اس حدیث سے والدین کی عظمت اور ان کے حقوق کی اہمیت واضح ہے۔

صلہ رحمی

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو شخص اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے' اسے چاہیے کہ وہ مہمان کی عزت کرے' اور جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیے کہ وہ صلہ رحمی کرے اور جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے' اسے چاہیے کہ بھلائی کی بات کرے یا پھر خاموش رہے۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ یہاں یہ حدیث صلہ رحمی کے مسئلے کی اہمیت کے لیے بیان ہوئی ہے۔ صلہ رحمی کا مطلب ہے' رشتے داروں کے ساتھ حسن سلوک کرنا' ان سے ہر صورت میں تعلق جوڑ کر رکھنا۔ حتیٰ کہ اگر رشتے دار بد اخلاقی کا مظاہرہ اور تعلق توڑنے کا ارتکاب کریں' تب بھی حقوق قرابت کی ادائیگی اور تعلق جوڑے رکھنے کا اہتمام کیا جائے۔ اسی کا نام صلہ رحمی ہے اور شریعت اسلامیہ نے اس کی بڑی تاکید کی ہے۔

2۔ رشتے داروں میں ننھیال اور ددھیال دونوں شامل ہیں۔ دونوں کو ہر حال میں عزت کی نگاہ سے دیکھنا چاہیے۔

رشتہ داری

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"بے شک اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا فرمایا' جب وہ ان کی پیدائش سے فارغ ہوا تو رحم (رشتہ داری) نے کھڑے ہو کر کہا۔

"یہ اس شخص کا مقام ہے جو قطع رحمی سے تجھ سے پناہ مانگے؟"

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"ہاں' کیا تو اس بات پر راضی نہیں کہ میں اس سے (تعلق) جوڑوں جو تجھ سے جوڑے اور اس سے قطع (تعلق) کرلوں جو تجھے قطع کرے" (توڑے؟)

رحم (رشتہ داری) نے کہا۔

"کیوں نہیں (ایسا ہی ہونا چاہیے)۔"

اللہ نے فرمایا "پس یہ تیرے لیے ہے" (یعنی ایسا ہی ہوگا) پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اگر تم چاہو تو (اس کی تائید میں یہ آیات قرآنی سورہ محمد 22-23) پڑھ لو۔

ترجمہ "پھر (اے منافقو!) تم سے یہی امید ہے کہ جب تمہیں اقتدار ملے تو تم زمین میں فساد پھیلاؤ اور اپنے رشتے ناتے توڑ ڈالو۔ یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت فرمائی اور انہیں بہرا اور اندھا کردیا۔" (بخاری و مسلم)

اور بخاری کی ایک روایت میں ہے' اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"جو تجھے ملائے گا' میں اسے ملاؤں گا اور جو تجھے کاٹے (توڑے) گا' میں اسے کاٹ دوں گا۔"

فائدہ : اس سے بھی صلہ رحمی کی تائید واضح ہے کہ یہ عمل اللہ سے خصوصی ربط و تعلق کا ذریعہ ہے اور قطع رحمی' یعنی رشتے داروں کے حقوق کی ادائیگی سے انکار اور ان سے تعلق برقرار رکھنے سے اعراض' اللہ کی ناراضی اور اس کے غضب کا باعث ہے۔

حسن سلوک کا مستحق

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا۔

"اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! میرے حسن سلوک کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تمہاری ماں۔"

اس نے پھر پوچھا "پھر کون؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "تمہاری ماں۔"

اس نے کہا "پھر کون؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ "تمہارا باپ۔" (بخاری و مسلم)

فائدہ : اس میں باپ کے مقابلے میں ماں کا حق مقدم اور تین گنا زیادہ بتلایا گیا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو مرد کے مقابلے میں عورت کا ضعف اور اس کا زیادہ ضرورت مند ہونا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ تین تکلیفیں ایسی ہیں جو صرف ماں اولاد کے لیے برداشت کرتی ہے۔ باپ اس میں شریک نہیں ہوتا۔ ☆9 مہینے تک حمل کی تکلیف۔ ☆ زچگی کی تکلیف، جس میں عورت کو موت و حیات کی کشمکش کے جاں گداز مرحلے سے گزرنا پڑتا ہے۔ ☆ پھر دو سال تک رضاعت (دودھ پلانے) کی تکلیف۔ جس میں اس کی راتوں کی نیند بھی خراب ہوتی ہے، اس کا حسن اور صحت بھی متاثر ہوتی ہے اور بچے کے آرام و راحت کے لیے بعض دفعہ خوراک میں بھی احتیاط اور پرہیز کی ضرورت پیش آتی ہے۔

ذلت

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"ناک خاک آلود ہو، پھر ناک خاک آلود ہو، پھر ناک خاک آلود ہو اس شخص کی جس نے بڑھاپے میں اپنے والدین کو پایا، ان میں سے ایک کو یا دونوں کو اور پھر (بھی ان کی خدمت کرکے) جنت میں نہیں گیا۔" (مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ ناک کا خاک آلود ہونا کنایہ ہے ذلت سے۔ گویا اس کی ناک مٹی میں مل گئی۔ اس میں ایسے بدنصیب کے لیے بددعا یا اس کے انجام بد کی خبر ہے جو اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک اور ان کی خدمت کر کے اپنے رب کو راضی نہیں کرتا۔

2۔ والدین کی خدمت تو ہر عمر ہی میں ضروری ہے، وہ جوان ہوں تب بھی۔ حدیث میں بڑھاپے کا ذکر اس لیے ہے کہ کبرسنی (بڑھاپے) میں والدین خدمت اور نیکی کے زیادہ ضرورت مند ہوتے ہیں۔ احتیاج اور ضعف کے اس دور میں انہیں حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا نہایت سنگ دلانہ جرم اور چند در چند قبیح فعل ہے اور اپنی اس ذلیل حرکت کی وجہ سے وہ جنت سے محروم رہ سکتا ہے۔

صلہ رحمی

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے ایک آدمی نے کہا "اے اللہ کے رسول! میرے کچھ رشتے دار ہیں میں ان سے صلہ رحمی کرتا ہوں اور وہ مجھ سے قطع تعلق کرتے ہیں۔ میں ان سے اچھا سلوک کرتا ہوں اور وہ مجھ سے برا سلوک کرتے ہیں۔ میں ان سے تحمل اور بردباری سے پیش آتا ہوں اور وہ میرے ساتھ نادانی سے پیش آتے ہیں۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اگر تو ایسا ہی ہے جیسا کہ تو نے کہا ہے تو گویا تو ان کے منہ میں گرم راکھ ڈال رہا ہے اور ان کے مقابلے میں تیرے ساتھ ہمیشہ اللہ کی طرف سے ایک مددگار رہے گا جب تک تیرا رویہ یہی رہے گا۔" (مسلم)

گرم راکھ گویا کہ تو ان کو گرم راکھ کھلا رہا ہے۔ یہ تشبیہ ہے کہ جس طرح گرم راکھ کھانے والے کو تکلیف ہوتی ہے اسی طرح قطع رحمی کرنے والے کو گناہ ملے گا اور ان کے ساتھ اس احسان کرنے والے پر کوئی ملامت نہیں۔ گناہ عظیم کے مستحق وہی ہیں کیونکہ وہ اس کے حق میں کوتاہی اور اسے اذیت میں مبتلا کر رہے ہیں۔

فوائد و مسائل :

1۔ ایک رشتے دار کی بدسلوکی یا قطع رحمی، دوسرے رشتے دار کی بدسلوکی اور قطع رحمی کے لیے وجہ جواز نہیں کیونکہ رشتے داروں کی بدسلوکی کے باوجود ان سے حسن سلوک ہی کی تاکید ہے۔

2۔ ہر حال میں حسن سلوک کرنے والا اللہ کے ہاں نہایت معزز و مکرم ہے اور اللہ تعالیٰ اس کے لیے آسمانوں سے مددگار نازل فرماتا ہے۔

3۔ قطع رحمی کا انجام گرم راکھ کے کھانے کے انجام بد کی طرح نہایت برا ہے۔

رشتہ داروں سے سلوک

حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ انصار مدینہ میں کھجوروں کے باغات کے اعتبار سے سب سے زیادہ مال دار تھے اور انہیں اپنے مالوں میں سب سے زیادہ پسندیدہ بیرحاء (نامی باغ) تھا۔ یہ مسجد نبوی کے سامنے تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس میں تشریف لاتے اور باغ میں موجود پاکیزہ پانی نوش فرماتے۔ چنانچہ جب آیت لن تنا نازل ہوئی تو ابو طلحہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا۔

"اے اللہ کے رسول! اللہ تعالیٰ نے آپ پر یہ آیت نازل فرمائی ہے۔

ترجمہ: "تم ہرگز نیکی کو نہیں پہنچ سکو گے، جب تک کہ تم اپنی پسندیدہ چیزیں (اللہ کی راہ میں) خرچ نہیں کرو گے" اور مجھے اپنے مالوں میں سب سے زیادہ محبوب بیر (باغ) ہے میں اسے اللہ کے لیے صدقہ کرتا ہوں، میں اللہ سے اس کے اجر کی اور اس کے پاس اس کے ذخیرہ ہونے کی امید رکھتا ہوں۔ چنانچہ آپ جہاں اللہ آپ کو سمجھائے، اسے اپنے تصرف میں لائیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"واہ واہ! یہ تو بڑا نفع بخش مال ہے۔ یہ تو بڑا نفع بخش مال ہے۔ تو نے جو کچھ کہا ہے۔ میں نے سن لیا ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ تم اسے اپنے قرابت داروں میں تقسیم کردو۔"

حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔

"ٹھیک ہے، اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! میں ایسا ہی کروں گا۔"

چنانچہ انہوں نے اسے اپنے رشتے داروں اور چچا زاد بھائیوں میں تقسیم کردیا۔ (بخاری و مسلم)

فائدہ : اس سے یہ واضح ہوا کہ اللہ کی راہ میں صدقہ و خیرات کرتے وقت پہلے اپنے قریبی رشتے داروں کو دیکھا جائے، اگر وہ مستحق امداد ہوں ان کی امداد کی جائے، اس کے بعد اگر کچھ بچے تو دوسروں پر صدقہ کیا جائے۔ اس کے برعکس درست نہیں کہ دوسروں کو تو ہر طرح کا مفاد پہنچایا جائے مگر اپنے محروم رہیں۔ بہرصورت انہیں مقدم رکھنا چاہیے۔

بڑا اجر

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور عرض کیا۔

"میں آپ سے ہجرت اور جہاد پر بیعت کرتا ہوں اور اللہ سے اجر کا طالب ہوں۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا "تیرے ماں باپ میں سے کوئی زندہ ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "ہاں، بلکہ دونوں ہی" (زندہ ہیں)۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پوچھا "کیا تو واقعی) اللہ سے اجر کا طالب ہے؟"

اس نے کہا۔ "ہاں۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "پھر تو اپنے والدین کے پاس لوٹ جا اور ان کی اچھی طرح خدمت کر۔" (بخاری و مسلم اور یہ الفاظ صحیح مسلم کے ہیں۔)

فوائد و مسائل : جہاد عام حالات میں فرض کفایہ ہے، یعنی مسلمانوں کی پوری آبادی میں سے حسب ضرورت کچھ لوگ جہاد میں حصہ لیں تو سب کی طرف سے جہاد کا فرض ادا ہو جائے گا۔ اس صورت میں جہاد میں حصہ لینے کے لیے والدین کی اجازت ضروری ہے کیونکہ ان کی خدمت فرض عین ہے۔ فرض کفایہ کی ادائیگی کے لیے فرض عین چھوڑنا جائز نہیں ہے۔ حدیث میں اسی صورت کا بیان ہے۔

بعض مخصوص حالات میں جہاد فرض عین ہو جاتا ہے، اس وقت والدین کی اجازت ضروری نہیں کیونکہ اس وقت ہر شخص کے لیے جہاد میں حصہ لینا ناگزیر ہوتا ہے۔ خصوصاً اس وقت جب دشمن حد سے بڑھ جائے اور نظریاتی اور ملکی سرحدوں پر حملہ آور ہو۔

اصل صلہ رحمی

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"وہ شخص صلہ رحمی کرنے والا نہیں ہے، جو (کسی رشتے دار کے ساتھ) احسان کے بدلے میں احسان کرتا ہے، بلکہ اصل صلہ رحمی کرنے والا وہ ہے، جب اس سے قطع رحمی (بدسلوکی وغیرہ) کی جائے تو وہ صلہ رحمی (حسن سلوک) کرے۔" (بخاری)

فائدہ : اس حدیث سے صلہ رحمی کے حقیقی تقاضے واضح ہوتے ہیں۔ جو رشتے دار ادب و احترام سے پیش آئیں اور آپ کے ساتھ اچھا سلوک کریں ظاہر بات ہے، آپ بھی ان کے ساتھ ایسا ہی معاملہ کریں گے۔ لیکن یہ صلہ رحمی نہیں ہے۔ احسان کے بدلے احسان ہے۔ اس کے برعکس آپ کا ایک قریبی رشتے دار بداخلاق ہے، آپ سے بدسلوکی کرتا ہے اور آپ سے تعلق توڑنے پر تلا رہتا ہے (جیسا کہ جہالت کے یہ مظاہرے ہمارے معاشرے میں عام ہیں) لیکن آپ صبر و تحمل اور عفو و درگزر سے کام لیتے ہیں، بدسلوکی کا جواب حسن سلوک سے دیتے ہیں، ترک تعلق کی کوششوں کے مقابلے میں تعلق برقرار رکھتے ہیں۔ یہ ہے اصل صلہ رحمی جس کا تقاضا اسلام کرتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ جذبات، انا اور وقار کا مسئلہ ہے۔ اس جھوٹی انا کو شریعت کے تقاضوں پر قربان کر دینا بہت دل گردے کا کام ہے۔ لیکن کمال ایمان بھی یہی ہے کہ ایسا کیا جائے ورنہ باہم مسکراہٹوں کے تبادلے میں تو کوئی کمال نہیں۔

رشتہ داری

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"رحم (رشتے داری) عرش سے لٹکی ہوئی ہے اور کہتی ہے، جو مجھے ملائے، اللہ اسے ملائے اور جو مجھے کاٹے اسے اللہ تعالیٰ کاٹے۔" (بخاری و مسلم)

فائدہ : رحم (رشتے داری) کا اس طرح بولنا اور اللہ تعالیٰ سے مکالمہ کرنا (جیسا کہ اس سے پہلے ایک حدیث میں گزرا) اللہ تعالیٰ کے لیے کوئی مشکل بات نہیں۔ وہ ہر ایک چیز میں ادراک و شعور اور گویائی کی قوت پیدا کرنے پر قادر ہے۔

بیادِ محمود ریاض

روشنی کے سفیر

آمنہ ریاض

پچھلے سال کی فروری کی بات ہے۔

لاہور کی رہائشی ایک خاتون بطور خاص ہم سے ملنے ہمارے گھر آئی تھیں۔ میری اور تنزیلہ کی تحاریر کے ساتھ ساتھ "چاند نگر پبلی کیشنز" کے چاروں جریدوں کی زبردست فین تھیں۔ بہت دیر نشست رہی چائے پی گئی۔ خاتون نے بڑے اچھے کمنٹس دیے۔ یوں مجھے دل خوش ہو گیا۔ رخصت سے چند منٹ پہلے کہنے لگیں۔

"مجھے بہت افسوس ہوتا ہے، جب یہ خیال آتا ہے کہ محمود ریاض صاحب اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ وہ بقید حیات ہوتے تو میں ایک بار کراچی جا کر ان کا شکریہ ضرور ادا کرتی۔ جنہوں نے "چاند نگر پبلی کیشنز" کی بنیاد رکھ کر ہم جیسوں کا بھلا کر دیا۔ میری والدہ یہ بات نہیں مانتیں۔ مگر میں اعتراف کرتی ہوں کہ میری ذہنی تربیت میں آدھا حصہ "خواتین" "شعاع اور کرن" کا ہے۔ شادی سے پہلے اور بعد میں جب بھی ضرورت پڑی ان ہی ڈائجسٹ کی کہانیاں میری رہنمائی کرتی رہیں اور میں ہی کیا ـــ میرے سرکل میں کئی ایسی خواتین ہیں، جو برملا اس بات کا اعتراف کرتی ہیں کہ ان کی ذہنی نشوونما میں ان ڈائجسٹ کا بڑا ہاتھ ہے اور سارا کریڈٹ محمود ریاض صاحب کو جاتا ہے۔ وہ اتنے بہترین جرائد کا اجرانہ کرتے تو ہم تفریح، تفریح میں اتنی اچھی باتیں کبھی نہ سیکھ پاتے۔"

مجھے بڑی خوشگوار حیرت ہوئی۔ کیونکہ ایسا تبصرہ یا احساس تشکر قارئین کے خطوط میں تو کئی بار پڑھنے کو ملا مگر آمنے سامنے بیٹھ کر کسی سے اظہار سننے کا یہ پہلا موقع تھا۔

میں یہ بھی بتاتی چلوں کہ یہ محترمہ محض گھر کی چار دیواری تک محدود رہنے والی خاتون نہیں ہیں۔ بلکہ لاہور کے ایک پرائیویٹ کاروباری ادارے میں ایگزیکٹو پوسٹ پر کام کر رہی ہیں۔

اس وقت مجھے بشریٰ آپا کی احسان مندی کے گہرے احساس میں ڈوبی ہوئی آواز کے ساتھ ساتھ وہ تمام معزز حضرات بھی یاد آ رہے ہیں۔ جنہوں نے پچھلے سال "خواتین" کے ایک سروے میں خواتین کے لیے جاری شدہ تمام ڈائجسٹ اور ان کی مصنفین سے متعلق کم و بیش ایک سی رائے دی تھی اور کہا تھا "خواتین جمود کا شکار ہیں ان کی تحریریں چار دیواری تک محدود ہیں۔"

سوچتی ہوں، آخر کس کی رائے پر یقین کیا جائے۔ ایک طرف یہ مرد حضرات ہیں، جو یہ ثابت کرنے میں لگے ہیں کہ خواتین مصنفین قبل مسیح کے موضوعات پر لکھ رہی ہیں یا ان کی سوچ چار دیواری کے مسائل سے نکلنے نہیں پاتی اور یہ کہ ان "چار دیواری موضوعات" سے معاشرے کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا اور دوسری جانب بشریٰ آپا جیسی خواتین ہیں، جو برملا اس بات کا اعتراف کرتی ہیں ان کی ذہنی تربیت میں خواتین ڈائجسٹ کا کتنا ہاتھ ہے۔ درحقیقت یہی وہ نکتہ تھا، جسے کئی سال قبل محمود ریاض صاحب نے سمجھ لیا تھا۔ جب سارا زمانہ مردوں کی اصلاح میں سر کھپا رہا تھا۔ انہوں نے صنف نازک کی حیثیت کو معاشرے میں تسلیم کرتے ہوئے ان کی تربیت کا بیڑا اٹھا لیا۔

ساتھ ہی ساتھ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ اس سلسلے

میں انہیں کڑی تنقید برداشت کرنا پڑی ہوگی۔ جب فورٹ ولیم کالج کی بنیاد رکھی گئی اور مصنفین نے سادگی و سلامت کے نمونے پیش کرنا شروع کیے تو کئی مخالفین ایسے تھے' جو اس سہل پسندی کو تنقید و طنز کا نشانہ بناتے رہے۔ 1869ء میں ڈپٹی نذیر احمد کا شاہکار "مراۃ العروس" کی صورت میں منظر عام پر آیا۔ موضوع تھا "خواتین کی اصلاح معاشرت" چپکے چپکے اس پہ بھی بڑی لے دے ہوئی۔ اس سے ثابت ہوا کہ ہر عظیم کام' خواہ اس کی افادیت اگلے چند سالوں میں تسلیم کرلی گئی ہو۔ اپنے آغاز پر تنقید ضرور سہتا ہے اور اس کام کو انجام دینے والا کئی گنا زیادہ تنقید سہتا ہے۔ (ممکن ہے ہمیں غلطی پر ہوں' لیکن متعصب ذہنیت کا وقتاً فوقتاً اظہار یہی کہتا ہے۔)

میں سو فیصد پر یقین ہوں کہ جب خواتین ڈائجسٹ کا اجرا ہوا ہو گا تو محمود ریاض صاحب نے بھی ایسی ہی تنقید سہی ہوگی۔ مگر آفرین ہے اس انسان پر' جس نے صلے کی پروا کیے بنا اپنے مقصد و ارادے سے ایک قدم پیچھے ہٹنا گوارا نہ کیا اور خواتین کے ان جرائد کو مقبول عام بنا کر چھوڑا۔ چونکہ مقصد اصلاحی تھا' سو دیے سے دیا جلتا چلا گیا اور آج یہ حال ہے کہ گو کہ آسمان پر بیک وقت کئی ستارے چمکتے ہیں۔ مگر زیادہ روشن و تابناک ستارے سب سے پہلے بصارت کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ اسی طرح کئی ڈائجسٹ میں "کرن' خواتین اور شعاع" کی آب و تاب بے مثال ہے۔

کچھ لوگ ریاض صاحب کی ذات کو شجر سایہ دار سے تشبیہ دیتے ہیں۔ یہ تینوں ڈائجسٹ اس درخت کے پھول ہیں' جو ان شاء اللہ کبھی نہیں مرجھائیں گے۔ لوگ اس درخت کے سائے تلے اپنے ماحول کی پریشانیاں دور کرنے آتے ہیں' تھوڑی دیر ستاتے ہیں۔ مستقل سلسلوں سے اپنے ذوق کی پیاس بجھاتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ مگر اس سائے کی تراوٹ کبھی نہیں بھولتے۔

کہتے ہیں اللہ ایسے لوگ کم پیدا کرتا ہے' جن میں نئی سوچ کی آبیاری کرنے کی ہمت و حوصلہ ہو۔ بنا کسی صلہ کی امید رکھے' وقت اور توانائی خرچ کرنا کوئی معمولی بات نہیں اور ایسے لوگوں کو نہ سراہنا بذات خود ایک بددیانتی ہے اور میں اس بددیانتی کی مرتکب نہیں ہونا چاہتی۔

محمود ریاض صاحب ایک انسان نہیں' بلکہ اپنی ذات میں ایک مکمل ادارے کی حیثیت رکھتے تھے۔ افسوس ہے (اور جو ہمیشہ رہے گا) کہ مجھے اس ادارے سے فیض حاصل کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ بہر حال ان جیسے لوگ قوم کے لیے سرمائے کی حیثیت رکھتے ہیں اور تاریخ کے صفحات میں ان کا ذکر ہمیشہ بڑے فخر سے کیا جاتا رہے گا۔

انسان کا کیا ہے' اُسے تو فنا ہو ہی جانا ہے۔ عمل باقی رہنے کی چیز ہے اور محمود ریاض صاحب کا عمل سنہرا حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ (آمین)

آپ سب سے فقط اتنی گزارش ہے کہ یہ مضمون پڑھ کر اول و آخر درود شریف کے ساتھ سورۃ فاتحہ پڑھ کر مرحوم کے لیے دعا فرمادیجئے۔ جو احسان "خواتین' کرن اور شعاع" کی صورت میں انہوں نے کیا' کچھ تو اس کا حق ادا ہوگا۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے۔

آمین۔

شادی مبارک ہو

فہد رزاقی عمارہ اقرار

آسیہ رزاقی

"ہیلو۔ ممی! السلام علیکم۔ میں دیبا بول رہی ہوں منیاپولس سے۔"

"خیریت... وعلیکم السلام۔"

رات کے بارہ بجے امریکہ سے فون۔ مگر وہاں تو دن ہوگا نا۔

دیبا نے بتایا کہ ان کے بڑے بیٹے فہد کی شادی جنوری میں ہو رہی ہے۔ بارات فیصل آباد جائے گی۔ عامر سے بات ہوئی۔ عامر میری بڑی نند کے بیٹے ہیں۔ دیبا رشتے میں میری بھتیجی ہیں۔ ابا کے ننھیال سے تعلق ہے یعنی نواب لوہارو کے خاندان سے ہیں۔ یہ رشتہ دیبا کی ایک دوست کے توسط سے طے ہوا ہے فیصل آباد میں۔ باراتی اسلام آباد میں جمع ہوں گے۔ فی الحال صرف نکاح ہوگا۔

عامر کے چھوٹے بھائی سلمان عرف مانی اپنی فیملی کے ساتھ اسلام آباد پہنچ گئے۔ وہ نو سال کے بعد پاکستان آئے تھے۔ ان کے بچے ایک ہفتے کے لیے آئے تھے۔ اس لیے ہم سب لوگ ایبٹ آباد سے اسلام آباد گئے۔ تاکہ ہمارے بچے امریکن بچوں سے مل لیں۔ صورت شناس ہو جائیں۔

پھر بچے واپس امریکہ چلے گئے۔ ان کے اسکول کالج کھلنے والے تھے۔ ہم لوگ واپس آگئے۔

مانی معہ بیگم کے یہاں رہے۔ انہیں بھتیجے کی شادی کی تیاری کے سلسلے میں کافی کام تھا۔ عامر پاکستان نہیں آرہے تھے۔ دیبا اپنے بیٹے کو لے کر آگئیں۔ مگر یہاں طاہر القادری کا ڈراما دھرنے کی شکل میں چل رہا تھا۔ سخت پریشانی تھی۔ بازار بند راستے بند۔ اور انہیں بری کے جوڑے لینے تھے۔

دھرنا ختم ہوتے ہی بھاگ دوڑ شروع ہوئی۔ غرضیکہ خاصی اچھی بری بن گئی۔ پھر دولہا میاں کی دادی۔ تینوں پھپھوئیں۔ لالی۔ غزالی۔ فرح' لالی کے بیٹے احمد کے ساتھ عمرے کی ادائی کرکے اسلام آباد پہنچیں۔ گویا باراتی آگئے۔ ہم لوگ بھی اسلام آباد گئے۔

مانی کی پھوپھی زاد بہن سہیلہ کے گھر سب جمع تھے۔

شادی کی گہما گہمی تھی۔ بازاروں کے چکر۔ حسب دستور۔ پینڈیوں کے لیے ثابت مونگ منگوالی تھی مگر ایبٹ آباد کی ہڈیاں جمانے والی سردی میں ہمت نہ پڑی اور پھر لائٹ کا بار بار غائب ہونا۔ کبھی متواتر کئی گھنٹے غائب۔

رسم کے لیے میر بیکری سے مٹھائی لے لی۔ لیکن دولہا کی دادی ہاشمہ رزاقی عمرے کے دوران تھکان کی وجہ سے اور سردی کی شدت کے اثر سے جکڑن کا شکار ہوگئیں۔ انہیں اسپتال داخل کرنا پڑا۔ فرح (چھوٹی پھپھو دولہا کی) اپنی امی کے ساتھ ہاسپٹل میں رہیں۔ سہیلہ میزبان تھیں۔ ان کی ممانی (ہاشمہ رزاقی) اسپتال میں تھیں اس لیے بارات میں نہ جاسکیں۔ ان کے شوہر ڈاکٹر امین الدین بھی نہیں گئے۔ بارات فیصل آباد روانہ ہوگئی۔ کراچی سے سہیلہ کی چھوٹی بھابھی جو امریکہ سے آئی ہوئی تھیں' اپنی بہن کے ہمراہ آگئی تھیں۔ سہیلہ کے فرزند کمال اپنی فیملی کے ساتھ گاڑی میں۔ ہم لوگ بڑی وین میں سوار ہوئے۔ مانی صبح ہی دولہا کو اور کمال کے ایک بیٹے کو لے کر دوسری کار میں جاچکے تھے۔

دراصل انہیں ہم سب کے اصرار اور تقاضے پر کہ جب یہاں پندرہ دن رہنا ہے تو نکاح کے بعد رخصتی کرالو۔ دلہن والوں سے یہ بات طے کرنی تھی۔ انہیں شاید اعتراض تھا۔ اب سب دعا مانگ رہے تھے کہ دلہن کے ابا مان جائیں۔ ہم لوگ جس وین میں تھے۔ اس میں دیبا کے نانا' خالہ' ماموں' ممانی' سہیلہ کی بھابھی نگہت' ان کی بہن فرح' مانی کی بیوی مانہ' ہماری بہو' پوتی آمنہ' پوتے علی اور غزالی۔ لالی کمال کی گاڑی میں تھیں۔

رونق تو وین میں تھی۔ دیبا' نگہت اور فرح' مانہ نے خوب شادی کے گانے گائے۔ رنگ جمایا۔

اسلام آباد سے موٹروے کے راستے فیصل آباد کا سفر دلچسپ تھا۔ دائیں بائیں کینو کے باغات زعفرانی کینوؤں سے لدے کھڑے تھے۔ جی چاہتا تھا۔ تازے تازے کینو توڑ کر کھائیں۔ مگر موٹروے پولیس اور دو طرفہ لوہے کے جنگلے۔

بارہ ربیع الاول کی مناسبت سے فیصل آباد خوب پھولوں اور روشنیوں سے سجا ہوا تھا۔ چناب کلب میں سات کمرے بک کرالیے گئے تھے۔ خوب وسیع گراؤنڈ۔ پارکنگ۔ پھولوں سے سجا ہوا کلب۔

احمد نے بتایا۔ مانی' ماما فہد کے ساتھ دلہن والوں سے گفت و شنید کررہے ہیں۔

ہم سب اپنے اپنے کمروں میں سامان رکھ کر چائے کا آرڈر دے کر آرام کرنے لگے۔ چائے چل رہی تھی کہ مانی کی آمد ہوئی۔ ڈانس کرتے ہوئے وی کا نشان بناتے مانی صاحب آئے۔ گویا مطالبہ منوالیا۔ رخصتی طے ہے۔ مبارک باد دی گئی۔ ایک کمرے میں جمع ہو کر ہلا گلا کیا گیا۔

پھر مزید مہمان آگئے۔ لاہور سے سلمیٰ اپنے بچوں کے ساتھ آئیں۔ کراچی سے گڈو ماموں اپنی بیگم فوزیہ کے ساتھ آئے۔ ان لوگوں کے لیے مزید دو کمرے لیے گئے۔ حالانکہ اتنے بڑے کمرے تھے۔ ان میں گدے بچھا کر کئی لوگ سوسکتے تھے۔ مگر مانی صاحب کی دریا دلی۔

مہندی کے فنکشن میں جانے کے لیے سب لوگ لاؤنج میں جمع ہوئے۔ پھر سب گاڑیوں اور وین میں بھر کر دلہن والوں کے گھر پہنچے۔ جہاں بڑے سے صحن میں شامیانے لگا کر مہمانوں کے بیٹھنے کا انتظام تھا۔ سلمیٰ لاہور سے ڈھولکی لے آئی تھیں۔ ہماری سب لڑکیوں نے گانے گائے۔ فرح ڈھولکی بجارہی تھی۔

اسٹیج پر دولہا اپنی والدہ کے ہمراہ صوفے پر براجمان تھے۔ سہیلہ نے سب کو ڈرایا ہوا تھا کہ فیصل آباد میں آج کل بہت سردی ہے۔ شامیانوں اور قناعت کے درمیان جو گیپ ہوتا ہے۔ اس سے بھقا بھق ہوا آتی ہے۔ تم لوگ سوئٹر پہن کر اور شالیں لے کر جانا مگر کسی نے اس پر عمل نہیں کیا۔ گیپ بھی تھا اور ہوا بھی مگر سردی بہت کم تھی۔

محفل اپنے عروج پر تھی گانوں کی' جب دلہن زرتار دوپٹے کے سائبان تلے بہنوں اور بھائی کے جلو میں آئیں۔ دیبا نے اٹھ کر رسم کی ابتدا کی۔ پہلے ابٹن پھر مہندی لگائی۔ منہ میٹھا کیا۔ پھر باقی سب نے بھی رسم ادا کی۔ گانے بھی ہوتے رہے۔ پھر دلہن والے اسٹیج پر آگئے۔ انہوں نے فہد کو ابٹن لگایا۔ منہ میٹھا کیا۔ اتنی مٹھائی کھلائی گئی کہ بے چارے کا پیٹ حلوائی کی دکان بن گیا ہوگا۔

دولہا کی بڑی سالی فہد کی انگلی پکڑ کر بیٹھ گئی۔ انگلی چھڑانے کے لیے منہ مانگا تاوان دینا پڑا۔ شور ہوتا رہا۔ آخر کھانے کے لیے بلایا گیا تب شور تھما۔ کھانے کے بعد سب واپس چناب کلب آئے' راستے میں ربیع الاول کی روشنیاں اور رونقیں دیکھتے ہوئے۔ مانی کے کمرے میں پھر محفل جمی۔ دولہا لطف لیتے رہے۔ دولہا دلہن کے لیے ایک کمرا اور لیا گیا۔ صبح اسے سجایا سنوارا گیا۔ حجلۂ عروسی کا روپ دیا گیا۔

مانی کے چھوٹے ماموں عرفان رزاقی اور سلطانہ بارات میں نہ آسکے۔ اسلام آباد میں طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے وہیں ٹھہر گئے۔ وہ کراچی سے آگئے لیکن بلڈ پریشر نے سفر کی اجازت نہ دی۔ ان کی کمی بہت محسوس ہوئی۔

سہ پہر کو لاہور سے طارق اور عادل بھی آگئے۔ ان کے لیے پھر ایک کمرا لیا گیا۔ طارق' عادل عامر مانی کے چچازاد بھائی ہیں۔ شاہد حسین رزاقی کے بیٹے۔ جو ادبی حلقوں کی مانی ہوئی شخصیت تھے۔ عادل ماڈل ٹاؤن سے جبکہ طارق کینیڈا سے آئے تھے۔ سب سے مل ملا کر وہ اپنے کمرے میں رات کی تقریب کے لیے تیار ہونے چلے گئے۔

ذرا غور تو کریں۔ ایک شادی کے لیے امریکہ' کینیڈا' لاہور' کراچی' اسلام آباد۔ فیصل آباد میں جمع ہوگئے۔ جہاں محبت ہو' اتفاق اور رواداری ہو۔ فاصلے کوئی اہمیت نہیں رکھتے اور شکر ہے ابھی کچھ خاندانوں میں اپنائیت کے تقاضے فرض کی طرح پورے کیے جاتے ہیں۔

دیبا نے بری کے کپڑوں کے میچنگ جوتے سینڈل وغیرہ کی تیاری یہیں آکر کی تھی۔ گو کہ طاہر القادری کے دھرنے کی وجہ سے دکانیں بازار بند تھے مگر بعد میں سب کچھ ہوتا گیا۔ کافی سامان وہ امریکہ سے لائی تھیں۔ خصوصاً میک اپ کی تمام مطلوبہ اشیا' سوئٹر' موزے اور بھی نہ جانے کیا کیا۔ بری میں چودہ جوڑے تھے۔ دلہن کی بہنوں کے لیے بھی جوڑے بنائے ان کے ساتھ میچنگ انڈین جیولری غرضیکہ شاندار بری اور لوازمات۔

سب سے بڑی مشکل تو دولہا کی شیروانی تھی۔ بارے کپڑا خرید کر درزی کو دیا گیا۔ اس نے کمال پھرتی سے تین دن میں شیروانی سی دی۔ بچے ہوئے کپڑے سے جوتے بھی بنوائے گئے۔ پٹکا سرخ غرضیکہ دولہا میاں صحیح معنوں میں سج گئے۔ شیروانی کے کار چوب کے ہم رنگ کرتا شلوار بھی اسی نے سیے۔

بارات ہوٹل روانہ ہوئی۔ دلہن کی طرف بہت اچھا انتظام تھا۔ ماشاء اللہ بہنیں بھی خوب تیار شیار تھیں۔ پیاری ہیں سب۔ دلہن تو ہے ہی خوبصورت۔ نکاح ہوا کچھ خوشی کچھ غم۔ مرحومہ ماں کی یاد۔

نکاح کے بعد دولہا دلہن اسٹیج پر لائے گئے۔ سالیوں نے دولہا کا کھسہ یوں چھپتا جیسے خزانے کا نقشہ۔ اور خزانہ تو اس مطالبے میں تھا' جو نیگ کے لیے ہوا۔ بہرحال ہنسی خوشی مطالبات پورے کرکے کھانے کی طرف توجہ کی۔ رخصتی کے وقت سب بہنوں کی آنکھیں نم تھیں۔ خالہ اور تائی امی بھی سب سے مل کر اپنے جذبات محبت ظاہر کررہی تھیں۔ کلب میں دولہا دلہن کو لے کر سب حجلۂ عروسی میں چلے گئے۔ میں اور بچے (پوتا پوتی) اپنے کمرے میں۔

صبح مانی نے دلہن والوں کو ناشتے پر مدعو کیا ہوا تھا۔ ہم سب ڈائننگ ہال میں جمع ہوگئے۔ پھر دولہا اور ان کی اماں دیبا' دلہن' بہنوں کے ہمراہ ڈائننگ ہال میں آگئے۔ خوب پر تکلف ناشتا ہوا۔ احمد نے خوب تصویریں بنائیں۔ پھر لان میں جاکر بھی بے شمار تصویریں بنائیں۔

دلہن کو ابھی بہنوں کے ہمراہ میکے جانا تھا۔ پھر بعد دوپہر اسلام آباد دولہا کے ساتھ۔ سلمیٰ لاہور روانہ ہوئیں۔ میں اور آمنہ (پوتی) عادل طارق کے ساتھ

لاہور آئے۔
ماڈل ٹاؤن میں عادل کے گھر جاکر نماز ادا کی۔ کشمیری لذیذ چائے عائشہ نے پلائی۔ اس سے پہلے کھانا بھی تو کھایا۔ پھر چائے کے بعد عادل ہمیں سلمیٰ کے گھر چھوڑنے آئے۔ لاہور میں اسلام آباد سے زیادہ سردی تھی۔ ایک ہفتہ سب سے مل ملا کر ہم دونوں ڈائیوو سے اسلام آباد آئے۔ کیونکہ دو تین دن کے بعد فہد اور دیبا' فرح' ہاشمہ رزاقی امریکہ روانہ ہونے والے تھے۔ برسوں کے بعد ملنا ہوا تھا۔ اب نہ جانے کب ملیں۔ دولہا کو چاہیے کہ ان لوگوں کو دعائیں دیں۔ جن کے اصرار پر انہیں دلہن ملی تھی ورنہ وہ تو نکاح کر کے جانے کے ارادے سے آئے تھے۔ رات تین بجے فہد سب کا سامان لے کر ایئرپورٹ چلے گئے۔ ترکش ایرلائن سے جانا تھا۔

صبح ساڑھے چھ کی فلائٹ تھی۔ سامان جہاز میں لوڈ ہو چکا تھا۔ جب دیبا اور فرح امی کو لے کر پہنچیں۔ جانچ پڑتال کے وقت پتا چلا۔ دادی کا گرین کارڈ موجود نہیں۔ گھر پر فون آیا۔ لالی غزالی نے بقیہ سوٹ کیس وغیرہ تلاش کیے۔ ماں' ثمانہ اور احمد ایک دن پہلے امریکہ پہنچ گئے تھے۔ وہاں فون کیا۔ بارے گھر میں گرین کارڈ مل گیا۔ جہاز سے سامان اتار آگیا۔

فرح نے دیبا سے کہا۔
"بھابھی! آپ اور فہد چلے جائیں۔ میں امی کو لے کر آجاؤں گی۔" مگر دیبا نے کہا تم اکیلی کس طرح سنبھالو گی۔"

فہد نے بھی سفر ملتوی کیا اور کہا۔ "میں دادی کو لے کر جاؤں گا۔" غرضیکہ سب واپس آئے اور فہد صاحب دوپہر کے بعد فیصل آباد روانہ۔

وہاں دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ یہ صاحب ایک دم دلہن کے سامنے جاکر کھڑے ہو گئے۔ وہ سمجھیں میرا وہم ہے۔ (ہائے ڈراما) یہ دوبارہ ان کے سامنے جاکر بولے تو وہ حیرت سے دم بخود ہو گئیں۔ ان کی تو عید ہو گئی۔ اور اس دن ویلنٹائن ڈے بھی تھا۔ گویا دن عید تو شب شب برات ہوئی۔

مگر ایک ہفتے بعد پھر جدائی کا وقت آگیا۔ گرین کارڈ آگیا اور امریکی مسافر روانہ ہو گئے۔ دلہن اب انتظار کی گھڑیاں گن رہی ہو گی۔ کب ویزا آئے گا اور وہ اپنے پیا کے گھر رخصت ہو کر جائے گی۔

سب سے بڑھ کر مبارک باد کی مستحق سہیلہ' ان کے میاں امین الدین' ان کے بیٹے کمال اور بہو مونا ہیں۔ جنہوں نے ان باراتیوں کی انتہائی محبت۔ خلوص اور عزت کے ساتھ پذیرائی کی۔ خندہ پیشانی اور خوشی کے ساتھ خاطر مدارت۔ سب کے آرام کا خیال رکھا۔ اپنے کمرے بچوں کے کمرے مہمانوں کے لیے وقف کر دیئے۔ بچوں نے بھی بے حد محبت اور جوش و خروش سے مہمانوں کو ٹائم دیا۔ آؤ بھگت کی۔

اس دور میں ایسی محبت اور اخلاص شاید ہی کہیں ملے۔ ہاشمہ رزاقی کو بزرگ کی حیثیت سے بھی۔ رشتے کے تقدس کے لحاظ سے بھی پورا پروٹوکول دیا۔ ان سے ملنے کے لئے آنے والے کراچی' لاہور' پنڈی اور اسلام آباد سے بھی جوق در جوق آئے۔ انہیں بھی پوری عزت دی۔ خاطرداری میں کمی نہ کی۔

فرح کے حساب سے ان کی امی سے ملنے' خیریت کو آنے والے لوگ پچھتر بنتے ہیں۔ سب کو خوش رکھنا کتنا مشکل مرحلہ ہے لیکن اعلا ظرف والے لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ یہاں مونا کی امی کا ذکر بھی ضروری ہے۔ غیر ہوتے ہوئے بھی وہ برابر کبھی مٹھائی کبھی کیک وغیرہ بلکہ نمکین کیک جو منفرد لذت کا تھا' لاتی تھیں۔ سب کا شکریہ۔

یہ منفرد شادی تھی۔ جس میں نہ ڈھولکی۔ نہ کوئی فضول رسم ہوئی نہ ہی لڑکیوں نے رقص کیے۔

چناب کلب کے بیروں نے اپنی محبت اور یگانگت کے اظہار میں گلاب کے پھولوں کا ایک سہرا دولہا کو لا کر پہنایا تھا۔ جو فہد کے جثے پر اونٹ کے منہ میں زیرہ ثابت ہوا۔ ان لوگوں کی خوشی کے لیے کچھ دیر فہد نے پہن کر فوٹو اتروایا۔

پھر گاڑی میں بیٹھ کر اتار دیا کہ ان لوگوں کی دل شکنی نہ ہو۔

ماریہ زاہد سے ملاقات

شاہین رشید

شوبز کی دنیا یوں تو گلیمر اور چکا چوند کی دنیا ہے۔ تاہم کچھ فنکار ایسے بھی ہیں' جنہوں نے اس دنیا میں گلیمر سے زیادہ اپنی محنت اور اپنے فن سے ایک نمایاں شناخت حاصل کی ہے۔ نوجوان اور ابھرتی ہوئی اداکارہ ماریہ زاہد کا شمار بھی ایسے ہی فنکاروں میں ہوتا ہے۔ ماریہ گلیمر سے زیادہ فن پر توجہ دیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے خاصی کم عمری میں ماں کا کردار بغیر کسی ہچکچاہٹ کے نہ صرف قبول ہی کیا۔ بلکہ اسے نہایت لگن کے ساتھ ادا بھی کیا۔ آج ہم آپ کی ملاقات ماریہ زاہد سے کرا رہے ہیں۔

"کیسی ہیں ماریہ۔۔۔ بہت مصروف رہتی ہیں شاید اس لیے انٹرویو کے لیے وقت نہیں ہے آپ کے پاس؟"

"میں ٹھیک ہوں۔۔۔ اور واقعی بہت مصروف رہتی ہوں۔ ورنہ جلدی انٹرویو دینے میں مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہوتا اور اب بھی میں شوٹ پہ ہوں۔ اس لیے آپ جلدی جلدی کرلیں۔"

"چلو تو پھر پہلے اپنے بارے میں بتاؤ کہ کب اور

کہاں پیدا ہوئیں۔ اصلی نام کیا ہے' وغیرہ وغیرہ۔"

"نام تو میرا ماریہ زاہد ہے۔ سب مجھے ماریہ کے نام سے ہی بلاتے ہیں۔ میں 31 مئی 1989ء کو کراچی میں پیدا ہوئی۔ میرا ستارہ جیمنائی ہے اور میری ہائٹ پانچ فٹ ساڑھے پانچ انچ ہے۔ میں نے فیشن ڈیزائننگ میں بی بی اے کیا ہے۔ میں گھر میں بڑی ہوں۔ میرے بعد ایک بہن ہے اور پھر تین بھائی ہیں' ماشاء اللہ سے۔ پنجابی ہوں۔ ملک کہلاتے ہیں ہم اور "چکوال" سے میرا تعلق ہے۔"

"شادی یا منگنی؟"

"نہ شادی' نہ منگنی۔ ان شاء اللہ جلدی شادی کروں گی۔ ویسے تو جب اللہ کو منظور ہوگا' ہو جائے گی۔"

"اس فیلڈ میں کیسے آئیں؟"

"میں یونیورسٹی میں بی بی اے کی طالبہ تھی اور ساتھ ساتھ فیشن ڈیزائننگ بھی پڑھ رہی تھی۔ ایک دن ہماری یونیورسٹی میں "فیشن شو" تھا۔ اس شو میں فیصل قاضی بھی آئے تھے۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں ایک "سوپ" کے لیے آڈیشن کرنا ہے۔ تو میں نے اپنی دوستوں کے ساتھ تفریح' تفریح میں آڈیشن دے دیا۔ مگر اتفاق دیکھیں کہ میرا سلیکشن ہو گیا۔ پھر انہوں نے میرے گھر فون کر کے میرے والدین سے اجازت لی اور یوں اس فیلڈ میں میری انٹری ہوئی۔"

"گھر والوں نے کوئی اعتراض تو نہیں کیا؟ اور پہلا پروگرام کیا تھا تمہارا؟"

"نہیں! گھر والوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا اور میرا پہلا پروگرام سوپ "کاہے کو بیاہی بدیس" تھا۔ ایک دن کی شوٹ تھی اور وہ میرا پہلا اتفاق تھا کہ جب میں نے کیمرا فیس کیا تھا۔ اس کے بعد جویریہ سعود کا سوپ "یہ کیسی محبت ہے" کیا اور اس سوپ سے میں رجسٹرڈ ہوئی تھی۔"

"تمہیں شوق تھا یا سب کچھ اتفاقاً" ہو گیا؟"

"اگر مجھے شوق ہوتا تو میں بہت پہلے اس فیلڈ میں آ چکی ہوتی۔ میں تو بس اتفاقاً" آ گئی اور جب آ گئی تو شوق بھی بڑھتا چلا گیا۔ میں نے کب سوچا تھا اس فیلڈ میں آنے کا۔۔۔ جب ڈرامے دیکھتی تھی تو سب کو کام کرتے ہوئے دیکھ کر اچھا لگتا تھا اور مزے کی بات کہ جب پہلی مرتبہ کیمرا فیس کیا تو سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ چیز کیا ہے۔ (قہقہہ) اور بار بار ایک سین کیوں کر رہے ہیں۔ پہلی پہلی بار کیمرا فیس کر رہی تھی تو تھوڑی گھبرائی ہوئی بھی تھی۔ مگر میں نے اپنے آپ کو جلدی سنبھال لیا۔"

"اس فیلڈ میں کہاں تک جانے کی خواہش ہے اور یہ بتاؤ! کہ تم اتنی سی عمر میں ماں کا رول کیوں کرتی ہو؟"

"سب کی طرح میری خواہش بھی بہت آگے تک جانے کی ہے اور جہاں تک ماں کے رول کی بات ہے تو "خوشبو کا گھر" میں نے ماں کا رول کیا ہے۔۔۔ اور کسی میں نہیں کیا۔ اس کی آخری اقساط میں تو میں نے کام ہی چھوڑ دیا تھا۔ بس آخری قسط میں تھوڑا سا سین تھا۔ ہوا یہ کہ جب یہ سوپ شروع ہوا تو مجھے ینگ ٹو اولڈ کریکٹر کا پتا تھا۔ مگر مجھے اتنے بڑے بچے کی ماں بنا دیں گے۔ یہ مجھے نہیں معلوم تھا۔ اب چونکہ میں نے کنٹریکٹ سائن کیا ہوا تھا۔ اس لیے مجھے کرنا پڑا' مگر یہ تجربہ برا نہیں رہا۔ لوگوں نے میرے کام کو پسند کیا۔ مجھے اچھا فیڈ بیک ملا۔ میرا کام رجسٹرڈ ہوا اور ویسے بھی فیلڈ میں ہر طرح کے رول کرنے پڑتے ہیں۔ ہم اصل زندگی میں کیا ہیں' یہ سب کو پتا ہوتا ہے اور پھر چہرے بھی بتا دیتے ہیں کہ ہم بڑے ہیں یا چھوٹے ہیں۔"

"اس فیلڈ میں کیا اچھائی اور کیا برائی دیکھی؟"

"کافی برائیاں ہیں۔ لوگ ایک دوسرے کی برائیاں بہت کرتے ہیں۔ تنقید بہت کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے اور راہ میں رکاوٹیں ڈالنے کی بہت کوشش کی جاتی ہے اور دوسروں کی ترقی سے بہت حسد کرتے ہیں۔ مگر یہ حال صرف اس فیلڈ کا نہیں ہے بلکہ پورے ملک میں' ہر شعبے میں یہی حال ہے۔ لوگ کسی کو ترقی کرتا دیکھ نہیں سکتے۔ لیکن خیر! یہ ہمارا ملک ہے۔ چاہے جیسا بھی ہے۔ مگر میں نے دیکھا ہے کہ باہر کے ملکوں میں لوگ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ انہیں لوگوں سے غرض نہیں کہ کون کیا کر رہا ہے۔"

"تمہیں کسی نے کبھی نقصان پہنچایا؟"

"نہیں! اللہ کا شکر ہے کہ کسی نے نقصان نہیں پہنچایا۔ لیکن چونکہ میرا ستارہ جیمنائی ہے تو میں ڈبل پرسنالٹی کا شکار ہوں۔ میرا موڈ کبھی کچھ تو کبھی کچھ ہو جاتا ہے۔ مگر مجھے لوگوں کو ٹریٹ کرنے کا فن آتا ہے میں کسی کو اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دیتی۔"

"مطلب کیسے ٹریٹ کرتی ہو؟"

"بھئی! اگر کوئی بدتمیزی کرے یا کسی بات کو کریدنے کے لیے آگے بڑھ کر بات کرے تو مجھے ایسے لوگوں سے بہت نفرت ہے۔ دل چاہتا ہے کہ ایسے لوگوں کو تھپڑ مار دوں۔۔۔ تو میں ایسے لوگوں سے سختی سے پیش آتی ہوں۔ ایسے لوگ جنہیں پروفیشنل لائف کے تقاضوں کا علم نہیں۔ میری نظر میں انہیں کام کرنے کا حق ہی حاصل نہیں ہے۔"

"تمہاری صبح کب ہوتی ہے اور آغاز کس طرح کرتی ہو؟"

"کام پر منحصر ہے۔ کام نہ ہو تو آرام سے اٹھتی ہوں' ورنہ جلدی اٹھ جاتی اور آغاز کس طرح کرنا ہے۔ میرا تو دل چاہتا ہے کہ صبح اٹھتے ہی بیگ میں پیسے ڈالوں اور شاپنگ پہ چلی جاؤں اور خوب موج مستی کروں۔ ناشتا میں کرتی نہیں ہوں۔ کھانا وغیرہ امی پکاتی ہیں۔ بس خوب مزے کی زندگی گزر رہی ہے۔"

"غصے کی تیز ہو؟ اور کس پہ نکلتا ہے؟"

"ہاں! بالکل تیز ہوں۔۔۔ اور کھانے پہ غصہ نکلتا ہے۔ غصے میں کھانا پینا مجھے زہر لگتا ہے اور کوئی میرے سامنے لا کر رکھ دے تو اٹھا کر پھینک دیتی ہوں۔ یہ میری بہت بری عادت ہے اور مجھے اس بات پہ بہت ڈانٹ پڑتی ہے۔ اس معاملے میں' میں بہت بدتمیز

ہوں۔ اس وقت امی کے یہی جملے سننے کو ملتے ہیں کہ پرائے گھر جاؤ گی تو پتا چلے گا۔"

اپنی ہانکتے رہتے ہیں۔ ان کے ساتھ موڈ خراب ہو جاتا ہے اور جو میری بات کو ویلیو نہ دیں اور اپنی بات کو اہم سمجھیں' ان کے ساتھ موڈ خراب ہو جاتا ہے۔"

"تو پھر اپنی غلطی کا اعتراف بھی نہیں کرتی ہوں گی؟"

"اکثر کر لیتی ہوں۔ مگر جب سامنے والا اپنی غلطی تسلیم نہیں کرتا تو پھر میں بھی نہیں کرتی اور کہتی ہوں کہ بھاڑ میں جاؤ۔"

"اس فیلڈ میں آ کر اچھا لگ رہا ہے یا سوچتی ہو کہ میں بھی ایک عام لڑکی ہوتی؟"

"میں تو ابھی بھی اپنے آپ کو ایک عام لڑکی ہی سمجھتی ہوں۔ کیونکہ اس فیلڈ میں آجانے سے میں بدل نہیں گئی اور نہ ہی زندگی کے مسائل سے آزاد ہو گئی ہوں۔ ہماری زندگی میں بھی وہی پریشانیاں ہوتی ہیں' جو عام لوگوں کو یا ہمارے اردگرد کے لوگوں کو ہوتی ہیں۔ ہم میں کوئی سرخاب کے پر نہیں لگے کہ ہم عام انسان سے مختلف ہو گئے ہیں۔ ہم بھی عام لوگوں کی طرح گھر سے نکلتے ہیں' کام کرتے ہیں' گھر آجاتے ہیں'

وہی کچھ کھاتے ہیں جو دوسرے کھاتے ہیں۔"

"کردار کون سے کرنا چاہتی ہو؟"

"ویسے تو بہت سے کردار کرنے کی خواہش ہے' لیکن معذور لڑکی کا کردار کرنا چاہتی ہوں۔ اس میں پرفارمنس کی گنجائش زیادہ ہوتی ہے۔"

"اپنی کن عادتوں سے پریشان رہتی ہو؟"

"ایک تو یہ کہ میں دوسروں پر بہت جلدی بھروسا کرلیتی ہوں۔ بہت جلدی یقین کرلیتی ہوں اور جب دھوکا کھاتی ہوں تو پچھتاتی ہوں اور ایک یہ کہ مجھے نہ صرف جلدی غصہ آتا ہے' بلکہ آتا بھی بہت تیز اور خطرناک ہے اور میرا غصہ نہ صرف میرے لیے ناقابل برداشت ہوتا ہے' بلکہ دوسروں کے لیے بھی ناقابل برداشت ہوتا ہے۔ ویسے "عموماً" میں غصے میں بات چیت بند کردیتی ہوں۔"

"لوگ پہچان لیتے ہیں اور کیا لوگ ڈراما شوق سے دیکھتے ہیں؟"

"جی ہاں! لوگ پہچان لیتے ہیں اور پہچان کر بے ساختہ بولتے ہیں۔ "ارے! آپ؟ کیسی ہیں آپ؟ آپ کو فلاں ڈرامے میں دیکھا تھا۔ بہت اچھی لگ رہی تھیں اور لوگ ڈراما دیکھتے ہیں تو پہچانتے ہیں۔ ورنہ تو کوئی ہمیں پہچانتا بھی نہیں۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ لوگ ڈرامے' بہت شوق سے دیکھتے ہیں۔"

"کیا ڈراموں میں فنکار کی شخصیت کا عکس ہوتا ہے؟"

"میرے خیال میں' بہت کم۔۔۔ کبھی کبھار ہی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی کردار آپ کو آپ کی شخصیت اور مزاج کے مطابق ملتا ہے۔ ورنہ "عموماً" تو ہم وہ کچھ پرفارم کررہے ہوتے ہیں' جو ہم نہیں ہوتے۔ اب جیسے میری خواہش ہے کہ میں معذور لڑکی کا کردار کروں۔ تو ظاہر ہے کہ میں ایسی نہیں ہوں اور اگر یہ کردار کروں گی تو اپنی شخصیت سے ہٹ کر ہی کروں گی۔"

"اکثر لوگ ہجوم میں بھی اکیلے ہوتے ہیں۔ کبھی زندگی میں کچھ کمی محسوس ہوتی ہے؟"

"زندگی میں کبھی کبھی اچھے لائف پارٹنر اور مخلص دوستوں کی بہت کمی محسوس ہوتی ہے۔ اس لیے کبھی کبھی ہجوم میں بھی اکیلا پن محسوس ہوتا ہے اور اس وقت بہت اپ سیٹ ہوجاتی ہوں' جب میں کچھ کرنا چاہوں اور کر نہ سکوں۔"

"چھٹی کا دن سو کر گزارتی ہو یا انجوائے کرتی ہو؟"

"زندگی ایک بار ہی ملتی ہے' اس لیے سو کر وقت گنوانا نہیں چاہتی۔ چھٹی کے دن کوئی اچھی سی فلم دیکھتی ہوں یا پھر گھر والوں کے ساتھ کہیں گھومنے پھرنے نکل جاتی ہوں۔"

"بچت کس انداز میں کرتی ہو؟"

"گولڈ کی شکل میں۔۔۔ یا تو ویسے ہی گولڈ لے لیتی ہوں یا پھر کوئی چھوٹا موٹا زیور بنوالیتی ہوں۔"

"تمہارے ڈیل ڈول سے بھی لگتا ہے کہ تم پنجابی ہو تو کبھی پنجابی کردار کیا ہے؟ یا ماڈلنگ کی ہے؟"

"جی ہاں! سب یہی کہتے ہیں۔ پنجابی فوراً" پہچانے جاتے ہیں اور پنجابی کردار ابھی ملا نہیں۔ اگر ملے گا تو میرا خیال ہے "آسانی سے نبھالوں گی۔ ابھی تک تو صرف اداکاری کی ہے' ماڈلنگ نہیں کی اور نہ ہی کرنے کا ارادہ ہے۔ فلم سے کوئی اچھا کردار آفر ہوا تو ضرور کروں گی۔"

"اور یہ آخری سوال کہ کوئی انوکھی خواہش ہے تمہاری؟"

"مجھے سفر کا بہت شوق ہے اور یہ انوکھی تو نہیں' بلکہ ایک جائز خواہش ہے کہ میں پوری دنیا گھومنا چاہتی ہوں اور دنیا کی ترقی کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"ہماری دعا ہے کہ تمہاری یہ خواہش پوری ہوجائے۔" اور پھر ہم نے ماریہ زاہد سے اجازت چاہی۔

دستک دستک دستک

شاہین رشید

علیشبا یوسف

"کیسی ہیں؟ آج کل اسکرین سے غائب ہیں؟"

"کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے ویسے بھی آپ کو پتا ہے کہ میں کام ذرا کم ہی کرتی ہوں۔ ہمیشہ اچھے پروجیکٹ کے انتظار میں رہتی ہوں۔ میری تو یہی سوچ ہے کہ بندہ کم کام کرے' مگر اچھا کرے۔"

"بالکل... کیونکہ آپ نے ابھی تک جتنا بھی کام کیا ہے بہترین کیا ہے اور "اک نظر میری طرف" کو تو شاید ناظرین کبھی بھول ہی نہیں پائیں گے۔"

"جی! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ وہ میری زندگی کا ایک ایسا ڈراما تھا۔ جس نے مجھے بہت زیادہ پہچان دی۔ ابھی بھی لوگ ملتے ہیں تو اسی حوالے سے یاد کرتے ہیں کہ جی! آپ کا کردار بہترین تھا۔"

"ڈرامے میں رونے کا بھی ریکارڈ قائم کیا ہوگا؟"

قہقہہ۔ "بالکل جی! پوری سیریل میں شاید ایک' دو اقساط میں ہنسی ہوں گی یا مسکرائی ہوں گی۔ ورنہ تو بس کیا بتاؤں' پوری سیریل میں رونا ہی رونا تھا۔ ویسے کردار بہت اسٹرونگ تھا۔"

"اس میں تو کوئی شک ہی نہیں کہ کردار اسٹرونگ تھا۔ گلیسرین کے استعمال سے آنکھوں کا تو حشر ہو گیا ہوگا؟"

"ہاں جی! مت پوچھیں کہ کیا حشر ہو گیا تھا۔ سوجن ہو جاتی تھی۔ پھر ٹھنڈے پانی سے دھوتی تھی تو نارمل ہو جاتی تھیں۔"

"ہمارے یہاں تو فلم کا کوئی اسکوپ نہیں ہے۔ ملک سے باہر سے آفر آئے تو؟"

"ایسا نہیں ہے کہ ہمارے ملک میں فلموں کا اسکوپ نہیں ہے۔ اگر اچھی فلمیں بنیں تو لوگ کیوں نہ سینما ہاؤسز کا رخ کریں۔ آخر جب "بول" "خدا کے لیے" اور "رام چند پاکستانی" جیسی فلمیں لگی تھیں تو کیا لوگوں نے سینما ہاؤسز کے رخ نہیں کیے تھے۔ تو اگر اپنے ملک کی کسی ایسی ہی اچھی فلم کے لیے مجھے آفر آئی تو ضرور ضرور کام کروں گی اور باہر سے آفر آئی تب بھی ضرور سوچوں گی۔"

"ماڈلنگ جاری ہے؟"

"کم کام کرتی ہوں۔ بے شک ماڈلنگ میں پیسہ کافی ملتا ہے۔ مگر جو سکون و اطمینان اداکاری کر کے حاصل ہوتا ہے وہ کمرشلز کر کے نہیں ملتا۔"

"مگر ابتدا تو آپ نے کمرشل سے ہی کی تھی؟"

"بے شک! میرا پہلا کمرشل ایک کریم کا کمرشل تھا۔ جس نے کافی شہرت دی تھی۔ وہ کمرشل میں نے اپنے گھر والوں سے چھپ کر کیا تھا۔ کیونکہ مجھے ڈر تھا کہ میرے والد اجازت نہیں دیں گے۔ مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ بس انہوں نے ایک بات ضرور کہی کہ اس کو پروفیشن نہیں بنانا۔ صرف شوق کی حد تک ہی رکھنا اور میں نے ایسا ہی کیا۔"

"کردار لیتے وقت صرف ڈائریکٹر کی ہدایات پر عمل کرتی ہیں یا خود بھی اسکرپٹ کا مطالعہ کرتی ہیں؟"

"ایسا نہیں کہ میں صرف ڈائریکٹر کی ہدایت پر عمل کرتی ہوں۔ مجھے جو کردار آفر ہوتا ہے میں نہ صرف اسکرپٹ کا مطالعہ کرتی ہوں' بلکہ ڈائریکٹر سے بھی تفصیلی ڈسکس کرتی ہوں اور اپنے اطراف میں بھی دیکھتی ہوں کہ جو رول مجھے دیا گیا ہے' ویسے لوگ کس طرح زندگی بسر کرتے ہیں۔"

"ویسے بچپن میں کیا بننے کا ارادہ کیا گیا تھا؟"

"چھوٹی تھی تو والد کے پروفیشن سے بہت متاثر تھی۔ وہ قومی ایرلائن میں تھے تو دل چاہتا تھا کہ میں بھی فضاؤں میں اڑوں اور کمرشل پائلٹ بنوں۔ مگر پھر سوچا کہ لائف تو بہت مصروف ہو جائے گی اور اپنی کوئی ذاتی زندگی ہی نہیں رہے گی۔ سو ارادہ ملتوی کر دیا اور پھر قدرت مجھے خود بخود اس فیلڈ میں لے آئی اور بس اس کو سب کچھ سمجھ لیا۔"

"گھر والے آپ کی اداکاری کو کس حد تک پسند کرتے ہیں؟"

"بہت پسند کرتے ہیں۔ خاص طور پر امی... امی کی ہمیشہ ہدایت ہوتی ہے کہ میں اداسی والے رول نہ کیا کروں۔ اس سے ان کو شک ہونے لگتا ہے کہ جیسے میں سچ مچ اداس ہوں۔ "اک نظر میری طرف" میں اگر میں نقلی روتی تھی تو امی اصل میں روتی تھیں۔"

"ہوں... کتنے سال ہو گئے ہیں اس فیلڈ میں؟"

"دیکھیں جی... میں 16 ستمبر 1985ء کو پیدا ہوئی۔ جب 16 سال کی تھی تو پہلا کمرشل کیا اور تب سے لے کر اب تک اس فیلڈ میں ہوں۔ اب خود اندازہ لگا لیں کہ مجھے کتنے سال ہو گئے ہیں اس فیلڈ میں۔"

"گڈ... پھر تو ٹی وی کا ماحول گھر جیسا ہی لگتا ہوگا؟"

"بالکل... اب تو سب اپنی فیملی کی طرح ہی لگتے ہیں۔ کیمروں سے بھی بہت اچھی دوستی ہو گئی ہے۔"

"اور مختلف جگہوں پہ پہچان کی بھی بہت عادت ہو گئی ہوگی؟"

"نہیں! ایسی بات نہیں ہے۔ پہچان کا اپنا ہی مزا ہے اور ہر دفعہ ایک نیا احساس ہوتا ہے۔ بہت اچھا لگتا ہے۔ جب لوگ پہچانتے ہیں۔ تعریف کرتے ہیں۔ اپنے مشورے دیتے ہیں۔"

"پرائیویسی متاثر نہیں ہوتی؟"

"نہیں نہیں... ایسی کوئی بات نہیں۔ لوگ ہم سے پیار کرتے ہیں' ہمیں عزت دیتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لیے اگر ہم ان کے پاس کھڑے ہو جاتے ہیں تو اس میں کیا حرج ہے۔"

"اب تک کے ڈراموں میں سب سے اچھا کس کو کہیں گی؟"

"سب ہی اچھے ہیں۔ سنجیدہ ڈراموں میں "اک نظر میری طرف" اور ہلکے پھلکے ڈراموں میں "تا کے کی آئے گی بارات" بہت اچھے رہے۔"

"مزاج کیسا پایا ہے؟"

"تھوڑا غصہ آتا ہے' مگر غلط باتوں پر... ویسے ہنس مکھ ہوں۔"

"فیملی لائف کیسی گزر رہی ہے؟"

"الحمد للہ! بہت اچھی۔"

رز کمالی

"جی رز! کیسی ہو... اسکرین سے غائب ہو؟"

"نہیں! ایسی کوئی بات نہیں۔ اسکرین پہ ہوں۔ مگر

"دیگر چینلز پر۔ کبھی کبھی گیپ آجاتا ہے۔ کام ہو رہا ہوتا ہے اور جب مکمل ہوتا ہے تو پھر ایک دم ہی اسکرین پہ ایک ہی چہرہ ہوتا ہے۔ لیکن مجھے خوشی ہے کہ آپ نے میری غیر موجودگی کو محسوس کیا۔"

"ابوظہبی میں پیدا ہوئیں۔ وہیں تعلیم حاصل کی۔ اب دل چاہتا ہے واپس جانے کو؟"

"میرا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ پاکستان مجھے بہت پسند ہے۔ ہمارا اپنا ملک ہے۔ بس مجھے شوبز میں آنے کا شوق تھا اور اپنی خواہش کی تکمیل کے لیے مجھے مشکلات سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔"

"اچھا! کن مشکلات سے گزریں؟"

"بس! کیا بتاؤں۔ انسان کوئی بھی کام شروع کرتا ہے تو مشکلات کا سامنا تو کرنا ہی پڑتا ہے اور پھر ہماری فیملی میں کوئی اس فیلڈ میں تھا بھی نہیں۔ اس لیے بھی جگہ بنانے میں مشکل پیش آئی۔ مگر شکر ہے کہ کامیاب ہوگئی۔"

"انسان قسمت کے بل بوتے پر آگے بڑھتا ہے یا پھر محنت کے بل بوتے پر؟"

"میرا خیال ہے کہ دونوں کے بل بوتے پر۔ ہم محنت کرتے ہیں اور قسمت ہمیں وہاں پہنچا دیتی ہے جہاں ہمارا نصیب ہوتا ہے۔ تو بس میں نے محنت کی اور میری قسمت نے مجھے اس فیلڈ میں آنے کے لیے محنت کروائی۔"

"صرف آرٹسٹ بننے کا شوق تھا؟ کچھ اور بننے کا نہیں سوچا؟"

"نہیں! ایسی بات نہیں۔ اداکاری کے بارے میں تو میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ بس ٹی وی پہ آنے اور ہوسٹنگ کرنے کا شوق تھا۔ ابتدا ہوسٹنگ سے ہی کی۔ پھر اداکاری کی آفرز آگئیں تو اس میں مصروف ہوگئی اور جب تک لوگ مجھے پسند کرتے رہیں گے۔ میں اداکاری کرتی رہوں گی۔ ورنہ چھوڑ دوں گی۔"

"کتنے سال ہوگئے ہیں اس فیلڈ میں؟"

"جی! 2006ء میں، میں نے انٹری دی تھی اور اب 2013ء ہے تو آپ خود اندازہ لگائیں کہ کتنے سال ہوگئے ہیں اور شکر ہے کہ ان سالوں میں بہت کچھ پایا ہے۔ عزت، شہرت اور دولت۔"

"تم کمرشلز میں نظر کیوں نہیں آتیں؟"

"کمرشلز کی آفرز آئی تھیں۔ مگر مجھے چونکہ اداکاری اور ہوسٹنگ میں مزا آتا ہے۔ اس لیے اس کو اپنایا۔"

"شہرت تو مل گئی۔ سنبھالنے میں مشکل تو نہیں ہو رہی؟"

(ہنستے ہوئے۔) "ارے نہیں۔۔۔ میں تو اپنی اس شہرت سے بہت خوش ہوں۔ کیونکہ عزت شہرت سب کے حصے میں نہیں آتی۔ مجھے آٹوگراف دینا اچھا لگتا ہے۔"

"اداکاری کے علاوہ دوسرا آپشن کیا تھا؟"

"شاید ڈاکٹر بن جاتی۔ یا کسی بڑی کمپنی میں جاب کر رہی ہوتی اور جو کمائی وہ کپڑوں، بیگوں یا پھر جوتوں پر خرچ کر رہی ہوتی۔ جیسا کہ اب کر رہی ہوں یا پھر شادی کرکے بچے پال رہی ہوتی۔" قہقہہ۔

"انسان کی اچھی تربیت میں کس کا ہاتھ زیادہ ہوتا ہے والدین کا یا پھر اساتذہ کا؟"

"دونوں کا۔ پہلا ہاتھ والدین کا، جس میں وہ ہمیں مینرز سکھاتے ہیں۔ اچھا، برا بتاتے ہیں اور پھر اساتذہ جو ہمیں علم کی اہمیت سے روشناس کراتے ہیں، تو اچھے والدین، اچھے اساتذہ، اچھا ماحول اور اچھے دوست ایک اچھا انسان بننے کے لیے بہت ضروری ہیں۔"

"کچھ اپنے بارے میں بتائیں؟"

"میں ابوظہبی میں پیدا ہوئی۔ ایک بھائی ہے اور میں ہوں۔ ابتدائی تعلیم ابوظہبی میں ہی حاصل کی۔ اے لیول تک۔ پھر شوبز میں کچھ کر دکھانے کا شوق مجھے پاکستان لے آیا۔"

☼ ☼ ☼

نبیل

"جی جناب! کیا حال ہیں؟ اور مصروفیات تو ہمیں آپ کی معلوم ہیں۔ "بلبلے" "ہمنی مون" "شادی کا لڈو" بے حد کامیاب جا رہے ہیں۔ آپ کو سب کا رسپانس کیا مل رہا ہے؟"

"جی بالکل! آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں اور سب کا رسپانس بہت اچھا مل رہا ہے۔ بہت پسند کیے جاتے ہیں ہمارے ڈرامے۔"

"پھر بھی تینوں میں ہٹ کون سا ہے؟"

"اس وضاحت کی تو شاید ضرورت ہی نہیں ہے۔ "بلبلے" سب سے زیادہ پسند کیا جا رہا ہے۔ اس کی ریٹنگ سب سے زیادہ ہے۔"

"آپ نے اپنے آپ کو مزاحیہ ڈراموں تک کیوں محدود کر لیا ہے؟"

"یہ بڑا اچھا سوال کیا آپ نے۔۔۔ میری ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ سب سے الگ، سب سے منفرد کام کروں۔ ابتدا "دھواں" سے کی۔ آج تک سب کو یاد ہے۔ پھر جو بھی سنجیدہ کردار کیے۔ وہ بھی لوگوں کو یاد

ہیں مگر سنجیدہ کام تو سب ہی کر رہے ہیں۔ اس لیے میں نے سوچا کہ ڈپریشن کے اس دور میں ایسا کام کروں کہ لوگ کم سے کم قہقہہ نہیں تو اپنے لبوں پر مسکراہٹ تو لا ہی سکیں۔ بس یہی سوچ کر "بلبلے" کا آغاز کیا۔ اب تک ڈھائی سو سے زیادہ اقساط پیش کر چکا ہوں اور اس کی مقبولیت میں روز بروز اضافہ ہی ہو رہا ہے۔"

"اس میں کوئی شک نہیں کہ "بلبلے" مزاحیہ پروگراموں میں نمبرون ہے۔ پروڈکشن ہاؤس بنانے کا خیال کیسے آیا؟"

"سب کا دل چاہتا ہے کہ اپنا سرمایہ ایسی جگہ لگائے جہاں سے اچھا ریٹرن بھی ہو۔ چنانچہ اس سوچ کے ساتھ اپنا پروڈکشن ہاؤس کھولا۔ اللہ نے کامیابی دی اور آج سب کچھ ہے میرے پاس۔ میری پہلی پروڈکشن "بلبلے" اور دوسری "لو کے لیے" تھی ——— اور "لو کے لیے" بھی ناظرین نے خاصا پسند کیا تھا۔"

"جس زمانے میں آپ اس فیلڈ میں آئے۔ اس دور میں تو اس فیلڈ کو زیادہ پسند نہیں کیا جاتا تھا۔ پھر اجازت کیسے مل گئی؟"

"بڑی مشکل سے۔ کیونکہ گھر والوں کی خواہش تھی کہ میں اعلا تعلیم حاصل کر کے کسی ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب کروں۔ اعلا تعلیم تو حاصل کر لی۔ مگر جاب کی خواہش پوری نہ ہو سکی کیونکہ میں اس فیلڈ میں آ گیا۔ سب کا خیال تھا کہ میں زیادہ عرصہ اس فیلڈ میں نہیں رہ سکوں گا۔ کیونکہ اکثریت کا خیال تھا کہ مجھے اداکاری نہیں آتی۔ مگر میں نے اکثریت کا یہ خیال غلط کر دکھایا ہے۔"

"اعلا تعلیم؟ کہاں تک پڑھا؟ اور لٹریچر سے دلچسپی ہے؟"

"جی! اعلا تعلیم... میں نے اکنامکس میں ماسٹرز کیا ہے اور لٹریچر میں بہت دلچسپی ہے۔ انگریزی اردو کے تقریباً" سب ہی نامور لوگوں کا مطالعہ کیا ہے۔ مثلاً اپنے لوگوں میں قدرت اللہ شہاب، فیض احمد فیض، اشفاق احمد، بانو قدسیہ، غالب، اقبال، حسرت، مشتاق احمد یوسفی اور بہت سے۔"

"پنجابی گھرانے سے تعلق ہے۔ مگر اردو بہت صاف ہے آپ کی؟"

"گھر میں پنجابی بولی جاتی تھی، گھر سے باہر نہیں۔ پہلے اسکول، کالج، یونیورسٹی، پھر یہ فیلڈ، ہر جگہ اردو ملی۔ اپنی قومی زبان ہے۔ بہت پیار ہے مجھے اس سے۔"

"کراچی میں کب سے ہیں؟"

"تقریباً" پندرہ سال ہو گئے ہیں۔ 1998ء میں کراچی شفٹ ہو گیا تھا اور آج تک کراچی میں ہی ہوں۔ بس! شکر ہے کہ بڑی اچھی زندگی گزر رہی ہے۔"

"اور فیملی لائف؟"

"وہ بھی بہترین گزر رہی ہے۔"

☆

عالیہ بخاری

دو راستے

خیام کا تعلق اس دنیا سے ہے جہاں دن سوتے اور راتیں جاگتی ہیں۔ ستارہ نانی، نگینہ خالہ اور دل دار نانی نے اس کی پرورش بے حد ناز و نعم سے کی ہے۔ پھر بھی وہ اس زندگی سے سخت کبیدہ خاطر ہے۔ حتی کہ ایک دن وہ اس گھر سے کسی کو بتائے بغیر نکل آتا ہے۔ راستے میں اس کا ٹکراؤ سالار سے ہوتا ہے، جس سے اس کی شناسائی ہے، جو ریڈیو پر کام کرتا ہے۔ سالار تمام معاملہ فی الفور سمجھ جاتا ہے۔ گھر سے نکلتے ہوئے خیام رقم کے علاوہ نانی کے زیورات بھی اٹھا لاتا ہے، جس پر اسے کوئی پشیمانی نہیں ہے۔ سالار، لاری اڈے تک خیام کو چھوڑتا ہے۔ خیام کے لیے سالار کا رویہ حیران کن ہے۔ شہر آکر اسے کئی روز تک بے روزگار رہنا پڑتا ہے۔ وہ بابو شوکت کے ہوٹل میں قیام کرتا ہے۔ زیورات کے ساتھ قیمتی آرائی چوڑیاں دیکھ کر خیام کو شدید جھٹکا لگتا ہے اور پہلی مرتبہ اپنے پیچھے رہ جانے والی کا بھروسا ٹوٹ جانے کا دکھ ہوتا ہے۔

ربیعہ کا تعلق سفید پوش خاندان سے ہے۔ اس کے والد سرکاری محکمے کے ایمان دار ہیڈ کلرک ہیں جبکہ بھائی معاذ بالکل ابا کا پرتو رفاحی کاموں میں وہ ہر چیز بھولے رکھتا ہے۔ حتی کہ اپنی پڑھائی بھی۔ اماں اور دادی ہر دم معاذ اور ربیعہ کے لیے دعا گو ہیں۔

— ۶۱ —

اکسٹھویں قسط

نانی ستارہ کے پرشکوہ چوبارے پر آج پھر ایک سخت دن اترا تھا۔ ایک خالی خالی سی نگاہ انہوں نے کمرے کے کھلے دروازے سے نظر آتے محرابی برامدے پر ڈالی۔ نیٹ کے کاسنی گلابی پردے ہوا کے جھونکوں سے اڑتے ہوئے ایک دوسرے سے لپٹے جا رہے تھے۔ آج شاما کو اتنی بھی توفیق نہیں ہوئی تھی کہ وہ انہیں سمیٹ کر ڈوری سے باندھ ہی دیتی۔

صندل کے کمرے سے ایک بار پھر رونے کی دردناک آواز آ رہی تھی۔ وہ اس طرح رو رہی تھی جیسے۔۔۔

پتا نہیں کیوں آج انہیں صبح سے فیروزہ کی موت والا دن یاد آ رہا تھا' جب بھری جوانی میں تمام تر حسرتوں کے ساتھ وہ قبر میں جا لیٹی تھی۔۔۔

اس دن بھی ایسی ہی گریہ زاری تھی کہ در و دیوار روتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ فرق یہ تھا کہ اس روز تعزیت کے لیے آنے والیوں سے سیڑھیاں' برآمدہ' ہال اس طرح کھچا کھچ بھرے تھے کہ الامان!

نانی ستارہ کے دل پر آج بھی اس سیاہ ترین دن کی یاد عذاب کی طرح نازل ہوئی تھی۔

"شاما!" انہوں نے برآمدے سے گزرتی ہوئی شاما کو آواز دی۔

"ڈاکٹر کو فون کرو' آ کر صندل کو دیکھ لے۔ کتنے گھنٹے گزر گئے ہیں روتے پیٹتے۔۔۔ کوئی سکون کا انجکشن ہی لگا جائے۔"

"کر دیا ہے نانی۔۔۔ باجی نگینہ نے خود تھوڑی دیر پہلے کیا تھا۔" وہ چلتی ہوئی اندر آ کھڑی ہوئی۔ "ہوا بھی تو بہت برا ہے نا۔۔۔ صندل کی تو ہمت ہی ٹوٹ گئی۔ بچی نے کتنے شوق سے۔۔۔"

ایک ساتھ گرتے کئی آنسوؤں نے شاما کو بات بھی پوری نہیں کرنے دی تھی۔ اس کی وفاداری اس زوال پذیر وقت میں بھی اتنی ہی اجلی اور خاص تھی بلکہ شاید پہلے سے بھی زیادہ۔۔۔

"یوں رو رو کر جان کھونے کا فائدہ۔۔۔ مجھے کم از کم نگینہ سے ایسی امید نہیں تھی۔ مشکل سے مشکل وقت کو اس نے اپنی ہمت کے سہارے کاٹ دیا تو اب کون سی قیامت آ گئی۔"

"ہمت ہی تو ٹوٹ رہی ہے باجی نگینہ کی' جان توڑ محنت کی ہے ساری زندگی۔۔۔" اس نے بہت ہلکے سے کہا تھا مگر نانی نے سن لیا۔

"آپ نے بھی تو باجی گلناز کو کچھ نہیں کہا۔ کیسا واویلا مچا کر گئیں۔ کسی کا بھی لحاظ نہیں کیا۔ باجی نگینہ کو زیادہ زخم ان کی باتوں کے لگے۔ پتا نہیں کب کب کے طعنے دے ڈالے۔ بڑا ہی گند ہے ان کے دل میں آج بھی نانی میرا تو دل چاہ رہا ہے کہ ان کے دروازے پر کھڑی ہو کر وہ کھری کھری سناؤں کہ اوقات یاد آ جائے۔"

دکھ سے مایوسی اور پھر بے ساختہ ابھرتا ہوا غصہ۔ شاما کے موڈ نے چند پل میں کئی رنگ بدلے۔ نانی نے نگاہ اٹھا کر اس کے گہرے سانولے تپتے ہوئے چہرے کی طرف دیکھا۔

"ساری عمر جو کچھ خود کرتی رہیں بیٹی اس سے بھی چار ہاتھ آگے ہے۔ یہ سارے ٹھاٹ باٹ جن پر اترا رہی ہیں اس پر ڈوب کر مر جانا چاہیے انہیں۔" شاما جل کر بولی۔

"شاما!" نانی ستارہ کی آواز بے ساختہ اونچی ہوئی تھی۔ "دماغ تو خراب نہیں ہو گیا تیرا۔ ہوش میں رہ کر بات کر۔ یہ کس پر طعنہ زنی کر رہی ہے ہمارے خاندان پر۔۔۔ میری سگی بہن کا گھرانہ ہے۔۔۔ گلناز اور الماس جدا نہیں ہیں ہم سے۔۔۔"

انہیں شاما پر بڑے زور کا غصہ آنا شروع ہوا تھا۔ کمرے میں اندر آتی نگینہ نے ان کی بات سن کر بے اختیار ہی ماتھے کو چھوا۔

"آفرین ہے آپ پر اماں! اب بھی وہ آپ کا خون۔۔۔ آپ کا خاندان۔۔۔ اب بھی آپ ان کے آگے ڈھال بن

کے لیے تیار۔" مسہری پر پائنتی کی طرف بیٹھتے ہوئے اس نے شاما کو جانے کا اشارہ کیا تو وہ چپ چاپ آنسو صاف کرتی باہر نکل گئی۔

"شاما کو روکنا ضروری تھا۔ ملازمہ ہے وہ۔ بہرحال "آج ان کے بارے میں کچھ کہہ رہی ہے تو کل کو یقینا" اس کے دل سے ہماری عزت بھی جاتی رہے گی۔ سمجھا کرو۔"

نانی ستارہ کے نقطہ نظر میں آج اتنا دم نہیں تھا کہ نگینہ کی بدقسمتی اسے سہار سکتی۔

"رہنے دیں بس۔۔۔" اس نے اکتاہٹ سے ہاتھ ہلایا۔ "قسم کھا کر کہتی ہوں آپ کے اس نام نہاد خاندان سے ہزار درجے اوپر مقام ہے شاما کا میرے دل میں۔ میرے ہر دکھ درد میں بساط سے بڑھ کر ساتھ دیا ہے غریب نے۔ ہماری خوشی میں خوشی اور ہمارے دکھ پر دکھی۔۔۔" اس کی آنکھیں بہت رو لینے کے بعد سوج رہی تھیں اور آنکھوں پر ہمہ وقت لگا رہنے والا نیلا آئی شیڈ بھی گم ہوا تھا۔ ایسی حالت میں اس کے چہرے کی کرختگی کم ہوتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

"سارا قصور میری قسمت کا ہے!" نگینہ کی ٹھنڈی سانس میں بھی کتنی ہی آہ و زاری تھی۔ "ساری عمر ان خارزاروں کے جوتے تلے رہی' صبر کا بھاری پتھر دل پر رکھا' یہی سوچا کہ صندل بڑی ہو گی تو دن پھر جائیں گے۔ کبھی بھولے سے بھی خیال نہیں آیا تھا کہ اگر وہ بھی ماں جیسی ہی قسمت لے کر پیدا ہوئی ہے تب کیا ہو گا؟" اس نے دوپٹے کے پلو سے اپنا بھیگا چہرہ صاف کیا۔ "میری نحوست میری بچی کی زندگی کو کھا رہی ہے اماں۔۔۔!" اس کے لہجے اور چہرے پر بڑی دل توڑتی کیفیت تھی۔

نانی ستارہ کے دل پر آنسوؤں کے کئی قطرے ایک ساتھ گرے تھے۔

"ہم نے تو اپنے طور پر نیکی کی تھی۔ سوچا حالات بد سے بدتر ہو گئے ہیں۔ سارا محلہ مارے لحاظ کے کچھ نہیں کہہ رہا مگر عبرت پکڑ رہا ہے۔ ذلت تو ہماری بھی ہے نا۔ کام دلوا دیں گے تو لڑکی چار پیسے کما لے گی۔ مگر توبہ الٰہی!"

ابھی چند گھنٹے پہلے قیمتی لباس اور زیورات سے سجی گلناز بیگم اسی کمرے میں بڑے تکبر کے ساتھ ہاتھ نچا نچا کر کہہ رہی تھی۔

"سیکڑوں فنکشن کر ڈالے میری الماس نے' ایک سے ایک سپرہٹ گیا۔ ایک بوتل بھی نہیں ٹوٹی کسی میں اور یہاں؟ صندل کا نام لگنا تھا کہ سارا معاملہ ہی چوپٹ ہو گیا۔ ایسا خوش مزاج' دل کا سخی نبیل سیٹھ بے چارہ منٹوں سیکنڈوں میں ہی چٹ پٹ ہو گیا۔ خود گولی ماری یا کسی نے مار دی نحوست تو صندل کی ہی آگے آئی۔ اس کا کوئی کام بن ہی نہیں سکتا ہے۔ مل گیا ثبوت ایک بار پھر۔"

اس نے نہ صندل کے زرد پڑتے چہرے کی طرف دیکھا اور نہ ہی نانی ستارہ کی بزرگی کا ہی آج لحاظ کیا تھا۔ وہ یکسر بھول گئی تھی کہ صندل کو ساتھ لانے کی شرط پر ہی نبیل نے اسے یہ فنکشن آفر کیا تھا۔

"کتنا منع کیا تھا سب نے کہ صندل کو مت ساتھ لگا۔ مگر میری ہی مت ماری گئی تھی۔ اپنی بچی کے روشن مستقبل کو گرہن لگا لیا۔ صبح ہی سے کم بخت میڈیا والوں کے فون پر فون آ رہے ہیں کہ نبیل کی موت کی وجوہات کے بارے میں کچھ جانتی ہیں تو بتائیں۔ ایک نے تو کھل کر کہا کہ الماس سے محبت میں ناکامی خودکشی کی وجہ ہے۔ لعنت ہو ان پر۔۔۔ میری بچی کے نام پر تیری اور صندل کی نحوست اثر پڑا ہے نگینہ۔۔۔" وہ بکتی جھکتی وہاں سے گئی تھی۔

دروازے کی چوکھٹ سے لگی صندل کی رہی سہی ہمت بھی اس کے ساتھ ہی رخصت ہوئی تھی۔ وہ اس طرح تڑپ تڑپ کر روئی کہ اسے سنبھالنا ناممکن ہو گیا۔

فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔

"گیتی کا ہے!" نانی ستارہ نے اطلاع دیتے ہوئے فون سائیڈ ٹیبل سے اٹھا کر کان سے لگانا چاہا تب ہی نگینہ نے فون ان کے ہاتھ سے لے لیا۔

"مبارک ہو گیتی آرا۔۔۔ تیری خوشی پوری ہوئی۔ نہیں آرہے ہیں اب ہم تیرے کراچی۔۔۔ ہو گیا کینسل صندل کا پروگرام۔ کیسے منہ بھر کر ٹوکا تھا تو نے بہن کو۔ بنی بنائی بات بگڑ گئی اس کی۔ ہماری مصیبتوں کے دن کم ہونے والے نہیں ہیں۔"

وہ گیتی آرا پر اس طرح بگڑ رہی تھی جیسے اس سارے معاملے میں سب سے بڑی قصوروار وہی ہو۔

"کیا ہو گیا ہے نگینہ! بچی پر کیوں غصہ کر رہی ہے۔ پتا نہیں وہ اپنی کن پریشانیوں میں ہے اور پھر اس کا قصور کیا ہے۔"

نانی ستارہ نے غصے سے کہتے ہوئے نگینہ سے فون زبردستی لیا۔

"اسے نہ کہوں تو کسے کہوں۔۔۔ بدشگونی تو اس نے ہی کی تھی۔ الزام سارا صندل پر ڈال گئی وہ بدبخت گلنار۔"

فون کے دوسرے سرے پر گیتی آرا نے نگینہ کو چلاتے ہوئے سنا تھا۔ اس کی آواز بھیگی ہوئی تھی۔

"ماں کی بات کا خیال مت کرنا بیٹا! یوں ہی پریشان ہو جاتی ہے۔ سب خیریت ہے یہاں۔" نانی ستارہ کے لہجے میں وہ فطری ساٹھہراؤ تھا، جو ہمیشہ معاملات کو سلجھانے کا کام بخوبی انجام دیتا تھا۔

گیتی آرا نے ایک گہری سانس لی۔ "مجھے امی کی کوئی بات بری نہیں لگی ہے نانی! اللہ کے ہر کام میں کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ امی ابھی بھی نہیں جانتیں کہ اللہ نے کس بڑے عذاب سے ہمیں بچالیا ہے۔ ہم اس کا جتنا بھی شکر کریں۔ کم ہے۔"

کراچی جانے کے بعد سے یہ پہلی بار تھا کہ وہ اتنی زیادہ پُرسکون تھی۔

"کوئی خاص بات ہوئی ہے کیا؟"

"جی! زرتاج بیگم کے شوہر نبیل نے گزشتہ رات خودکشی کرلی ہے۔" اس نے بہت سکون سے اطلاع دی۔

"کیا؟" وہ سخت حیرت میں مبتلا ہوئی تھیں۔ آنسو صاف کرتی نگینہ نے چونک کر انہیں دیکھا۔

"یہ فنکشن وہی کروا رہا تھا نانی! اس کی بڑی آرزو تھی کہ وہ کسی بھی طرح سالار کو ذلیل کرواسکے۔ خاص طور پر ہمارے گھرانے کا انتخاب کرنا پرفارمنس کے لیے۔۔۔"

اب بتانے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

نگینہ، نانی ستارہ کے چہرے کے بدلتے ہوئے رنگ کو دیکھ کر چند منٹوں کے لیے تو واقعی اپنا دکھڑا بھول گئی تھی۔

"الٰہی تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تو نے ہم جیسے کم ترین درجے والوں کی بھی عزت بنائے رکھی۔ قربان جاؤں تیری شان کریمی کے مالک! جو ہمارے عیبوں پر پردہ ڈالتا ہے مگر ہم نہ سمجھتے ہیں۔ نہ باز آتے ہیں۔" فون بند کر کے انہوں نے بڑی عاجزی سے ہاتھ جوڑے تھے۔ ان کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔

"کیا ہوا اماں! ایسا کیا کہا گیتی نے۔۔۔ سب ٹھیک تو ہے اس کو کوئی پریشانی تو نہیں۔"

نگینہ نے بے تابانہ سوال در سوال کر ڈالے تھے۔ وہ بھول رہی تھی کہ ابھی چند منٹ پہلے تک وہ گیتی سے کتنی زیادہ ناراض تھی۔

"شاما!" نانی ستارہ نے اونچی آواز میں پکارا۔

"جی نانی!" وہ دوسرے ہی لمحے حاضر تھی۔

"وضو کا پانی رکھو۔۔۔!"

وہ الٹے قدموں واپس مڑ گئی۔

"میں ذرا شکرانے کے نفل پڑھ لوں۔" وہ اٹھنے لگی تھیں تب ہی نگینہ نے ہاتھ پکڑ کر روکا۔

آج دن بھر سے مجھے ادھیلے کے دوران شکرانے کے یہ سعد لمحات۔۔۔؟

وہ مکمل حیران تھی۔ نانی ستارہ نے محبت سے اس کا چہرہ چھوا۔

"تجھے مبارک ہو نگینہ! اللہ نے تیرے پورے خاندان کو بچالیا۔" انہوں نے قصہ مختصر کر کے گوش گزار کرنا شروع کیا۔ نگینہ کی آنکھیں حیرت سے کھلی تھیں۔

☼ ☼ ☼

دور اس بڑے سے گھر کی اوپری منزل میں بڑا سکون بھرا وقت اترا تھا۔

"آج کا دن میں ساری زندگی نہیں بھول سکوں گا گیتی!"

"اور میں بھی!" گیتی نے مسکرا کر سالار کی طرف دیکھا۔

وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی کمرے میں آیا تھا اور اسی کے کہنے پر گیتی نے نانی ستارہ کو یہاں ہونے والے حادثے کی خبر دی تھی۔

"وہ میرا خاندان ہیں اور ہر اچھی بری بات میں انہیں شریک رکھنا میرا فرض ہے۔"

"بس ایک بات کا افسوس ہے کہ تم نے اتنی بڑی بات مجھ سے چھپائی۔ وہ میرے ہوتے ہوئے تمہیں ڈراتا رہا اور میں بے خبر رہا۔ سوچ کر بھی خود پر شرم آتی ہے۔ تمہیں کیا مجھ پر ذرا سا بھی بھروسا نہیں تھا گیتی! اچا ہے کچھ بھی ہو جاتا۔ تم مجھے چھوڑ کر کیسے رہ سکتی تھیں؟"

ایک برا امکان، جو اللہ کی مہربانی سے ٹلا تھا۔ وہ اس پر رہ رہ کر افسردگی میں مبتلا ہو رہا تھا۔

گیتی نے نرمی سے سالار کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔ وہ چاہتی بھی تب بھی اسے نہیں سمجھا سکتی تھی کہ وہ اس کی عزت کے بارے میں اتنی حساس ہو چکی ہے۔ سالار اس کے اترے ہوئے چہرے کو دیکھ کر ہلکے سے مسکرا دیا۔

"چلو چھوڑو یہ جھگڑا کسی اور وقت کے لیے اٹھا کر رکھتا ہوں۔" اس نے گیتی کا ہاتھ محبت سے تھاما۔

"آج خیام کو دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی، وہ کتنا بدل گیا ہے نا!" گیتی ہلکے سے مسکرائی۔

"مجھے تو اب تک یقین نہیں آرہا کہ وہ یہاں آیا خود اور مجھے کیا ہوا تھا جو بے وقوفوں کی طرح رونے بیٹھ گئی۔ کیا سوچتا ہو گا وہ۔"

"کچھ نہیں سوچتا ہو گا، اب وہ ایک بدلا ہوا لڑکا ہے۔ بے حد سمجھ دار، سلجھا ہوا اور پُراعتماد۔ میں نے اس کے ایسا ہی ہونے کی تمنا کی تھی۔ لیکن ایسا ہو بھی سکے گا، یہ مجھے یقین نہیں تھا۔ معاذ اور اس کے والد یقیناً "حیرت انگیز لوگ ہیں۔"

"انہوں نے ہمارے خاندان پر ایسا احسان کیا ہے جو کبھی اتارا نہیں جاسکتا۔ میرا بہت دل چاہ رہا تھا کہ میں نانی کو خیام کے بارے میں بتاؤں۔ لیکن آپ نے منع کر دیا تھا۔"

"ہاں، یہ ضروری تھا۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہوا۔ "یہ فیصلہ خود خیام کو کرنے دو۔ وہ کب کس سے ملنا چاہے گا، سب کے لیے یہی بہتر ہو گا۔" اس نے گاڑی کی چابی اور والٹ اٹھایا۔

"میں ذرا راجو کو دیکھ آؤں۔ آج اس کے پاس نہیں جاسکا۔ مہلت ہی نہیں ملی۔ اسے اب تک اس حادثے کی خبر نہیں ہے۔"

"زرتاج بیگم واپس آئیں گی کیا؟" گیتی اس کے ساتھ چلتی ہوئی باہر آئی۔

"ان کے ساتھ کمال صاحب کا کانٹیکٹ ہے۔ اطلاع رات ہی ہو گئی تھی لیکن وہ شاید ابھی آئیں گی نہیں۔ ان کے وکیل نے بتایا ہے کہ ان کی اپنی حالت بھی ٹھیک نہیں ہے۔" وہ دونوں سیڑھیاں اتر کر نیچے آئے۔
"ذرا دو چار دن گزر جائیں تو تم لاہور ہو آنا۔ میرا جانا ابھی مشکل ہو گا۔ میں ان دنوں یہیں کراچی میں ہی رہنا چاہتا ہوں۔"
"مجھے کہیں نہیں جانا اب۔" گیتی نے ایک گہری سانس لی۔ "اور جائیں گے تو ہم ایک ساتھ ہی جائیں گے ویسے بھی میں چلی جاؤں گی تو گھر کو کون دیکھے گا۔"
سالار ایک دم ہنستا چلا گیا۔
"اچانک ہی ساری ذمہ داریوں کا خیال تمہیں کیسے آگیا۔ کہاں تو چپ چاپ راہ فرار اختیار کر رہی تھیں۔"
"آپ جائیں' آپ کو دیر ہو رہی ہے۔" گیتی نے جھینپ کر اسے باہر کا راستہ دکھایا۔

☼ ☼ ☼

"خاندان بھر میں منہ دکھانے کے قابل نہیں ہم!" آپا گل اپنے پسندیدہ جملے کی تکرار میں مصروف تھیں۔ ماحول کی ہولناکی کو بڑھانے کا یہ ان کا تیر بہدف نسخہ تھا۔
"یہ لڑکی ہمیشہ ہمارے لیے مسئلے کھڑی کرتی رہی ہے۔ جب ٹھیک ٹھاک تھی تب بھی ہمارے سروں پر بیٹھ تلوار لٹکتی رہی اور اب اس بیماری میں تو حد ہی ہو چکی ہے۔"
کمرے میں موجود تینوں لوگوں کو ان کی بات مکمل کرنے کا انتظار کرنا پڑا۔
"یہ بیماری وغیرہ صرف ڈراما ہے۔ جویا جان بوجھ کر آنکھیں بند کیے ہوئے ہے تاکہ وہاں رکنے کا جواز رہے۔ معاذ جیسا عاشق میسر ہے تو..."
"خدا کے لیے گل!" شاکرہ امی نے ان کے آگے بے ساختہ ہاتھ جوڑے۔ "اب تو اس پر رحم کرو۔ سگی بہن ہے تمہاری۔ کس حال میں پڑی ہے۔ کیا تمہارے دل کو کچھ نہیں ہوتا اسے دیکھ کر۔" ان پر جو ہمہ وقت رقت طاری رہنے لگی زیادہ بولنے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔
آپا گل نے اکتاہٹ کے ساتھ سر کو ہلکی سی جنبش دی۔ "ہونہہ... ایموشنل بلیک میلنگ..."
"واہ آپا گل! اب تو تم صحیح وقت پر انگریزی کے الفاظ بھی استعمال کرنے لگی ہو۔ اسی طرح ترقی کرتی رہیں تو..."
"بدتمیزی مت کرو سلمان!" انہیں سلمان کے مذاق پر جھنجلاہٹ ہوئی تھی۔
"ہمارے گھر کا ہمیشہ سے یہی مسئلہ رہا ہے کہ گھر کے اول ایشوز پر بات کرنے کے بجائے ان سے آنکھیں چرا لی جاتی ہیں۔ حالانکہ اگر وقت پر ہی ان کی روک تھام کر لی جاتی تو آج وہ اتنے بڑے پہاڑ بن کر ہمارے سینوں پر نہ دھرے ہوتے۔" چڑچڑے انداز میں بات کرتے وہ اظہار صاحب کی طرف مڑیں۔
"ابو... آپ سن رہے ہیں نا۔"
"ہاں... آں!" وہ جس طرح چونکے تھے' اس میں ان کا جواب پوشیدہ تھا۔ آپا گل نے بے اختیار ہی ماتھے کو چھوا۔
"آپ نے اسی وقت معاذ کو وہاں سے چلتا کیوں نہیں کیا۔ اچھا موقع تھا' اسلام چچا کے سامنے ہی آپ کو سختی سے بات کرنی چاہیے تھی۔ وہ آخر کیوں ٹھیکے دار بن کر بیٹھا ہے۔"
"میں نے کہا ہے نا اسلام بھائی کو... چلا جائے گا وہ۔" ان کے لہجے میں دبی دبی سی کیفیت تھی۔

"یہ کیا بات ہوئی... وہاں کچھ اور ہوا ہے کیا؟"
"نہیں تو... کیا ہونا ہے؟" اظہار صاحب نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ آئی سی یو کے آگے کھڑا معاذ نگاہوں سے ہٹتا اور پھر آموجود ہوتا۔
"ٹھیک ہے... پھر میں فرید الدین کو ساتھ لے کر جاؤں گی اسپتال... دیکھتی ہوں کیسے رکتا ہے معاذ وہاں۔" پوری قطعیت کے ساتھ آپا گل کا ایک اور فیصلہ سامنے آیا۔
"فی الحال اس کا علاج ہونے دو' بے کار کے تماشے مت کھڑے کرو گل! فرید الدین کا وہاں کیا کام ہے۔" شاکرہ امی نے ایک بار پھر اپنے آنسو صاف کر لیے تھے۔
"کیوں نہیں ہے' اس کا کام... جویا کا منگیتر ہے وہ... ہونے والا شوہر' اس سے زیادہ کسی اور کا حق نہیں ہے جویا پر... اور مت بھولیں کہ آپ لوگ اسی کے گھر کی چھت کے نیچے بیٹھے ہیں۔ آج وہ نکال دے تو کوئی دوسرا ٹھکانا بھی نہیں ہے۔"
"کیوں... تمہارا گھر بھی تو ہے۔ کیا تم اپنے والدین اور بہن بھائی کو چند روز بھی اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتیں آپا گل!" سلمان نے بہت سنجیدگی سے ان کی طرف دیکھا تھا۔
"نہیں... کبھی نہیں۔" ایک لمحے کا بھی توقف کیے بغیر انہوں نے صاف جواب پکڑا دیا۔ "میں اپنے میاں اور سسرال والوں کے سامنے نگاہ نیچی نہیں کر سکتی۔ تم تو سدا کے بے حس ہو سلمان! ورنہ یہ بات کبھی منہ سے بھی نہ نکالتے۔ بہنوں کے گھر جا کر پڑے رہنے کا خیال تم جیسے انسان کو ہی آسکتا ہے۔"
سلمان نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ "یہ بے حسی بھی تمہاری بخشی ہوئی ہے آپا گل! ورنہ ایک وقت تھا جب تم زوبیہ کے ٹکڑوں پر پڑے رہنے کو اپنی اور میری عزت افزائی سمجھتی تھیں اور پھر اب اتنے سال سے جویا کی کمائی بھی تو کھا رہے ہیں ہم۔ جب اس میں شرم نہیں تو..."
اظہار صاحب اٹھ کر بالکونی میں جا کھڑے ہوئے تھے' پر کسی نے بھی ان کے اٹھنے کو نوٹ نہیں کیا۔ سب ان کی عدم موجودگی کے عادی ہو چکے تھے۔
آپا گل اور سلمان کے درمیان اس طرح کی تکرار معمول کا حصہ تھی۔ مشترکہ مفادات پر دونوں کی رائے ایک ہوتی اور ذرا ادھر ادھر ہوتے ہی اگلے پچھلے سارے حساب بے باق کر لیے جاتے۔
"جویا غیر شادی شدہ ہے۔ اگر جاب کر رہی تھی تو ظاہر ہے اسے یہیں خرچ کرنا تھا۔ میری بات اور ہے۔ میں ایک عزت دار آدمی کی بیوی ہوں۔ سوسائٹی میں ہمارا کوئی مقام ہے۔ میری ساری سسرال انتہائی پڑھی لکھی اور تمیزدار ہے۔ تم لوگوں کی طرح نیم خواندہ' آدھا تیتر آدھا بٹیر والی حالت نہیں ہے ان لوگوں کی۔" ان کے لہجے کے کھردرے پن میں غرور کا رنگ شامل ہوا۔
"وہی سسرال جسے آج تک تم نے منہ نہیں لگایا اور اب وہ تمہیں منہ نہیں لگاتے۔ سب پتا ہے ہمیں۔ اسی شہر میں ہم بھی رہ رہے ہیں۔" سلمان اکتاہٹ سے کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ آپا گل کا چہرہ خفت سے سرخ پڑ رہا تھا۔
"آپ سن رہی ہیں نا امی! پھر بھی نہیں ٹوک رہیں اسے۔ جویا کی شادی فرید الدین سے ہو جائے۔ اس کے بعد کبھی قدم بھی نہیں رکھوں گی۔ آپ لوگوں کے ہاں۔ میری بلا سے سب بھاڑ میں جائیں۔"
بالکونی میں کھڑے اظہار صاحب نے اپنے عقب سے آتی ان آوازوں سے سخت وحشت محسوس کی تھی۔ کاش کوئی ان دونوں کے منہ پر ہاتھ رکھ کر انہیں خاموش رہنے پر مجبور کر دے۔
انہیں بے ساختہ دن یاد آئے' جب گھر میں ان کے حکم کا سکہ رائج تھا۔ وہ صحیح معنوں میں سربراہ تھے اور مجال

نہیں تھی کسی کی کہ وہ ان کے آگے زبان بھی کھولے... ہر ایک اپنی ضرورت کے لیے ان کی طرف دیکھتا تھا۔

سونے سے لدی شاکرہ بیگم۔

خوشامدی نگاہوں سے دیکھنے والی گل۔

اور یہ سلمان اور زوبیہ کی شاہانہ شادی۔

اب اس کسمپرسی کے عالم سے گزرتے ہوئے بے محابا خرچ' سونے اور ڈائمنڈ کی خریداری' فائیو اسٹار ہوٹل میں دیے جانے والے عشائیہ کے بارے میں سوچنا' جیسے کسی اور ہی عالم کی باتیں لگتی ہیں۔

انہوں نے آنکھوں میں آتے آنسوؤں کو ہتھیلی سے رگڑ کر خشک کیا۔

آپا گل اور سلمان کی لڑائی پتا نہیں کس نہج پر پہنچ کر دھیمی پڑ چکی تھی۔

"میں آج ہی فرید الدین کو لے کر اسپتال جاؤں گی ابو۔" وہ ان کے عقب میں آکر کھڑی ہوئی تھیں۔ "میری بات ہو گئی ہے فرید الدین سے۔ وہ کسی دوسرے اسپتال میں جویا کے علاج کی ذمہ داری اٹھانے کے لیے تیار ہے۔ ویسے بھی یہ اسپتال محض اپنا بل بنانے کے لیے مشہور ہے۔ علاج تو ہر جگہ ایک سا ہی ہوتا ہے۔ ہم کم از کم اسلام چچا کے احسان سے تو نجات حاصل کر سکیں گے۔"

اس ساری بات کے دوران اظہار صاحب نے ایک بار بھی ان کی طرف پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔

"اور فرید الدین کا احسان۔" انہوں نے جیسے سرگوشی سی کی۔

"وہ ہم پر احسان نہیں کر رہا' اس کا فرض بنتا ہے۔ یہ گھر بھی تو آخر اسی نے دیا ہے آپ کو۔ وہ یہ سب خوشی خوشی کر رہا ہے۔"

"پھر بھی ہمارے لیے تو باعث شرم ہے نا۔ اگر تمہارے ہاں نہیں رہ سکتے تو پھر یہ بھی تو بیٹی کا ہی گھر ہوا نا۔" اس بار انہوں نے پلٹ کر آپا گل کی طرف دیکھا تھا۔

"حد ہے' آپ بھی کس کو کس سے ملا رہے ہیں۔ اکبر اعلا خاندان سے تعلق رکھتے ہیں ابو! ان کے اور فرید الدین کے لائف اسٹائل میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ فرید الدین کا خاندان نچلے درمیانے درجے سے تعلق رکھتا ہے۔ صرف وہی ہے جو زمین' پیسہ' جائیداد دبا کر بیٹھا ہے' لیکن پیسہ خرچ کرنے کا نہ سلیقہ' نہ تمیز۔ وہ تو الٹا ہمارا احسان مند ہو رہا ہے کہ ہم اسے رشتہ دے رہے ہیں۔ ساری عمر خرچا اٹھائے گا سارے گھر کا۔ عزت سے گزر جائے گی زندگی آپ سب کی۔"

بولتے بولتے ان کا سانس پھولنے لگا تھا۔

"میں چلتی ہوں۔ فرید الدین نیچے آچکا ہے۔" وہ کہتے ہوئے مڑ گئیں۔ وہ مزید کچھ بھی نہیں کہہ سکے۔ اظہار صاحب اور سلمان دونوں نے خاموشی اختیار کی تھی۔

صرف شاکرہ امی گرتی پڑتی پیچھے پیچھے آئی تھیں۔

"گل... گل... بات تو سنو!"

مگر وہ اپنے بھاری بھرکم وجود کو سنبھالتے ہوئے سیڑھیاں اترتی چلی گئیں۔

"جانے دیں انہیں' کچھ نہ کچھ تو کر ہی لیں گے۔" سلمان نے شاکرہ امی کو کندھوں سے تھامتے ہوئے کہا تو وہ وحشت زدہ نگاہوں سے اسے دیکھے گئیں۔

"اب کریں بھی تو کیا' سڑک پر جا کر تو بیٹھنے سے رہے' نہ گھر بکتا' نہ یہ سب ہوتا۔"

اظہار صاحب ابھی تک بالکونی میں کھڑے نیچے بازار میں پتا نہیں کیا تلاش کیے جا رہے تھے۔ مصلحت بھری گھناؤنی خاموشی کا یہاں کب سے راج تھا۔

انہوں نے اپنے کندھوں پر رکھے سلمان کے ہاتھ ہٹائے اور خود مسہری پر جا کر بیٹھ گئیں۔ سلمان کچن سے جا کر اپنے کھانے کے لیے کچھ نکال لایا تھا اور اب اس اطمینان کے ساتھ کھا رہا تھا جیسے اب دنیا میں اس کے کرنے کے لیے کچھ نہیں۔

وہ بہت غور سے اس کی شکل دیکھے گئیں۔ وہ تینوں ایک سے تھے۔

اظہار صاحب' آپا گل اور سلمان۔

غضب کی مماثلت۔

جویا کے نیم جان وجود پر ٹوٹ پڑنے کے لیے بے تاب تین بڑے گدھ۔

شاکرہ امی نے بے اختیار جھرجھری سی لی۔

"آپ سو جائیں' بہت دیر سے اٹھی ہوئی ہیں۔" ہمدردانہ مشورہ دیتا ہوا سلمان دوبارہ کچن میں کچھ اور لینے کے لیے جا چکا تھا۔

ایک تھکی تھکی سی سانس شاکرہ امی کے لبوں سے آزاد ہوئی۔ اب پتا نہیں' وہاں اسپتال میں کیا ہونے والا ہے۔

بالکونی میں کھڑے اظہار صاحب کی نگاہ نے فرید الدین کی گاڑی کا تب تک پیچھا کیا' جب تک وہ انہیں نظر آتی رہی۔

دل میں گزشتہ شام سے بڑی بے وقت ایک خلش ابھری تھی مگر اس پر دھیان دینے میں خسارہ ہی خسارہ۔ انہوں نے خوف زدہ ہو کر اپنا دھیان دوسری طرف لگانا چاہا۔

☼ ☼ ☼

خیام ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی واپس گیا تھا۔ اس کے پاس کرنے کے لیے بہت ساری باتیں تھیں۔

نبیل کی خودکشی' اپنا ابا کے ساتھ سالار کے گھر جانا اور سب سے اہم گیتی آرا سے اپنی ملاقات۔

معاذ چاہنے کے باوجود بھی کسی ایک بات پر فوکس نہیں کر پا رہا تھا۔ تب بھی اسے سب سے زیادہ اہم خیام کا گیتی سے سامنا کر لینا لگا تھا۔

"بہت اچھا کیا تم نے... سالار جیسے بہترین شخص کے ساتھ تمہارے خاندان کا تعلق بتاتا ہے کہ وہ سب یقیناً بہت اچھے ہیں اور گیتی سے تو میں مل چکا ہوں کئی بار راجو اور زری کی شادی کے سلسلے میں۔ بہت سادہ اور حساس گیتی ہے۔"

خیام ہلکے سے مسکرایا۔ اس کا ہر انداز اب اس کی ذہنی مضبوطی کی گواہی دینے لگا تھا۔

"میں چلتا ہوں' رات میں آجاؤں گا۔"

"نہیں' کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تم گھر پر ہوتے ہو تو مجھے بے فکری رہتی ہے کہ وہاں تم ہو۔" معاذ نے سختی سے منع کیا۔

"شائستہ آنٹی بہت ناراض ہیں آپ سے۔ تھوڑی دیر کے لیے گھر کا چکر لگا لیں۔ انہیں ناراض مت رہنے دیں۔"

معاذ افسردگی سے مسکرا دیا۔

"یہی کوشش کرتا رہا ہوں اب تک لیکن..." اس نے نچلے لب کو دانتوں تلے دباتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی۔

کاش۔۔۔ کاش اس کے بس میں ہوتا تو وہ ایک چھوٹے سے پل کے لیے بھی معاذ بھائی کو اداس نہ ہونے دیتا۔
قریب پڑا ایک چھوٹا سا پتھر خیام نے یوں ہی دور اچھال دیا۔
"تم ان سے کہنا کہ میری فکر مت کریں، کل پرسوں تک لگاؤں گا چکر۔ اصل میں تا خیام۔۔۔"
وہ کچھ کہتے کہتے پھر رکا۔ یہ ٹوٹے پھوٹے فقرے بھی ان ہی دنوں کی دین تھے۔
"پتا نہیں کیوں زندگی میں پہلی بار میں اتنا وہمی ہو رہا ہوں خیام! ایسا لگتا ہے کہ اگر میں اسے اسی طرح چھوڑ کر ذرا سی دیر کے لیے بھی یہاں سے گیا تو اللہ نہ کرے، اللہ نہ کرے اسے کچھ ہو جائے گا۔"
"صرف وہم ہے آپ کا، کچھ بھی نہیں ہوگا، کچھ بھی نہیں۔" خیام کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔
وہ اس کے جانے کے بعد بھی تھوڑی دیر وہیں بیٹھا رہا۔ زویا اسے خیام کے ساتھ مصروف دیکھ کر اس وقت ا
جویا کو دیکھنے چلی گئی تھی اور اب پتا نہیں کہاں تھی۔ وہ چلتا ہوا آئی سی یو والے بلاک کی طرف آیا۔
لمبے سے کوریڈور کے اختتام پر وہی ایک سا منظر، جہاں وہ کھڑا ہوتا تھا۔ وہاں سے محض چند قدم کے فاصلے پر
شیشے کی دیوار کے اس پار نظر آتی تھی۔
دنیا مافیہا سے بے خبر۔
دن رات میں کتنی ہی بار وہ یہاں آ کر اسے دیکھتا تھا۔ ہر بار اس امید کے ساتھ کہ شاید کوئی بہتری کی صورت نکلے۔
"اور بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اس کی موجودگی کا ذرا سا بھی اثر نہ لے۔" اس نے کئی بار حیرت سے سوچا تھا۔
معمول کا راؤنڈ لگا کر نکلتے ہوئے ڈیوٹی ڈاکٹر نے ہمدردی سے معاذ کو دیکھا، وہ سب اب اس کی وہاں موجودگی کے عادی ہوتے جا رہے تھے۔
"آج ان کی طبیعت میں خاصی بہتری ہوئی ہے۔ جلد ہی کوئی اچھا رزلٹ آنے والا ہے ان شاءاللہ۔ انہوں نے رسپانس دینا شروع کر دیا ہے۔" معاذ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
ڈاکٹر ہمیشہ امید باندھنے والی باتیں کرتے تھے مگر اس وقت کچھ خاص بات ضرور محسوس ہوئی تھی۔ وہ اس کا کندھا تھپک کر جا چکا تھا۔
معاذ کا دل بڑے عجیب سے انداز میں دھڑکنا شروع ہوا تھا۔
"جویا۔۔۔ جویا۔۔۔ جویا۔"
بنا آواز، بنا الفاظ، اس خاموش پکار کی شدت روز بڑھتی تھی۔
شیشے سے ماتھا ٹکائے، بنا پلک جھپکائے، ایک کے بعد ایک، کتنے ہی آنسو معاذ کی آنکھوں سے گرتے رہے۔
وقت کی رفتار یہاں گم ہوتی تھی۔ تب ہی جویا کی بند پلکوں میں جنبش ہوئی تھی۔
معاذ نے بے تابی سے اس کی طرف دیکھا تھا۔
"یا اللہ۔۔۔"
وہ آہستہ آہستہ آنکھیں کھول رہی تھی۔
امید اور ناامیدی کے اعصاب شکن مرحلے کا خاتمہ ہوا۔
جویا کی آنکھیں کھل چکی تھیں اور وہ ٹھیک اس کے سامنے کھڑا تھا۔ ایک بہت ہی بے ساختہ سی مسکراہٹ معاذ کے چہرے پر پھیلی تھی۔ جویا کا چہرہ بے تاثر تھا لیکن اس کی نگاہ معاذ پر جمی تھی۔ بڑی گہری ویرانی تھی اس کی آنکھوں میں۔ چند لمحات بڑی خاموشی سے گزرتے چلے گئے۔ کیا خوش بختی ہے کہ ان سعد لمحات میں صرف وہی دو تھے، کوئی تیسرا نہیں۔

مگر پتا نہیں وہ اسے پہچان بھی رہی ہے یا نہیں۔
ایک طویل بے ہوشی کے بعد کے فطری خدشات نے معاذ کو خوف زدہ کرنا چاہا۔ مگر تب ہی۔
جویا کی آنکھوں سے آنسو کا ایک قطرہ پھسل کر گرا تھا۔
"شکر ہے کہ وہ پہچان رہی تھی۔" ایک اور بھاری بوجھ دل سے اترا۔ جویا نے تھک کر دوبارہ آنکھیں بند کر لی تھیں۔
وہ یہاں سے ہٹنا تو نہیں چاہتا تھا لیکن باہر زویا کو یہ خوش خبری سنانی ضروری تھی۔ اندر آئی سی یو میں جویا کے ہوش میں آ جانے کا نوٹس لے لیا گیا تھا۔ معاذ نے سینئر ڈاکٹرز کو آئی سی یو کی طرف تیزی سے جاتے ہوئے دیکھ کر بڑا اطمینان محسوس کیا تھا۔
وہ تقریباً "دوڑتا ہوا باہر آیا۔ زویا سامنے سیڑھیوں پر ہی کھڑی تھی۔
"جویا کو ہوش آگیا ہے زویا!"
"ہاں!" ایک بے ساختہ گہری خوشی نے زویا کو گھیرا۔ فوری طور پر تو وہ کچھ بھی کہنے کے قابل نہیں تھی۔
"اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ دیکھنا اب وہ کتنی جلدی سنبھل جائے گی۔ ان شاءاللہ۔"
"ان شاءاللہ!" زویا نے تمام عرصے میں کمال ہمت کا مظاہرہ کیا تھا، مگر اس اچھی خبر نے بچا کھچا سارا حوصلہ ختم کیا تھا۔ وہ وہیں سیڑھیوں پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر بے اختیار روتی چلی گئی۔
"یہ کیا۔ تم بھی اس طرح کرو گی تو پھر جویا کو کون سنبھالے گا۔ اب تو اسے تمہاری پہلے سے زیادہ ضرورت ہے۔" زویا کے سر پر ہاتھ رکھ کر وہ نرمی سے اسے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ عقب میں آ موجود ہوئیں۔
"تھوڑا راستے سے، ساری جگہ گھیر کر کھڑے ہو گئے، ذرا جو تمیز ہو۔" وہ بنا مڑے آپا گل کو پہچان چکا تھا۔
"آپا! جویا کو ہوش آگیا ہے ابھی ابھی۔۔۔ وہ۔۔۔" زویا نے سارے اختلاف بھول کر جو خوش خبری انہیں سنانی چاہی تھی، ان کے ساتھ کھڑے فرید الدین کو دیکھ کر پوری طرح نہ سنا سکی۔
اس کے چہرے کی مسکراہٹ بتا رہی تھی کہ آپا گل سے زیادہ وہ خوش ہوا ہے۔
"ہاں تو ہوش میں آنا ہی تھا۔ ایسا کوئی لاعلاج مرض تھوڑی لاحق ہو گیا تھا، جو جان لے کر ہی ٹلتا۔ ہٹو، آئیں بھائی فرید الدین!"
روکھائی سے کہتی ہوئی وہ آگے بڑھنے لگی تھیں کہ معاذ سامنے آ کھڑا ہوا۔
"آپ نہیں جائیں گی وہاں۔ کوئی نہیں جائے گا۔" اس نے ان دونوں کو باری باری دیکھا تھا۔
آپا گل نے چونک کر معاذ کی طرف دیکھا۔ وہ بے حد سنجیدہ تھا اور اس طرح سامنے کھڑا تھا جیسے انہیں روکنے کا پورا ارادہ کر چکا ہے۔
آپا گل اور فرید الدین کو مجبوراً "قدم روکنے پڑے۔
"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا ہے معاذ! ہوتے کون ہو تم روکنے والے۔ بڑی بہن ہوں میں جویا کی اور یہ اس کے ہونے والے شوہر۔" آتے جاتے لوگوں کے خیال سے وہ دبی آواز میں بات کر رہی تھیں۔
"وہ کچھ بھی نہیں لگتیں آپ اس کی۔ شرم آنی چاہیے آپ کو ایسا دعوا کرتے ہوئے۔ چلی جائیں واپس۔ فوراً۔" اس کی آنکھوں میں، لہجے میں کچھ ایسا جلال تو تھا جو آپا گل جیسی عورت کو گڑبڑا رہا تھا۔
فرید الدین کو ان کا ساتھ دینے کے لیے آگے آنا پڑا۔
"زبان سنبھال کر بات کرو، بہت دیکھے ہیں تم جیسے، لگتا ہے تم ایسے نہیں سمجھو گے۔"
"تمہیں تو میں بات کرنے کے قابل بھی نہیں سمجھتا فرید الدین! بہتر ہو گا تم اس معاملے سے الگ رہو اور

تمہارا کوئی تعلق ہے بھی نہیں۔" معاذ کا لہجہ بے حد سرد تھا اور آواز بہت دھیمی۔ وہ خود بھی سیڑھیوں سے نیچے آچکا تھا۔ سو غیر محسوس انداز میں وہ لوگ کچھ اور پیچھے ہٹے تھے۔

"آپ چلی جائیں واپس اور جو کر سکتی ہیں کر گزریں۔ مجھے اب کسی تماشے کا کوئی خوف نہیں کیونکہ..." آپا گل کے تپتے ہوئے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے اس نے ذرا سا رک کر اپنی بات مکمل کی۔ "کیونکہ میں نے اپنی زندگی میں آیا سب سے بڑا خوف جھیل لیا ہے۔"

سیڑھیوں پر پیچھے کھڑی زویا نے آہستگی سے اپنی آنکھیں خشک کیں۔

"تم اچھا نہیں کر رہے ہو معاذ! میں اسلام چچا کو بلاتی ہوں۔ وہ خود نپٹیں گے تم سے' یا پھر پولیس..." وہ تیز تیز بولتی ہوئی فریدالدین کی طرف مڑیں۔ "آپ پولیس کو بلوائیں فرید بھائی! ابھی اسی وقت' دیر کیوں کر رہے ہیں۔"

"پولیس!" فریدالدین کو دھکا سا لگا۔ وہ فطرتاً "جمع تفریق والا شخص تھا۔

پولیس والوں کو بلا کر ان کا خرچا پانی برداشت کرلیتا' تب کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اسلام صاحب کی اعلا صحافتی پہچان اور معاذ کا میڈیا کانٹیکٹ اس سارے معاملے کو چٹکی میں اڑا سکتے تھے۔ سو لمحے سے بھی کم وقت میں اس نے صحیح فیصلہ کیا۔

"کیوں اپنی بے عزتی کروانا چاہتی ہیں آپ... پولیس نے کیا کرلینا ہے آکر۔ ابھی چلیں' پھر میں دیکھتا ہوں کیا کرنا ہے۔" اس نے آخری جملہ کہتے ہوئے معاذ کی طرف دیکھنا چاہا لیکن فوراً" ارادہ بدل گیا۔ وہ بات مکمل کرکے پارکنگ کی طرف بڑھ گیا۔

آپا گل کو اس سے اس طرح میدان چھوڑنے کی توقع نہیں تھی۔

"فرید بھائی... سنیں تو..." تیزی سے کہتی ہوئی وہ اس کے پیچھے پیچھے گئی تھیں۔ شاید انہیں امید تھی کہ وہ اسے واپس لے آئیں گی۔

"پتا نہیں اب کیا ہوگا۔" معاذ نے عقب میں زویا کو کہتے ہوئے سنا۔

"کچھ بھی نہیں اور جو ہوگا' دیکھ لیا جائے گا۔" معاذ کے لہجے میں گہرا اطمینان تھا۔ "میں کسی قیمت پر بھی ان دونوں کا جویا سے سامنا نہیں چاہتا تھا' اللہ نہ کرے اس کی حالت پھر بگڑ جاتی تو..."

وہ ادھورا جملہ چھوڑ کر واپس سیڑھیاں چڑھ کر آئی سی یو کی طرف جانے والے کاریڈور کی طرف بڑھا۔

زویا نے ایک گہری سانس لی۔ آپا گل اور فریدالدین اب بہت دور نظر آرہے تھے۔ بظاہر فی الحال ان کی واپسی کا امکان بھی نہیں تھا۔ سو وہ بھی پورے اطمینان کے ساتھ اندر کی طرف گئی۔

"عجیب آدمی ہیں آپ... وہ آپ کی منگیتر پر اپنا حق جتا رہا ہے اور آپ بجائے اس کو وہاں سے ہٹانے کے چپ چاپ چلے آئے۔ یہ بھی نہیں کہا کہ ہم جویا کو دوسرے اسپتال میں داخل کریں گے۔"

آپا گل سارے راستے فریدالدین کی غیرت کو جگانے کی کوشش میں لگی رہیں۔ "وہ آپ کی عزت ہے' کیوں بھول رہے ہیں۔"

وہ چپ چاپ سنے گیا۔

آپا گل کو اس کے اس بے حد سرد رویے سے مایوسی ہو رہی تھی۔ نہ وہ غصے میں آرہا تھا اور نہ ہی کسی قسم کی انتقامی کارروائی پر راضی تھا۔

"میں تو سمجھی تھی کہ آپ ابھی معاذ کو وہاں سے چلتا کریں گے یا کم از کم جویا کو تو وہاں سے لا ہی سکتے تھے ہم۔" اتنی دیر میں پہلی بار اس نے جواباً" نفی میں سر ہلایا تھا۔

"میں اس جھگڑے کو بڑھانا نہیں چاہتا۔ آپ کچھ بھی وجہ سمجھیں۔ ہاں جویا ٹھیک ہو جاتی ہے تو فوری طور پر سادگی سے نکاح کے لیے تیار ہوں' ورنہ..."

آپا گل نے بڑی بے تابی سے اس کے جملے کے مکمل ہونے کا انتظار کیا۔

"ورنہ جو کچھ میرا خرچا ہوا ہے مجھے واپس چاہیے اور گھر بھی پہلی تک خالی ہو جائے۔" اس نے بہت تحمل سے بات مکمل کی تھی مگر پھر بھی آپا گل نے پیروں تلے سے زمین کھسکتے ہوئے محسوس کی۔

خرچا... پیسے...

ہاتھوں میں ڈالے ہوئے سونے کے بھاری کڑے چمک کر ان کا مذاق اڑانے لگے اور پیسے... آپا گل کے سامنے ایک بڑا سا سوالیہ نشان آکھڑا ہوا تھا۔

اب تک ہر چیز ان ہی کے ہاتھ میں تھی۔ ایک سوائے گھر کے' جس میں لا بٹھانے کا احسان وہ دن رات جتا رہی تھیں۔

"میں جویا اور معاذ کے درمیان جو سلسلہ ہے' اسے بھی نظر انداز کر سکتا ہوں۔ لڑکے' لڑکیاں ایسی جذباتی محبتیں کرلیتے ہیں لیکن وقت کے ساتھ یہ ختم بھی ہو جاتی ہیں۔ میں شادی کے بعد فوری طور پر کچھ عرصے کے لیے یہ شہر چھوڑ دوں گا۔ لگ کر اس کا علاج بھی کروا دوں گا' لیکن اب اور دیر نہیں' یہ معاملہ اب ختم ہو جانا چاہیے۔"

فریدالدین کے تحمل پر آپا گل کی سانس بحال ہوئی تھی۔

"جویا ہوش میں آچکی ہے۔ دو چار دن میں اور بہتر ہو جائے گی' ہم اسے گھر لے آئیں گے۔ اس بار کوئی شور' ہنگامہ نہیں' کسی کو خبر نہ ہونے دیں گے۔ گھر میں سب کی یہی آرزو ہے کہ یہ رشتہ پایہ تکمیل تک پہنچے۔"

"اچھی بات ہے۔" اس نے آہستگی سے کہا۔ "اور بہتر ہوگا کہ آپ لوگ معاذ کے گھر والوں کے ساتھ اپنی محاذ آرائی کو ختم کردیں۔ اس لڑکے کو ہماری طرف سے اب مکمل اطمینان ہونا چاہیے' یہ بہت ضروری ہے۔"

آپا گل نے تعریفی نگاہوں سے فریدالدین کو دیکھا تھا۔

☼ ☼ ☼

ابا کے کمرے کی کھلی کھڑکی پر سے پردے ہٹے ہوئے تھے۔ پچھلے احاطے کی طرف سے آتے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے رات کی رانی اور چمپا کی خوشبو سے بوجھل ہو رہے تھے۔

"دنیا میں اس جگہ سے زیادہ اپنائیت اور سکون شاید ہی کہیں اور ہو یہاں بیٹھ کر ہر مشکل سے مشکل مسئلے کا حل نکالا جاسکتا تھا۔" خیام کو یاد آیا کہ جب وہ پہلی بار اس کمرے میں آکر بیٹھا تھا تب اسے یہی خیال آیا تھا۔

آج اسی خیال کی تصدیق ہوئی تھی۔ شاید کہیں اور بیٹھ کر کسی اور کے منہ سے یہ سننا مشکل ہی نہیں' ناممکن ترین تھا۔ وہ بنا پلک جھپکائے چند لمحے ان کی شکل دیکھے گیا۔

"مجھے پتا ہے بیٹا! تم کس کیفیت سے گزر رہے ہو' لیکن وہ تمہاری زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہیں۔ بے شک تمہاری نگاہ سے اوجھل رہے۔ لیکن تم ان ہی کا خون ہو اور یہ ان ہی کی نہیں تمہاری بھی خوش نصیبی ہے کہ تمہاری آئندہ زندگی ان کے سائے میں گزرے۔"

"لیکن میں ان سے نہیں ملنا چاہتا ابا!" ان کی بات ختم ہوتے ہی وہ تیزی سے بولا تھا۔ "اب مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے۔ میری زندگی کا سب سے تکلیف دہ دوران کے بغیر گزر چکا ہے۔" وہ بولتے بولتے رکا۔

"کاش! انہوں نے میری ماں کو اکیلا نہ چھوڑا ہوتا۔ تب شاید وہ اس طرح اندر ہی اندر گھل کر ختم نہ ہوتیں۔ یا پھر وہ مجھے بھی ان کے بعد اپنے ساتھ لے گئے ہوتے لیکن نہیں۔ انہوں نے تو شاید کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا کہ وہ مجھے کس ماحول کے سپرد کرچکے ہیں' میری ہر تکلیف' میرے سوچنے کے غلط صحیح انداز' ہر بات کے وہی ذمہ دار ہیں'

آپ منع کردیں انہیں۔"

اس کا چہرہ سرخ پڑ رہا تھا۔

اب جبکہ اس کی شخصیت میں بہت سی بہتری آچکی تھی۔ تب بھی اپنی زندگی کے اس حساس ترین پہلو پر بات کرنا اس کے لیے آسان نہیں تھا۔ ابا نے بہت محبت سے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔

"تم تو میرے بہت ہی اچھے بچے ہو خیام! اور تم مجھ سے وعدہ کرچکے ہو کہ اب تم سب کو معاف کرتے چلو گے اور میں جانتا ہوں کہ تم کر بھی رہے ہو' پھر بھی۔"

"ان کا معاملہ الگ ہے ابا! میں اپنی نانی اور خالہ سے اب ناراض نہیں' بلکہ شرمندہ ہوں۔ جو کچھ ہوا' اس میں ان کا قصور نہیں تھا لیکن میں نے ہمیشہ انہیں ہی سزا دی' کبھی عزت کرہی نہیں پایا ان کی' حالانکہ وہ بے چاری..."

نچلا لب دانتوں تلے دباتے ہوئے خیام نے نفی میں سر ہلایا۔

"تمہارے باپ بھی بے حد مجبور تھے۔ میں ان کی وکالت نہیں کررہا' لیکن بیٹا! یہ سمجھنا غلط ہے کہ مرد کبھی مجبور نہیں ہوتا۔ تمہارے باپ پر ان کی پہلی بیوی کے خاندان کا بڑا دباؤ تھا۔ وہ اثر ورسوخ والے لوگ تھے اور اس وقت تک تمہارے والد خود اس پوزیشن میں نہیں تھے۔ جس میں وہ آج ہیں اور کم از کم ایک بات پر تو تمہیں یقین کرنا ہی پڑے گا کہ انہوں نے تمہاری ماں کے علاوہ کسی سے محبت نہیں کی۔"

ان کا مخصوص دھیما دھیما محبت بھرا انداز... خیام کے لیے ان کی کہی کسی بھی بات کو رد کرنا ناممکن تھا۔

"پھر بھی ابا! ان کی محبت ہمارے کسی کام تو نہیں آئی۔ الٹا جان لیوا ہی ثابت ہوئی۔" ہتھیلی سے اپنی آنکھیں رگڑ کر خشک کرتے ہوئے وہ افسردگی سے مسکرایا۔

"تو تم نہیں مانو گے۔ میں جواب یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ تم بہت ہی فرماں بردار بیٹے ہو' سو میں غلطی پر تھا۔"

"ایسا بالکل نہیں ہے۔ ایسا ہو بھی کیسے سکتا ہے ابا! اس دنیا میں آپ اور معاذ بھائی ہی تو ہیں میرے۔ مجھے زندگی کی طرف واپس لانے والے' آپ نے تو وہ کیا جو کوئی کسی کے لیے نہیں کرسکتا' آپ کا حکم میں کیسے ٹال سکتا ہوں۔" وہ بہت مشکل سے اپنے آنسو ضبط کررہا تھا۔

"یہ میرا حکم نہیں ہے بیٹا! خود اپنے دل سے فیصلہ کرو۔ ایک بار اپنے سارے دکھ' ساری محرومیاں بھول کر اس

شخص کے بارے میں سوچو' جس نے ساری عمر اپنے ضمیر کے آگے مجرم بن کر گزاری ہے۔ جو اپنی اولاد کے لیے ترستا رہا۔ ان کی ہماری عمر اب ڈھلان کا سفر ہے۔ اگر تم اس سفر میں ان کا ہاتھ تھامنا چاہو تو ہم صبح چلے چلیں گے ان کے ہاں' ورنہ میں تم سے دوبارہ کبھی نہیں کہوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔"

اپنی بات ختم کرکے وہ ہلکے سے مسکرائے بھی' اس پر سے دباؤ کم کرنے کے لیے۔

"اب تم بھی آرام کرو۔ اسپتال کے کئی چکر لگتے ہیں آج کل تمہارے' تھک گئے ہو گے بہت۔"

جویا کے ہوش میں آنے کی خبر سن کر ابا اور ربیعہ دونوں ہی اسے دیکھنے گئے تھے اور ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی وہ لوگ اسپتال سے واپس آئے تھے۔

"شکر ہے کہ وہ ہوش میں آگئیں ابا! آپ پلیز جویا کے والدین سے بات کریں۔ معاذ بھائی کو میں نے اتنا اپ سیٹ پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ زمانے بھر سے غافل ہو کر رہ گئے ہیں وہ۔"

اسلام صاحب کے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ ابھری۔

"جو بات تم جانتے ہو' ہر دیکھنے والا محسوس کرسکتا ہے۔ وہ معاذ کی ماں کو دکھائی نہیں دیتی۔ ایک فضول ضد باندھ لی ہے انہوں نے' میں صرف جویا کے ماں' باپ کو کیسے الزام دے سکتا ہوں بیٹا!"

وہ چپ چاپ ان کی شکل دیکھے گیا۔

"اللہ مالک ہے' تم آرام کرو۔ میں بھی لیٹوں گا۔"

آج وہ خلاف معمول اپنی رائٹنگ ٹیبل پر نہیں بیٹھے تھے۔

"میں تھوڑی دیر باہر بیٹھوں گا ابا! مجھے ابھی نیند نہیں آرہی۔"

"ٹھیک ہے' بتی بجھا دو۔"

وہ جانتے تھے کہ اسے تنہائی درکار ہے۔

ربیعہ کچن کی لائٹ بند کررہی تھی' جب اس نے خیام کو احاطے کی سیڑھیوں پر تنہا بیٹھے دیکھا تھا۔ سر جھکائے کسی خیال میں گم' بالکل تنہا۔ وہ نیم روشن کچن میں کھڑی چپ چاپ اسے دیکھے گئی۔

ایک تھکا دینے والے دن کے اختتام پر بھی وہ آرام کرنے سے کیوں گریزاں تھا۔

اندر سے دادی آواز دے رہی تھیں۔

ربیعہ بھاری دل لیے کاریڈور سے گزرتی دادی کے کمرے کی طرف چلی گئی۔ رات لمحہ لمحہ کرکے گزری تھی۔ کئی بار اسے خیال آیا کہ وہ پچھلے احاطے کی طرف جاکر دیکھے کہ خیام ابھی وہاں ہے یا نہیں' پھر پتا نہیں کب وہ آہستہ آہستہ نیند کی وادی میں اتر گئی تھی۔

البتہ جب فجر کی اذانوں کے وقت اٹھ کر وہ کچن کی طرف جارہی تھی' تب اس نے خیام کو پچھلے احاطے سے اٹھ کے ابا کے کمرے کی طرف جاتے دیکھا۔

"خدایا!" اسے بے حد رنج ہوا تھا۔

"ابا!" خیام' وہ کھلے دروازے سے اندر آیا۔

اسلام صاحب وضو کرکے واپس کمرے میں آئے تھے۔

"ہاں خیام۔ میں تمہیں ہی دیکھنے آرہا تھا بیٹا! کیا تم آج سوئے نہیں رات بھر۔" وہ فکرمندی سے پوچھ رہے تھے۔

"ابا' میں آپ کے ساتھ ان کے پاس جاؤں گا۔" اس نے اس تیزی سے جملہ مکمل کیا جیسے ڈر ہو کہ اگر ابھی

بھی نہ کہا تو شاید پھر نہیں کہہ سکے گا۔ اسلام صاحب کے چہرے پر بے ساختہ مسکراہٹ چھیلی تھی۔

وہ دو قدم بڑھا کر ان کے قریب آیا۔ اسلام صاحب نے بے اختیار اسے گلے لگایا تھا۔

"تم نے مجھے مایوس نہیں کیا بیٹا! اور مجھے پورا یقین تھا کہ تم ایسا کبھی نہیں کرو گے۔" اسلام صاحب کی آواز بھیگ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"آپ میں سے کوئی ایک جا کر پیشنٹ سے مل سکتا ہے چند منٹ کے لیے۔"

معاذ زویا اور اپنے لیے چائے کے کپ لے کر آیا ہی تھا کہ ایک نرس نے آکر انہیں اطلاع دی۔

ان دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تھا۔

"تم چلی جاؤ زویا!"

"نہیں معاذ بھائی! آپ جائیں۔" زویا نے اس کے ہاتھوں سے کپ لے کر سائیڈ میں رکھتے ہوئے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ وہ کچھ تذبذب میں تھا۔

"اس کی ذہنی حالت اتنی اچھی نہیں ہے زویا! محض چند پل میں ہی وہ رونے لگی تھی۔ اب پتا نہیں کس طرح ری ایکٹ کرے گی۔"

"کرنے دیجیے لیکن میں جانتی ہوں کہ اس کی ہمت اور حوصلہ بھی صرف آپ کو دیکھ کر ہی قائم ہوگا اور ویسے بھی جو حق آپ کا ہے وہ کسی کا نہیں، جائیے پلیز۔۔۔ دیر مت کریں۔" زویا کا اصرار بڑھ رہا تھا۔

ابھی صبح ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی اور اسپتال میں خاصا سناٹا تھا۔

"جائیں معاذ بھائی، پلیز!"

وہ خاموش قدموں سے آگے بڑھتا چلا گیا۔ جویا سامنے بیڈ پر لیٹی تھی۔ وہ اس کے بالکل قریب آکھڑا ہوا اور شاید ایک بار بھی وہ اپنی پلک نہیں جھپک سکا تھا۔

"جویا۔۔۔!" اس کا یخ ہاتھ نرمی سے اپنے ہاتھ میں تھامتے ہوئے وہ پورا کانپ اٹھا تھا۔

"جویا۔۔۔ جویا!" تیسری یا چوتھی پکار کے جواب میں اس نے اپنی آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا۔

"کیسی ہو۔۔۔؟"

بے حد نرمی سے کہتے ہوئے اس نے خود کو ذرا بھی جذباتی نہیں ہونے دیا مگر پھر بھی اسے خود اپنی ہی آواز اجنبی لگی۔

جویا کی نگاہوں میں بڑی گہری بے یقینی تھی۔

"جویا! یہ میں ہی ہوں، تم چپ کیوں ہو۔۔۔ بات کرو پلیز۔" معاذ کی آواز سرگوشی سے زیادہ نہیں تھی۔ لیکن اپنی موجودگی کا جو احساس وہ اسے دلانا چاہتا تھا۔ دلا چکا تھا۔

جویا کے لب ہلکے سے کھلے تھے اور اس کی نگاہ معاذ کے چہرے سے ہٹ کر اپنے ہاتھ پر آئی تھی جو معاذ کے دونوں ہاتھوں میں تھا۔ اس نے کچھ کہنا چاہا، لیکن آنکھوں سے ایک ساتھ کئی آنسو گرتے چلے گئے۔

اس کا چہرہ، اس کی آنکھیں۔۔۔ پورا وجود بے بسی کی تصویر تھا۔

کاش! وہ اسے اس بدترین حال میں دیکھنے کی تکلیف سے بچ سکتا۔

بہت نرمی سے اس نے جویا کے آنسو خشک کیے۔

"معاذ۔۔۔ تم۔۔۔" چند لمحوں کے لیے جویا کے چہرے پر خوشی کی چمک سی ابھری۔

وہ ہلکے سے مسکرایا۔

"جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ۔ مجھے بلانے کے لیے بیمار پڑنا ضروری نہیں تھا۔ ویسے ہی کہہ دیتیں کہ آجاؤ تو میں ایک اشارے پر دوڑا چلا آتا۔" اس کی طرف تھوڑا سا جھک کر وہ دھیرے سے کہہ رہا تھا۔

جویا روتے روتے مسکرائی تھی۔

اور وہ اسی مسکراہٹ کا منتظر تھا۔

"تمہیں صرف مجھے پریشان کرنے کا شوق ہے، اس کے لیے جو کرنا پڑتا ہے کر گزرتی ہو۔ اب دیکھ لو، خود آرام سے لیٹی ہو اور میں۔۔۔"

لاپروا سے لہجے میں بات کرتے ہوئے ایک دم ہی اس کے گلے میں نمکین سا پانی اٹکا تھا، جسے اس نے پوری بہادری سے اپنے اندر اتارا۔

"کیا میں بہت بیمار ہوں؟" اس کے لہجے میں فکر سے زیادہ حیرت تھی۔

معاذ نے محبت سے انکار میں سر ہلایا۔

"کچھ خاص نہیں، ٹھیک ہو جاؤ گی دو چار دن میں۔"

"اور۔۔۔ اور۔۔۔" تب ہی اسے اپنے حالات کی تمام تر بدصورتی یاد آئی تھی۔

مایوں کی وہ رسم اور فریدالدین کے نام پر لگنے والا ابٹن، جسے اس نے محسوس کرنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔

پہلی بار معاذ نے اپنے ہاتھ پر اس کی گرفت محسوس کی، وہ خوف زدہ تھی۔

"معاذ۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ سب لوگ۔۔۔"

"کوئی نہیں ہے اور کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ میں کہہ رہا ہوں تم سے۔" پورے اعتماد کے ساتھ وہ اسے یقین دلا رہا تھا۔

"کچھ سوچنے کی ضرورت نہیں ہے، میں ہوں نا، پھر کس بات کی پروا ہے تمہیں۔"

"وہ سب کہاں ہیں۔ تمہیں کیسے آنے دیا۔ چلے جاؤ۔ پلیز! انہیں پتا چل جائے گا تم یہاں ہو تو پتا نہیں۔۔۔" وہ پھر سے اسی خوف میں گھرنے لگی تھی۔ جو اس کی ہر خوشی کو نگل چکا تھا۔

اور اسے اس خوف کی نذر کرنے میں وہ خود کو کیسے بری الذمہ قرار دے سکتا ہے۔ کتنے ہی دن سے خود کو کمپوز کرنے کے لیے کتنی ہی جدوجہد کرنی پڑی تھی۔

"معاذ! چلے جاؤ یہاں سے، باہر وہ لوگ ہوں گے، آپا، گل، ابو۔۔۔" اس کی گھبراہٹ بڑھ رہی تھی۔

اور یہ اس کے لیے اچھا نہیں تھا۔

"سب کچھ بالکل ٹھیک ہے۔ تم مت سوچو اس بارے میں۔۔۔ اب کچھ غلط نہیں ہونے والا۔ بس تم ٹھیک ہو جاؤ۔ بہت پریشان کر لیا مجھے۔ اب اور اجازت نہیں دے سکتا، سمجھیں!"

جویا کی نگاہیں معاذ کے چہرے پر جمی تھیں۔

اس پوری دنیا میں اس سے بڑھ کر کون تھا، جس پر وہ ہمیشہ آنکھ بند کر کے بھروسا کرتی آئی تھی۔ اس وقت بھی جب وہ کوئی ایک بھی ایسی بات نہیں کرتا تھا، جس سے خوش امیدی جھلکتی ہو۔ کوئی چھوٹے سا چھوٹا عہد و پیمان بھی نہیں، پھر بھی۔۔۔

"تم مجھے بچا لو گے نا معاذ؟" اس کی آنکھوں میں امید کی کرن روشن ہوئی تھی۔

"کوئی کچھ نہیں کر سکتا اب۔ میں ہوں نا۔۔۔" پھر اسے ریلیکس کرنے کی خاطر بولا۔ "بس اب رونا نہیں ورنہ ڈاکٹرز مجھے نکال باہر کریں گے اور میں جانا نہیں چاہتا یار۔۔۔"
جویا مسکرائی تھی۔

✵ ✵ ✵
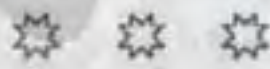
رات بھر نمی سے بھرپور ہوائیں معمول کا حصہ تھیں۔
سمندر سے قریب ترین رہائشی علاقوں کی گلیاں اور سڑکیں دن چڑھے تک اس طرح بھیگی بھیگی محسوس ہوتیں جیسے ابھی ابھی بوندا باندی ہو کر رکی ہو۔
وہ لوگ جب گھر سے نکلے تو خاصا سویرا تھا اور منزل مقصود پندرہ بیس منٹ سے زیادہ دوری پر بھی نہیں تھی۔ ان ہی شفاف دھلی ہوئی سبزے سے ڈھکی گلیوں سے گزرتے ہوئے وہ دونوں ہی کسی سوچ میں گم تھے۔
تب ہی اسلام صاحب کو کچھ خیال آیا۔
"تم نے مجھ سے ایک بار بھی نہیں پوچھا کہ وہ کون ہیں کیا کرتے ہیں نام کیا ہے ان کا!"
"کیا فرق پڑتا ہے ابا! وہ کوئی بھی ہیں کچھ بھی ہیں اس سے کون سی حقیقت بدلنے والی ہے۔" ڈرائیو کرتے ہوئے خیام نے سامنے دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔
"کیا ابھی سیدھا ہی چلنا ہے۔" اس نے بات بدلی تھی۔
"ہاں بس اس راؤنڈ اباؤٹ سے الٹے ہاتھ پر لے لینا پانچواں گھر ہے۔"

خیام نے گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔
عجیب سی بات تھی کہ نہ کوئی خوشی تھی اور نہ ہی گھبراہٹ۔ یہ ایسے ہی تھا جیسے ابا کے ساتھ کہیں بھی چلے جانا۔
"تو کیا وہ اس کے لیے اتنے غیر اہم ہیں؟" اس نے اپنے باپ کے بارے میں سوچا۔ وہ ان کے بتائے ہوئے پتے پر محض چند منٹ بعد ہی کھڑا تھا۔
"یوسف کمال!" اس نے نیم پلیٹ پر اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی۔
"کیا وہ کمال صاحب کے ہاں نوکری کرتے ہیں یا پھر ان کے رشتے دار ہیں؟"
وہ اسلام صاحب سے پوچھ رہا تھا تب ہی وہ بڑا سا رار گیٹ کھلتا چلا گیا۔
ہزاروں گز پر پھیلا ہوا وہ شان دار وسیع و عریض گھر جو باہر سے گزرنے والوں کو بھی اپنی طرف لازمی متوجہ کرتا تھا۔
ڈرائیو وے سے گزرتے ہوئے خیام نے بڑی بے نیازی سے اس ساری شان و شوکت پر نگاہ ڈالی تھی۔
(اگلی قسط آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

سلویٰ علی بٹ

گورنمنٹ کالج برائے خواتین کا سیاہ آہنی گیٹ ٹھیک ڈیڑھ بجے چوکیدار نے پورا کھول دیا تھا۔ چند ایک لڑکیاں جو گیٹ کے اندرونی سائیڈ سے چٹخنی کھلنے کے انتظار میں تھیں لمحہ کی تاخیر کیے بغیر باہر لپکیں۔ ان میں ایک چندا بھی تھی۔ نام تو اس کا مہرالنساء تھا مگر وہ راجپوت برادری کی شاید پہلی یا عرصہ بعد پیدا ہونے والی گوری چٹی لڑکی تھی۔

دادی نے لال گلابی گول مٹول سی پوتی کو محبت سے چور لہجے میں جو چندا پکارا تو بس پھر ہر ایک کی زبان پہ یہی چڑھ گیا اور مہرالنساء پہ شاید اپنے نام کا اثر چڑھ گیا تھا، جو چھینی ناک، دھوپ سے جھلسے ہوئے گھاس کے تنکوں کی مانند بالوں اور ذرا چوڑے ماتھے کے ساتھ خاندان کی سب سے نمایاں اور خوب صورت لڑکی شمار کی جاتی تھی۔

چندا لمبی لمبی چھلانگیں لگاتی، کالج کے گیٹ سے دور ہوتی۔ ہر آدھ منٹ بعد پیچھے مڑ کر یہ تسلی کرتی کہ کوئی سہیلی یا کلاس فیلو تو پیچھے نہیں آ رہی۔

اس کے دل میں چور تھا اور یہ چور اس کے قدم لڑکھڑائے دے رہا تھا۔ ورنہ وہ روز اپنی سہیلیوں کے ہمراہ ہی بس اسٹاپ تک جاتی تھی۔ بڑی سڑک پار کر کے بائیں طرف کالونی تھی۔ اسی کالونی کے گیٹ پہ شیراز اس کا منتظر تھا۔

موٹر بائیک پہ ایک ٹانگ اوپر دھرے شیراز پہ جیسے ہی اس کی نگاہ پڑی، اس کے قدم اٹھانے کی رفتار تیز ہو گئی۔

"آج بہت ٹائم پہ پہنچی ہو۔" اس کے قریب آنے پہ وہ موٹر سائیکل سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"جلدی چلو، کہیں کالج کی کوئی لڑکی مجھے دیکھ نہ لے۔"

شیراز کے سوال کو نظر انداز کر کے پھولی سانس کے درمیان بولتی وہ شیراز سے پہلے ہی اپنی سیٹ سنبھال چکی تھی۔

شیراز نے ذرا حیرت سے اس کی یہ حرکت نوٹ کی۔ پھر اس کی نقاب سے جھانکتی آنکھوں میں خوف بھانپ کر موٹر سائیکل اسٹارٹ کر دی۔

سارے رستے وہ جلدی جلدی کا شور مچاتی رہی تھی۔ اس نے بڑی سی چادر کا کس کر نقاب کیا ہوا تھا۔ کوئی اسے پہچان لے، یہ امکان ذرا کم ہی تھا، لیکن چندا کے ہاتھ پیر لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہونے تک سُن رہنے تھے۔

ڈی پراہٹ پہنچ کر اس نے شکر کا کلمہ پڑھا۔

وہ ہر ماہ یہیں ملاقات کے لیے آتے تھے۔ یہ ان کا سال سے معمول تھا۔ اب یہاں کے ویٹر بھی ان کے شناسا ہو گئے تھے۔ انہیں دیکھ کر ایک بے تکلف سی مسکراہٹ اچھالتے اور چندا گڑبڑا جاتی۔

"کہاں تھیں اتنے روز سے؟ تمہارا سیل بھی مسلسل بند تھا، کوئی اطلاع، نہ خبر، میں کتنا پریشان تھا۔" اپنی مخصوص میز سنبھالتے ہی وہ اس پہ برس پڑا۔ چندا نے ایک نظر اس پہ ڈال کر شیشے کے جگ میں سے پانی کا گلاس بھر کے پیا۔

"افتخار بھائی نے حمیرا کو بھگا کے شادی کرلی ہے۔" اس کے تمام سوالوں کا جواب دے دیا گیا تھا۔

شیراز بھونچکا رہ گیا۔ وہ افتخار بھائی کے صرف نام سے واقف تھا۔ شیراز نے کبھی انہیں دیکھا نہیں تھا اور حمیرا نامی کسی لڑکی سے وہ محبت کرتے تھے' یہ بھی اسے چندا کی زبانی دو ماہ قبل ہی معلوم ہوا تھا۔

"مم۔۔۔ مگر کیوں؟" شیراز نے ایک بے تکا سا سوال کیا۔ جواباً" چندا نے اسے جن نظروں سے دیکھا تھا' ان میں احمق لکھا صاف نظر آرہا تھا۔

"اب پھر۔۔۔" اس نے بوکھلاہٹ میں یہی پوچھ لیا۔

"پھر کیا' شادی ہوگئی ہے' امی نے انہیں قبول کرلیا ہے' آخر افتخار بھائی گھر کے واحد کمانے والے ہیں۔ امی درگزر سے کام نہ لیتیں تو وہ اپنی نئی نویلی دلہن کو لے کر ہمارا ناطقہ بھی بند کرسکتے تھے۔ امی کی مجبوری تھی۔" وہ سر جھکائے میز کی صاف سطح کو کھرچتے ہوئے بتارہی تھی۔

"جب تمہاری امی مان سکتی تھیں تو یہ کام سیدھے طریقے سے بھی ہوسکتا تھا۔ انہوں نے اتنا بڑا قدم کیوں اٹھایا۔" وہ ابھی تک حیرت زدہ تھا۔ کیونکہ وہ چندا کی زبانی جانتا تھا کہ اس کے والد کی وفات کے بعد بڑا بیٹا ہونے کی حیثیت سے افتخار کی گھر میں پوزیشن بہت مضبوط تھی۔ گھر کا ہر فیصلہ اور خرچہ مکمل اس کے اختیار میں تھا۔

"ہم گئے تھے رشتے لے کر لیکن حمیرا بھابھی کی سوتیلی ماں اور بہنوں نے ہمیں بہت بے عزت کیا۔ ہم ماں بیٹی کے کردار پہ بھی کیچڑ اچھالا گیا' انہوں نے اتنی بدتمیزی اور غیر مناسب الفاظ استعمال کیے کہ ہم کانوں کو ہاتھ لگاتی وہاں سے نکلی تھیں۔ حمیرا کی سوتیلی ماں' ہمارے سامنے ہی اسے پیٹنے لگ گئی تھی' توبہ استغفار!"

چندا یہ واقعہ یاد کرکے بدمزا ہوئی تھی۔

"اب کیا ہوگا؟" شیراز نے ہتھیلی سے تھوڑی مسلی۔ ویٹران کے سامنے پزار کھنے لگا تھا۔ وہ خاموش ہوکر شیراز کے سوال کا جواب سوچنے لگی۔

"لوگ بہت باتیں بنارہے ہیں۔ سب رشتے دار ہم پہ انگلیاں اٹھارہے ہیں۔ افتخار بھائی کی اس حرکت کو برا بھلا کہہ رہے ہیں۔ ہم بہت پریشان ہیں' اس لیے امی مجھے کالج بھی نہیں آنے دیتیں' آج بھی میں تمہارے خیال سے بڑی ضد کرکے آئی ہوں' اسی لیے سیل فون بھی بہت احتیاط سے استعمال کرنے لگی ہوں۔" چندا نے اسے ساری تفصیل بتادی۔

پریشانی اس کے چہرے سے جھلک رہی تھی۔ افتخار نے انہیں محلے بھر میں شرمندہ کروادیا تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد افتخار نے جیسے عقل مندی سے گھر کا انتظام سنبھالا تھا۔ وہ اسی سمجھ بوجھ کی وجہ سے بھائی کی گرویدہ تھی۔ اسے افتخار سے یہ توقع نہیں تھی۔

"یار! پرسوں آمنہ آپا آرہی ہیں۔ میں تو ان سے بات کرکے تمہارے گھر رشتہ بھجوانے والا تھا۔" شیراز کو اپنی فکر ستائی تھی۔

"ابھی مت بھیجنا۔" اس نے دھیمے سے کہتے ٹھنڈے ہوتے پزا پہ نگاہ جمادی اور شیراز نے اس پہ۔

"ابھی حالات سازگار نہیں ہیں۔ امی بہت اپ سیٹ ہیں۔ بات بننے کے بجائے بگڑ بھی سکتی ہے۔ پہلے افتخار بھائی اور اب میں' انہیں بہت دکھ ہوگا۔"

وہ بڑی نرمی سے اسے سمجھارہی تھی اور شیراز مان گیا تھا۔ اسے بھی یہی مناسب لگ رہا تھا۔ لیکن وہ دل میں آمنہ آپا کو اپنے راز میں شامل کرنے کی ٹھان چکا تھا۔

"مہینے میں ایک بار تو ملتی ہو' اب وہ بھی نہیں۔" وہ بچوں کی طرح منہ بسورتے نخرے دکھا رہا تھا۔

اتنی سنگین صورت حال میں بھی چندا کی ہنسی نکل گئی۔ "تمہیں بھی مہینے میں ایک بار ہی تنخواہ ملتی ہے اور میں بہت کفایت شعار لڑکی ہوں۔" اس نے مسکراتے ہوئے فرضی کالر اکڑائے۔

اس کی مسکراہٹ میں شیراز کی ہنسی بھی شامل ہوگئی۔

☆ ☆ ☆

حمیرا بہت باادب' سلیقہ مند اور سلجھی ہوئی لڑکی تھی۔ اس کے متعلق یہ پہلی رائے چندا نے سترہ روز بعد قائم کی تھی۔ ناہید (ساس) نے اسے اول روز سے دبا اور ڈرا کے رکھا تھا۔ ڈرتی تو وہ اپنی سوتیلی ماں اور بہنوں سے بھی تھی' بلکہ پٹتی بھی تھی۔ یہاں ناہید مارتی نہیں تھیں مگر ہر وقت غضب ناک بنی رہتی تھیں۔

چندا اس کی بہت سی خوبیوں کی گرویدہ ہورہی تھی لیکن ماں سے اسے خاص احتیاط برتنی پڑتی کیونکہ وہ اس کا حمیرا کے ساتھ زیادہ بول چال کرنا یا اٹھنا بیٹھنا بالکل پسند نہیں کرتی تھیں۔ اس سارے قصے میں چندا کا یہ نقصان ہوا تھا کہ شیراز کی بہن واپس چلی گئی تھی اور فائدہ یہ کہ اب ناہید نے اس کے لیے روز نت نئے رشتے دیکھنے کا سلسلہ موقوف کردیا تھا۔

وہ ماتھے پہ بل ڈالے حمیرا کی نقص بینی میں مشغول رہتیں۔ کئی بار چندا نے محسوس کیا کہ امی زیادتی کررہی ہیں' لیکن اس میں بھابھی کی طرف داری کرنے اور ماں کو روک کے اپنی شامت بلوانے کی ہمت نہیں تھی۔ ناہید کا پارہ ہر پل چڑھا رہتا۔

"لو یہاں ابھی صحن ہی نہیں دھلا' ڈیڑھ گھنٹہ تو ہو ہی گیا ہے۔ مجھے گھر سے نکلے ہوئے۔ سارے جہاں کے نکمے' سست اور کام چور ہمارے لیے ہی رہ گئے تھے۔ آدھی دوپہر کچن میں ہی گزاردی۔ چلو جی! دوپہر میں فاقے کرنے پڑیں گے۔"

ناہید قریبی اسٹور سے سودا لینے اور بل جمع کروانے گئی تھیں۔ اندر داخل ہوتے ہی بولنے لگیں۔

حمیرا کچن صاف کرچکی تھی۔ برتن بھی دھلے ہوئے تھے۔ وہ پریشر ککر چولہے پہ چڑھا رہی تھی۔

"وہ امی! افتخار جمعۃ المبارک والے دن گیارہ بجے آتے ہیں' انہوں نے صبح گوشت کا کہا تھا۔ میں نے سوچا کچن صاف کرکے گوشت چڑھادوں' صحن دھو کر ہانڈی بھون لوں گی' آپ تو جانتی ہیں وہ آتے ہی بھوک کا شور مچادیں گے۔"

ناہید نے حسب معمول بہت تحمل سے اس کی ساری گفتگو سنی تھی' اب ٹانگ کھینچنے کی باری تھی۔

"یہ سوچنے کا کام تجھے کس نے سونپا ہے۔ ابھی میں اس گھر کی مالکن زندہ ہوں اور تجھ سے بہتر سوچ سکتی ہوں اور تو کتنی دیدہ دلیری سے شوہر کا نام لے رہی ہے تیرے دیدوں میں ذرا شرم ولحاظ ہے کہ نہیں۔ آئندہ تیرے منہ سے شوہر کا نام نہ سنوں' چل فٹافٹ صحن دھو۔ شوہر کے آنے تک کام سے فارغ ہوجانا۔ مظلوم ہیروئن' جمعۃ المبارک ہے۔"

آخر میں ناہید اس کے لہجے کی نقل اتارتیں اسے بے انتہا شرمندہ چھوڑ کر کمرے میں آگئیں۔

اندر لیٹی چندا نے ماں کی ساری غیر مہذبانہ گفتگو سنی تھی۔ وہ ماں کے اس بدلتے روپ پہ بہت حیران تھی' کیونکہ اس نے ماں کو ہمیشہ بہت خوش اخلاق اور تمیزدار دیکھا تھا۔

"کیا ہوگیا ہے امی! بھابھی کے ساتھ اس طرح پیش نہ آیا کریں۔ میرے سر میں درد تھا اور وہ بے چاری صبح سے کاموں میں جتی ہوئی ہیں۔ میں نے۔۔۔"

"تمہاری جرأت کیسے ہوئی کہ اس کے لیے ماں کو غلط کہو۔ اب تم مجھ سے زبان درازی کروگی۔" ناہید نے دانت کچکچاتے ہوئے بیٹی کو گھورا۔ ماں کے خطرناک تیور دیکھ کر' اس کا سانس خشک ہوگیا۔

"نہیں امی! میرا مطلب تھا۔ بھابھی اب اتنی بھی بری نہیں۔" اس نے اٹکتے ہوئے اپنا دفاع کیا۔

"زیادہ ہمدرد بننے کی ضرورت نہیں بیٹا' پہلے ہی اس کا دیوانہ ہے۔ اب تم بھی اس کی حمایت کرنے چلی ہو' جانتی ہو اس کی وجہ سے تمہارے رشتے آنا بند ہوگئے ہیں۔ رزاق صاحب کے گھر تیری بات پکی ہو ہی جاتی' اگر یہ سیاپا نہ پڑتا۔ میں بیوہ تیرے رشتے کے لیے کہاں خوار ہوتی پھروں' ملنے جلنے والوں اور رشتے داروں نے آنکھیں ہی پھیرلی ہیں۔"

ناہید سر تھام کر چارپائی پر گرسی گئیں۔

حمیرا سے بغض کی بڑی وجہ بھی یہی تھی' ورنہ وہ اپنے بیٹے کو بھی برابر قصوروار گردانتیں۔

☼ ☼ ☼

چندا کے بی اے کے پیپر نزدیک آئے گئے تو وہ کالج سے بے فکر ہو کر ہر ذمہ داری سے آزاد اپنے کمرے میں مقید ہو کر رہ گئی۔ وہ دن رات پڑھائی میں جتی ہوئی تھی۔ شیراز سے بھی کبھی کبھار بات ہوتی۔ وہ بھی زیادہ ملنے اور بات کرنے پہ اصرار نہ کرتا۔ حمیرا اسے اندر ہی کھانا اور چائے وغیرہ دے جاتی۔ جب اس کا اپنا دل اکتا جاتا تو اٹھ کر باہر آجاتی۔ وہ ہر چیز سے کٹ کر خود کو پڑھائی میں مصروف رکھے ہوئے تھی۔

پیپر آئے اور ایک ایک کرکے گزرتے چلے گئے۔ اس کا بوجھ بھی سرکتا گیا۔ تمام امتحان اس کی توقع کے مطابق ٹھیک ہوئے تھے۔ امتحانوں سے فارغ ہو کر اس نے گھرداری کی طرف دھیان لگایا اور اسے شدید جھٹکا لگا تھا' صورت حال کتنی بدل گئی تھی۔ حمیرا اور ناہید نے سمجھوتا کرلیا تھا۔ ناہید اسے بڑی نرمی سے بیٹی کہہ کر مخاطب کرتیں' وہ بھی انہیں امی جی کہنے لگی تھی۔ ہر وقت چیخ و پکار اور ٹینشن والی کیفیت رفع ہوگئی تھی۔

راوی چین ہی چین لکھتا تھا۔ چندا اس کایا پلٹ پہ حیران تھی۔ اماں' حمیرا کے ساتھ یوں گھلی ملی تھیں جیسے اسے خود اپنے ہاتھوں سے بیاہ کر لائی ہوں۔ ان کے مابین کبھی کوئی چپقلش جیسے تھی ہی نہیں۔ چند ایک عزیز و اقارب بھی ملنے آئے تھے۔ وہ محلے میں نکلی تو اب کسی نے بھی اسے دیکھ کر چہ میگوئیاں شروع نہیں کی' نہ ہی کسی نے رستہ روک کر افتخار کے عمل کی وضاحت مانگی۔

"تو کیا وقت نے اس قصہ پہ دھول ڈال دی ہے۔" وہ دل میں خود سے پوچھ کے رہ گئی۔ اس روز وہ کچن میں چائے بنا رہی تھی۔ جب ناہید نے اسے کمرے میں بلایا۔ وہ اپنے اور ماں کے لیے کپوں میں چائے ڈال کر اندر لے آئی۔

"جی امی' کیوں بلایا تھا۔" ٹرے رکھ کر وہ بھی برابر صوفے پہ بیٹھ گئی۔ ناہید ریموٹ سے ٹی وی بند کر مکمل اس کی طرف متوجہ ہوگئیں۔

"تیرے چاچو زاہد کا فون آیا تھا' وہ کل ہمارے گھر تیرا رشتہ لینے آنا چاہ رہے ہیں۔" بغیر تمہید باندھے سیدھا دھماکا کردیا گیا۔

چندا کے ہاتھ سے چائے کا کپ چھلک پڑا۔ اسے ماں سے اتنی بے رحمی اور رازداری کی توقع نہیں تھی۔ رات اس کی شیراز سے بات ہوئی تھی' اس کی آمنہ ہفتہ بھر تک آنے والی تھیں۔ اس بار شیراز نے انہیں بطور خاص چندا کے گھر بھجوانے کے لیے بلایا تھا۔ شیراز کے والدین بھی راضی تھے۔ وہ اپنے حصے کی دکھا چکا تھا' اب اس کی باری تھی۔

"میں چاچو کے رنڈوے بیٹے جو ایک بچی کا باپ ہے' اس سے شادی نہیں کرسکتی۔" اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ فی الحال اسے یہی بہانہ مناسب لگا۔

"میں نے تم سے تمہاری رائے یا مرضی نہیں پوچھی' تمہیں اطلاع دے رہی ہوں' تاکہ تم ذہنی طور پر خود کو تیار رکھو اور تمہارے لیے کیا بہتر ہے' یہ میں ماں ہونے کے ناتے بہتر جانتی ہوں۔ اپنے بھائی کے کرتوت کے بعد کسی خوش فہمی میں مت رہو۔"

ناہید کا لہجہ اٹل اور سختی لیے ہوئے تھا۔ بیٹے کے بعد وہ اسے کوئی ڈھیل نہیں دے سکتی تھیں' قریبی رشتے داروں نے چندا کی پوچھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا' حالانکہ چند ماہ قبل یہی رشتے دار چندا کے رشتے کے خواہاں تھے۔

حالات ان کے حق میں ہوتے تو ناہید' دیور کے رنڈوے بیٹے کا سوچتی بھی نہیں۔ اب مجبوری تھی' دیور جھولی پھیلائے آئے تھے۔ لڑکا سرکاری ملازم تھا' تنخواہ اچھی تھی۔ گوکہ اس نے ہمیشہ اپنی بیٹی کے لیے بہت اونچے گھر کا خواب دیکھا تھا۔ لیکن اس وقت تو یہ غنیمت تھا۔

"برا مت مانیے گا امی! میرے پاس اس سے بہتر رشتہ ہے۔"

چندا نے بڑی ہمت کرکے کہہ دیا۔ کل چاچو آرہے تھے' گھر کی بات تھی رسم بھی ہو سکتی تھی۔ تاخیر چندا کی خوشی چھین لے جاتی۔

"کیا بکواس کررہی ہے تو چندا!" ناہید نے اسے بازو سے پکڑ کر جھنجوڑ ڈالا۔

"جب آپ کے پاس کوئی آپشن ہی نہیں تو اس میں کیا برائی ہے۔ آپ کے بھتیجے کی طرح دو بار جو نہیں' آپ پھر اس سے ایک بار مل لیں' پھر اعتراض نہیں کریں گی۔"

اس کا جملہ ابھی منہ میں تھا کہ ناہید نے ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے منہ پہ دے مارا۔ بازو سے جھٹکا دے کر اسے بیڈ پر پھینک دیا۔ ان کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ "بے شرم' بے غیرت! اپنے بھائی کی برابری کرے گی' پہلے بدنامی میں کوئی کسر رہ گئی ہے' جو تو نے پوری کرنی ہے۔ تیرا تو میں گلا دبا دوں گی' لیکن دوسری بار دھوکا نہیں کھاؤں گی۔ کرتی ہوں تیرے چاچے کو فون کہ کل ہی نکاح کے لیے آجائے' رخصتی بعد میں۔ مجھے تجھ جیسی بدبخت پر بھروسا نہیں رہا۔ کل کلاں تو بھی اس کے ساتھ چلی گئی تو لوگ مجھ پہ تھوکیں گے۔ میرے سفید چونڈے میں خاک ڈلوائے گی' کاٹتی ہوں میں تیرے پر۔"

ناہید آتش فشاں بنی اسے دھمکیاں دیتی واقعی برآمدے میں لگے فون سے کال ملانے لگی تھیں۔

چندا کا جسم آگ کی مانند دہک رہا تھا۔ یہ سب کتنا اچانک ہوگیا تھا۔ ماں نے اس کی بات سننا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ وہ خود کو اس سزا کا متحمل نہیں پائی تھی۔ اس کا دماغ سُن ہوا جارہا تھا۔ وہ خطرناک عزائم لیے اٹھی اور اپنے کمرے کو اندر سے مقفل کرلیا۔

اس نے شیراز کو فون پہ ساری روداد سنا دی۔ وہ بھی پریشان ہوگیا۔ باہر ناہید' حمیرا سے عرصہ بعد الجھ پڑی تھیں۔ وہ شاید چندا کا غصہ اس پہ نکال رہی تھیں۔ چندا تکیہ کانوں پہ دھرے لیٹی رہی۔

شام کو افتخار بھائی آئے تو اس کے کان کھڑے ہوگئے۔ اب یقیناً وہ اس کے متعلق پوچھتے اور ناہید کیا بتاتی ہے۔ وہ دروازے سے کان لگائے کھڑی رہی۔ صحن میں کوئی نہیں بول رہا تھا۔ سارے میں جامد سناٹا تھا۔ دوسرے کمرے میں میٹنگ چل رہی تھی۔

وہ کان لگائے کھڑی رہی' تب ہی اسے افتخار کی مدھم سی آواز سنائی دی۔

"ٹھیک ہے امی! میں مولوی صاحب کو نکاح کا کہہ کر آتا ہوں۔"

چندا پہ بجلی گری تھی۔ حالات ایک دم پلٹا کھا جائیں گے۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ وہ غصے اور تنفر سے پاگل ہوئے جارہی تھی۔ اس کا بھائی اور ماں کتنے ظالم ہوگئے تھے۔

اس کا جی چاہ رہا تھا کہ ہر چیز تہس نہس کردے اور اس نے واقعی سب کچھ تہس نہس کرنے کا فیصلہ کرکے شیراز کو فون کردیا۔ اگر انہوں نے اسے موقع نہیں دیا تھا تو وقت ضائع وہ بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔

☼ ☼ ☼

رات ڈیڑھ بجے اس نے اپنے کمرے کا لاک کھولا تھا۔ سارا گھر خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔ ساری لائٹیں بھی بجھی ہوئی تھیں۔ اس کی ماں دوسرے کمرے میں دروازہ بھیڑے محو خواب تھی۔

چندا نے بڑی سی چادر اوڑھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں موبائل اور دوسرے میں جوتا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی چاروں اطراف نگاہ رکھے گیٹ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ گیٹ کے ساتھ بیٹھک تھی' جو اب افتخار بھائی کا کمرا تھا۔ گیٹ کھولنے میں اسے خاصی احتیاط برتنی تھی۔ گیٹ کے کنڈے پہ ابھی اس کا ہاتھ گیا ہی تھا کہ اسے کسی کے سسکنے کی آواز سنائی دی۔ اس کے حواس چوکنے ہوگئے۔ یہ آواز افتخار بھائی کے کمرے سے آرہی تھی۔

وہ گیٹ چھوڑ ان کے دروازے کے ساتھ آلگی۔ ایسا اس نے بالکل غیر ارادی طور پر کیا تھا۔ اگر وہ جاگ رہے تھے تو اس کے گیٹ کھلنے کی آواز انہیں ہوشیار کرسکتی تھی۔

اس نے دروازے کے ساتھ کان لگا کر سننا چاہا کہ وہ اس وقت کیا باتیں کررہے ہیں۔

"چپ کر جاؤ حمیرا! اور کتنا روؤ گی۔" افتخار بھائی کی جھنجلائی ہوئی سی آواز آئی۔

"امی کے الفاظ مجھے چین نہیں لینے دے رہے افتخار! میں نے چندا کو ہمیشہ اپنی بہن سمجھا ہے۔ میں نے اسے کچھ غلط نہیں سکھایا اور امی سارا الزام مجھ پہ دھر رہی ہیں۔ انہوں نے مجھے گھر سے بھاگی ہوئی اور بری عورت کا طعنہ دیا۔ یہاں تک کہ مجھے فاحشہ جیسے گندے الفاظ کہنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ میں مر کیوں نہ گئی افتخار! اتنی بے عزتی۔۔۔ اس سے تو بہتر تھا میں وہیں اپنی سوتیلی ماں کی گالیاں اور مار برداشت کرتی رہتی۔ امی مجھے اتنا کچھ کہتی ہیں، میں خاموشی سے برداشت کر لیتی ہوں لیکن اتنے گندے الفاظ۔۔۔" وہ ہچکیوں سے رو رہی تھی۔

"پلیز اپنا یہ بھوں بھوں بند کرلو حمیرا! مجھے صبح سو کام ہیں، اب تو تمہیں یہ سب برداشت کرنے کی عادت ہو جانی چاہیے۔ آخر جرم بھی تو کیا ہے۔ امی نہ سہی کوئی اور سہی۔ یاد کرو تمہارے اسی رونے نے مجھ سے یہ غلطی سرزد کروائی تھی۔ اب پھر وہی نحوست! اب کیا چاہتی ہو کہ میں تمہارے لیے اپنی ماں سے جھگڑوں، تاکہ جو بچی کھچی عزت ہے وہ تم جیسی کے پیچھے لگ کر اس کا جنازہ بھی نکل جائے۔ میری ماں نے بھی تو دنیا والوں کی بری بھلی برداشت کی ہے اور آج۔۔۔ آج تمہاری وجہ سے میری بہن کا ایک دوہا جو سے رشتہ ہونے جا رہا ہے۔ خاموش ہو کے سو جاؤ، جان چھوڑو۔" افتخار کے الفاظ کی سنگینی اس کے حواس مختل کر رہی تھی۔

جو حالت حمیرا کی تھی کم و بیش ایسی ہی حالت باہر کھڑی چندا کی ہو رہی تھی۔ اس کے سارے جسم پہ باریک چیونٹیاں سی رینگ رہی تھیں۔ اسے لگ رہا تھا کہ یہ سب حمیرا کے بجائے اسے کہا گیا ہو اور افتخار کی جگہ شیراز بول رہا ہو۔

وہ بھی تو گھر سے بھاگنے لگی تھی۔ وہ بھی شام سے فون پہ شیراز کو رو، رو کے اپنا دکھ سنا رہی تھی۔ شیراز کے گھر والے بھی مان گئے تھے۔ اس کے گھر میں بھی ایک کنواری بہن اور بھائی تھا۔ اگر اس کے اس حرکت نے چندا میں اتنی ہمت پیدا کر دی کہ رات کے اندھیرے میں گیٹ تک جا پہنچی تھی تو شیراز کی بہن بھی اس کی دیکھا دیکھی یہ حرکت کر سکتی تھی یا پھر شیراز کی بہن نہ سہی اس کی... سلسلہ یوں ہی چلنا تھا۔ اس کی ٹانگیں کپکپانے لگیں۔ وہ ڈولتی ہوئی وہیں زمین پہ بیٹھتی چلی گئی۔

وہ حمیرا جتنی عظیم اور صابر نہیں تھی۔ اسے غلطی پر شرمندہ ہونا بھی نہیں آتا تھا۔ کل کو اس کی ساس برا بھلا کہہ کر دل کی بھڑاس نکالتی تو وہ یقیناً ان سے الجھ پڑتی۔ اس کی ماں بھی تو حمیرا کے لیے الفاظ استعمال کر جاتی جنہیں سن کر چندا بھی شرم سے نگاہیں چرا لیتی اور محبت کا بھوت ایک دن جان پہ چھوڑ دیتا ہے۔ جیسے اس نے افتخار بھائی کی چھوڑ دی تھی۔

وہ رو رہی تھی۔ شیراز کی کال آنے لگی تھی۔ اس نے لیس کا بٹن دبا دیا۔

"چندا! کہاں ہو؟ باہر کیوں نہیں آ رہی ہو۔ تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ جلدی کرو۔" وہ جھنجلایا ہوا لگ رہا تھا۔

"میں نہیں آؤں گی شیراز!" وہ محض اتنا ہی کہہ پائی۔ نہ کوئی تفصیل، نہ وضاحت نہ صفائی۔

فون بند کر دیا گیا۔ اس نے موبائل سے سم نکال کے دور پھینک دی اور دیوار کا سہارا لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ چپل فرش پہ پھینک کے پاؤں میں اڑس لی۔ اب اسے کوئی جلدی نہیں تھی۔ کسی کے جاگ جانے کا ڈر نہ تھا۔ اس کا ضمیر مطمئن تھا کہ وہ ایک غلط عمل سے بچ گئی تھی۔

حمیرا دنیا والوں کے لیے بے حیا اور بد ذات سہی اس کی عظیم رہنما تھی۔ جس نے اسے اور اس کی آنے والی نسلوں کو ذلت کے گڑھے میں گرنے سے بچا لیا تھا۔

سعدیہ رئیس

صبح کا ہلکا ہلکا اجالا پھیلنے کے ساتھ ساتھ ہی چڑیوں کی چہچہاہٹیں سب طرف موسیقیت سی بکھیرنے لگی تو شگفتہ بھی اپنے اوپر سے کھیس ہٹا کر اٹھنے کے لیے چوکس ہو گئیں۔ سائیڈ ٹیبل سے اپنی عینک اٹھا کر آنکھوں پر لگائی اور سرہانے رکھا دوپٹا اٹھا کر اچھی طرح اوڑھ لیا۔ حسب معمول وہ علی الصبح ہی بیدار ہو گئی تھیں، لیکن سب طرف چھائے سکوت اور بند دروازوں کے پیچھے گہری نیندوں کا احساس کر کے وہ بھی نماز فجر کی ادائی کے بعد کچھ دیر کے لیے اپنے بستر میں گھس گئی تھیں، ورنہ انہیں نماز فجر کے بعد دوبارہ لیٹنے یا سونے کی عادت نہیں تھی، بلکہ وہ تو گرما گرم چائے تیار کر کے فوراً" ہی ناشتا کر لیا کرتی تھیں، مگر اب یہاں انہیں چائے کی طلب کو دبانا پڑا کہ ابھی کچن ان کے لیے نیا تھا۔ ہرچند کہ یہ گھر، یہ جگہ ان کے لیے بالکل بھی نئی نہ تھی۔ مگر اب اتنے عرصے بعد اسی ماحول میں ایک نیا پن جھلک رہا تھا۔

انہوں نے بند کھڑکی کے دونوں پٹ وا کر دیے۔ ایک نورانی سا اجالا بند کمرے میں پھیل گیا اور تازہ ہوا کے جھونکے نے طبیعت کو سیراب کر دیا۔ کھڑکی سے ہی کچن میں روشنی دکھائی دی۔ ساتھ ہی برتنوں کی ہلکی سی کھٹر پٹر بھی سنائی دی۔ اس کا مطلب تھا کہ گھر والے جاگ گئے تھے۔ وہ آہستہ خرامی سے کمرے سے باہر نکل آئیں۔ مگر کچن کے پاس پہنچ کر بری طرح چونک گئیں۔ خیال تھا کہ کچن میں ان کی بھاوج ناصرہ ہوں گی۔ مگر وہاں تو ان کے پیارے بھائی ہدایت اللہ سر پر ٹوپی جمائے بڑے انہماک سے چائے بنانے میں مصروف تھے۔

"صبح بخیر آپا!" ان کی چاپ پر پلٹ کر انہوں نے مسکرا کر ان کا خیر مقدم کیا۔

شگفتہ نے نثار ہوتی نظروں سے اپنے بھائی کو دیکھا۔ وہ بڑا ذمہ دار اور بردبار سا لگا۔ ورنہ پہلے کیسا لاپروا ہوا کرتا تھا۔ یہ بھی انہیں اچھی طرح معلوم تھا اور عمر کے ساتھ ساتھ تو ہر انسان کے مزاج، شخصیت اور عادتوں میں تبدیلیاں آ ہی جاتی ہیں۔ اس کا سب سے بڑا استاد وقت اور تجربہ ہوتا ہے۔ مگر پھر بھی کبھی کبھی اس کی ساری سمجھ داری دھری رہ جاتی ہے اور وقت کے ہاتھوں چوٹ کھا کر ایک نیا سبق اس کے اندر ایک نئی تبدیلی لاتا ہے۔

"تم چائے بنا رہے ہو؟" انہوں نے تعجب سے پوچھا۔

"جی آپا! کافی عرصے سے میں نے اپنا یہ معمول بنا لیا ہے۔ دراصل ناصرہ رات کو دیر تک جاگتی ہے۔ پھر اسے دائمی کھانسی نے بھی خاصا تنگ کر رکھا ہے۔ رات بھر بے آرام رہتی ہے۔ اس لیے صبح جلدی نہیں اٹھ پاتی۔" انہوں نے بنا شرمندگی کے بڑے رسان سے انہیں آگاہ کیا۔

"لاؤ... میں تمہاری مدد کر دیتی ہوں۔" وہ چند قدم آگے بڑھیں۔

"ارے! نہیں آپا! چائے تو تیار ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ آپ کو صبح خیزی کی عادت ہے۔ اسی لیے نماز پڑھتے ہوئے واپسی پر میں حلوائی کی دکان سے آپ کے لیے حلوہ پوری لیتا ہوا آ گیا۔" ہدایت نے محبت سے کہا۔

"ارے! کیا ضرورت تھی۔ بس سادہ سا ناشتا صحیح تھا۔ ویسے بھی اب اس عمر میں ثقیل چیزیں معدے پر گراں گزرتی ہیں۔ چلو خیر! لے آئے ہو تو کھا لوں گی۔ بڑے عرصے بعد ہم دونوں بہن بھائی مل کر ناشتا کریں گے۔" فطری خوشی سے ان کا چہرہ چمکنے لگا۔

سورج کی اجلی کرنوں نے سوئے سوئے ہر منظر کو نمایاں کر دیا تھا ان کی بے تاب نظریں سب طرف دوڑنے لگیں۔ لیکن جس ماحول اور جس منظر سے وہ مانوس تھیں، وہ وہاں مفقود تھا۔ جانی بوجھی جگہ انجانی سی لگ رہی تھی۔

یہاں آنے سے پہلے اور سارا راستہ ہی وہ بہت پرجوش اور جذباتی سی ہوتی رہی تھیں۔ یہ وہ گھر تھا، جہاں ان کا بچپن گزرا تھا۔ عمر کے انیس برس اس گھر میں لاتعداد یادوں کی صورت سب طرف بکھرے تھے۔ لیکن اب یہاں سب بدلا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اتنے

Saba

برسوں میں بہت کچھ بدل گیا تھا۔ سیمنٹ کے پکے فرش پر ایک جانب کپڑے دھونے کی ہودی تھی۔ مگر اب وہاں موزائیک کا فرش تھا اور ہودی کی جگہ واش بیسن تھا۔ جس پر بڑا خوب صورت سا فینسی آئینہ لگا ہوا تھا۔ کھلے برآمدے پر چھت ڈال دی گئی تھی اور گلاس وال لگا کر اس کی خوب صورتی مزید بڑھا دی گئی تھی۔ کارنر پر منی پلانٹ کی خوب صورت بیل دیوار پر چڑھ رہی تھی۔ وہ کمرا جہاں کھجور کی چٹائی پر بیٹھ کر چھوٹے بچے سیپارے پڑھتے تھے' اب وہاں بچوں کا اسٹڈی روم تھا۔ میز' کرسیاں' بک شیلف اور ایسا ہی بہت سا سامان وہاں رکھا تھا۔ کچن کے باہر ہی ہوا کے رخ پر مٹی کی صراحی رکھی رہتی تھی اور اس کے پاس ہی پانی جذب کرنے کے لیے موبج کا ٹکڑا ڈال دیا جاتا تھا' تاکہ پانی اس ٹکڑے میں جذب ہو جائے' مگر اب وہاں سپاٹ سا فرش تھا اور سنگی دیوار کے پاس پانی کا پائپ اور وائپر رکھا ہوا تھا۔

چوبیس برس پہلے وہ حارث کی دلہن بن کر یہ انگنا چھوڑ کر کینیڈا روانہ ہو گئی تھیں۔ وہ جدائی اور دوری کے احساس سے بے حد نڈھال اور افسردہ تھیں کہ حارث بھی نئی نویلی دلہن کو سنبھالنے میں ہلکان ہو گئے۔ شادی کے بعد اوائل سالوں میں ہی انہوں نے ایک آدھ بار پاکستان کا چکر لگایا تھا۔ ہر بار واپسی پر وہ پہلے سے بھی زیادہ اداس ہو جاتی تھیں۔ مگر پھر جیسے تیسے انہوں نے خود کو اس زندگی میں ایڈجسٹ کر ہی لیا۔

حارث نے بھی ان کا خیال رکھنے میں کبھی کوئی کمی نہ کی تھی۔ گھومنا پھرنا' سیر سپاٹے اور شاپنگ میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ لیکن اصل بات یہ تھی کہ شگفتہ کو ان باتوں سے تقویت نہ ملتی تھی۔ جب بہت گھبرا کر انہوں نے ایک اسلامی مرکز میں جانا شروع کیا تو پہلی بار انہیں اپنی ذات کے خول سے نکل کر اپنے مذہب کو قریب سے سمجھنے اور جاننے کا موقع ملا۔ اپنے دکھ اور کمزوریوں سے نکل کر وہ اپنی خامیوں اور غلطیوں کو سدھارنے میں لگ گئیں۔ اس عمل سے ان کے ہلکان دل کو اتنی تقویت ملی کہ ان کی ساری کسک ب... رہی۔

اب ایک مدت بعد انہوں نے پاکستان کا رخ... تھا۔ کیونکہ انہیں اپنے بیٹے کے لیے ایک نیک ... اور باحیا لڑکی کی تلاش تھی اور دوسرے ان کی د... الوطنی انہیں بے چین کر رہی تھی۔ بچھڑے عزیز... اور آبائی گھر کو زندگی میں ایک بار پھر دیکھنے کی تڑپ... انہیں بہت پرجوش کر دیا تھا۔

جب تک ہدایت حلوہ پوری اور چائے لے آئے' تب تک وہ حال سے ماضی اور ماضی سے حال... سفر طے کر کے واپس آ چکی تھیں۔ بھائی کے ساتھ ... کرتے ہوئے وہ بغور ان کا جائزہ لیتی رہیں۔ بردباری ... سنجیدگی تو خیر ان کی عمر کا تقاضا تھی۔ مگر ان کی کنپٹیو... کے سفید بال وقت سے پہلے انہیں بوڑھا دکھا ر... تھے۔ چہرے پر تفکر کی پرچھائیاں اور دبلاپن دیکھ... انہیں بہت افسوس ہوا۔ ہدایت ان کا وہ بھائی تھا ج... پر ٹوٹ کر جوانی آئی تھی۔ اس کے مضبوط ہاتھ پیر ا... نکلتا ہوا قد' سب ہی کی نظروں میں آتا تھا۔ مگر ا... جوانی ڈھل گئی تھی۔ گزرتا وقت بہت گہری چھاپ... کے نقوش پر چھوڑ گیا تھا۔ بدل تو خیر وہ خود بھی ... تھیں۔ ان کا جسم پہلے سے کہیں فربہ ہو گیا تھا اور ... کے بال بھی خاصے کم ہو گئے تھے۔ مگر اچھی آب و... کی وجہ ان کے چہرے پر بڑی جان دار ملاحت نظر ... تھی اور چہرے کی رنگت بھی سرخ و سپید تھی۔ یا تو ... ان کی عبادتوں اور نیک خیالات کا کمال تھا یا پھر ان ... اندر اترے گہرے سکون و اطمینان کی وجہ سے تھا۔

"بہت کمزور اور دبلے لگ رہے ہو ہدایت اللہ؟" انہوں نے خاصی تشویش سے پوچھا۔

"بس آپا! زندگی کے سو بکھیڑے اور الجھنیں ہیں۔ نہ پریشانیاں ختم ہوتی ہیں اور نہ حالات بدلتے ہیں۔ بہت کوشش کرتا ہوں کہ ناصرہ کو خوش رکھوں۔ ... مسئلے مسائل تو جی کا جنجال بن گئے ہیں۔" انہوں نے ادھوری سی وضاحت دی۔

"ہاں! وہ تو میں دیکھ رہی ہوں کہ تم نے ماشاء اللہ گھر کو بنانے میں بڑی محنت کی ہے۔ مگر اپنا بھی تو خیال رکھا جاتا ہے' کھوں کی میں ناصرہ سے۔" انہوں نے ارادہ ظاہر کیا۔

"ارے انہیں آپا۔ ناصرہ سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ وہ تو پہلے ہی خاصی پریشان رہتی ہے۔ بہت تعاون کرتی ہے وہ میرے ساتھ گھر چلانے میں۔ مگر مسائل ختم ہی نہیں ہوتے۔ آپ کو نہیں پتا' اس نے سنبل کا رشتہ بھی بڑے جتنوں سے کیا ہے۔ ورنہ اپنوں نے تو حد ہی کر دی تھی ہمیں پریشان کرنے میں۔ ارشد کی منگنی کرانے میں بھی ناصرہ ہی کا کمال ہے۔ ورنہ لوگوں نے تو بندشیں کرا دی تھیں ہمارے ارشد کے لیے' تاکہ اس کی شادی ہی نہ ہو۔" ہدایت نے بلا جھجک انہیں بہت سی اہم باتوں سے آگاہ کر دیا۔

"ائے ہئے۔ یہ کون ہیں جادو ٹونا کرنے والے؟" وہ حق دق سی فکر مندی سے پوچھنے لگیں۔

"چھوڑیں آپا! آپ بھی کن باتوں میں پڑ گئیں۔ چلیں کچھ اور باتیں کرتے ہیں۔" انہیں پریشان دیکھ کر ہدایت نے فوراً" ہی موضوع بدل دیا۔

مگر در حقیقت شگفتہ نئی سوچوں میں گھر گئی تھیں۔ ہدایت کے جانے کے بعد بھی وہ بہت دیر تک ان کی باتوں پر غور کرتی رہیں۔ ارد گرد پھیلے گمبھیر سناٹے کو کسی اسکول وین کے تیز ہارن نے توڑا۔ تب کچھ چونک کر انہوں نے اپنے اطراف پر غور کیا۔ اس وقت وہ بالکل اکیلی بیٹھی تھیں۔ گھر کے مکین ابھی تک خواب غفلت میں پڑے میٹھی نیند میں مدہوش تھے۔ انہوں نے دیوار گیر گھڑی میں وقت دیکھا تو آٹھ بج چکے تھے۔ ماحول پر وہی خوابیدہ سکوت چھایا ہوا تھا' جیسے رات ابھی گزری نہ ہو۔ حالانکہ رات تو کب کی گزر چکی تھی۔ نیا سورج طلوع ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی۔ مگر اس گھر کے کمروں' برآمدوں میں اندھیرا اترا ہوا تھا۔ جس نے ساری برکتوں اور رحمتوں کو اپنی سیاہی میں چھپا لیا تھا۔

اس غیر محسوس سی خاموشی سے گھبرا کر وہ اپنے کمرے میں چلی آئیں اور فراغت کے ان لمحات کو گزارنے کے لیے "فضائل و اعمال" کا مطالعہ کرنے لگیں۔

جانے کب تک وہ اکیلی بیٹھی رہیں۔ پھر تھک کر بستر پر دوبارہ لیٹ گئیں۔ اپنی پوری زندگی میں انہوں نے کبھی بھی اتنا زیادہ آرام نہیں کیا تھا۔ گیارہ بجے کے قریب گھر میں زندگی کے آثار نمودار ہوئے۔ باہر کی چہل پہل اور آوازوں کو سن کر وہ خود بھی باہر چلی آئیں جہاں ناصرہ کچن میں گھسی ناشتے کا انتظام کر رہی تھی اور ملازمہ وہیں کھڑی سنک میں برتن دھو رہی تھی۔ بارہ بجے تک ناشتے سے فارغ ہو کر ناصرہ سب سے اہم مسئلے "آج کیا پکایا جائے" کو لے کر بیٹھ گئی۔

"حد ہوتی ہے لاپروائی کی۔ بغیر بتائے ہدایت اتنی جلدی دکان پر چلے گئے۔ پتا بھی ہے کہ آپا آئی ہوئی ہیں۔ مگر خیال ہی نہیں ہے۔" اسے اپنے میاں پر غصہ تھا۔

"ارے بھئی' میں کچھ بھی کھا لوں گی۔ میرے لیے تکلف نہ کرو۔" شگفتہ نے فوراً" منع کیا۔

"اس کی آپ فکر نہ کریں۔ وہ تو میں خود ہی دیکھ لوں گی۔ مگر یہ ہدایات بھی ایسے ہیں کہ ان پر غصہ آجاتا ہے۔ میرے جاگنے سے پہلے ہی اتنی جلدی گھر سے نکل گئے۔" وہ بدستور غصے میں تھی۔

"جلدی!" شگفتہ نے چونک کر گھڑی دیکھی جو اب ایک بجنے کا اعلان کرنے والی تھی۔

مگر وہ ناصرہ کو کچھ نہ کہہ سکیں' کیونکہ اس وقت وہ بہت مصروف تھی۔ وہ ملازمہ کی تنخواہ سے چھٹیوں کے پیسے کٹوتی کر رہی تھی' جس پر ملازمہ اس سے کافی بحث و تکرار کر رہی تھی۔ شگفتہ نے بڑی ناگواری سے وہ سب کچھ سنا۔ اس کے بعد ناصرہ کچن میں کھانا پکانے گھس گئی۔ تب تک انہوں نے سکون سے اخبار کا مطالعہ کیا۔

اسی وقت ناصرہ کی اکلوتی بیٹی سنبل دہائی دیتی چلی آئی۔ ذرا سی دیر میں ہی ایک ہنگامہ گرم ہو گیا۔ سنبل غصے میں اپنے شوہر سے لڑ کر میکے آگئی تھی اور اب دونوں ماں، بیٹیاں رونے دھونے اور اس کے سسرال والوں کو کوسنے دینے میں مصروف تھیں۔ سنبل کے گلے شکوے ہی ختم نہ ہو رہے تھے اور ناصرہ اسے ڈھارس دیتی جا رہی تھی۔

"کیا ہو گیا ناصرہ! آخر قصہ کیا ہے؟" شگفتہ نے ناصرہ کا کندھا ہلا کر متوجہ کیا اور ناصرہ تو جیسے منتظر بیٹھی تھی۔ ان کی ذرا سی ہمدردی اور اپنائیت پر اس نے سنبل کی سسرال میں ہونے والے مظالم کی داستان بیان کر دی۔

"مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ لوگ اتنے جاہل اور نیچ نکلیں گے۔ ساس، بیٹے کو بیوی کے خلاف ورغلاتی رہتی ہیں۔ وہ جلاد بن کر اس پر ظلم توڑتا ہے۔ ہر بات پر پابندی اور روک ٹوک ہے۔ میکے والے بے حد برے ہیں۔ نہ وہ اسے کہیں آؤٹنگ پر لے جاتا ہے، نہ ہمارے گھر آنے دیتا ہے۔ گھل گھل کر آدھی ہو گئی میری بچی۔" وہ جو شروع ہوئی تو چپ کرانا مشکل ہو گیا۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔ فکر نہ کرو اس کا غصہ اترے گا تو خود ہی بیوی کی یاد آئے گی۔"

شگفتہ نے ماں بیٹی کو دلاسا دیا۔ مگر کچھ بھی ٹھیک نہ ہوا۔ بات بڑھتی ہی گئی۔ ناصرہ نے صاف کہلوا دیا کہ "سنبل اب وہاں نہیں جائے گی۔" ادھر سے ترنت جواب آگیا کہ "بلا سے بیٹھی رہے" اور ناصرہ تو غصہ سے ادھ موئی سی ہو گئی۔

"ان کی یہ جرات، یہ ہمت؟ ارے! فقیروں کی طرح جھولی پھیلا کر مانگ کر لے کر گئے تھے میری سنبل کو۔ اور اب دکھا دی اپنی اصلیت۔ میں نے بھی ان لوگوں کی ناک رگڑوا کر نہ چھوڑی تو میرا نام بھی ناصرہ نہیں۔"

ناصرہ نے علی الاعلان تہیہ کیا۔ شگفتہ خاموش تماشائی کی طرح سب دیکھتی رہیں۔ حالات بدلتے ہو گئے۔ ادھر سنبل کی پریشانی ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ ناصرہ کے بیٹے ارشد کی منگنی ٹوٹ گئی۔

"ارے! نہ جانے کس دشمن کی نظر لگ گئی میرے گھر کو۔ مشکلوں نے میرا ہی گھر دیکھ لیا ہے۔ یا اللہ! حاسدین کو غارت کر جنہوں نے میرا گلشن اجاڑا ہے۔ ابھی تو سنبل کا ہی مسئلہ حل نہ ہوا تھا کہ ارشد کی منگنی بلاوجہ ہی ٹوٹ گئی۔" ناصرہ سخت پریشان تھی۔

اس بار شگفتہ چپ نہ رہ سکیں۔ کتنے ہی دنوں سے وہ خاموش بیٹھی یہ سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔

"میرا تو خیال ہے کہ تم اپنے بھائی منظور کو بلا کر ان سے بھی مشورہ لو۔ وہ تمہارے بڑے بھائی ہیں۔ ہو سکتا ہے، وہ سنبل کے مسئلے کا حل نکال دیں۔" انہوں نے مشورہ دیا۔

"ان سے تو ہماری بات ہی نہیں ہے انہوں نے ہماری سنبل کو لینے کے بجائے اپنی بیوی کی بھانجی کو اپنی بہو بنا لیا۔ اب جو ہماری سنبل یہ ساری مصیبت پیٹ رہی ہے تو یہ سب ان ہی کی وجہ سے ہے۔ اگر وہ اسے بہو بنا لیتے تو وہ اتنا دکھ ہی نہ اٹھاتی۔ ہمارا تو ان سے کافی عرصہ سے ملنا جلنا ختم ہے۔" ناصرہ کے انکشاف سے وہ پہلے سے بھی زیادہ پریشان ہو گئیں۔

"یعنی قطع رحمی کر لی ہے تم نے؟ چچ چچ یہ تو بہت بری بات ہے۔" "نہیں حقیقتاً" "بہت دکھ پہنچا تھا۔"

"اسی قابل ہیں وہ۔ ہم نے تو انہیں سنبل کی شادی پر بھی نہیں بلایا تھا۔" ناصرہ نے فخریہ انکشاف کیا۔

"مگر ناصرہ! یہی رشتہ داریاں ہماریاں آزمائش ہوتی ہیں۔ یہ بات بالکل بھی مناسب نہیں لگ رہی۔ تمہیں ان سے ملنا جلنا ختم نہیں کرنا چاہیے۔" وہ کہے بغیر نہ رہ سکیں۔ مگر ناصرہ ان کی بات سنی ان سنی کر کے اپنے کسی کام میں مصروف ہو گئی۔

سنبل کا مسئلہ کسی طور حل ہو کر نہ دے رہا تھا۔ ناصرہ کا بلڈ پریشر بھی ہائی ہو گیا اور اختلاج قلب نے اسے مکمل طور پر نڈھال کر دیا۔ ادھر آئے روز کی مہمان داری بھی جاری و ساری تھی۔ کیونکہ عزیز، رشتہ دار شگفتہ سے ملنے وہیں آ رہے تھے۔

سنبل والی بات بھی کسی سے چھپی نہ رہی اور ارشد کی منگنی ٹوٹنے کی خبر کو سب نے چٹخارے لے کر ادھر ادھر پھیلایا۔ ان ہی دنوں ان کی دوسری بھاوج یعنی ناصرہ کی دیورانی شاہدہ نے انہیں بشرط رازداری یہ بات بھی بتائی کہ ارشد کی بات بچپن ہی سے ان کی بیٹی ہما سے طے تھی۔ لیکن ناصرہ نے پیسہ دیکھ کر ارشد کی منگنی مالدار گھرانے میں کر دی تھی۔

"اب عقل ٹھکانے آگئی ہو گی ناصرہ کی۔" شاہدہ نے ان کے کان میں سرگوشی کی۔ اس خبر کو سن کر شگفتہ کو ناصرہ کی عقل پر کافی افسوس ہوا۔ ہما کو انہوں نے دیکھا تھا۔ وہ بہت پیاری اور شوخ سی لڑکی تھی اور آج کل ان کی خدمت پر کمربستہ تھی، کیونکہ یہ بات بھی سب کے علم میں تھی کہ وہ اپنے بیٹے کے لیے لڑکی کی تلاش میں ہیں۔ اب شاہدہ ہما کے رشتے کے لیے پریشان تھیں۔

"اگر کوئی رشتہ آپ کی نظر میں ہو تو ہما کو ضرور یاد رکھیے گا آپا!" انہوں نے دبے لفظوں میں شگفتہ کو اشارہ بھی دے دیا۔

اور شگفتہ تو اس خبر کو سنتے ہی ہما کے لیے پریشان ہو گئی تھیں۔ لیکن ان کی چھوٹی بہن میمونہ کے اگلے انکشاف کو سن کر انہیں سخت دھچکا پہنچا۔

"ہما کے کرتوت ہی کہاں اچھے ہیں۔ ادھر ادھر دوستیاں پال کر رکھی ہے۔ اسی لیے تو ناصرہ نے اسے رد کیا تھا۔" میمونہ نے بڑی رازداری سے انہیں آگاہ کیا۔

"ہا۔ یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ اور یہ شاہدہ نے بیٹی کی طرف سے آنکھیں کیوں بند کر رکھی ہیں۔ نظر نہیں رکھتی وہ اس پر؟" انہیں بے حد افسوس ہوا۔

"ہاں! اسے یہ سب نظر نہیں آتا بس ایک ایک سے ہما کے رشتے کے لیے کہتی رہتی ہے۔"

وہ بےزاری سے کہہ کر ان کے پاس سے ہٹ گئی۔ یہ دیکھے بغیر کہ شگفتہ گم صم بیٹھی رہ گئی ہیں۔ ان ہیر پھیر کی باتوں نے صحیح معنوں میں انہیں چکرا کر رکھ دیا تھا۔ ان سب کی شخصیت پیاز کے چھلکوں کی طرح پرت در پرت ظاہر ہو رہی تھی۔ ہر کوئی اپنے اصلی روپ سے الگ ثابت ہو رہا تھا۔

وہ سب ایک دوسرے سے مل رہے تھے۔ ایک دوسرے کے معاملات سے آگاہ تھے، مگر دل کے اندر باہر کے حالات بے حد مختلف تھے۔

منگنی ٹوٹنے کے بعد سے ارشد کا موڈ بے حد خراب تھا اور جس روز سے ہما وہاں سے ہو کر گئی تھی، اس کا مزاج اور بھی بگڑ گیا۔ اس نے غصے سے کرسی کو ٹھوکر ماری اور سب کا بائیکاٹ کر کے کمرا نشین ہو گیا۔ ادھر سنبل تصویر غم بنی بیٹھی۔ شگفتہ کو اس کا اجاڑ روپ دیکھ کر وحشت ہونے لگی اور ناصرہ تو نہ جانے کن چکروں میں پڑ گئی تھی۔

چند دن سے اس کے معمولات بھی کچھ عجیب سے ہو گئے تھے۔ روز دوپہر کو وہ گھر سے باہر چلی جاتی تھی اور اب ہر روز باقاعدگی سے الگ کمرے میں اگربتیاں جلا کر بیٹھ جاتی۔ اس کے بعد مرچوں اور کافور کی دھونی سارے گھر میں دیتی پھرتی۔ اس کے علاوہ ہر روز مغرب کے وقت ایک چراغ جلا کر دہلیز پر رکھ دیتی۔ اس نے سنبل کے بازو پر بھی ایک تعویذ باندھ دیا تھا۔

"یہ سب کیا ہے ناصرہ؟" شگفتہ سے رہا نہ گیا تو پوچھ بیٹھیں۔

"آپا! گھی سیدھی انگلیوں سے نہ نکلے تو انگلیاں ٹیڑھی کرنی ہی پڑتی ہیں۔ یہ سب سنبل کا گھر آباد کرنے کے لیے کر رہی ہوں۔ ہمارے پیر و مرشد بڑی کرامت والے ہیں۔ ان کے تعویذوں سے بہت سے بگڑے کام سنور جاتے ہیں۔ اب دیکھتی جائیں آپ، کیسے سنبل کا شوہر موم ہوتا ہے۔ پیر صاحب نے وعدہ کیا ہے کہ وہ ارشد کا رشتہ بھی اچھی جگہ کرا دیں گے۔"

ناصرہ کی رام کہانی سن کر شگفتہ نے بے یقینی سے

اسے دیکھا۔ یہ وہی ناصرہ تھی جو بیاہ کر آئی تھی تو اسے اپنے گریجویٹ ہونے پر بہت ناز تھا۔ بہت سمجھ دار اور پڑھا لکھا سمجھتی تھی خود کو اور آج۔۔۔

ناصرہ کا یقین اس قدر تھا کہ اسے سمجھانا یا کچھ کہنا اس وقت بے کار ہی تھا۔ سو وہ اس معاملے میں چپ رہیں۔ مگر ایک مشورہ دینے سے نہ چوکیں۔

"میری مانو تو ارشد کی بات شاہدہ کی بیٹی ہما سے طے کر دو۔" انہوں نے مشورہ دیا۔

"ارے آپا! دو ملاؤں میں مرغی حرام۔۔۔ یا آپ کہہ لیں کہ مرغا حرام۔ میرے ارشد پر ایک طرف شاہدہ کی نظر ہے تو ادھر میمونہ بھی آس میں ہے۔" اس نے نئی بات بتائی۔

"اچھا! تو وہ جو ہما کے افیئرز ہیں، تمہیں ان پر کوئی اعتراض نہیں ہے؟" انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

"ارے آپا! یہ سب بے پر کی باتیں ہیں۔ ہما کو صرف ڈی ویلیو کرنے کے لیے میمونہ الٹی سیدھی باتیں کرتی پھرتی ہے۔" اس نے میمونہ کی باتوں کو بالکل رد کر دیا۔

شگفتہ چند لمحوں تک کچھ بولنے کے قابل نہ رہیں۔ وہ سب ایک دوسرے کے سارے کچے چٹھوں سے واقف تھے۔ ان سب کے پہلو میں دل بھی دھڑکتا تھا اور سب کے ۔۔۔ دماغ بھی خوب کام کرتے تھے۔ مگر ان سب کا مسئلہ یہ تھا کہ پہلو میں لگا دل مطلب کی باتوں پر دھڑکتا تھا اور دماغ ہمیشہ اپنے فائدے کی بات ہی سوچتا تھا۔ بھلے سامنے والا جائے چولہے میں۔

وہ سب اسی لیے مشکلات کا شکار تھے کہ بظاہر ایک دوسرے سے ملنے کے باوجود ایک دوسرے سے ازحد شاکی بھی تھے۔ انہوں نے ناصرہ کو پیر و مرشد پر اندھا اعتماد کرنے سے منع بھی کیا۔ مگر ناصرہ اسی احترام اور ایمان کے ساتھ پیر و مرشد کا پیٹ بھرتی رہیں۔ ان کی کرامتوں کے لیے ہر بار ہی ایک بڑی رقم وہ ان کی نذر کرتی تھیں۔

ایک روز اچانک ہی سنبل کا شوہر اسے لینے آگیا۔ ناصرہ پر تو شادی مرگ طاری ہو گئی۔

"دیکھا۔۔۔ میں نہ کہتی تھی کہ پیر و مرشد کی کرامت سے سب ٹھیک ہو جائے گا؟" سنبل کے جانے کے بعد ناصرہ نے بطور خاص شگفتہ کو جتایا۔

"استغفر اللہ۔۔۔ توبہ کرو بی بی! توبہ۔۔۔ یہ سارے کام تو اللہ کے ہیں۔ سب سے بڑا پیر دستگیر اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ تمہارا کمزور ایمان تمہیں پیر جی کے سامنے جھکا رہا ہے۔ حالانکہ ایسا کچھ بھی نہیں۔ تمہاری مشکلات تمہاری اپنی پیدا کردہ ہیں۔ ان کا حل بھی تمہیں خود نکالنا چاہیے۔ ورنہ معاملات اسی طرح الجھتے چلے جاتے ہیں۔ ذرا دھیان سے سنو! سنبل نے میرے سمجھانے پر اپنے میاں سے خود رابطہ کیا تھا۔ اسی لیے وہ خوشی خوشی اسے لینے آگیا۔ ان دونوں میں صلح صفائی میں نے کرائی ہے اللہ کے حکم سے کہ وہی سب سے بڑا کارساز ہے۔ سب سے بڑا وہی ہے۔ اسی سے مانگو۔ اسی سے چاہو۔ سب کچھ ملتا ہے۔ اپنی غلطیوں پر ڈھٹائی سے ثابت قدم رہنے کے بجائے نادم ہونا سیکھو۔ سوچو کہ شاید ہماری کسی کوتاہی کے باعث ہماری زندگی میں یہ پریشانی آئی ہو گی۔"

ناصرہ کا اندھا یقین اور بے پایاں خوشی دیکھ کر شگفتہ نے ڈپٹ کر اسے آئینہ دکھایا۔ اس وقت ان کے ایک ایک لفظ نے ناصرہ پر اپنا اثر دکھایا۔ کیونکہ شگفتہ نے انہیں زبانی طور پر ہی نہیں، عملی طور پر بھی مسئلہ حل کر کے دکھایا تھا۔

ناصرہ کے دل کا بوجھ ہلکا ہوا تو جیسے سارے معاملے سدھرتے گئے۔ ان کی بات مان کر ناصرہ نے ارشد کی بات ہما سے طے کر دی اور ان دونوں کی منگنی پر اس نے اپنے بھائی سے قطع رحمی بھی ازخود ختم کر دی۔

ان سب کو خوش دیکھ کر شگفتہ کو جتنی خوشی ہو رہی تھی اس سے زیادہ خوشی انہیں اس بات کی تھی کہ وہ ناصرہ کو راہ راست پر لے آئی تھیں۔ وہ پیروں، باباؤں کے سحر سے باہر نکل گئی تھی، ایک گہرا سکون ان کے اندر اتر آیا تھا۔

اس روز وہ نماز عصر سے فراغت کے بعد کمرے میں بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھیں کہ ناصرہ کسی اجنبی خاتون کے ساتھ ان کے کمرے میں آگئی۔

"آپا! یہ میری پڑوسن حامدہ ہیں۔ آج کل بڑی سخت پریشان ہیں۔ ان کی بیٹی کسی دوسرے لڑکے کو پسند کرتی ہے، جبکہ اس کی بات انہوں نے اپنے بھائی کے گھر طے کر رکھی ہے۔ یہ آپ کے پاس اسی لیے آئی ہیں، تاکہ آپ کی دعاؤں سے ان کے حالات سنور جائیں۔" ناصرہ نے روانی سے انہیں اپنی پڑوسن کے مسئلے سے آگاہ کیا۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتیں یا کہتیں ان خاتون نے آگے بڑھ کر عقیدت سے ان کا ہاتھ تھام کر اس کی پشت پر احترامی بوسہ دے ڈالا۔ شگفتہ کرنٹ کھا کر پیچھے ہوئیں۔

"بڑی تعریف سنی ہے جی آپ کی۔ میں تو آپ کی تعریف سنتے ہی آپ کی مرید بن گئی ہوں۔ بڑا درجہ ہے جی آپ کا۔ میرے لیے بھی دعا کریں۔ کیا پتا آپ کی کرامت سے میری بیٹی کی ضد ختم ہو جائے۔ ساری زندگی آپ کے پاؤں دھو، دھو کر پیوں گی جی۔۔۔ اگر میری بیٹی باز نہ آئی تو میرے گھر میں بڑا فساد ہو گا۔" آپ دعا کریں جی۔"

وہ خاتون ان کے سامنے دوزانو بیٹھی عجز و انکساری کا مرقع لگ رہی تھیں۔ شگفتہ نے حیرت سے پھٹی آنکھوں سے ان خاتون کو دیکھا اور پھر چشم تصور میں وہ خود ایک لمبے سے سبز چغہ میں ملبوس موتیوں اور منکوں کی بہت سی مالائیں پہنے بیٹھی نظر آئیں۔ اس تصور سے ہی انہوں نے جھرجھری لی اور ایک طرف ڈھے گئیں۔

عنیزہ سید

چالیں بازی کی بساط

مکمل ناول

اس شہر کا موسم بہت سرد تھا اور اسے اتنی سردی کی عادت نہیں تھی۔ وہ اجنبی شہر، نئی نوکری، رہنے کا نامناسب ٹھکانا، کھانے پینے کے غلط اوقات اور نامناسب بندوبست، عملی زندگی کے بازی کے دستانے پہن کر اس سے ہاتھ ملانے آئی تھی۔ یہاں آنے کے کچھ ہفتے کے اندر اندر ہی اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ گھر اور گھر والوں کا ساتھ کتنا سکون بخش تصور تھا لیکن وہ اپنی ضدی طبیعت اور چیلنج قبول کرنے والے مزاج کے ہاتھوں مجبور تھا۔ اس نے گھر سے آنے والی فون کالز کے جواب میں۔ "جاب بالکل ٹھیک جا رہی ہے" جیسے جواب دے کر انہیں اپنی طرف سے مطمئن کر دیا تھا۔

"تم ادھر کیوں نہیں گئے عذرا بھابھی کی طرف، میں نے تمہیں کتنی تاکید کی تھی؟" امی نے البتہ اسے دو تین مرتبہ یاد دلایا تھا۔

"کیا ضرورت ہے امی! میں جہاں ہوں، بہت خوش ہوں۔ کوئی تنگی ہوتی تو ضرور جاتا۔" اس نے لاپروائی سے کہا اور قلعی اڑی دیواروں کو دیکھا جو اس کمرے کے چاروں طرف کھڑی تھیں جس میں وہ اتنے دنوں سے رہ رہا تھا۔ اس کمرے کا فرش بھی جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا اور صفائی نہ ہونے کی وجہ سے میلا بھی لگتا تھا۔ لکڑی کی ایک ڈیسک نما میز، ایک بغیر گدی کی کرسی اور ایک نواڑی چارپائی جس کی نواڑ کئی جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھی، اس کمرے کا کل سامان تھی۔ اس ٹوٹی ہوئی اور یکساں ہموار پائے نہ ہونے کے باعث ہلتی جلتی چارپائی پر اس کا صاف ستھرا بستر بلنگ کے لحاف سمیت رکھا تھا۔ یہ بستر امی نے یہاں آتے ہوئے اپنی جستی پیٹی میں سلیقے سے جمے بستروں کی تہہ سے نکالا

تھا اور دو دن دھوپ میں رکھ کر اسے حرارت اور ہوا پہنچا کر فنائل کی بو کا اثر کم کرنے کی کوشش میں مصروف رہی تھیں۔

"یہ لحاف اور یہ گدا میں نے اس سال گرمیوں میں بنوائے تھے۔" وہ کسی کی طرف سے سوال کیے جانے کے بغیر ہی ہر ایک کو بتائے جاتیں۔

"لحاف کا کپڑا میں نے روبی کے ہاتھ منگوایا تھا کوئٹہ سے اور اس کا استر میں نے خود خریدا تھا کلیم کلاتھ والوں سے۔ پچھلے سال ابا جان جو روئی بہاول پور سے لائے تھے' وہی دھنکوا کر بھری ہے۔ ڈورے میں نے خود ڈالے ہیں۔"

وہ مزید وضاحت کرتیں اور ہولڈال کھول کر کپڑے سے جھاڑتیں۔

داؤد صحن میں رکھی کرسی پر نیم دراز' سستی سے بند ہوتی آنکھوں کو بمشکل کھولتا اور امی کی کارروائیاں دیکھتے ہوئے ان کی باتیں سنتا۔ وہ اس تذکرے سے کبھی کبھی چڑ بھی جاتا تھا۔ لیکن اس اجنبی شہر کی نامانوس فضا میں دن بھر کی خواری کے بعد تھکے ہوئے جسم کے ساتھ جب وہ بستر پر دراز ہوتا اور اس لحاف کو سر تک اوڑھتا تو اسے ایک ایسی مانوس نرمی اور حرارت کا احساس ہوتا کہ وہ کچھ دیر کے لیے باہر کی دنیا کی تمام مشکلات بھول جاتا۔ اس سرد ترین اور کہر آلود شہر کے ناموافق موسم میں اگرچہ یہ اکیلا لحاف ٹھنڈ کی شدت سے بچانے کے لیے کافی نہیں تھا' مگر وہ اونی سویٹر' جیکٹ' موزوں اور ٹوپی سمیت جب اس لحاف میں گھستا تو آپ ہی آپ اس کے سردی سے بجتے دانت آہستہ آہستہ بند ہونے لگتے اور اکڑے ہوئے منجمد ہاتھ سیدھے ہو کر حرکت میں آنے کے قابل محسوس ہونے لگتے۔ اسے اس لحاف کے استر سے امی کی مہک اٹھتی محسوس ہوتی۔ لحاف میں ڈورے امی نے اپنے ہاتھوں سے ڈالے تھے۔ اسے امی کی گفتگو یاد آتی تو گھر سے اور گھر والوں سے دوری کا احساس شدت پکڑ جاتا اور آنکھیں بھیگنے لگتیں۔

"واہ جناب عالی! ابھی سے گھبرا گئے اور "امی کے پاس جانا ہے" کی پکار ڈالنے لگے۔ آپ تو اپنے تمام روزی اور روزگار کا ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے کا دعوا کر کے گھر سے نکلے تھے۔ اتنی جلدی آپ کا جنون ہوا ہو گیا۔ کہاں گئے ہمت مرداں' جفاکشی اور محنت کے ہتھیار جو شوق' لگن اور جدوجہد کے دستوں میں جڑے تھے۔ آپ کے ہتھیار غالباً" کچی مٹی یا کاغذ سے بنے ہوئے کھلونے تھے' جو کسی وار کے بغیر ہی ٹوٹ گئے۔"

وہ خود کو ڈانٹتے ہوئے بے چینی سے کروٹ بدلتا۔ چارپائی کے پائے کروٹ بدلنے پر ڈول جاتے۔ اس کے نواڑ میں سے کسی انسان کے انگڑائی لینے کی سی آوازیں اٹھتیں۔

"یاد ہے! یہ تو امی اور مریم باجی نے بھی کہا تھا کہ پردیس کی زیادہ کمائی سے دیس کی کم کمائی زیادہ بہتر ہے۔ کم از کم گھر کا آرام اور تین وقت کا کھانا تو ڈھنگ سے مل جاتا ہے مگر نہیں آپ پر تو کچھ کر دکھانے کا بھوت سوار تھا۔ کر لیجیے بتیس ہزار ماہوار کی نوکری۔ بتیس ہزار جن میں سے آدھے سے زیادہ تو یہاں رہنے کے خرچے پر اٹھ جایا کریں گے اور باقی جو آپ گھر بھجوائیں گے' اتنے اپنے علاقے میں رہ کر چھوٹی موٹی نوکری کر کے بھی کما سکتے تھے۔"

وہ ایک ہفتے کے اندر نجانے کتنی بار یہ تجزیہ کر چکا تھا' مگر واپسی ایک ایسا فیصلہ تھا جو شاید اس کی ضدی طبیعت اور چیلنج قبول کر لینے والا مزاج کبھی کسی صورت بھی نہ کرنے دیتا۔

"جو ہو گا' دیکھا جائے گا۔" لحاف کا سرا ذرا سا کھسکنے پر کمرے کی یخ فضا محسوس کرنے کے بعد وہ کروٹ بدلتے ہوئے سوچتا اور چارپائی کے بجنے اور ٹوٹی نواڑ کی دہائیوں میں اپنے دانت کٹکٹانے کی آواز بھی شامل کر دیتا۔

"موسم بھی بدلے گا۔ سدا اتنی سردی تو نہیں رہے گی۔" وہ خود کو تسلی دیتا۔ "بہتر رہائش بھی تلاش کر لوں گا۔" لحاف کے اندر چھائے اندھیرے میں امید کی کرن اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیتی۔

"اور کھانا؟" سوچوں میں مگن جاگتے رہنے پر اس کا خالی معدہ دہائی دینے لگتا اور اسے یاد آتا کہ وہ چنے اور چاول جو اس نے شام پانچ بجے دفتر سے واپسی پر بطور ڈنر کھائے تھے' وہ کبھی کے ہضم ہو چکے۔ "ذرا قدم جم لیں سنا ہے اس شہر میں ایک سے ایک ہوٹل موجود ہے۔" وہ تسلی کی ایک اور لوری نظریں گاڑتا اور پھر لحاف کے اندر کی حرارت اس کے ٹھٹھرتے جسم کو اپنی آغوش میں مکمل طور پر جکڑ لیتی اور اس کی آنکھیں بند ہونے لگتیں۔ نیند کی دیوی وہ واحد فراخ دل خاتون تھی جو ایسے میں بھی اس پر بالآخر مہربان ہونے لگتی ایک اور رات ختم ہونے لگتی۔

☼ ☼ ☼
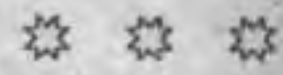
"یار! یہ کس قسم کا کمرا تم نے مجھے لے کر دیا ہے؟" کمرے کے درمیان کھڑا وہ نادر سے شکوہ کر رہا تھا۔

"اس کے روشن دان دیکھو چار شیشے تھے اس روشن دان میں۔ اب صرف ایک ہی بچا ہے۔ باقی جگہ گتے لگا کر اور کپڑے کے گولے پھنسا کر کور کی گئی ہے۔ اب بتاؤ بھلا ان گتوں اور کپڑوں میں سے روشنی کا گزر کیسے ہو گا۔ جب ہی تو دن میں بھی اندھیرا ہی رہتا ہے۔"

"ایک ہی گتا ہے بھائی جان!" نادر نے اس کی بات کی سنجیدگی کو کم کرنے کی کوشش کی "ایک خالی جگہ پر تو چڑیوں نے ایسا خوب صورت گھونسلہ بنا رکھا ہے کہ نہ کسی گتے کی ضرورت باقی رہی ہے نہ کپڑے کی۔ ہاں البتہ کپڑے کے گولے والا خانہ کچھ بچ نہیں رہا۔" اس نے ہونٹ سکیڑتے ہوئے سر ہلایا۔

"میں گھر سے نیا کپڑا لا کر سلیقے سے گولا بنا کر ٹھونس دیتا ہوں خالی جگہ کے سائز کے حساب سے' پھر برا نہیں لگے گا۔" اس نے جیسے کوئی ترکیب سوجھ جانے پر چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔

"نادر بی سیریس یار۔" وہ اکتا کر بولا۔ "اتنا یخ کمرا ہے یہ۔ برفیلی ہوائیں اس کمرے کے در و دیوار میں موجود سینکڑوں درزوں سے اندر آتی ہیں۔ رات بھر کمرے میں چوہے ناچتے پھرتے ہیں اور یہ چڑیوں کا خوب صورت گھونسلہ۔" اس نے روشن دان کی طرف اشارہ کیا۔ "اس میں بھی رات بھر چڑیوں کو نیند نہیں آتی۔ مسلسل چوں چوں کرتی رہتی ہیں۔"

"انسومنیا کا شکار ہوں گی یہ چڑیاں۔ داستان امیر حمزہ سناتی ہوں گی ایک دوسرے کو۔" نادر نے ایک مرتبہ پھر اس کی بات کا غیر سنجیدہ جواب دیا۔

"او خدا کے بندے! یہ فرش دیکھو' اکھڑا اور ٹوٹا ہوا اور یہ اتنا غلیظ باتھ روم ہے' جس کی نہ کوئی ٹونٹی ٹھیک ہے نہ پائپ۔ تیزاب کی نجانے کتنی بوتلیں لگا چکا ہوں میں اس کی صفائی پر' مگر اس کو استعمال کرنے سے پہلے دس مرتبہ سوچتا ہوں اور پھر دل کڑا کر کے جب استعمال کرنے داخل ہو ہی جاتا ہوں یا تو کسی بھی ٹونٹی میں پانی نہیں آ رہا ہوتا یا اتنا آ رہا ہوتا کہ بندہ پورے باتھ روم کو بطور باتھ ٹب استعمال کر لے۔ اتنا پانی جمع ہو جاتا ہے اس میں۔"

"یہ تو اچھی بات ہوئی نا بھائی جان! باتھ ٹب میں نہانے کا جو مزا ہے' بالٹی کے پانی میں کہاں۔"

"ہاں اتنے یخ پانی سے بھرے باتھ ٹب میں نہانے لگا تو تمہیں میری اکڑی ہوئی لاش ہی ملے گی کسی دن یہاں۔" داؤد کو اپنی بے بسی پر غصہ آنے لگا۔

"او بھائی جان! اتنے کم پیسوں میں تو ایسا ہی کمرا ملے گا نا!" نادر کو شاید اب اس کی حالت پر ترس آ گیا تھا۔ "اسی شہر میں اچھے فرنشڈ کمرے بھی ہیں لیکن آپ جانیں ان کا کرایہ بھی تو پھر اتنا ہی ہو گا نا!"

"خیر فرنشڈ کمروں والا کرایہ تو میں افورڈ نہیں کر سکتا۔ تم مجھے اس سے کچھ زیادہ پیسوں میں نسبتاً" بہتر کمرا دلا دو یار! اس جگہ کچھ دن میں مزید رہا تو میرا دماغ مفلوج ہو جائے گا۔" اس نے سر ہلا کر کہا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔

"ٹھیک ہے' میں دیکھتا ہوں۔" نادر نے اپنا ٹول باکس بند کرتے ہوئے کہا۔ وہ الیکٹریشن تھا اور کمرے

کی بجلی خراب ہونے پر تاریں چیک کرنے آیا تھا۔

"کمیشن میں چلی کباب کھاؤں گا بھائی جان! یاد رکھیے گا۔ اگر آپ کی مرضی کا کمرا مل گیا تو۔" نادر کمرے سے باہر نکلتے ہوئے بلند آواز میں بولا۔

"ٹھیک ہے۔" داؤد نے سر ہلایا "اور اگر نہ ملا تو جہان بھر کی ٹوٹی چپلیں تم پر برساؤں گا۔ یاد رکھنا!"

اگلا جملہ اس نے نادر کے پیچھے کمرے سے باہر نکل کر اس کے کان کے پاس منہ لاتے ہوئے اتنی ہی بلند آواز میں بولا تھا، جتنی بلند آواز میں نادر چلی کباب کھلانے کی بات کر کے گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

دو سال پہلے تک داؤد کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایک روز وہ رزق اور نوکری کے لیے کسی اجنبی شہر کے اجنبی راستوں پر جوتے چٹخاتا خود پر جبر کی آخری حد کو پہنچنے والا تھا۔ اس نے سول انجینئرنگ میں اپنے شوق اور میرٹ پر داخلہ لیا تھا۔

ابا کے انتقال کے بعد فاروق بھائی ابا کی دکان چلا رہے تھے۔ دکان کی آمدنی اچھی خاصی تھی اور مکان بھی اپنا تھا۔ امی نے روبی باجی اور فائزہ آپا کی شادی ابا کے بعد فاروق بھائی کے ذریعے دکان سے آنے والی آمدنی سے ہی کی تھی۔ داؤد کا داخلہ اور پڑھائی بھی اسی آمدنی کے کرم سے چل رہی تھی۔ راوی اچھا خاصا چین لکھ رہا تھا، لیکن پھر امی کو فاروق بھائی کی شادی کی فکر ستانے لگی۔ سعدیہ بھابھی بڑی پھپھو کی اکلوتی بیٹی تھیں اور ان کی شادی کے دس سال بعد بڑی منتوں مرادوں سے پیدا ہونے والی اولاد تھیں۔ پھپھو نے جب مرحوم بھائی کے گھر کے کفیل فاروق بھائی پر نظر کی تو شاید ان کو آنے والے سالوں کے لیے منصوبے بنانے میں زیادہ مہینے نہیں لگے۔ ادھر پھپھو اور سعدیہ بھابھی نے فاروق بھائی کو الو کا گوشت کھلانا شروع کیا، ادھر وہ امی کے سر ہو گئے۔ امی اور دونوں بہنوں کی رائے اگرچہ پھپھو اور ان کے گھرانے کے بارے میں

بہت اچھی نہ تھی لیکن اتنی بری بھی نہیں تھی بھتی کر فاروق بھائی کی شادی کے بعد ہو گئی۔

شادی کے بعد دو سال کے اندر اندر پھوپھا اعجاز حیدر نے فاروق بھائی کو ساتھ ملا کر ریل بازار والی دکان نام منتقل کرالی۔ پٹواری، تحصیل دار، ناظم، ایم پی اے سب ہی سے پھوپھا کی صاحب سلامت تھی، ملی بھگت اتنی کامیاب رہی کہ جب دکان کے اوپری حصے کو جس میں دکان ہی کا گودام بنایا گیا تھا، ڈھا کر فاروق بھائی کے لیے الگ گھر کی تعمیر شروع ہوئی اور ملنے ملانے والوں نے گھر آ کر امی کو اس گھر کی دیواریں کھڑی ہونے کی مبارک باد دی تو امی کے کان اور آنکھیں دونوں اکٹھے ہی کھلے۔

امی کی طبیعت مسکینی، عاجزی اور قہر و جلال کا انتہائی متوازن مجموعہ تھی اور امی نے سارا قصہ سننے کے بعد فاروق بھائی پر اپنے مزاج کے چاروں ہی رنگ آزمائے مگر الو کا گوشت اتنا پُر تاثیر تھا کہ فاروق بھائی کی آنکھیں بلندی کا سفر طے کرتے کرتے ماتھے پر جا چڑھیں۔

"اتنی سی عمر سے محنت کرتا آیا ہوں۔" وہ ہاتھ کے اشارے سے بتاتے ہوئے بحث کا آغاز کرتے۔ "یتیمی، ناتجربہ کاری، پڑھائی چھوٹ جانے کا غم، کسی چیز کی پروا نہیں کی اور بڑا بن کر خود سے بڑی بہنوں اور چھوٹے بھائی کے سر پر ہاتھ رکھا، دن رات کی محنت سے وقت سے پہلے سر میں چاندی کے بال جھلملانے لگے مگر شکایت کا لفظ زبان پر نہیں لایا۔ سوچا چلو ایک میری قربانی سے باقیوں کی زندگیاں بہتر گزرتی ہیں تو اور کیا چاہیے۔ کون سی بات آپ سے چھپی ہے امی! کس کس کا ذکر یاد دلاؤں۔" وہ الفاظ کا ذخیرہ ختم ہونے پر امی سے سوال کرتے۔

"ہاں تو فرض تھا تمہارا۔" امی کی طبیعت سے جلال کا رنگ ابھرتا اور الفاظ کی گل پاشی کرنے لگتا۔ "کون سی پڑھائی چھوٹی تھی تمہاری؟ اپنے ابا کی وفات کے سال تک تم میٹرک کا امتحان تین بار دینے کے باوجود

کلیئر نہیں کر سکے تھے۔ شیخ مسکین کے لڑکے منور کے ساتھ منر گشت کرنے میں مصروف رہتے تھے سارا دن۔ اس مالک کو ہماری سفید پوشی کا بھرم رکھنا منظور تھا سو تم دکان پر بیٹھنے لگے۔"

امی سانس لینے کو توقف کرتے ہوئے فاروق بھائی کی طرف دیکھتیں جو ان کی بات سن کر یوں سر جھٹک رہے ہوتے جیسے امی کی دلیل پر ہنس رہے ہوں۔

"بہنوں کے سر پر ہاتھ رکھنا تمہارا فرض تھا۔ دکان اور دکان کی آمدنی میں کیا ان یتیم بچیوں کا حق نہیں تھا۔ وہ اپنا حق وصول کر کے گئی ہیں۔ تمہارا احسان نہیں تھا۔ ان کے باپ کی محنت پر ہی تم اپنی عزت بنانے بیٹھے تھے اور جہاں تک چھوٹے بھائی کا تعلق ہے تو اسے اپنے ساتھ دکان پر بیٹھنے ہی کب دیتے تھے۔ جب میں اسے کہتی کہ کالج سے واپس آ کر بھائی کے ساتھ دکان پر بیٹھا کرو تو تم ہی شیرینی میں گھلی آواز میں منع کرتے۔ "نہیں امی! اسے یکسوئی سے پڑھنے دیں۔ خوامخواہ اس کا ذہن بھٹکے گا۔ اس کو جس چیز کی ضرورت ہے۔ مجھے بتائیں، میں حاضر ہوں نا پوری کرنے کے لیے۔" بتاؤ! کیا کہتا نہیں تھا ایسے؟"

فاروق بھائی رخ موڑ کر کسی اور طرف دیکھنے لگتے۔

"رہی بات بالوں میں چاندی جھلملانے کی تو کس نے کہا تھا آٹھویں جماعت ہی میں سستے جیل کی شیشیاں لا کر بالوں کو کھڑا کرنے کی کوشش کیا کرو۔ کتنا منع کرتی تھی۔ بال جھڑنے اور سفید ہونے کی بیماری تو لگنی ہی تھی۔"

امی کی حقائق پر مبنی جھاڑ کا فاروق بھائی کے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا تھا۔

"ہاں تو بس سب ہو گیا اور بہت ہو گیا، بہنیں بیاہی گئیں اور یہ۔" وہ طنز اور حقارت سے داؤد کی طرف اشارہ کرتے "خیر سے تقریباً" انجینئر بن گیا، میرے فرض پورے ہو گئے، اب مجھے اپنے بیوی بچوں کے لیے کچھ کرنے دیں۔"

"ہاں تو کرو، کس نے منع کیا ہے۔" امی قہر کی پٹڑی سے تحمل کی پٹڑی پر اتر تیں۔

"وہی تو کرنے لگا ہوں۔ جب ہی تو اوپر سے لے کر نیچے تک سب نے عدالت لگا رکھی ہے۔" وہ ابرو چڑھاتے ہوئے کہتے۔

"کوئی عدالت نہیں لگی۔" امی عاجزی کی پٹڑی پر رکے جاتیں "یہ گھر حاضر ہے، اس میں دل چاہے تو ہمارے ساتھ مل کر پکاؤ، چاہو تو اپنا ہانڈی چولہا الگ کر لو مگر یہاں سے کہیں اور جانے کی بات کیوں کرتے ہو۔"

"بات ہی نہیں کر رہا صرف، بلکہ جا بھی رہا ہوں۔" وہ اکڑ کر امی کی عاجزی پر چڑھائی کرتے۔

"اچھا!" امی عاجزی کی بگل کھینچ کر اتارتیں۔ "ضرور جاؤ مگر پہلے ذرا دکان کی چابیاں میرے حوالے کر دو۔"

"وہ کیوں کروں؟" فاروق بھائی بے اختیار کرتے کی

جیب پر ہاتھ رکھتے خواہ اس میں چابیاں ہوتیں یا نہ ہوتیں۔

"میں نے دی تھیں نا تمہیں، مجھے واپس کرو۔ میں خود اس کا فیصلہ کروں گی۔" امی انگلی سے اشارہ کرتیں کہ چابیاں فوری طور پر ان کے حوالے کی جائیں۔

"فیصلہ تو ہو چکا۔" فاروق بھائی چہرے پر مکارانہ مسکراہٹ سجا لیتے "دکان میری، گھر داؤد کا۔"

"کیا مطلب؟" امی چمک کر کہتیں "کس نے تمہیں اکیلے بٹوارہ کرنے کا اختیار دیا ہے۔"

"میں بڑا ہوں نا!" وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھتے "ہر معاملے میں مجھے بڑا بڑا کہہ کر کام نکلوائے گئے کہ نہیں تو جب میں ہی بڑا ہوں تو فیصلہ بھی مجھے ہی کرنا ہے نا!"

"بے انصافی پر مبنی تقسیم کا اختیار نہ تمہارے پاس ہے، نہ میرے پاس اور یاد رہے کہ یہ دونوں چیزیں تمہارے باپ کی وراثت ہیں اور ان کی وارث میں دونوں بیٹیاں بھی ہیں۔"

"آپ اور دونوں بیٹیاں بھی اسی مکان سے حصہ لے لیں۔ دکان تو مجھ اکیلے کے نام ہو چکی۔" وہ امی کی بات سنی ان سنی کر کے اٹھ جاتے۔

"دکان کیسے تجھ اکیلے کے نام ہوئی، کس نے کی، کیوں کی؟"

امی کے سوالوں کے جواب پٹواری تحصیل دار، ناظم، پرانی اور نئی فائلوں کے کاغذوں کے درمیان کہیں بکھرے پڑے تھے مگر بدلتے حالات کی سختی کے آگے ہمت نے اتنی جلدی جواب دیا کہ سر اٹھا کر سوال کرنے کا ارادہ ترک کرنا پڑا۔

فاروق بھائی کی ماتھے پر چڑھی آنکھوں پر لالچ اور بے گانگی کی چربی بھی چڑھ گئی اور وہ اپنے نئے گھر میں شفٹ ہونے کے بعد یوں لاتعلق ہوئے جیسے کسی کو پیچھے چھوڑ کر آئے تھے نہ ہی کسی کو پہچانتے تھے، چند ہی دنوں میں لوگ ان کا یہ تعلق بھول کر انہیں ریل بازار والے فاروق سیٹھ کے نام سے یاد کرنے لگے تھے۔

اور امی داؤد کے ساتھ اس سات مرلے کے پرانے گھر میں بدلتے وقت کا اور حالات کا ماتم کرنے کو اکیلی رہ گئی تھیں۔

"میں نے کتنا منع کیا تھا امی! بڑی پھپھو کے گھر رشتہ نہ کریں پچھتائیں گی، لیکن آپ پر بیٹے کی محبت کی محبت کا بھوت سوار تھا۔" ایک بہن کہتی۔

"جادوگرنیاں ہیں دونوں ماں بیٹی! یاد نہیں ابا کی زندگی میں کیسے پھپھو ان کا سایہ بن کر رہتی تھیں، مجال ہے جو گھر میں آپ کی کچھ چلنے دیں۔" دوسرے اظہار خیال کرتے۔

"شکر کریں داؤد کی انجینئرنگ مکمل ہو گئی ورنہ نجانے کیا حال ہوتا۔" پہلی کو خیال آتا۔

"چھ ماہ کے اندر ہی ان کی تمام بچتیں اور کمیٹیاں اپنے اختتام کو پہنچ چکی تھیں۔

وہ امی، بہنوں اور بھائی سے کبھی بھی بہت زیادہ بے تکلف نہیں رہا تھا۔ کبھی کبھی اسے ایسا لگتا ابا کی وفات نے اس کی زندگی اور شخصیت پر بہت گہرا اثر ڈالا تھا۔ وہ اس وقت کالج کا طالب علم تھا گو وہ ابا سے بھی خاص بے تکلف نہیں تھا مگر ان کے ہونے سے اسے جو احساس تحفظ حاصل تھا، وہ ان کے بعد کوئی اور نہیں دے سکا تھا۔ فاروق بھائی کفالت کرنے کے زعم میں مبتلا ہو کر اپنا قد اتنا اوپر نکال گئے کہ سر اٹھا کر انہیں دیکھنے کی کوشش میں اس کی گردن تھکنے لگتی۔ اسی لیے اس نے خود کو اپنی ہی ذات کے حصار میں مقید کر لیا۔

امی کا خیال تھا وہ ہمیشہ سے ہی کم گو تھا۔ اس کی اور بڑی بہنوں اور بھائی کی عمروں میں خاصا تفاوت بھی تھا اس لیے وہ ان سے بے تکلف نہیں تھا۔

کبھی کبھی اس کا دل چاہتا وہ امی کو بتائے کہ ایسا نہیں ہے۔ وہ ان سب سے کھل کر ڈھیر ساری باتیں کرنا چاہتا تھا مگر اسے سب اپنی اپنی دنیا میں مگن نظر آتے تھے جہاں اس کی دخل اندازی کی گنجائش نہیں تھی اس لیے وہ ان کے دروازوں پر دستک دیے بغیر ہی لوٹ آتا تھا مگر اس کی زندگی امی کو ایسا کچھ بتائے بغیر اپنے کم گو تاثر کے ساتھ ہی ٹھیک گزر رہی تھی، اس لیے اس نے انہیں کبھی بتانے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔

"داؤد! تم کوشش کرو، تمہیں نوکری جلدی مل جائے۔" اب یوں ہونے لگا کہ سب ہی ایک، بھی دوسری بہن اسے مشورہ دینا نہ بھولتی۔

مگر نوکریاں منڈی میں کھلے عام بکنے والا مال نہیں تھیں کہ جیب سے پیسہ دے کر خرید لی جاتیں، اگر وہ ایسی جنس تھیں بھی تو اس کی جیب میں ان کو خریدنے کے لیے پیسہ نہیں تھا۔

"تمہارے بھائی جان کہتے ہیں اگر نہیں مل رہی اپنے شعبے میں نوکری تو فی الحال داؤد یہیں کوئی چھوٹا موٹا کام کر لے۔" دوسری بہن مشورہ دیتی اور وہ سر ہلا دیتا۔

وہ اپنی اس کم گوئی کی وجہ سے اکثر ان کو یہ بھی بتا نہیں پاتا تھا کہ وہ نوکری کی کوشش کر رہا تھا اور فی الحال اس نے ایک ٹیوشن اکیڈمی بھی جانا شروع کر دیا تھا۔ وہ شام کو وہاں حساب اور فزکس پڑھاتا تھا۔

وہاں سے اتنی رقم ضرور مل جاتی تھی کہ امی کا ہاتھ تنگی سے بچ جاتا۔ مگر کاغذ کا وہ ٹکڑا جسے ڈگری کہتے تھے، ہر دم اس کی آنکھوں کے سامنے ناچتا تھا۔

اس نے بہت محنت کے بعد کاغذ کا وہ ٹکڑا حاصل کیا تھا اور جو کام وہ کر رہا تھا وہ تو اس کے بغیر بھی کیا جا سکتا تھا۔ اس نے پہلے سے زیادہ شدت سے اپنے شعبے میں نوکری حاصل کرنے کی کوشش کرنا شروع کر دی۔

ایک غیر ملکی تعمیراتی کمپنی کی طرف سے اسے انٹرویو کے لیے لاہور بلایا گیا اور غیر متوقع طور پر تجربے اور سفارش کے نہ ہونے کے باوجود اس کا انتخاب بھی ہو گیا۔ اس کمپنی کو اس شمالی علاقے میں سڑکوں کی تعمیر کا ٹھیکہ ملا تھا۔ اس کا اس کمپنی کے ساتھ دو سال کا معاہدہ ہوا جو کارکردگی کی بنیاد پر توسیع بھی پا سکتا تھا۔ گھر میں کسی کو بھی یہ نوکری پسند آئی تھی نہ اجنبی علاقے میں جا کر رہنے کا خیال۔

"امی! یہ بنیادی تنخواہ ہے۔ اس میں الاؤنسز شامل کر لیں تو بہت زیادہ بن جاتی ہے۔ اوپر سے کام بھی میری پسند کا ہے، مجھے جانے دیں، اسی میں بہتری ہے۔ یہاں اکیڈمی میں پڑھا پڑھا کر میرا ذہن زنگ آلود ہو کر جائے گا۔" وہ یہ نوکری کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا اور اسے امی کو ہر حال میں منانا تھا۔

"اجنبی علاقہ ہے۔ اوپر سے کمپنی اپنے ذمہ رہائش اور کھانے کا انتظام بھی نہیں لے رہی۔ تمہیں تو گھر سے باہر کی مشکلات کا اندازہ ہی نہیں۔ تم کیسے رہو گے وہاں؟"

"امی مشکلات میں پڑ کر ہی میں اپنی فیلڈ میں تجربہ حاصل کرنے کے بعد آگے بڑھ پاؤں گا۔ میرے پاؤں ٹیوشنز کے کلے سے باندھ کر میری ڈگری کے پرزے پرزے مت کریں پلیز۔" اس نے سخت لہجے میں کہا۔

"جانے دیں امی!" ایک بہن پھر مداخلت کو آئی "جتنا اسے ہم سب نے لاڈلا رکھا ہوا ہے نا، اسے پتا ہی نہیں کہ ایک پورا دن گزارنے کے لیے انسان کو کتنا تردد کرنا پڑتا ہے اور یہ تو خیر سے دو سال وہاں گزارنے جا رہا ہے، جانے دیں۔ چند ہی دنوں میں آٹے دال کا بھاؤ پتا چل جائے گا۔"

بہن کے الفاظ اس کے لیے وہ چیلنج بن گئے جسے ہر حال، ہر قیمت پر پورا کرنے کی خاطر اب وہ اس اجنبی علاقے کے نامانوس ماحول میں اس ناقابل برداشت کمرے میں صرف ایک بستر اور رضائی کے دل خوش کن تصور کے ساتھ گزارہ کر رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

نادر نے حسب وعدہ تین دن کے اندر اس کے لیے ایک کمرہ ڈھونڈ لیا تھا اس روز دفتر سے واپسی پر نادر اسے کمرا دکھانے لے گیا۔ یہ اس شہر کا ایک نسبتاً کھلا علاقہ تھا۔ اس محلے میں جہاں نادر اسے لے کر گیا تھا قدیم اور جدید گھروں کا امتزاج تھا۔ کچھ گھر قدیم طرز تعمیر پر بنے تھے اونچے گھر اور کم چوڑے ماتھے والے گھر جبکہ کچھ گھر نئے بنے تھے لیکن اس شہر کے لوگ خاصا کاروباری ذہن رکھتے تھے۔ کم رقبے پر ایسے

گھر بناتے جن کا ایک حصہ اپنی رہائش کے لیے اور باقی کا گھر مختلف پورشنز میں تقسیم کر کے کرائے پر چڑھانے کا رواج تھا۔ اس شہر میں بہت سے کالج اور بورڈنگ اسکول اور یونیورسٹیاں تھیں۔ کہنے کو یہ چھوٹا سا شہر تھا مگر روزگار کی خاطر قریبی چھوٹے بڑے دیہاتوں اور قصبوں سے اس شہر میں نقل مکانی کا رجحان بھی لوگوں میں پایا جاتا تھا' جب ہی اکثر گھر طلبا اور روزگار کی خاطر آئے ہوئے لوگوں کو کرائے پر دینے کے نظریہ سے بنائے جاتے تھے۔

داؤد نے دلچسپی سے ان گھروں اور گلیوں کو دیکھا۔ جہاں وہ اب تک رہ رہا تھا' یہ علاقہ اس سے بدرجہا بہتر لگ رہا تھا۔

"بس بھائی جان! اچھی طرح کمرا دیکھ لیں۔" ایک پرانی طرز کے بنے گھر کی ڈیوڑھی سے سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر بنے ایک کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔ "اس سے بہتر کمرا آپ کو مناسب کرائے میں نہیں ملے گا اور یہ اس لیے مل گیا کہ سیزن آف ہے۔" نادر نے جتایا۔

"ہوں!" داؤد کمر پر ہاتھ رکھے کمرے کا جائزہ لینے لگا کمرے کی دو دیواروں میں روشن دان بھی تھے اور کھڑکیاں بھی' اور ان کے شیشے بھی پورے تھے۔ کمرا کشادہ تھا اور اس میں لکڑی کا ایک سنگل بیڈ بھی تھا۔ دیوار گیر الماری بھی تھی اور ایک رائٹنگ ٹیبل اور کرسی بھی موجود تھی۔ اس کے خدشات کے برعکس باتھ روم صاف اور قدرے کشادہ تھا۔

"ہاں جی پھر پسند آیا کہ نہیں؟" وہ باتھ روم کا جائزہ لینے کے بعد مڑا تو نادر نے جواب کے لیے منتظر نظروں سے اسے دیکھا۔

"ہاں ٹھیک ہے۔" داؤد نے سرہلایا۔ "لیکن یہ بتاؤ ادھر نیچے کون رہتا ہے۔"

"آپ خوش قسمت ہیں بھائی جان!" نادر نے ہنس کر کہا "نیچے کا حصہ ایک ڈاکٹر صاحب نے مطب کے لیے لے رکھا ہے اور مطب کا دروازہ دوسری طرف کھلتا ہے۔ ڈیوڑھی سے اوپر آنے کا راستہ بالکل الگ ہے۔ مطب والے حصے کا دروازہ اندر سے بند رہتا ہے آپ کو کوئی ٹینشن نہیں ہوگی اوپر آنے جانے کی۔"

"چلو پھر تو جان چھوٹی ورنہ میں تو مالک مکان یا کسی اور کرائے دار کے ساتھ کے تصور سے ڈر رہا تھا۔ مجھے کسی کے ساتھ کچھ شیئر کرنے کی عادت نہیں۔ گھر' کمرا' باتھ روم وغیرہ۔" اس نے کہا۔

"عادت ڈال لیں بھائی جان!" نادر زور سے ہنسا "شادی ہو جائے گی تو بھابی کو کیا کسی اور گھر میں رکھیں گے اور خود کسی اور گھر میں رہیں گے۔"

"شادی ہوگی تو دیکھیں گے۔" وہ بھی اس جہنم سے جان چھوٹ جانے پر کئی دنوں کے بعد کھل کر ہنسا تھا۔ "تم مالک مکان سے فائنل کرلو' میں سامان لے کر آتا ہوں' پھر تمہاری چپل کے ساتھ تواضع کروں گا۔" وہ مسکرایا اور نادر کے آنکھیں دکھانے پر اس نے اسے آنکھ ماردی۔

کمرے سے باہر چھوٹا سا کھلا حصہ بھی تھا' جہاں سورج نکلنے کی صورت میں دھوپ آنے کا امکان ہو سکتا تھا۔

"یار نادر! سردیوں میں کبھی ادھر دھوپ بھی نکلتی ہے۔" اسے چھت کا کھلا حصہ دیکھ کر خیال آیا۔

"نکلتی ہے بھائی جان! مگر اس میں شدت بڑی ہوتی ہے' جلدی جھلسا دیتی ہے۔" نادر نے چھت کی مغربی منڈیر سے نیچے جھانکتے ہوئے کہا۔

"اونچائی کا علاقہ ہے نا' سورج اور چاند دونوں سے فاصلہ میدانی علاقوں کی نسبت کم ہے۔" پھر اس نے مڑ کر داؤد کی طرف دیکھا۔

"اور ہاں گیس کا کنکشن بھی ہے کمرے میں۔ میری مانیں کوئی چھوٹا موٹا گیس ہیٹر خرید لیں یا ایک گیس اسٹوو خرید لیں' کھانا بھی گرم کر سکیں گے اور آگ بھی تاپ سکیں گے۔" سیڑھیاں اترتے ہوئے نادر نے کہا۔

"مالک مکان کی بیوی نے صبح صفائی کروادی تھی کمرے اور باتھ روم کی' لہٰذا فی الحال صفائی کا تو کوئی جھنجھٹ ہی نہیں ہے۔ بس سامان لا کر رکھ لیتے ہیں۔

ہاں گیس اور بجلی کا بل ڈاکٹر صاحب سے شیئر کرنا ہوگا۔ شکر کریں مطب چلاتے ہیں بس اور مطب کے لیے صرف ایک دو روشنیوں کی ضرورت پڑتی ہوگی انہیں یا پھر پانی کی موٹر چلاتے ہوں گے اوپر ایک واٹر ٹینک موجود ہے اور گیس کا گیزر نیچے لگا ہے۔"

نادر مسلسل بول رہا تھا اور وہ سیڑھیاں اتر کر گلی کے نکڑ تک پہنچ چکے تھے۔ اس گلی میں سبزی کی ایک دکان بھی تھی اور اکادکا اور دکانیں بھی' داؤد نے ان پر غور نہیں کیا۔ اس کا ذہن سامان اٹھا کر یہاں لانے کے بعد اس اذیت ناک کمرے سے ہمیشہ کے لیے نجات میں گم تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ ہفتے کے دن اس نئے کمرے میں منتقل ہوا تھا۔ نادر نے کمرے کو ترتیب دینے میں اس کی پوری مدد کی تھی۔ وہ اپنے گھر سے کاٹن کے پرانے پردے اٹھا لایا تھا جنہیں اس نے نائلون کی رسی میں پرو کر کھڑکیوں کے دونوں سروں پر کیل ٹھونک کر ان میں ٹانگ دیا تھا۔ داؤد کے کپڑے جو اب تک بیگ میں ٹھنسے تھے انہیں نکال کر اس نے دیوار گیر الماری کے خانوں میں سلیقے سے رکھا تھا۔ کپڑے رکھنے سے پہلے گھر سے لائے پرانے اخبار الماری کے خانوں میں بچھانا وہ نہیں بھولا تھا۔ کرسی پر رکھنے کو کورچڑھی گدی بھی وہ اپنے گھر سے اٹھا لایا تھا۔

"یار! تم تو بڑے سلیقے والے ہو۔" داؤد نے باقی کاموں سے فارغ ہو کر نادر کو اس کی کتابیں میز پر ترتیب سے لگاتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

"آپ کیا یاد کریں گے بھائی جان!" اس نے کتابیں رکھنے کے بعد ہاتھ جھاڑے "آپ نادر کے دیس آئے اور پریشان رہے۔ نادر نے یہ کیسے گوارا کیا۔ یہ نادر ہی کا دل جانتا ہے۔ قسم سے اگر آپ کم سے کم کرائے کی تاکید نہ کرتے تو پہلے دن ہی اس کمرے میں ہوتے۔" اس نے جذباتی انداز میں کہا۔

نادر کی کوششوں سے کمرا بہت بہتر لگ رہا تھا۔

سامان اٹھا کر ادھر آتے ہوئے وہ بازار سے گیس کا ایک چھوٹا چولہا اور ربڑ کا پائپ بھی لیتے آئے تھے۔ نادر نے گیس کے پوائنٹ کے ساتھ پائپ جوڑ کر چولہا چالو کر دیا تھا۔ مالک مکان سے بات کرنے کے بعد نادر گیزر بھی چلا آیا تھا۔ رات تک باتھ روم کا پانی گرم ہو جانے کا امکان تھا۔

"نادر یار! بہت مہربانی تمہاری۔" ذہنی سکون نے جسم کو بھی ایک عجیب سا سکون دیا تھا۔ "ٹھیک کہتی تھیں بہنیں۔ انہوں نے واقعی بہت لاڈ سے رکھا ہوا تھا۔" اسے واقعی کبھی پتا نہیں چلا تھا کہ صرف ایک پورا دن گزارنے کے لیے کتنا تردد کرنا پڑتا تھا۔ نادر کو اس سے کوئی غرض وابستہ نہیں تھی۔ وہ کنسٹرکشن مٹیریل سپروائزر کے پاس کام کرتا تھا اور داؤد سے اس کی ملاقات اتفاقاً" سائٹ سروے کے دوران ہوئی تھی۔ نادر نے ہی اسے پہلا کمرا دلوایا تھا اور وہی اب اپنی سماجی و اخلاقی امداد کے لیے حاضر مزاج کی وجہ سے اسے یہاں پہنچانے کا ذمہ دار تھا۔

☼ ☼ ☼

اگلا دن اتوار کا تھا۔ چھٹی کا دن' جس کے لیے ہفتے بھر انتظار رہتا تھا کیونکہ اتوار کو جب تک دل چاہے سو رہنے کی عیاشی کی جاسکتی تھی' مگر پچھلا دن مصروف گزرنے اور نئے کمرے میں کوئی مسئلہ نہ ہونے کے سبب وہ رات بھر گہری نیند سویا رہا تھا اسی لیے صبح وقت پر آنکھ کھل گئی۔ گھنٹہ بھر یوں ہی بستر میں پڑے رہنے کے بعد وہ اٹھا اور باتھ روم میں گھس گیا۔ پانی گرم اور صاف تھا۔ کئی دنوں بعد اس نے سکون سے شیو اور غسل کیا۔

"یا اللہ! تیری کتنی ایسی نعمتیں ہیں جو آسانی سے میسر ہوں تو انہیں برتتے ہمیں تیرا شکر ادا کرنے کا خیال تک نہیں آتا۔" غسل کرتے ہوئے اس نے کئی بار سوچا تھا۔

اس غسل نے کئی دنوں بعد اسے تازہ دم اور اس کے ذہن کو درپیش مسائل کی کثافتوں سے آزاد کر دیا

تھا۔ وہ گنگناتے ہوئے باتھ روم سے نکلا۔ کمرے کے سرد ماحول کو حرارت بخشنے کے لیے چولہا جلایا اور دیوار گیر الماری کے ایک پٹ میں جڑے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر بالوں میں کنگھی کرنے لگا۔ اب اسے بھوک لگ رہی تھی۔

"لو ناشتے کے لیے کوئی چیز لا کر رکھنا تو میں بالکل بھول ہی گیا۔" اسے یاد آیا۔ باہر نکل کر کچھ کھانے یا کھانے کے لیے کچھ خریدنے کے ارادے سے سویٹر، جیکٹ، موٹے اونی موزے پہن کر جوگر پہننے کے بعد سر پر اونی ٹوپی رکھتا وہ کمرے سے باہر نکل آیا۔ باہر ابھی تک اندھیرا چھایا تھا اور شدید سردی کا راج تھا۔ سردی کی شدت کو محسوس کر کے اس کا جسم کپکپانے لگا۔ سیڑھیاں اتر کر نیچے آنے پر اسے لگا سارے محلے پر نیند کا غلبہ طاری تھا۔ کہیں سے کسی جاندار کی ہلکی سی آواز بھی نہیں آرہی تھی۔ کل اس نے یہاں صرف ایک سبزی کی دکان ہی دیکھی تھی جو اس وقت بند تھی۔ ہر سانس کے ساتھ منہ سے دھواں اڑاتا وہ جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ٹھونسے آگے بڑھا۔ اسے اپنے علاوہ کوئی دوسرا ذی روح نظر نہیں آیا۔ اسٹریٹ لائٹس کی مدھم روشنی میں کچھ ٹھیک سے نظر بھی نہیں آرہا تھا۔ گلی کے اختتام پر اسے آگے بڑی سڑک نظر آرہی تھی مگر وہ اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ وہ مایوس ہو کر واپس پلٹنے ہی لگا تھا جب گرم تازہ روٹی بننے یا آٹے کے آگ پر پکائے جانے کی سوندھی سوندھی خوشبو اس کے نتھنوں سے ٹکرائی۔ سبزی کی دکان کے سامنے کسی جگہ سے ہی وہ خوشبو آرہی تھی۔ وہ آگے بڑھا، زرد بلب کی مدھم روشنی کے نیچے وہ ایک کھلی دکان تھی جس کے ایک طرف چھوٹے سے بورڈ پر "روز نیٹا بیکرز اسٹیبلشڈ 1971ء" کے الفاظ درج تھے۔ اس دکان کا کوئی داخلی دروازہ نہیں تھا۔ شیشے کے ایک بڑے سے کاؤنٹر میں بیکری کی اشیا سجی تھیں اور ایک طرف گڑے دیسی تنور سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ وہ بے اختیار آگے بڑھا۔ شیشے کے کاؤنٹر کے پیچھے ایک سفید بالوں والا ادھیڑ عمر شخص کھڑا کاؤنٹر پہ ڈسپلے کے لیے چیزوں کی ترتیب درست کرنے میں مصروف تھا۔

"السلام علیکم!" اس نے آگے بڑھ کر اسٹوو پر رکھے پین کو دیکھا جس میں دودھ ابل رہا تھا۔

"وعلیکم السلام!" کاؤنٹر کے اندر جھک کر کام کرتا شخص سیدھا ہوا۔ اس نے موٹے اونی سویٹر پر گیلس پہن رکھے تھے۔ داؤد کو اس کے گیلس دیکھ کر ہنسی آئی مگر اس نے اپنے چہرے کی سنجیدگی کو قائم رکھا۔

"ناشتے کے لیے آپ کے پاس کیا کیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"سب کچھ۔" وہ شخص اسٹوو پر ابلتے دودھ کے قریب گیا اور اپنے پیچھے دیوار میں جڑے شیلف میں رکھے مختلف جاروں میں سے ایک چھوٹا جار اتار لایا۔ اب وہ جار کھول کر اس میں سے چائے کی پتی نکال کر ابلتے دودھ میں ڈال رہا تھا۔

"مثلاً"۔ پتی دودھ میں ڈلتے ہی دودھ میں سے چائے کی مہک اٹھنے لگی۔ اس مہک نے داؤد کو ایک عجیب سی زندگی بخش حرارت کا احساس دیا۔

"مثلاً" بریڈ، رسک، جیم، بٹر، کیک رس، پین کیکس، بن اور تازہ گرم باقرخانی۔" اس شخص نے ناشتے کی اچھی خاصی ورائٹی اسے بتائی۔

"ہوں!" داؤد نے سر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے دلچسپی سے اس چھوٹی سی بیکری کا جائزہ لیا جس کا روز نیٹا بیکری والا بورڈ دھوئیں اور گرد سے میلا ہو رہا تھا۔

"مجھے معلوم نہیں تھا اس چھوٹے سے علاقے میں مجھے بیکری آئٹمز کی اتنی وسیع رینج دستیاب ہو سکے گی۔" اس نے کہا۔

"تم بالکل اجنبی چہرہ ہو۔" اس شخص نے چشمہ درست کرتے ہوئے داؤد کو غور سے دیکھا۔

"جی کل ہی شفٹ ہوا ہوں اس علاقے میں۔"

"ہوں۔" اس شخص نے کہا۔ "تمہارا لب و لہجہ بھی مقامی نہیں ہے، کہاں سے آئے ہو۔"

"اوکاڑہ سے آیا ہوں۔" داؤد نے ایک بار پھر شیشے کے پیچھے ڈسپلے میں رکھی چیزوں کو دیکھا۔

"اوہ! اوکاڑہ تو بہت دور ہے۔" اس شخص نے کہا

اور کاؤنٹر کے ساتھ آنے جانے کے لیے بنا چھوٹے سے دروازے کا پٹ کھولا۔ "اندر آجاؤ، تم تو مہمان ہو۔" اس نے کہا اور خود ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ داؤد اس کا شکریہ ادا کرتا اس چھوٹے سے راستے سے اندر داخل ہو گیا۔ کاؤنٹر کے پیچھے تندور اور اسٹوو سے اٹھتی حرارت تھی۔

"میری تازہ باقرخانی چکھو اور گرم چائے پیو۔" اس شخص نے کاؤنٹر کے پیچھے رکھی دو چیری کرسیوں میں سے ایک داؤد کو پیش کی اور وہ چائے کے دو بڑے مگ اٹھا لایا۔

"یہ خالص ترین دودھ کی چائے ہے۔" اس نے کہا "اور یہ عمدہ اور خستہ ترین باقرخانی ہے، جو شاید تمہیں پورے ملک میں کہیں اور دستیاب نہ ہو، پوچھو کیوں؟"

"کیوں؟" داؤد نے اس کا سوال دہرایا۔

"کیونکہ پاکستان میں کسی دوسرے کے پاس ایسی باقرخانی بنانے کی ترکیب ہی موجود نہیں ہے۔" اس نے کہا اور قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

"واہ پھر تو میں خوش قسمت ہوں جو یہ باقرخانی کھانے یہاں چلا آیا۔" داؤد نے خلاف مزاج پہلی بار کسی اجنبی سے دوستانہ انداز میں بات کی۔

"ابھی تو میں تم کو اپنی دوسری خصوصی چیزیں چکھاؤں تو تم خود کو اور بھی زیادہ خوش قسمت سمجھنے لگو کہ تم کو یہاں آنے کا موقع ملا۔" اس نے کہا اور پہلے سے زیادہ بلند آواز میں قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا۔

"اوہ ڈیڈی! ڈونٹ بی سو لاؤڈ (ابا اتنی بلند آواز میں مت ہنسیں) ابھی سب لوگ سوتا پڑا ہے۔" بیکری والے کے پیچھے دیوار گیر شیلفوں میں بنے لکڑی کے ایک چھوٹے دروازے کے پیچھے سے ایک نسوانی آواز آئی اور ساتھ ہی کسی نے زور سے کوئی چیز پٹخی۔

"اوہ آئی ایم سوری ڈارلنگ!" بیکری والے نے کھلا منہ قابو کر کے بند کرتے ہوئے کہا "لیکن صبح کے نو بجنے والے ہیں، سارے لوگ ابھی تک سوتے پڑے رہیں تو میرا کیا قصور کہ میں کھل کے ہنس بھی نہ سکوں۔" وہ بولا۔

"دوسروں کا نیند حرام کرنے کا تمہیں کوئی حق نہیں ہے اس لیے۔" پیچھے سے آواز آئی اور ساتھ ہی ایک ہاتھ دروازے سے باہر آیا جس میں گندھے آٹے کی پرات تھی۔

"لو یہ ڈو پکڑو اور مزید باقرخانیاں تیار کرنی شروع کردو۔ کسٹمرز کے آنے کا ٹائم ہونے کو ہے۔" تحکمانہ انداز میں کہا گیا۔ داؤد باقرخانی ہاتھ میں پکڑے پوری کھلی آنکھوں سے اس بازو کو دیکھ رہا تھا جس پر سرخ اور سبز ڈبی دار نمونے کے سویٹر کا آستین چڑھا تھا۔ آستین جہاں ختم ہو رہی تھی اس سے آگے بازو کے ذرا سے خالی حصے میں دودھیا شفاف رنگت کی جلد تھی۔

"بٹر کا برتن دینا بھول گئیں تم، پروسس بھی کیا بٹر کہ نہیں؟"

"کیا تم سوچ سکتے ہو کہ میں نے نہیں کیا ہو گا۔" ایک اور برتن پکڑے ہاتھ باہر آیا۔

"نہیں! میں نہیں سوچ سکتا کیونکہ بٹر پروسس کرنا پاکستان کی سب سے ماہر بٹر پروسیسر زینا وقار کی ذمہ داری ہے۔" بیکری والا ایک بار پھر قہقہہ لگا کر ہنسنا چاہتا تھا مگر پھر شاید اسے کچھ دیر پہلے کی وارننگ یاد آگئی سو وہ منہ بند کرتا ہوا مڑ گیا۔

"ارے مسٹر! تمہاری چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے اور باقرخانی بھی۔" اس نے داؤد کو حیرت سے دیکھتے دیکھا تو بولا۔ "اور ٹھنڈی ہو کر تو اس باقرخانی کی ساری خستگی اور مزا ختم ہو جائے گا۔"

"اوہ آئی ایم سوری!" داؤد نے سر ہلایا اور باقرخانی توڑ کر کھانے لگا۔ باقرخانی واقعی عمدہ اور لذیذ تھی۔ اس نے اپنے گھر میں باقرخانی کبھی نہیں کھائی تھی، البتہ اس کا نام ضرور سنا تھا اور کہیں دیکھی بھی تھی، مگر روز نیٹا بیکرز قائم شدہ 1971ء کی وہ باقرخانی کھانا یقیناً "ایک لذیذ تجربہ تھا۔

"میرا خیال نہیں تھا کہ اس شہر کے اس چھوٹے سے علاقے کی ایک اندرونی گلی میں مجھے ایک اچھی

بیکری دستیاب ہو جائے گی۔" چائے پینے کے دوران اس نے محض تعلق بڑھانے کی خاطر بیکری والے کی تعریف کی۔

"میرے بھائی نے یہ بیکری 1971ء میں جب یہاں بنائی تھی' اس وقت یہ شہر کا سب سے آباد اور جدید علاقہ تھا۔ میرا بھائی کئی سال ڈنمارک میں رہ کر آیا تھا۔ اس نے وہیں بیکنگ سیکھی تھی۔ ہمارا باپ دادا بھی یہ ہی کام کرتا تھا جب انگریز یہاں رہتا تھا۔ یہ علاقہ انگریزوں کی چھاؤنی تھی اور افسروں کو بریڈ اینڈ کیک کی سپلائی میرے دادا کی بیکری سے ہوا کرتی تھی۔ جب زمانہ اور وقت آگے بڑھا تو میرے بڑے بھائی نے روایتی بیکنگ اور نان روٹی سے آگے کچھ اور سیکھنے اور کرنے کا سوچا' پھر وہ ہالینڈ چلا گیا اور جب وہاں سے لوٹا تو اس کے پاس بیکنگ کے مختلف کورسز کے سرٹیفکیٹس تھے اور وہاں کی بڑی بیکریز میں کام کرنے کا تجربہ بھی۔ وہ اپنے ساتھ کمرشل اوون بھی لایا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے پاس ہر قسم کے مولڈز تھے اور بے شمار تراکیب۔ ہم نے نئے عزم اور نئے سرے سے کام جمایا۔ اس وقت ہمارا کاروبار خوب چلا' لیکن پھر بھائی کی اچانک وفات' شہر کی توسیع اور بڑے بڑے ناموں والی بیکریوں کی شاخوں کی آمد نے ہمیں دور پھینک دیا۔ ہم پیچھے رہ گئے اور کسٹمر آگے بڑھ گیا۔" بڑے میاں کو بات سنانے کا فن خوب آتا تھا۔

"تم صرف باتیں ہی کرتے رہو گے ڈیڈی! یا پھر کوئی کام بھی کرو گے؟" اندر سے ڈپٹ کر کوئی بولا "ذرا دھیان سے سونگھو' باقرخانی زیادہ آنچ پکڑ رہی ہے' اس کی خبر لو۔ زیادہ سرخ ہو گئی تو سمجھو تین ہزار کا پڑا ہو گیا۔ کل والے ڈھائی ہزار کا پڑا بھی شامل کر لینا اس میں۔ جمع تفریق کر کے جواب نکال لینا کہ تم کتنے بوڑھے ہو چکے ہو۔"

بڑے میاں اندر سے آتی ڈپٹ سن کر تیزی سے تندور کی طرف لپکے اور لوہے کی دو سلاخیں پکڑ کر سرعت سے باقرخانیاں نکال نکال کر تندور پر رکھی بڑی چنگیر میں رکھنے لگے اور داؤد کچھ دیر پہلے سنی پہیلی پر غور کرنے لگا۔ تین ہزار اور ڈھائی ہزار کے نقصان کی جمع تفریق سے بڑے میاں کی عمر کا کیا تعلق ہو سکتا تھا۔ اس نے اٹھتے ہوئے سوچا اور جیب سے والٹ نکال کر بیکری والے سے ناشتے کی قیمت پوچھنے لگا۔

"آج کا ناشتا کامپلیمنٹری ہے۔" بیکری والے نے ایک گرم باقرخانی ہاتھ میں پکڑ کر آنکھوں کے سامنے کرتے ہوئے اسے غور سے دیکھنے کے بعد کہا۔ "تم اس جگہ نئے آئے ہو۔ نیا آیا مہمان ہوتا ہے لہٰذا مہمان کے لیے ناشتا کامپلیمنٹری تھا۔ کل آؤ گے اگر تو قیمت ادا کرنی ہو گی۔"

چاہتے ہوئے بھی داؤد اصرار نہیں کر پایا۔ اس محلے میں ایسی بیکری اور ایسا بیکر موجود ہونا ایسا ہی تھا جیسے وہ کوئی انگلش کنٹری سائیڈ اسٹوری پڑھ رہا ہو' یا پھر ایسی ہی کوئی فلم دیکھ رہا ہو۔ بیکری کی ظاہری حالت' بڑے میاں' جن کا نام سلمان انور تھا کا حلیہ اور اس یخ بستہ صبح میں ملنے والا باقرخانی اور چائے کا وہ ناشتا سب کسی ایسی فلم کا سین لگ رہے تھے جیسے وہ کنٹری سائیڈ کا مسافر تھا اور اسے راستے میں چھوٹی موٹی فارمنگ کے ساتھ ساتھ بیکری آئٹمز تیار کرنے والا کوئی خاندان مل گیا ہو۔ روزیٹا بیکرز سے ناشتا کرنے کے بعد وہ کئی دنوں کے بعد مسرور اور ہلکے دل کے ساتھ دل میں ایک پسندیدہ گانا گنگناتا واپس آیا تھا۔

اس نئی جگہ' نئے محلے اور نئے کمرے سے اس کی پہلی پہلی ملاقات بہت اچھی رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"میں نے آپا سکینہ کو فون پر تمہارے جانے کا بتایا تھا۔ تم جانتے ہو وہ کتنے اچھے دل کی خاتون ہیں۔ کھٹ سے عذرا بھابھی کو فون کر دیا کہ آمنہ کا بیٹا تمہارے شہر میں نوکری کی غرض سے ٹھہرا ہوا ہے۔ عذرا بھابھی کا رات کو مجھے فون آیا تھا' کہہ رہی تھیں آپ بتائیں آپ کا بیٹا کہاں رہ رہا ہے۔ میں خود اس سے رابطہ کر لوں گی۔" امی فون پر اسے بتا رہی تھیں۔

"سچ تو یہ ہے کہ ہم سب ایک دوسرے سے مصروفیتوں کا رونا روتے روتے اتنی دور ہو چکے ہیں کہ برسوں نہ کسی کی خبر لیتے ہیں' نہ دیتے ہیں' بے چاری عذرا بھابھی پر کم عمری میں بیوگی کا عذاب آن پڑا' چھوٹی سی بچی کا ساتھ تھا۔ ہم لوگوں نے بھی کہاں اس کو پوچھا تھا۔ ایسے میں اسے اپنے ماں باپ کے پاس ہی واپس جانا پڑا تھا۔ اب مجھے ہی دیکھو' اس جگہ کا نام سن کر ہی مجھے ان کی یاد آئی ورنہ تو عمر بھر شاید انہیں بھلائے ہی رہتی۔ اب ایسا کرو روبی تمہیں ان کا پتا لکھواتی ہے۔ دھیان سے لکھ لو اور ان سے جا کر ملو۔ کیا پتا تمہارے کتنے کام آئیں۔"

امی لمبی گفتگو کرنے کی عادی تھیں اور وہ انہیں ایک پی سی او سے کال کر رہا تھا۔ یہ ان دنوں کی بات تھی' جب موبائل فون عام نہیں ہوئے تھے اور پی سی او والوں کی چاندی تھی۔ جتنی لمبی کال اتنے زیادہ پیسے۔ داؤد نے بے بسی سے ادھر ادھر دیکھا۔ اس نے صرف گھر کی خیر خیریت پوچھنے کے لیے فون کیا تھا اور امی اسے نجانے کس کس کے قصے سنانے لگ گئی تھیں۔

"میں اب یہاں بالکل سیٹ ہوں امی!" اس نے بات ختم کرنے کے لیے کہا۔ "مجھے کوئی مسئلہ نہیں سو میں کیوں دور دراز کے بھولے بسرے رشتہ داروں سے ملتا پھروں گا۔"

"دور دراز؟" امی نے تیزی سے کہا۔ "دور دراز کے کہاں۔ میری اماں کے سگے چچا کے بیٹے کی بیوی ہیں عذرا بھابھی۔"

"میری اپنی سگی بھابھی نظریں ملانے اور تعلق رکھنے کی روادار نہیں امی! آپ جن بھابھی کا ذکر کر رہی ہیں ان سے آپ کا تعلق واقعی دور دراز کا ہی ہے۔" اس نے کہا۔

"تم ایڈریس لکھو۔ میں روبی کو فون دے رہی ہوں۔ ان سے تم مل لو گے تو مجھے اطمینان رہے گا کہ کوئی ایسا ہے وہاں جو کسی اونچ نیچ میں تمہارے کام آ سکتا ہے۔" امی نے ڈپٹ کر کہا اور فون روبی باجی کو پکڑا دیا۔

"اُفوہ! اب یہ سپلائی پتا نہیں کہاں ہے۔" اس نے فون بند کرنے کے بعد ہاتھ پر لکھا ایڈریس پڑھتے ہوئے کہا۔ "سپلائی" کیسا عجیب سا نام ہے اس علاقے کا۔" اس نے سر جھٹکا۔ اگرچہ اس کا اس ایڈریس پر جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن پھر بھی ہاتھ دھونے سے پہلے اس نے اسے اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"روزیٹا کی پیسٹریز اور کافی کا کپ۔"

روزیٹا بیکرز کے مالک' جن کا نام سلمان انور تھا' نے داؤد کے سامنے رنگا رنگ پیسٹریز اور کافی سے بھرا کپ رکھتے ہوئے کہا۔ "زندگی کا ایک حسین تجربہ ہے۔" داؤد نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا۔ وہ شخص بیانیہ کا ماہر تھا اور زیب داستان کے لیے بات کو بڑھا چڑھا کر سنانے کا عادی بھی۔ اس کی بیکری کی ظاہری حالت اور خود اس کے لباس اور انداز کی خستگی کے باوجود داؤد کو اندازہ ہوتا تھا کہ کسی زمانے میں یقیناً" اس شخص کا اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا رہا ہو گا۔

"یقیناً"۔" داؤد کو کبھی بھی کسی دوسرے شخص کی بلاوجہ تعریف کرنے کی عادت نہیں رہی تھی مگر اس شخص کا دل رکھنے میں نجانے کیوں اسے مزا آتا تھا۔ اس نے ایک پیسٹری میں کانٹا کھبویا اور اس کا ایک ٹکڑا الگ کر کے منہ میں رکھا "واہ مزا آگیا۔" اس نے کہا' پیسٹری واقعی لذیذ تھی۔

"میں بہترین پیوریز' مٹر' ینڈ فروٹس اور ایکسٹرا فلنگز استعمال کرتا ہوں ان پیسٹریوں کو بنانے کے لیے۔" سلمان صاحب نے اپنے لیے کافی کا مگ تیار کرنے کے بعد داؤد کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"جب ہی تو آپ کے آئٹمز میں بہت تازگی اور ٹیسٹ ہوتا ہے۔" داؤد نے کہا۔

"لیکن۔" انہوں نے سر ہلایا۔ "لوگوں کو قدر نہیں' وہ فار گرانٹڈ لیتے ہیں محنت کو بھی اور ایمانداری کو بھی۔ میری خالص چیزوں سے بنی پیسٹری پندرہ روپے میں بھی ان کو مہنگی لگتی ہے جبکہ بڑی بیکریز کے باسی بیکری آئٹمز جن کی شیلف لائف ختم ہو چکی

ہوتی ہے' وہ چالیس روپے میں خرید کر کھانے میں بھی انہیں فخر محسوس ہوتا ہے۔ صرف اس لیے کہ میں مارکیٹ میں نہیں بیٹھا۔ میری بساط بس محلے کی ایک گلی میں بیکری شیلف لگا کر سستی بیکری بیچنے کی ہے اور ......"

"ڈیڈی! کچھ اندازہ ہے' فضلو صبح کا گیا ابھی تک نہیں لوٹا۔" اندر سے آتی کرخت آواز نے سلمان صاحب کی گفتگو کا سلسلہ توڑ دیا۔

"آج اتنے دن بعد دھوپ نکلی ہے۔ چلا گیا ہو گا دور کہیں ٹھیلا دھکیلتا۔" سلمان صاحب نے اپنی بات کاٹے جانے پر آنے والے غصے کو دباتے ہوئے کہا۔

"کب آئے گا آخر واپس وہ۔ یہ نانوں کے لیے آٹا اس کا باپ گوندھے گا کیا؟" اندر سے آواز آئی۔ "میں بتا رہی ہوں میں تو بالکل نہیں گوندھ سکتی' میری انگلی کا زخم پک چکا ہے۔ مجھ سے مٹھی بند نہیں کی جا رہی۔"

"تو کہا نہیں تھا میں نے کہ ڈاکٹر گنجے کے پاس چلی جاؤ۔ جا کر چیرا دلواؤ انگلی کو۔" سلمان صاحب اٹھ کر اندر جانے والے دروازے کے قریب گئے اور اندر کی طرف رخ کر کے کسی سے مخاطب ہوئے۔

"کس وقت جاؤں آخر۔ مجھے فرصت ملتی ہے کبھی؟ دودھ میں سنبھالوں' کریم میں پھینٹوں' مکھن میں نکالوں' چھلنی میں صاف کروں' انڈے میں چنوں' اوونز میں چیک کروں..... میرے پاس مرنے کی فرصت نہیں' تم چیرا دلوانے کی بات کرتے ہو۔" اندر سے آواز آئی۔

"افوہ بھئی! ٹھیک ہے۔" سلمان صاحب بھناتے ہوئے واپس لوٹ آئے۔ "مت کرو کچھ' فضلو آ کر دیکھ لے گا۔"

"تو پھر آج دوپہر نان نہیں لگیں گے۔ لکھ کر لگا دو اپنی بیکری کے ماتھے پر' کوئی قطاریں باندھ کر یہاں کھڑا نہ ہو۔" لہجہ مزید کڑوا ہوا۔

"نان بائی کی دکان پر نان نہیں لگیں گے۔" سلمان صاحب نے بدک کر اندر کی جانب دیکھا "رکو! میں خود آ کر آٹا گوندھتا ہوں۔"

"رہنے دو ڈیڈی! ہرگز یہ کوشش نہ کرنا۔ آٹے سے دوگنا پانی ڈال کر تگنا گھی ملا کر اس کی لئی بنا کر رکھ دو گے' خوامخواہ دو ہزار کا نقصان ہو جائے گا۔" اندر والی کا حساب کتاب غضب کا تھا۔

"نان بائی کے تنور پر نان نہ لگیں' ایسا ناغہ اس تنور پر تاریخ میں کبھی نہیں ہوا۔ نہ ہی میں آئندہ ہونے دوں گا۔" سلمان صاحب مضطرب ہوتے ہوئے اٹھے۔

"بیٹھے رہو ڈیڈی! میں کر رہی ہوں خود ہی ہاتھ پر گلوز چڑھا کر' تم بس خمیر کا پیکٹ دو مجھے ایک۔" اندر سے وہی سفید ہاتھ باہر آیا۔ بازو پر چڑھے اونی سوئیٹر کی آستین سے گیلا آٹا چپٹا تھا۔

سلمان صاحب نے شیلف سے خمیر کا پیکٹ نکال کر اس ہاتھ کو پکڑایا اور واپس داؤد کی طرف مڑے۔

"یہ زینا ہے' زینب وقار۔ میرے بھائی کی بیٹی۔" انہوں نے خجل ہوتے ہوئے کہا۔ "زبان کی کڑوی ہے ذرا لیکن کام کی ماہر ہے' اپنے باپ سے زیادہ ماہر بیکر ہے۔"

"آپ کے بھائی کی بیٹی!" داؤد نے کہا۔ "اور آپ کو ڈیڈی کہتی ہے۔"

"ہاں!" انہوں نے سر ہلایا "اس کا ماں باپ کوئی نہیں' میری اولاد کوئی نہیں' سو ہم نے ایک دوسرے سے چچا بھتیجی کے بجائے' باپ بیٹی کا رشتہ جوڑ لیا ہے۔"

"اور یہ فضلو جو کوئی بھی ہے وہ آپ کا..." داؤد نے بے وجہ قیافہ لگانے کی کوشش کی اور پھر قیافے کو سوال بنا کر ادھورا چھوڑ دیا۔

"وہ ملازم ہے یہاں۔" وہ مسکرائے اور پھر انہوں نے سر ہلایا "ہم ہمیشہ سے اتنے زبوں حال بیکرز نہیں تھے۔ پہلے ادھر ایک نہیں' کئی ملازم ہمارے لیے کام کرتے تھے۔ بھائی کے بعد کچھ مجھے سنبھالنا نہیں آیا اسے' اس لیے کام بھی گھٹتا گیا اور ملازم بھی۔ ایک ایک کر کے سب ہی روزگار کی تلاش میں یہاں سے چلے گئے۔ لیکن اس فضلو کا کوئی آگا پیچھا بھی نہیں تھا اور بوڑھا بھی ہو رہا تھا۔ اس لیے ادھر ہی پڑا رہ گیا۔ اب وہ بیکری آئٹمز ٹھیلے پر لگا کر شہر میں گھومتا ہے اور بیچتا ہے۔ اس کا اور ہمارا اصل گزارہ اسی آمدنی پر ہوتا ہے۔"

"تنور گرم کرنے کا انتظام کرو ڈیڈی! تمہیں تو کسٹمرز سے باتیں کرنے کا مراق ہے' موقع مل جائے بس' ان ہی کے لیے چائے پانی کرنے لگ جایا کرو۔ دمڑی آنے کے بجائے' جو ہے وہ بھی خرچ ہو جائے۔" کرخت آواز نے دروازے کے قریب آ کر کہا۔

"اوہ ہاں!" وہ بوکھلا کر اٹھے اور تنور کے اوپر لگا گیس سپلائی والو نیچے کر کے تنور میں جھک گئے۔

داؤد کی کافی ٹھنڈی ہو چکی تھی اور اب سلمان صاحب کے مصروف ہو جانے کے بعد وہاں بیٹھے رہنے کی بظاہر کوئی وجہ بھی نہیں تھی لیکن وہ کچھ دیر مزید وہاں بیٹھا نجانے کیوں اس دروازے کو گھورتا رہا جس کے پیچھے اس کرخت آواز اور سفید ہاتھ کی مالکن موجود تھی۔ اسے اس کے بارے میں تجسس ہونے لگا۔ ہر ایسی چیز جو ان دیکھی ہو اور اس کی خبر بھی ہو اس کو دیکھنے اور جاننے کا شوق شاید انسانی فطرت کا حصہ ہے۔ اس رات لیٹے لیٹے اس نے سوچا۔

سلمان صاحب اس محلے میں اس کے واحد شناسا تھے۔ ان کی وجہ سے اسے کئی مشکلات سے نجات مل گئی تھی۔ اس کے کپڑے لانڈری والے تک پہنچانے کا ذمہ انہوں نے لے لیا تھا۔ پیسوں کی ادائی پر ان کے ہاں سے صبح شام چائے مل جاتی تھی۔ ناشتا تو ہوتا ہی ان کی بیکری پر تھا۔ رات کے کھانے کے لیے کبھی کبھی دوپہر کو ایک دو نان اس کے لیے بچا کر رکھ لیتے تھے۔ چھوٹا موٹا کوئی اور مسئلہ بھی ہوتا تو سلمان صاحب اس کی مدد کو ہر دم تیار ملتے۔ داؤد کا دل اب اس شہر اور نوکری میں لگنے لگا تھا۔

"اور جو اگر میں پہلے والا کمرا چھوڑ کر ادھر نہ آتا اور اس محلے میں معجزاتی طور پر مجھے روز ٹا بیکری نہ ملتی تو شاید میں اپنا چیلنج جیب میں رکھ کر دوسرے ہفتے ہی واپس لوکاڑہ چلا گیا ہوتا۔" اس نے سوچا اور کروٹ بدل کر سو گیا۔

☆ ☆ ☆

اس روز اتوار تھا' چھٹی کا دن تھا اور دھوپ کھل کر نکلی تھی۔ سورج کی شکل دیکھے کئی دن ہو چکے تھے۔ اس کا دل چھت پر بکھری دھوپ کو دیکھ کر باغ باغ ہو گیا۔ اپنا بستر اور لحاف چھت کی منڈیروں پر دھوپ لگوانے کے لیے ڈالنے کے بعد اس نے ملک پیک سے اپنے لیے خود چائے بنائی اور دو سلائس اور ابلا ہوا انڈا لے کر باہر چھت پر آ گیا۔ اس روز اس نے غور سے پہلی بار اس چھت کے گرد و نواح پر نظر ڈالی تھی۔ اس چھت سے چند تنگ سی سیڑھیاں اوپر جا رہی تھیں جن کے اختتام پر لکڑی کا ایک چھوٹا سا دروازہ تھا۔

وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آیا اور دروازے سے اس کی کنڈی کھول کر اس کے پار دیکھا۔ اس کے سامنے ایک چھوٹی سی چھت تھی جو اس کمرے کی چھت تھی جس میں وہ رہتا تھا۔ یہاں دھوپ اور بھی زیادہ تیز تھی' وہ سیڑھیاں اتر کر واپس آیا اور ایک چھوٹی تپائی اور کرسی اوپر پہنچا کر اپنا ناشتا بھی وہیں لے آیا۔ سردی کی دھوپ میں فرصت سے بیٹھ کر اونگھنا اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر اس نے برتن نیچے فرش پر رکھے اور خود ایک پرانا اخبار سر پر رکھ کر تپائی پر پیر ٹکائے بیٹھ گیا۔ چھت کی صفائی شاید برسوں سے نہیں ہوئی تھی۔ چھت کے ایک کونے میں پانی کا ٹینک نصب تھا جس سے یقیناً پانی رستا ہو گا جب ہی اس کے ارد گرد تازہ سبز کائی سی جمی تھی جبکہ باقی کی چھت کی کائی پرانی ہو کر سیاہ پڑ چکی تھی۔ اس چھت کے ارد گرد آس پڑوس کے گھروں کی اونچی نیچی چھتیں تھیں اور دھوپ نکلنے کی وجہ سے گہما گہمی سی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے ایک مانوس سے ماحول کو محسوس کرتے ہوئے انگڑائی لی اور آنکھیں موند لیں۔

"تمہارے ہاتھ تو ہمیشہ سے ٹوٹے ہوئے ہیں' کون سا ایسا دن ہے جب تمہارے ہاتھ سے کوئی برتن گر کر نہ ٹوٹا ہو۔ برتن توڑنے کا عالمی ریکارڈ قائم کر چکے ہو

تم۔" ایک تیز، کرخت اور مانوس آواز نے اسے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا۔ یہ آواز کہاں سے آ رہی تھی۔ اس نے چاروں طرف نظریں گھما کر دیکھا۔

"لو یہ بھی توڑ لو۔" ٹھک کی آواز کے ساتھ کوئی بولا "یہ بھی توڑو، یہ بھی، یہ بھی" ٹھک ٹھکا ٹھک.... چیزوں کی اٹھا پٹخ واضح سنائی دے رہی تھی۔ آواز کی سمت کا تعین کرتے ہوئے وہ بے اختیار ہی اٹھ کر تیزی سے ادھر گیا۔ اس چھت کے ساتھ دائیں جانب نیچے کسی گھر کا ایک کھلا صحن تھا اور صحن کے کونے میں بیٹھی ایک لڑکی گتے کے مختلف سائز کے ڈبے اٹھا اٹھا کر اپنے سامنے بیٹھے شخص کی طرف پھینکے چلی جا رہی تھی۔

"یہ بھی توڑ دو.... یہ بھی، سب کچھ ایک ہی دفعہ کیوں نہیں توڑ دیتے تم۔" وہ چلا رہی تھی اور وہ بوڑھا شخص جس کی جانب یہ ڈبے اچھل رہے تھے خود کو ان سے بچاتا دانت نکال رہا تھا۔

"تم تو اللہ کرے کسی بس کے نیچے آ جاؤ کسی دن۔ کوئی ڈاکو اغوا کر کے لے جائے تمہیں۔ بازار جاتے ہوئے راستے میں گندے نالے میں گر جاؤ کبھی۔" وہ بولے چلی جا رہی تھی۔

"بس والے مجھ سے بچ کر چلتے ہیں یہ میں بتا دوں تمہیں۔ انہیں پتا ہے بابا مار دیا تو لوگ نہیں بخشیں گے۔ اور ڈاکوؤں کو کیا فائدہ ہو گا مجھے اغوا کر کے، الٹا میں تو انہیں گلے پڑ جاؤں گا۔ رہ گیا گندا نالہ تو میں تو کبھی گندے نالے کے ساتھ چلتا ہی نہیں۔ دوسری طرف چلتا ہوں چاہے آ رہا ہوں یا جا رہا ہوں۔"

"اچھا تو پھر کسی دن چار کارتوس خرید لینا واپس آتے ہوئے اور وہ جو بندوق رکھی ہے نا اندر پچھلی نسلوں کی نشانی، اس میں بھر کر میرے سینے پر فائر کر دینا، میری تو خلاصی ہو تم لوگوں سے۔" وہ بازو اونچے کر کے کوسنے کے سے انداز میں بولی اور پھر ہاتھ اپنے سر پر رکھ دیے۔

"کارتوسوں پر پیسے ہی ضائع ہوں گے، بندوق کو اندر باہر زنگ لگا ہوا ہے، اس کی زنجیر بھی ٹوٹی ہوئی ہے۔" بوڑھا اور زور سے ہنسا "اور ٹریگر بھی درمیان سے ٹوٹا ہوا ہے۔"

"ہائے کم بخت! تم ویسے ہی کیوں نہیں مر جاتے۔ تمہارا ہارٹ کیوں نہیں فیل ہو جاتا۔" اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا اور گتے کا ایک چھوٹا ٹکڑا ملنے پر بوڑھے کی طرف اچھالا۔

"میں نے اپنے ٹائم پر ہی مرنا ہے تم جتنا مرضی کوس لو۔" بوڑھا ہنسا اور اٹھ کر ایک بڑے سے پتیلے میں جس کا نچلا حصہ کالا سیاہ ہو رہا تھا، صحن کے دوسری طرف رکھے حمام سے پانی بھرنے لگا۔

"چلو اٹھو۔ اب میدہ چھانو، خمیر بھگوئے کتنی دیر ہو چکی، کام کی فکر کرو کام کی۔" وہ لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"ہائے میری قسمت!" لڑکی نے دونوں ہاتھوں سے سر پیٹا اور قریب رکھے کالے ہملٹن بوٹ پکڑ کر پاؤں اس میں ڈالنے لگی۔ بوٹ پہننے کے بعد وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ اس نے سرخ بند کیوں والا گرم اسکرٹ پہن رکھا تھا اس پر سرخ موٹا اپرن جس پر جگہ جگہ آٹا لگا تھا۔

"نان بائی کی بیٹی!" داؤد نے زیر لب کہا "ارے یہ تو وہی ہے، ہو بہو وہی۔" وہ بلاوجہ پرجوش ہوا اور ارد گرد سر گھما کر اس گھر کی سمت کا اندازہ کرنے لگا۔

"ایگزیکٹلی۔" کچھ دیر سوچنے کے بعد اسے خیال آیا "روزیٹا بیکرز محلے کے جس حصے میں واقع ہے۔ اس کا عقبی حصہ ایگزیکٹلی یہی ہونا چاہیے، اس گھر کے جس حصے میں، میں رہتا ہوں۔" اسے اپنی جمع تفریق کے درست ہونے پر خوشی ہوئی۔ "مجھے اس بات کا کبھی خیال ہی نہیں آیا۔" وہ مسکرایا "آج بھی نہ آتا جو اس چھوٹی چھت کا سراغ نہ ملتا۔"

اسے ایک عجیب سی مسرت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ آواز جسے وہ اتنے دنوں سے دروازے کے بارے سن رہا تھا اور اس کی مالکن کے بارے میں پرتجسس تھا، اتنی قریب اور اتنی بلند تھی کہ کان لگائے بغیر بھی سنی جا سکتی تھی۔ اس نے دلچسپی سے اس لڑکی کو دیکھا جو صحن میں ادھر ادھر پھرتی مختلف چیزیں اکٹھی کر رہی تھی۔

داؤد کو لگا وہ اپنے نقش و نگار اور رنگت میں ایک پاکستانی لڑکی بالکل بھی نہیں لگ رہی تھی۔ اس کے سنہری بال سورج کی روشنی میں سونے کی طرح چمک رہے تھے۔

ایک آدھ بار کوئی بات کرتے ہوئے اس نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا تو داؤد نے نوٹ کیا اس کی رنگت سفید اور چہرے کا کوئی کوئی حصہ خصوصاً" رخسار اور ٹھوڑی پر سرخ نشان تھے جیسے خون جمنے پر پڑ جاتے ہیں۔ اس سرخ سفید رنگت کے ہوتے ہوئے بھی اس میں بالکل جاذبیت نہیں تھی۔ اس کی آنکھیں نیلی تھیں اور ہاتھ پاؤں میں بھی نزاکت نہیں تھی۔ وہ منڈیر کی آڑ میں کھڑا نان بائی کی بیٹی کو بکتے جھکتے ادھر ادھر کام کرتے صحن میں پھرتے دیکھتا رہا۔ اس گھر کا صحن کھلا تھا۔ جس کے ایک کونے میں جستی حمام رکھا تھا جس کے گول ڈھکن کے ایک طرف کیے گئے سوراخ کے عین اوپر پانی کی ٹونٹی نصب تھی۔ اسی ٹونٹی سے حمام میں پانی بھرا جاتا ہو گا، اس نے سوچا۔ حمام کے ساتھ دیوار میں اوپر نیچے کئی خانے تھے جن میں کاٹھ کباڑ ٹھسا تھا جسے دیکھنے پر محسوس ہوتا تھا کہ اس کاٹھ کباڑ کو وہاں ٹھنسے بھی سالہا سال گزر چکے تھے۔ اس پر گرد کی واضح تہہ دور ہی سے دیکھی جا سکتی تھی۔ اس کاٹھ کباڑ میں سے باہر کو نکلے آگ جلانے کی لکڑیوں کے سرے، اخبار کے رول، لوہے کی کچھ چیزوں کے باہر لٹکتے کنارے بھی دور سے ہی دکھائی دیتے تھے۔

صحن میں دو بڑے چولہے بھی نصب تھے۔ جن پر دھرے بڑے بڑے دیگچوں میں کوئی سیال چیز ابل رہی تھی۔ نان بائی کی بیٹی وقفے وقفے سے لوہے کے لمبے سرے والی ڈوئی سے اس ابلتی چیز کو ہلاتی پھر وہ چیچ قریب رکھے چھوٹے برتن پر جما کر ادھر ادھر کام کرتی نظر آ رہی تھی۔ ہاتھ گیلے ہو جانے پر، کسی چیز کو صاف کرنے، کوٹنے، جھٹکنے کے دوران وہ اپنے ہاتھ بار بار اسکرٹ سے رگڑ رگڑ کر صاف کرتی۔ جب ہی ایک مخصوص جگہ سے اس کا اسکرٹ انتہائی میلا لگ رہا تھا۔ داؤد کے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے پیتل کی بڑی بڑی پراتوں میں ڈھیروں میدہ گوندھا۔ بڑے بڑے دیگچوں سے شیرہ نما چیز بڑے ٹب میں انڈیلی اور اکیلی وہ ٹب اٹھا کر اندر ایک کمرے میں لے گئی۔

کمرے سے باہر نکلتے ہوئے اس کے ہاتھوں میں لکڑی کے بڑے بڑے دو کریٹ تھے، جو اس کے چہرے کے تاثرات سے ہی وزنی لگ رہے تھے۔ ان کریٹوں کو گھر کے بیرونی دروازے کے قریب رکھنے کے بعد وہ حمام کے قریب رکھے ڈھیروں برتنوں کو دھونے میں مصروف ہوئی۔ برتنوں، کاٹھ کباڑ، چولہوں، کریٹوں سے بھرے اس صحن میں دو عدد ٹرکی، ایک مور، چند مرغیاں اور چار بطخیں بھی آزادانہ ادھر ادھر گھوم رہی تھیں۔ داؤد نے دیکھا بطخیں اور مرغیاں دوبار گندھے ہوئے آٹے کی ان ڈھکی پراتوں پر اپنے پنجے جماتے گزر گئیں۔ مور نے تین دفعہ اپنے پر نیم دائرے کی شکل میں پھیلا کر انہیں جھاڑا اور ٹرکی تمام صحن میں پڑی ادھر ادھر بکھری چیزوں اور برتنوں کو ٹھونگیں مارتے پھر رہے تھے۔

ان مناظر کو دیکھتے ہوئے کئی بار داؤد کو ابکائی سی آنے لگی۔ "دنیا کے بہترین بیکرز میں سے ایک صاف ستھری روزیٹا بیکری قائم شدہ 1971ء کے آئٹمز کی پس پردہ تیاری کے منظر دیکھ کر اس کے پیٹ میں درد سا اٹھنے لگا۔ کرخت آواز اور کڑوے لہجے والی نان بائی کی بیٹی ہر کام کرنے کے دوران کئی مرتبہ سر کھجاتی اور پھر بغیر دھوئے انہی ہاتھوں اور ناخنوں سے دوبارہ کام میں مشغول ہو جاتی۔

"دروازوں اور پردوں کے پیچھے چھپے چند مناظر چھپے ہوئے ہی رہنے چاہئیں۔ ان کے کھل کر سامنے آ جانے پر ان سے منسلک ساری فینٹسی بھیانک خوابوں میں بدل جاتی ہیں۔" اس نے سوچا اور بے مزا ہوتا ہوا واپس اپنی کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔

"لاحول ولا! میں اتنے دنوں سے اس بیکری کے چین کیکس، باقر خانی پیسٹریز اور نان کھاتا رہا۔" اس نے بار بار اپنا سر جھٹکا۔ "لیکن ڈسپلے تو بہت اچھا ہے صاف ستھرا، کم از کم ان بیکرز سے تو اچھا ہے جہاں باسی کیک اور بدبودار بسکٹ ملتے ہیں۔" پھر اسے خیال

آیا۔ ”بڑی اور نامور بیکریز کے بارے میں کسی کو کیا پتا' ان کے کچنز میں کیا ہوتا ہے' فائیو اسٹارز ہوٹلز تک کے کچنز کا احوال کئی بار ہم پڑھ چکے۔“ اس کا ذہن کبھی روزیٹا بیکری کو فیل کرتا اور کبھی ولائیل سے نمبر دیتا رہا۔ سلمان صاحب کی صورت میں جو کمپنی اسے یہاں میسر آئی تھی۔ اسے وہ چھوڑنا نہیں چاہتا تھا' اس دوستی کی وجہ سے جو سہولتیں ملی تھیں' ان سے جدا بھی ہونا نہیں چاہ رہا تھا۔

”سلمان صاحب سے تعلق رکھنا ضروری ہے' ان کی دکان سے چیزیں خریدنا کوئی مجبوری تو نہیں ہے نا!“ آخر میں اس نے فیصلہ کیا۔ چھٹی کا وہ دن نان بائی سلمان اور اس کی کرخت آواز والی کم شکل پھیکی گوری بیٹی پر ہی غور کرتے رہنے کی نذر ہو گیا۔

☼ ☼ ☼
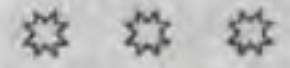
”کیوں بھئی کیا بات ہے۔ اب ناشتا کرنے نہیں آتے؟“ تین چار دن لاشعوری طور پر روزیٹا سے غیر حاضر رہنے پر پانچویں دن اس کے سامنے سے گزرتے ہوئے وہ سلمان صاحب کے ہاتھوں پکڑا گیا۔

”میدہ اب مجھے تنگ کرنے لگا ہے شاید۔“ اس نے بہانہ بنایا ”اس لیے سائٹ پر دوپہر کا کھانا ہی کھالیتا ہوں۔ ناشتا گول کر جاتا ہوں۔“

”تو مجھے بتایا ہوتا' میں تمہارا ناشتا تبدیل کر دیتا۔“ وہ بولے اور اٹھ کر دروازے کے قریب جا کر منہ اندر کرتے ہوئے بولے ”زینا او زینا! صبح کے لیے تھوڑا گندم کا آٹا گوندھ کر رکھ لینا' ساتھ میں رات کا بچا سالن بھی سنبھال لینا۔“

”اس عمر میں پراٹھا کھاؤ گے ڈیڈی؟“ اندر سے کرخت آواز آئی ”شام تک ہسپتال پہنچ جاؤ گے۔“

”اوہو! میں نہیں داؤد کھائے گا اور پراٹھا نہیں چپاتی کھائے گا۔“ سلمان صاحب نے سرہلاتے ہوئے کہا۔

”اچھا تو کیا روزیٹا کو ڈھابہ بنانے کا پلان بنا رہے ہو۔“ دروازے کے قریب سے آواز آئی۔ ”میں بتا رہی ہوں میں کوئی ناشتے' کھانے نہیں بنا رہی تمہارے ڈھابے کے لیے۔ پہلے کیا کم بیل کی طرح جوتے رکھتے ہو جو اب کاروبار بڑھانے کا سوچ رہے ہو۔“

”بات تو سن لو ذرا تھم کے۔“ سلمان صاحب نے کہا۔ ”میں کوئی ڈھابہ والبہ نہیں بنا رہا۔ میں صرف داؤد کے لیے ناشتا بنانے کا کہہ رہا ہوں۔“

”یہ جو کوئی بھی ہے نا داؤد' یہ پاؤں رکھنے کی جگہ پر لیٹنے کی تیاریاں کیوں کرنے لگا ہے اور تمہارا لگتا ہی کیا ہے آخر جو اس کی مفت خوری بڑھتی جا رہی ہے۔“ اندر سے آئے جواب نے داؤد کی خوددار طبیعت پر کاری ضرب لگائی۔

”آپ بیٹھ جائیں پلیز سلمان صاحب! میں کوئی ناشتا واشتا نہیں کر رہا۔ میں لنچ کر لیتا ہوں میرا گزارہ ہو جاتا ہے۔“ اس نے اٹھ کر سلمان صاحب کے قریب جا کر کہا۔

”ہاں۔۔۔ ڈلواؤ ہمارے گھر میں لڑائیاں۔“ اس کی بات پر دروازہ کھلا اور وہ اس کے بیچ ایستادہ ہو گئی۔ ”تم تو میسنے بنے' مسکین بن کر کہہ جاؤ گے' تمہارا گزارہ ہو جاتا ہے ہمارے گھر میں کل تک کتا بلی ہوتی رہے گی۔“

”میں تم سے مخاطب نہیں ہوں' میں سلمان صاحب سے بات کر رہا ہوں۔“ اس کے چہرے کے نقش و نگار اور ان پر سجے بھورے مل عین نظروں کے سامنے آیا کر داؤد گڑبڑا گیا۔

”جو بھی بات کر رہے ہو اور جس سے بھی کر رہے ہو' سنا تو مجھے ہی رہے ہو نا۔“ اس نے نیچے دروازے سے سر نکال کر باہر جھانکا۔ داؤد سلمان صاحب کے بالکل ساتھ کھڑا تھا۔

”تم چھوڑو داؤد! اس کی بک بک کو' اسے عادت ہے۔“ سلمان صاحب داؤد کا بازو پکڑ کر پیچھے کو کھینچتے ہوئے بولے۔

”میں کوئی آٹا واٹا نہیں گوندھ رہی سن لیا تم نے' جو ہم کھاتے ہیں۔ وہ اس کو بھی کھلا دینا۔“ وہ پیچھے سے

دھاڑی۔

”لوسٹ اپ زینا!“ سلمان صاحب نے گھما کر پیچھے ہاتھ مارا جو سیدھا اس کے چہرے پر جا کر لگا۔

”انکل پلیز! یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟“ داؤد نے گھبرا کر سلمان صاحب کا ہاتھ پکڑا۔ چھوٹا دروازہ کھٹ سے بند ہو گیا تھا۔

”تم نہیں جانتے یہ ہے ہی خبیث ماں کی خبیث اولاد!“ سلمان صاحب نے دانت کچکچاتے ہوئے کہا ”ان کا علاج دوسرے طریقے سے ہی کرنا پڑتا ہے۔“ اب وہ غصے سے کانپنے لگے تھے۔

”وہ سلمان صاحب کی بات اور بات کرنے کا انداز دیکھ کر حیرت زدہ تھا۔ سلمان صاحب اس سے مذہب' تاریخ' انگریزی اور اردو ادب' سیاست اور ثقافت پر گفتگو کرتے تھے اور داؤد کو شاید اسی لیے ان کے ساتھ وقت گزارنا پسند تھا۔ وہ اسے اس شہر کی تاریخ سے بھی آگاہ کرتے رہتے تھے جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ماضی میں یہاں کے اچھے' پڑھے لکھے لوگوں میں اٹھتے بیٹھتے رہے تھے لیکن اس روز سلمان صاحب اپنی وضع داری اور رکھ رکھاؤ بھول کر غصے میں یوں بل کھا رہے تھے کہ لگتا تھا ابھی اندر جا کر لڑکی کی شامت لے آئیں گے۔

”میں سچ کہہ رہا ہوں انکل!“ داؤد نے نرمی سے کہا۔ ”جب سے میں نے یہ والا ناشتا کرنا چھوڑا ہے میرا معدہ ٹھیک رہنے لگا ہے۔ آپ پلیز میرے لیے زحمت مت کیجیے گا۔“

”ہاں۔“ وہ پھنکارتے ہوئے سرہلا رہے تھے۔ ”یہ تو میں آج دیکھتا ہوں کہ یہ خبیث کی اولاد اور کتنی بک بک کرے گی۔“

”پلیز انکل! کول ڈاؤن' یہ کوئی ایسا ایشو نہیں ہے جس پر آپ اتنا ناراض ہوں۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ مجھے ناشتا نہیں کرنا۔“

”تم نے ناشتا کرنا ہے یا نہیں' میری بات کی توہین ہوئی ہے نا۔“ انہیں غصے کے مارے کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ ”کوئی توہین نہیں ہوئی۔“ داؤد نے جگ سے پانی گلاس میں انڈیل کر گلاس انہیں پکڑایا ”بس جانے دیں اس بات کو' آپ لوگوں کے پاس پہلے سے ہی اتنا کام ہے کہ مزید کسی کے لیے تکلف کرنے سے پرہیز ہی کیا کریں۔“ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس غصے کو کیسے ختم کرے۔

”پہلے یہ تکلیف کیا کم ہے کہ دنیا کے ماہر ترین بیکرز میں سے ایک یہاں خرچے سے تنگ بیٹھا ہے مگر اپنے معیار پر کمپرومائز نہیں کرتا۔“ سلمان صاحب نے لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”میں اپنی پروڈکٹس میں بہترین فلور استعمال کرتا ہوں۔ بہترین مکھن' بہترین جوسز' بہترین خمیر' مہنگی ترین شوگر' فلیور' چاکلیٹس' میں نے مہنگے سستے کی کبھی پروا نہیں کی۔ میرے پاس بہترین بھٹیاں (اوون) ہیں۔ ہائی جین کا مجھ سے زیادہ خیال کوئی رکھ نہیں سکتا ہو گا' لیکن پھر بھی میں ایک ناکام انسان اس محلے کے ایک کونے میں گمنام کاؤنٹر رکھے سستی ترین چیزیں بیچنے پر مجبور ہوں۔“ انہوں نے کہتے کہتے سر جھکا لیا۔ داؤد کی نظروں کے سامنے ان کے سب ”بہترین“ کا منظر گھوم گیا۔

”اوپر سے یہ خبیث ماں کی خبیث اولاد!“ پھر انہوں نے سر اٹھا کر بلند آواز میں کہا۔ ”یہ مجھے جواب دیتی ہے' یہ کروں گی یہ نہیں کروں گی۔“ انہوں نے اندر کی جانب اشارہ کیا۔ ”میں اس کو دیکھ لوں گا۔ میں اس کو دیکھ لوں گا۔“ انہوں نے جیسے اپنی بات کی توثیق کرتے ہوئے سرہلایا۔

”پلیز انکل! بھول جائیں اس سارے قصے کو اور صرف اتنا یاد رکھیں کہ کچھ بھی ہے۔ آپ کی ہر چیز بہترین ہے اور آپ ایک باکمال بیکر ہیں۔“ داؤد نے انہیں خاموش کرانے کی آخری کوشش کی۔

”ہاں یہ تو ہے۔“ ان کا لہجہ اس بات پر قدرے بہتر ہوا۔ ”اسی لیے تو میں تمہارا قدردان ہوں۔ تمہیں کوالٹی کی پہچان ہے' ورنہ اس محلے کے لوگ ایڈیٹ ہیں سب کے سب۔ انہیں کچھ پتا نہیں کہ معیار کیا چیز ہوتی ہے' اور دنیا کی بہترین بیکریز کیسے چلتی ہیں۔ اپنے

احمق اور گندے سندے بچوں کو پانچ پانچ روپے دے کر بھیج دیتے ہیں۔ جاؤ جا کر نان بائی سے کوئی چیز خرید کر کھالو۔ بھلا بتاؤ! دنیا کے بہترین ڈیری فارمز کے پروڈکٹس سے بنی یہ چیزیں پانچ پانچ روپے میں خریدی جاسکتی ہیں؟" انہوں نے داؤد کی طرف دیکھا۔ "لیکن مجھے بیچنی پڑتی ہیں کیونکہ اگر میں ایک دن نہ بیچوں گا تو باسی ہو جائیں گی۔ ان کی شیلف لائف ختم ہو جائے گی اور معیار پر میں کمپرومائز نہیں کرسکتا۔" وہ کئی بار کی کی باتیں دہراتے چلے جا رہے تھے اور داؤد شرمساری میں کہ کچھ تلخ واقعہ اس کی وجہ سے ہوا تھا، سر جھکائے سنے چلا جا رہا تھا۔

اسی دوران فضلو اپنی موبائل بیکری لے کر واپس آ گیا۔ سلمان صاحب کے عین سامنے آکر اس نے اپنی شیشے سے کور کی ہوئی ہتھ ریڑھی روکی جس کے مختلف خانوں میں کیک کے ٹکڑے، پیسٹریز، کریم رول، بسکٹ اور پنیر کے ٹکڑے سجے تھے۔ فضلو کو وقت سے پہلے واپس آتے دیکھ کر سلمان صاحب نے اسے گھورا۔

"اب تم کیا بری خبر لے کر واپس آگئے ہو؟"

"میں نے صبح ہی کہا تھا میری طبیعت ٹھیک نہیں۔ جسم ٹوٹ رہا ہے۔ مجھ سے نہیں کھینچی جائے گی ریڑھی۔" فضلو نے نڈھال آواز میں کہا اور جیب سے چند چھوٹے نوٹ اور ریزگاری نکال کر کاؤنٹر پر ڈھیر کر دی۔

"سب کام چور، نکمے، ہڈ حرام، روٹیاں توڑنے کے ماہر ہیں۔" سلمان صاحب ایک مرتبہ پھر بھڑکے۔ فضلو اس اشتعال کو خاطر میں لائے بغیر سر جھٹک کر وہاں سے چلا گیا۔

"اب بتاؤ۔ ان چیزوں کو میں کس کے ماتھے پر ماروں گا۔" سلمان صاحب نے داؤد کی طرف دیکھا۔ "سب کوڑے دان میں جائیں گے سب کے سب، کیونکہ میں معیار پر کبھی کمپرومائز نہیں کرتا۔" وہ تاسف سے بولے۔ داؤد نے موقع غنیمت جانا اور وہاں سے کھسک گیا۔ اس نے اس روز دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ راستہ بدل کر نسبتاً طویل راستے سے محلے سے نکلا کرے گا تاکہ روزانہ بیکری کے سامنے سے گزر ہو، نہ سلمان صاحب سے دوبارہ ملاقات ہو۔ یہ بیکری اور سلمان صاحب ایک خوش گوار تجربے سے اچانک ہی ناگواریت میں تبدیل ہونے لگے تھے۔

☼ ☼ ☼

"تم چھٹی لے کر کب گھر آرہے ہو؟" امی نے فون پر اسے کہا تھا۔

"مجھے بھی آپ کی یاد آرہی ہے امی! مگر کام ایسا ہے کہ ایک آدھ چھٹی سے زیادہ مل نہیں سکے گی اور سفر اتنا طویل ہے کہ دو دن تو آنے جانے میں لگ جائیں گے۔ پھر وہاں آپ کے پاس میں ایک دن ہی ٹھہر پاؤں گا۔" اس نے جواب دیا۔

"تم وہاں نہیں گئے نا!" امی نے شکوہ کیا۔

"وقت ہی نہیں ملا امی!" اس نے شرمندہ ہوتے ہوئے کہا۔

ان کا اصرار تھا کہ وہ ان کے کزن کی بیوہ، جو کئی سالوں سے اس شہر میں رہ رہی تھیں، ضرور ملنے جائے۔ اپنی مامتا کے ہاتھوں مجبور تھیں۔ یقیناً" ان کا خیال ہو گا کہ اس اجنبی شہر میں کوئی پرانا شناسا مل جائے تو شاید ان کے بیٹے کے لیے کچھ تو آسانی ہو جائے لیکن نجانے کیوں داؤد کو کسی ایسے گھر میں جانا جہاں کے مکینوں کو اس نے کبھی دیکھا نہیں تھا، جنہیں وہ جانتا بھی نہیں تھا، عجیب سا خیال لگتا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ ہفتے کی شام تھی، جو اس نے حسب معمول نادر کے ساتھ شہر اور شہر کے مضافات میں گھومنے پھرنے میں گزاری تھی۔ یہ شہر خوب صورت تھا اور اس کے مضافات اور بھی خوب صورت تھے۔ یہاں پہاڑ تھے، جھرنے اور آبشاریں تھیں۔ پہاڑوں پر بنے چھوٹے چھوٹے گھر تھے اور بھیڑ بکریاں چراتی پہاڑی خواتین بھی، سردی کا زور قدرے ٹوٹنے پر ہی وہ یہاں کی خوب صورتیوں کو دیکھ پایا تھا۔ دن بھر کی تھکا دینے والی مصروفیت کے بعد ان جگہوں کی سیر نے اس کی طبیعت بشاش کر دی تھی۔

"چلیں بھائی جان! اب چپلی کباب کھانے۔" واپسی پر نادر نے اسے چھیڑا۔

"چپلی کباب بہت کھالیے۔" داؤد بھی ترنگ میں آگیا۔ "آج تو گھر کا کھانا کھانے کو دل چاہ رہا ہے۔"

"ارے بھائی جان! گھر کا کھانا تو مجھے بھی میسر نہیں۔" نادر نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ "حالانکہ میرا تو گھر بھی یہیں ہے۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" وہ حیران ہوا۔

"بس گھر میں، میں ہوں، دو بھائی اور ان کی بیویاں۔ بھابھیوں نے کبھی گھر میں کچھ پکایا نہیں۔ کبھی کسی ہوٹل سے، کبھی ٹھیلے سے کھانا منگوا کر کھالیتی ہیں اللہ اللہ خیر صلا۔ میں بھی روزانہ کھانا باہر ہی سے کھا کر جاتا ہوں۔"

"بڑی عجیب بھابھیاں ہیں بھئی تمہاری۔" داؤد کو مایوسی ہوئی۔ بہت دنوں کے بعد اس کا کسی مکمل گھر کے ماحول میں بیٹھ کر کھانا کھانے کو دل چاہا تھا۔

"کیا کریں، ایسا ہی ہے بھائی جان!" نادر نے شانے اچکائے۔ "ماں باپ تو بچپن ہی میں ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ بھائیوں کے سر پر ہی پلے بڑھے ہیں۔ اب جو حالات ہیں برداشت کرنے پڑتے ہیں۔"

"اچھا پھر ایسا کرو۔" داؤد کو اچانک ایک خیال آیا اور اس نے جیب سے اپنی پاکٹ ڈائری نکالی "مجھے اس پتے پر پہنچا دو" اس نے ڈائری کا ایک صفحہ نادر کی نظروں کے سامنے کیا۔

"مسیائی تو یہاں سے ذرا دور ہے۔" نادر نے کہا۔ "لیکن آج ہمارے پاس موٹر سائیکل ہے، جلدی پہنچ جائیں گے۔" اس نے سر ہلایا۔

"چلو پھر مجھے آج وہاں چھوڑ آؤ، واپس میں خود آجاؤں گا۔" داؤد نے کہا اور نادر کے پیچھے موٹر سائیکل پر بیٹھ گیا۔

☼ ☼ ☼

اس نے اس شہر میں بہت کم بڑے اور کھلے گھر دیکھے تھے۔ کافی پرانا بنا ہوا گھر تھا۔ جس صحن سے گزر کر وہ اندر آیا تھا اس کے فرش پر سنگ سرخ کی مستطیل ٹائلیں اس انداز میں جوڑی گئی تھیں کہ چار، پانچ ٹائلیں مڑ کر ایک خاص فاصلے پر پھول نما نمونہ سا بنا رہی تھیں۔ صحن سے آگے برآمدے کے گول ستون بھی سنگ سرخ سے بنے تھے اور منقش تھے۔ برآمدے سے گزر کر اسے ایک بڑے، کھلے اور ہوادار کمرے میں بٹھایا گیا تھا۔

"کب سے شیر آیا، شیر آیا کی پکار سن رہے تھے، شکر آج شیر کا دیدار کر ہی لیا۔" امی کے کزن کی بیوی جنہوں نے اپنا نام عذرا بتایا تھا، کمرے میں رکھے صوفوں پر سے سفید چادریں اتارتے ہوئے بولیں۔ سفید چادروں کے نیچے سے پرانی طرز کے لکڑی کے لمبے بازوؤں والے اسپرنگ جڑے صوفے نکلے، جن میں سے ایک پر وہ بیٹھ گیا۔

"ارے کون آگیا جس کے آنے کی پکار سن رہے تھے ہم۔" اسی دم کمرے کے دروازے کے بیچوں بیچ ایک بڑی بی آکر کھڑی ہو گئیں۔ بڑی بی نے سفید غرارے کے اوپر کاسنی قمیص پہن رکھی تھی، سر پر جالی کا دوپٹا تھا۔

"ارے اس دور میں بھی اس قسم کی خواتین موجود ہوتی ہیں" داؤد نے بڑی بی کو دیکھتے ہوئے سوچا۔

"ارے اماں! یہ داؤد ہے۔ بتایا تو تھا آپ کو رفعت باجی کا بھانجا، صالحہ آپا کا بیٹا۔" وہ ہنس کر بولیں۔

"ارے ہاں ہاں!" بڑی بی پرجوش انداز میں آگے بڑھیں "بڑا بھاری پائنچا ہے بھئی داؤد میاں تمہارا۔" وہ اس کے قریب آکر پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔

"ہائیں بھاری پائنچا!" داؤد نے ٹھٹک کر اپنی پینٹ کے پائنچے کی طرف دیکھا۔

"اماں ہیں یہ میری!" عذرا نے مسکرا کر کہا۔ "ان کا مطلب ہے مشکل سے ہی آنا ہوا تمہارا یہاں۔" انہیں شاید بڑی بی کے الفاظ پر داؤد کی حیرت کا اندازہ ہو گیا تھا۔

"جی!" داؤد نے کہا۔ "دراصل میں اس شہر سے اتنا

واقف نہیں ہوں نا اس لیے پہلے نہیں آسکا۔۔۔"

"اور اب آگئے ہو تو ہم جانے نہیں دیں گے۔" وہ اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولیں۔

"میں نے تو سنتے ہی کہہ دیا تھا عذرا کو کہ تمہاری سسرال سے لڑکا ادھر آیا ہے۔ اسے یہیں رہنے کے لیے بلا لو' کہاں کرائے کے کمرے اور گھر ڈھونڈتا پھرے گا" بڑی بی نے کہا۔

"میں کیسے بلا لیتی اماں! لڑکے کا کچھ پتا ہی نہیں چلتا تھا کہ کہاں ہے۔" عذرا نے شکایتی نظروں سے داؤد کو دیکھا۔

"شاید ہی کوئی پہلی ملاقات میں اتنا بے تکلف ہوتا ہو۔" داؤد نے سوچا" یہ خواتین یوں پیش آرہی ہیں جیسے نجانے کب سے مجھے جانتی ہوں۔"

عذرا جنہوں نے اسے کہا تھا کہ وہ رشتے میں اس کی ممانی لگتی تھیں اور انہیں آنٹی کے لفظ سے سخت چڑ تھی للٰہذا وہ انہیں عذرا مامی کہہ کر ہی مخاطب کرسکتا تھا اور بڑی بی جو ان کی والدہ تھیں' اسے بتا چکی تھیں کہ وہ جگت اماں تھیں' للٰہذا وہ انہیں کسی اور نام سے بلانے کی زحمت نہ کرے۔ اپنی اپنی عمروں میں وہ خاصی پھرتیلی تھیں۔ جس پھرتی سے دونوں نے اس کے لیے چائے اور اس کے ساتھ کے لوازم تیار کیے تھے۔ اسے دیکھ کر وہ حیران رہ گیا تھا اور اس نے یہ بھی نوٹ کیا تھا کہ چائے کے ساتھ پیش کیے جانے والے سب کے سب لوازمات بھی گھر ہی میں تیار کیے گئے تھے۔

"ہم تو بھئی برس ہا برس سے اسی شہر میں رہ رہے ہیں' ہمیں تو پنجاب کے شہروں کی شکلیں بھی بھول گئیں۔ ہمارے ابا کا گھر کراچی میں تھا' میاں کا تبادلہ ادھر ہوا تو یہیں کے ہو کے رہ گئے۔ میاں کے عزیز پنجاب میں رہتے تھے سو عذرا کا رشتہ ان عزیزوں میں کردیا۔ یوں تین صوبوں سے شناسائی ہوئی مگر مستقل ٹھکانا تو ادھر ہی ہے' مگر اتنے سال یہاں گزارنے کے باوجود یہاں کی زبان نہ سیکھ پائے ہم۔"

بڑی بی نے اپنے پاندان سے چھالیہ نکال کر پھانکتے ہوئے اسے بتایا تھا۔ بڑی بی کا تعلق کراچی سے تھا اور بقول ان کے وہ ایک معروف اردو اسپیکنگ خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔

"میں اردو اسپیکنگ۔ عذرا کا باپ ہزارے والا' عذرا کا میاں پنجابی' للٰہذا ہماری ہما پنجابن۔ میاں! ہم تو سب زبانوں' سب صوبوں کے نمائندے ہیں جو رشتہ داری کی وجہ سے اکٹھے رہ رہے ہیں۔" وہ ہنستے ہوئے بولیں۔

"خاصی دلچسپ صورت حال ہے۔" داؤد محظوظ ہوا۔ "لسانی' علاقائی اور تعصباتی جھگڑے تو خوب ہوتے ہوں گے آپ کے گھر میں۔"

"ایسے ویسے۔" بڑی بی نے اپنے ادھ کھائے دانت دکھاتے ہوئے کہا" ہر کوئی اپنا راگ الاپ رہا ہوتا ہے۔ میں ہمارے تمہارے کرتی رہ جاتی ہوں۔ عذرا ٹھٹھا اے' ڈیڈا اے کہہ رہی ہوتی ہے اور ہماری وہ ہما۔ لانے جانے کرتی۔ رہتی ہے۔"

"واقعی!" اس نے بے یقینی سے بڑی بی کو دیکھا۔

"تو اور کیا' جب ہم تینوں کی لسانی جنگیں ہوتی ہیں اس وقت ایسا ہی ہوتا ہے۔" بڑی بی نے اسے یقین دلاتے ہوئے کہا۔

"ہم دراصل اپنی زندگیوں میں رونق برقرار رکھنے کو ایسی جنگیں چھیڑتے ہیں۔" عذرا مامی نے داؤد کے کپ میں چائے کا قہوہ انڈیلتے ہوئے بتایا۔ "ورنہ اماں کو کراچی دیکھے مدتیں ہو گئیں اور ہما نے بچپن میں کبھی پنجاب دیکھا ہوگا۔"

"تمہاری شکل میں ہما کو ایک ووٹ اور میسر آجائے گا۔" بڑی بی بولیں۔ "ارے میں تو کہتی ہوں بیٹا اپنا بوریا بستر اٹھاؤ اور ادھر ہی آجاؤ' اس گھر میں کئی کمرے خالی پڑے ہیں۔"

"لیکن میں جہاں رہ رہا ہوں وہ بھی بہت اچھی جگہ ہے۔" داؤد کو یہ آفر عجیب سی لگی۔

"اچھی ہی ہوگی' مگر گھر کا سا آرام کہاں۔" بڑی بی بولیں اور پھر عذرا مامی سے مخاطب ہوئیں۔ "میں تو کہتی ہوں کہ کل ہی کالج سے واپسی پر اس کا سامان گاڑی میں رکھ کر ادھر سے اٹھا لاؤ۔ اس سے پتا پوچھ لو اچھی طرح۔"

"ارے نہیں پلیز! اتنی جلدی میرے لیے یہ ممکن نہیں ہے۔" وہ اس آفر سے گڑبڑا گیا "میں تین مہینوں کا ایڈوانس کرایہ دے چکا ہوں۔"

"اچھا اماں دیکھتے ہیں۔ داؤد کو بھی سوچ لینے دیں اپنی سہولت کا۔" عذرا مامی' داؤد کے پس و پیش کو بھانپتے ہوئے بولیں۔

"میں تو اس خیال سے کہہ رہی تھی کہ چلو دوسرا جی ہو گا گھر میں تو کچھ رونق ہو جائے گی۔" بڑی بی مایوس ہوتے ہوئے بولیں۔

"اماں دراصل خاصی مجلسی خاتون ہیں' انہوں نے شروع سے ہی بھرے پرے گھر میں وقت گزارا ہے اسی لیے اب انہیں یوں اکیلے رہنا نہیں بھاتا۔ میں صبح اپنے کالج چلی جاتی ہوں اور ہما اسکول۔ اماں بیچاری سارا دن تنہا رہتی ہیں' اسی لیے تو اگر کوئی بھولا چوکا ادھر آجائے تو ان کا دل چاہتا ہے ادھر ہی رہ جائے۔" عذرا مامی نے بڑی بی کے اصرار کی وجہ بتاتے ہوئے کہا۔

"میں سمجھ سکتا ہوں۔" داؤد نے کہا اور اپنی پلیٹ میں دوسری دفعہ بیسن کا حلوہ نکالنے لگا۔ وہ گھر اور گھر کے جس ماحول سے اداس ہو رہا تھا اور جس کے متعلق سوچ کر اس نے اچانک ادھر چلے آنے کا فیصلہ کیا تھا' وہ اسے حقیقت میں مل رہا تھا اور غیر متوقع طور پر اس کے میزبان بھی پُرخلوص تھے۔ اسے وہ شام بہت اچھی لگی تھی۔ رات آٹھ بجے اس نے دونوں خواتین سے واپسی کی اجازت مانگی۔ اس وقت تک وہ اسے سادہ مگر پُرلطف کھانا بھی کھلا چکی تھیں۔

"واپسی کا راستہ آتا ہے نا؟" اسے دروازے پر چھوڑنے کے لیے آئیں عذرا مامی نے پوچھا۔

"جی اندازہ ہے۔" اس نے کہا اور باہر نکلنے کے لیے دروازہ کھولا۔ اس کے باہر نکلنے سے پہلے ایک لڑکی اندر داخل ہو گئی۔

"ارے! آج تم خاصی لیٹ ہو گئیں۔" عذرا مامی نے اندر آنے والی لڑکی سے پوچھا۔

"وہی سواری کا مسئلہ۔" وہ بولی۔ "ابھی بھی نادیہ کو آنا پڑا مجھے ڈراپ کرنے۔"

"اچھا۔۔۔ اس سے ملو یہ داؤد ہے۔ رفعت باجی کا بھانجا' صالحہ آپا کا بیٹا۔"

"اچھا!" لڑکی نے سر اٹھا کر داؤد کی طرف دیکھا۔ دروازے سے باہر تیز روشنی کا بلب روشن تھا۔ داؤد نے دیکھا۔ وہ ایک دبلی پتلی' سانولی سی لڑکی تھی اور دیکھنے میں کالج کی طالبہ لگ رہی تھی۔

"تو یہ ہیں وہ جن کا چرچا ہم اتنے دن سے سن رہے تھے۔ آپ سنا ہے عمارتیں بناتے اور ڈھاتے ہیں۔"

"ڈھانے کا تو ابھی تک کوئی تجربہ نہیں ہے' البتہ بنانا سیکھ رہا ہوں۔" داؤد نے کہا۔

"اور داؤد! یہ ہما ہے۔" عذرا مامی کو یاد آیا "میری بیٹی ہما' ایک پرائیویٹ اسکول میں پڑھاتی ہے۔ باٹنی میں ماسٹرز کر رکھا ہے اس نے۔ ایوننگ کلاسز لیتی ہے۔"

"اچھا۔" وہ مسکرایا۔ "میں سمجھ رہا تھا یہ میٹرک یا زیادہ سے زیادہ فرسٹ ایر کی اسٹوڈنٹ ہوں گی۔"

"کیوں آپ گلیور (Gulliver) ہیں کیا جو آپ کو میں بونوں کی دنیا کی فرد لگ رہی ہوں۔" لڑکی نے پوچھا۔

"خیر بونوں کی دنیا کی فرد تو میں نے نہیں کہا۔ البتہ مجھے آپ کے بارے میں یہ ہی خیال گزرا کہ شاید آپ اسکول کالج کی اسٹوڈنٹ ہیں۔ ایک تو بار بار یہ سننے کو مل رہا تھا کہ آپ اسکول چلی جاتی ہیں یا آپ اسکول گئی ہوئی ہیں' دوسرا آپ کی عمومی صحت بھی معاف کیجیے گا کچھ ایسی ہی ہے کہ آپ کو پہلی دفعہ دیکھنے پر کوئی مان نہیں سکتا کہ آپ ماسٹرز کر چکی ہیں۔" داؤد نے اس کی چوٹ کے جواب میں چوٹ کی۔ "خیر اب کر چکی ہیں تو اچھی بات ہے۔ فی الحال میں یہ نہیں کہوں گا کہ آپ سے مل کر خوشی ہوئی کیونکہ اتنی مختصر ملاقات میں پتا نہیں چلتا ٹھیک سے کہ خوشی ہوئی کہ نہیں۔۔۔ اگر پھر ملنا ہوا تو ہی بتا سکوں گا۔"

"کوئی بات نہیں۔" وہ سرہلاتے ہوئے بولی "ویسے بھی مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کسی کو مجھ سے

مل کر خوشی ہوئی یا نہیں، جس کو نہیں ہوتی، یہ اس کا مسئلہ ہے میرا نہیں۔"

"خوب!" وہ مسکرایا "چلیں اگر یہ میرا مسئلہ ہے تو میں اس پر سوچوں گا۔" اس نے سر جھکا کر عذرا امامی کو اللہ حافظ کہا۔

☼ ☼ ☼

وہ لڑکی دلچسپ تھی۔ داؤد کو لگا۔ اگر دوبارہ کبھی اس گھر میں جانا ہوا تو اس لڑکی سے خوب گفتگو رہے گی۔

"آپ ٹھیک کہتی تھیں امی! وہ لوگ بہت اچھے اور مخلص ہیں۔ وہاں جا کر میری اداسی قدرے کم ہو گئی۔ عذرا امامی کے ہاتھ میں آپ کے ہاتھ جیسا ذائقہ ہے۔ میں نے بہت دنوں بعد شوق اور رغبت سے کھانا کھایا۔ اب تو آپ خوش ہیں نا۔ میں نے آپ کی بات مان لی اور ان کے ہاں ہو بھی آیا۔ اب آپ کو اس شہر میں میرے اکیلے پن کا احساس تو نہیں ستائے گا نا۔" اس رات اس نے امی کو تفصیلی خط لکھا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس رات وہ گہری نیند سے اچانک ہڑبڑا کر جاگا تھا۔ نجانے کیوں اسے ایسا محسوس ہوا تھا کہ اس کے کمرے کی جس کھڑکی کے آگے اس کا پلنگ بچھا تھا، اس کھڑکی کو کوئی آہستہ آہستہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ اس نے تاریک کمرے میں ادھر ادھر دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے آواز کی سمت کا تعین کیا تھا۔ تقریباً" چار منٹ غور کرتے رہنے کے بعد اسے اندازہ ہوا تھا کہ اس کے سرہانے کی کھڑکی سے دستک نما آواز اٹھ رہی تھی۔ جب سے وہ اس کمرے میں آیا تھا اس نے یہ کھڑکی کھول کر اس کے پار کبھی نہیں دیکھا تھا اب یہ دستک اسے الجھن میں ڈال رہی تھی۔ اس بلندی پر کھڑکی پر دستک کیسے دی جا سکتی تھی جبکہ اس کے خیال میں دوسری طرف کوئی خالی جگہ یا کھلی گلی تھی۔

"کون ہے؟" وہ دستک کو اپنا واہمہ سمجھ رہا تھا اور اس واہمے کو مٹانے کے لیے بلند آواز میں بولا تھا۔

"کھڑکی کھولو۔" ایک نسوانی آواز سنائی دینے پر وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا تھا۔

"کون ہے؟" چند لمحوں کے بعد اس نے دھک دھک کرتے دل کو قابو کرتے ہوئے پوچھا۔

"میں ہوں، پلیز کھڑکی کھولو۔" گھٹی گھٹی سی آواز آئی۔

داؤد نے ہاتھ بڑھا کر بلب کا سوئچ نیچے کر دیا۔

"پلیز ہیلپ می۔" وہ آواز دوبارہ سنائی دی۔ داؤد کو لگا اس آواز میں آنسوؤں کی آمیزش تھی۔ داؤد نے اٹھ کر تیزی سے بیڈ کھسکایا اور کھڑکی کی چٹخنی نیچے کر دی۔ چٹخنی کے نیچے ہوتے ہی کھڑکی کا ایک پٹ آپوں آپ وا ہو گیا۔ داؤد نے حیرت اور بے یقینی سے دیکھا۔ تان بائی کی بیٹی کھڑکی کے دوسرے پٹ سے سر جوڑے بیٹھی تھی۔

"یہ، یہاں... اور کھڑکی کے پیچھے کیا ہے؟" اس نے خود سے سوال کیا اور دو قدم آگے بڑھا۔ کھڑکی کے ساتھ ہارڈ بورڈ کی ایک دیوار سی اٹھائی گئی تھی۔ جس میں ایک چوڑا شگاف تھا۔ اس شگاف سے سر نکال کر اس نے کھڑکی سے سر جوڑا ہوا تھا۔

"تم ادھر کیا کر رہی ہو؟" داؤد ایک لمحے کے لیے خوفزدہ ہو گیا۔

"اس نے مجھے ادھر بند کر دیا ہے۔" اس نے کھڑکی سے سر ہٹا کر کہا۔ اس کے کندھوں تک آتے سنہری بال بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔ داؤد نے دیکھا۔ اس کے سرخ و سفید چہرے پر دو جگہ پر نیل پڑے ہوئے تھے اور ماتھے پر چوٹ کا نشان تھا۔ اس کے کان سے خون رس رہا تھا اور ناک پر سوجن تھی۔ اس کی بائیں آنکھ پر بھی چوٹ آئی ہوئی تھی۔

"تمہیں کیا ہوا؟" داؤد متوحش ہوتے ہوئے بولا "اور یہ کون سی جگہ ہے جہاں تم بیٹھی ہو۔"

"مجھے کچھ کھانے کو دے دو پلیز۔" وہ نقاہت زدہ آواز میں بولی۔

داؤد کو اس ساری صورت حال پر گھبراہٹ سی ہونے لگی تھی۔ اس کا دل چاہا کھڑکی بند کر کے چٹخنی چڑھائے اور بیڈ کو اس کی جگہ پر کھسکانے کے بعد لیٹ کر سو جائے لیکن پھر اس کی نظر ایک بار پھر اس لڑکی کے زخم زخم چہرے پر پڑی اور اسے اپنے دل کی آواز پر کان بند کر دینے پڑے۔

کھانے کے لیے اس نے کمرے میں ادھر ادھر دیکھا اور پھر الماری کھول کر بسکٹ کا آدھا پیکٹ، نمکو اور کھجوریں نکال کر پلیٹ میں رکھ کر لڑکی کی طرف پلٹا جس کی آنکھیں اب بند ہو رہی تھیں اور سر جھک کر یوں جھول رہا تھا جیسے اسے خود پر قابو نہ ہو۔

"یہ لو۔" اس نے پلیٹ آگے بڑھائی۔ وہ آنکھیں بند کیے اسی طرح سر جھلا رہی تھی۔

"اے مس!" داؤد نے قدرے بلند آواز میں کہا اور جواب نہ ملنے پر دو قدم آگے بڑھ کر اس کے سر پر انگلیاں بجائیں۔ اس نے بمشکل آنکھیں کھول کر داؤد کی طرف دیکھا۔

"یہ لو کچھ کھا لو۔" داؤد کو اب اس کی حالت پر ترس آنے لگا تھا۔ اس نے خالی نظروں سے پلیٹ کی طرف دیکھا اور تیزی سے ہاتھ بڑھا کر پلیٹ پکڑلی۔ اب وہ بھکاریوں کی طرح پلیٹ میں رکھی چیزیں کھا رہی تھی۔ منٹوں میں وہ پلیٹ صاف کر چکی تھی۔

"پانی ملے گا؟" اس نے پلیٹ واپس داؤد کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ارے کیا تم کھجوروں کی گٹھلیاں بھی کھا گئیں؟" داؤد نے بے یقینی سے پلیٹ کی طرف دیکھا۔

"پانی دو مجھے۔" اب کے وہ ذرا تحکم آمیز آواز میں بولی۔ "وہ میں نے ادھر پھینک دی ہیں کمرے میں۔"

"ہوں!" اس نے جگ سے پانی گلاس میں انڈیل کر اس کی طرف بڑھایا۔

"چائے نہیں ہے تمہارے پاس۔" غٹاغٹ پانی پینے کے بعد اس نے آستین سے منہ صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

"اس وقت چائے کہاں سے آ سکتی ہے۔" داؤد نے گلاس میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"کیا تھا جو تم بنا لیتے۔" اس نے سر کھڑکی سے ٹکا کر کمزور آواز میں کہا۔

"میں نے تمہیں ٹی پارٹی پر مدعو نہیں کیا تھا، کیا ہوتا تو ضرور بنا لیتا۔" داؤد نے اس کے کان سے رستے خون کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"مگر میری سمجھ میں نہیں آ رہا، تمہیں ہوا کیا ہے اور تم یہاں بیٹھی کس جگہ ہو۔"

"اس نے مجھے بہت مارا ہے۔" وہ دوبارہ نیم غنودگی میں جانے لگی "اور یہاں بند کر دیا۔"

"اس نے کس نے۔"

"ڈیڈی نے۔" اس کی آنکھیں مکمل طور پر بند ہو رہی تھیں "ہائے بڑا درد ہے۔" پھر وہ اپنے کان پر ہاتھ رکھ کر اونچی آواز میں بولی۔

"سلمان صاحب نے؟" داؤد کے منہ سے حیرت زدہ الفاظ نکلے "نہیں میں نہیں مان سکتا، وہ ایسا نہیں کر سکتے۔"

"نہ مانو۔" اس کا سر کھڑکی کے سہارے سے ہٹنے کے بعد پھر سے جھولنے لگا تھا۔ "میں نے اپنی یہ حالت خود نہیں بنائی ہے۔"

"مگر کیوں مارا انہوں نے تمہیں۔ ویسے جتنی بدتمیز اور منہ پھٹ تم ہو میں سمجھ سکتا ہوں کہ انہیں غصہ آیا ہو گا کسی بات پر، مگر اتنی بے رحمی سے تمہیں وہ نہیں مار سکتے۔ سچ سچ بتاؤ قصہ کیا ہے۔"

"یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔" وہ آنکھیں کھولنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

"وہ ہمیشہ مجھے ایسے ہی مارتا ہے۔" اس کی آواز بھرانے لگی۔

"لیکن کیوں۔"

"وہ جو اتنا ہنس مکھ اور بامروت نظر آتا ہے نا اصل میں ایسا ہے نہیں ..... وہ بہت اذیت پسند ہے۔ وہ ظالم ہے اور بیمار ذہن۔ وہ اپنی ذہنی بیماری کا سارا غبار مجھ پر اور غریب فضلو پر نکالتا ہے۔ یہ دیکھو!" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہتے ہوئے اپنے سوئٹر کے بازو اوپر کیے۔ اس کے گورے بازوؤں پر زخموں کے نشان تھے جیسے کسی نے چاقو سے کٹ لگائے ہوں۔

"او میرے خدا!" داؤد دنگ رہ گیا اور اس نے

بے اختیار آگے بڑھ کر اس کا بایاں بازو پکڑ لیا جیسے یقین کرنا چاہتا ہو کہ جو وہ دیکھ رہا تھا وہ حقیقت ہے؟ آگے بڑھنے پر اسے اندازہ ہوا وہ ایک نیچی چھت کا کاٹھ کباڑ بھرے چھوٹے اور تنگ سے کمرے میں بیٹھی تھی۔

"یہ کون سی جگہ ہے جہاں تم بیٹھی ہو؟" وہ اس کا بازو پکڑے پکڑے بولا۔

"یہ اس گھر کی چھت پر بنا ایک اسٹور ہے جس میں ہم رہتے ہیں۔ اس کی پچھلی اور یہ والی دیوار کارڈ بورڈ سے کھڑی کی گئی ہے کیونکہ یہ دونوں جگہ ڈھکی ہوئی ہیں، ان پر موسم اثر نہیں کر سکتا۔"

"اوہ!" داؤد نے اس کا بازو چھوڑتے ہوئے کہا۔ اس محلے کے گھروں کے نقشے اتنے پیچیدہ تھے کہ شاید وہ کبھی اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ کس گھر کی چھت دوسرے کس گھر کی چھت سے جڑی ہے۔

"میں ڈیٹول لاتا ہوں۔" اس نے کہا اور باتھ روم سے ڈیٹول کی شیشی نکال لایا۔ ٹشو پیپر پر ڈیٹول انڈیل کر اس نے اس کے زخموں کو قدرے صاف کیا "مگر میرے پاس ان پر لگانے کو کوئی دوا نہیں ہے۔" اس نے افسوس سے کہا۔

"ٹھہرو میں تمہارے لیے دودھ گرم کرتا ہوں۔" اسے لگا لڑکی پر نیم بے ہوشی طاری ہونے لگی ہے۔ گرم دودھ کا کپ پینے کے بعد شاید اس کے جسم کو کچھ حرارت پہنچی تھی۔ وہ تھوڑا سنبھل کر بیٹھ گئی تھی۔

"میں زینب ہوں۔" اس نے داؤد کی طرف دیکھا "میں کل سے یہاں بند ہوں، اس ظالم نے مجھ پر کھانا پینا بند کر دیا، مجھے وحشیوں کی طرح مارنے کے بعد یہاں قید کر دیا۔ مجھے پتا تھا دیوار کے اس پار کسی گھر کی کھڑکی یا روشن دان ضرور ہو گا۔ میں نے اس سے۔" اس نے قریب رکھا لوہے کا ایک ٹکڑا جس کا کنارا کٹا ہوا اور تیز دھار تھا، اٹھا کر داؤد کو دکھایا "یہ دیوار کاٹی ہے۔ مجھے لگتا تھا اگر میں ایسا نہ کر پائی تو یوں ہی بھوکی پیاسی زخموں سے مر جاؤں گی اور وہ چاہتا بھی یہ ہی ہے۔"

"مگر وہ ایسا کیوں چاہتے ہیں۔" داؤد نے ایک بار پھر اپنا سوال دہرایا۔

"میں بتاتی ہوں، مگر تم وعدہ کرو اس سے جا کر نہیں جڑو گے۔"

"نہیں جڑتا۔" داؤد نے کہا "تم بتاؤ، یہ ماجرا کیا ہے؟"

وہ نیچی مگر بھاری آواز میں بتانے لگی۔

☼ ☼ ☼

وہ سلمان کی بیکری پر آنے والا ایک ایسا گاہک تھا جس پر سلمان پہلے دن ہی سے مہربان تھا اور سلمان اس پر مہربان کیوں نہ ہوتا وہی تو تھا جو اس جگہ پر اجنبی تھا، ورنہ محلے کے پرانے باسی تو سلمان اور اس کے گھر میں رہنے والوں سے یوں دور دور رہتے تھے جیسے ان سے تعلق رکھنا گناہ ہو۔ وہ بیکری سے اسی صورت کوئی چیز خریدتے تھے جب انہیں فوری ضرورت ہوتی اور دور مارکیٹ میں جانا ناممکن ہوتا۔ دوپہر کے وقت البتہ نان خوب بکتے اور وہ بھی اس لیے کہ محلے کی عورتیں روٹی پکانے کے تردد سے بچنا چاہتی تھیں اور سلمان ادھار پر نان دینے کو ہر وقت تیار رہتا تھا۔ نان کم قیمت شے تھی اس کی مد میں ہر گاہک کے کھاتے میں درج رقم کو دو چار سے ضرب دے دینے پر پندرہ دن یا مہینے کے بعد اتنی رقم نہیں بن پاتی تھی جو گاہک کو گراں گزرے۔ بیکری کی باقی چیزیں اکثر تو محلے کے بچے ہی خریدتے یا پھر فضلو کی ریڑھی پر منتقل ہو کر باہر بکنے چلی جاتیں۔ سلمان کے گھرانے کے بارے میں شکوک کا شکار محلے والے کبھی کم ہی ادھر بھٹکتے تھے۔ ایسے میں داؤد کو باقاعدہ گاہک بنانے کے لیے اس کے ساتھ حد درجہ مروت کا برتاؤ سلمان کی مجبوری تھی۔ ویسے تو یہ کوئی نئی بات نہیں تھی، کسی نہ کسی بات کو بہانہ بنا کر وہ اکثر ہی اسے پیٹتا رہتا تھا، مگر دو، تین دن تک داؤد کے انتظار کے باوجود اس کے ادھر نہ آنے کی وجہ اسے گردانتے ہوئے سلمان نے اسے بری طرح پیٹا اور زخمی حالت میں کاٹھ کباڑ کی کوٹھری میں بند کر دیا تھا۔ اٹھارہ گھنٹے زخموں سے چور چور کوٹھری میں پڑے رہنے اور اپنی فریادوں کی کوئی شنوائی نہ ہونے پر اس نے کمرے کی دیوار کاٹ کر جب دوسری طرف آواز دینے کی ٹھانی تو وہ خود بھی نہیں جانتی تھی کہ دیوار کے ساتھ والی کھڑکی کے پیچھے وہی داؤد موجود ہو گا، جس کی وجہ سے وہ اس حال کو پہنچی تھی۔ اس نے کارڈ بورڈ کی وہ دیوار کسی تک رسائی حاصل کرنے اور مدد مانگنے کے خیال سے کاٹی تھی اور اس کوشش میں اس کے پہلے سے زخمی ہاتھ اور بھی زیادہ زخم زخم ہوئے تھے مگر ایک امید اور وہیں پڑے پڑے مر جانے سے بچنے کا تصور اس سے وہ دیوار کٹوا گیا تھا۔

"وہ پاؤڈر اسمگل کرتا ہے، وہ چوری کی گاڑیاں بیچنے والے گروہ کا آلہ کار ہے، یہ بیکری اور تندور دوسروں کی نظروں میں روزگار کے ذریعے کے نام کی ڈھول ہے جو وہ یہاں بیٹھا اڑاتا رہتا ہے۔" اس نے زندگی میں پہلی بار کسی کو سلمان کے بارے میں بتایا تھا۔

"پہلے لوگ نہیں جانتے تھے، مگر اب شک میں پڑ چکے ہیں، اسی لیے کوئی ادھر نہیں پھٹکتا، لوگ شاید اس سے ڈرتے بھی ہیں، اس نے خوش اخلاقی، محبت اور مروت کا ڈھونگ رچا کر اسی محلے کے کئی لڑکے اس کاروبار میں پھنسائے ہیں۔ ان لڑکوں کے بارے میں کوئی نہیں جانتا وہ کدھر گئے۔ لیکن جیسے ہی محلے کا کوئی لڑکا غائب ہوتا ہے، اس کی جیب نوٹوں سے بھر جاتی ہے پھر یہ کئی دن مہنگی شراب پینے، مہنگی عورت گھر لانے اور مرغن کھانے کھانے میں مگن رہتا ہے، یہ بیکری محض ایک دھوکا ہے، ایک فریب ہے۔" اسے خود حیرت ہو رہی تھی۔ وہ ایک ایسے اجنبی کو جس کی وجہ سے کچھ دیر پہلے تک وہ جان لینے کے درپے تھی وہ سب کیوں بتا رہی تھی جو اگر سلمان تک پہنچ جاتی تو وہ اس کی دونوں ٹانگیں چیر دیتا اور دونوں بازو کاٹ کر پھینک دیتا۔ اس سے پہلے وہ اس کی ماں کے ساتھ ایسا ہی کر چکا تھا۔

"مجھے یقین نہیں آرہا، ایک پڑھا لکھا مہذب شخص حقیقت میں اتنا ظالم کیسے ہو سکتا ہے۔" داؤد نے اس کی بات سنتے ہوئے نجانے کتنی بار کہا تھا۔

"الٹا مجھے تم پر شک ہو رہا ہے۔ جتنی بدتمیزی سے تم اس کی کہی باتیں ماننے سے انکار کر دیتی ہو، وہ ایسا ہوتا تو اب تک تو تمہاری بوٹیاں چیل کووں کو کھلا چکا ہوتا۔" اس نے کہا تھا۔

"یہ میرے ہاتھ دیکھو، یہ میرے بازو، یہ پاؤں۔" اس نے ذرا فاصلے پر ہو کر اپنے ویلنگٹن بوٹ پاؤں سے اتار کر اسے اپنے زخمی پاؤں دکھائے تھے "وہ اپنے ساتھ ہونے والی ہر بری بات کا غصہ مجھ پر اتارتا ہے، تم اس کے کمرے میں رکھے ڈنڈے، چابک، چاقو اور رسیاں دیکھ لو تو شاید کبھی یہ سوال نہ کرو کہ وہ اتنا ظالم کیسے ہو سکتا ہے۔"

"تو تم کیوں برداشت کر رہی ہو اب تک، اتنی تو لمبی تمہاری زبان ہے، تم نے کسی کو بتایا کیوں نہیں۔" اسے ابھی بھی یقین کرنے میں تامل تھا۔

"میں نے تمہیں بتایا تو ہے کہ اس سے پہلے وہ میری ماں کے ساتھ کیا کر چکا ہے۔ میری ماں اپاہجوں کی طرح سسک سسک کر مری۔ سلمان کا خیال تھا کہ میری ماں نے میرے باپ کے کمائے سارے پیسے پیچھے بھیج دیے تھے، وہ اسے اذیتیں دیتا رہا۔ اس سے جانوروں کی طرح کام لیتا رہا اور آخر میں وہ اس کے ظلم کا شکار ہو کر مر گئی۔"

"اتنا ظلم، اتنی بربریت۔" رات کے آخری پہر اس نے سر جھٹکتے ہوئے کہا تھا "بتاؤ! میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟" اس نے پوچھا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی، کوٹھری کا دروازہ باہر سے کھلنے کی آواز آنے لگی۔

"تم اپنی کھڑکی بند کر لو۔" اس نے تیزی سے داؤد سے کہا تھا "کمرے میں روشنی کی ایک بھی لکیر اسے نظر آگئی تو۔" اس کی آواز خوف سے کانپنے لگی تھی۔

اور اس نے پھرتی سے کھڑکی بند کر کے پردہ برابر کر دیا تھا۔ کوٹھری میں پہلے کی سی تاریکی چھا گئی تھی۔

"باہر نکل خبیث کی اولاد، چل کر ڈو تیار کر، فضلو کا سامان ختم ہوا پڑا ہے۔" سلمان دانت پیستا نیچی آواز میں کہہ رہا تھا۔ مگر زینا کو یقین تھا کہ کھڑکی سے کان لگا کر سنتے اس شخص تک یہ نیچی آواز ضرور پہنچ چکی ہو گی

جس کو شاید ابھی بھی اس کی آپ بیتی پر داستان کا گمان تھا۔

"میں زخمی ہوں اور کچھ کرنے کے قابل نہیں ہوں۔" اس نے دانستہ چلا کر جواب دیا تھا۔

"نکلتی ہے الو کی پٹھی کہ میں۔" اس نے دروازے پر ہاتھ مار کے کہا تھا۔ وہ گھٹنوں کے بل رینگ کر باہر نکلی تھی۔ اسے باہر نکلنا ہی تھا' اندر سانس لینا محال تھا اور اگر سانس لینا ممکن بھی ہوتا تو سلمان کو انکار کرنا ناممکن تھا۔ وہ اسے مزید ایذا پہنچانے سے کبھی باز نہ رہتا۔

"چل آگے لگ۔" اس نے اس کے سر کی پشت پر زور سے ہاتھ مارا تھا۔ زینا کو اس بات کا بھی یقین تھا کہ کوٹھری کا دروازہ بند ہونے سے پہلے کہی گئی یہ آخری بات اور اس کے سر پر پڑنے والے ہاتھ کی آواز بھی کھڑکی سے کان لگا کر کھڑے داؤد تک ضرور پہنچی ہوگی۔

اس کے جلتے زخموں میں کچھ دیر کے لیے عجیب سی ٹھنڈک اترتی محسوس ہوئی۔ کوئی دوسرا کان تھا جس نے وہ سب سن لیا تھا۔ کوئی دوسری آنکھ جو اس کے زخم دیکھ چکی تھی۔ اس احساس نے زخموں کے باوجود صبح سے دوپہر تک اسے گھوڑے کی طرح دوڑایا تھا اور اب وہ پاؤں پھیلائے' دیوار سے ٹیک لگائے' آنکھیں موندے اسی تصور میں گم بیٹھی تھی' آج اس کے دکھ اور زخموں کے بارے میں اس کے علاوہ کوئی اور بھی تو سوچ رہا ہوگا۔

☆ ☆ ☆

اگلا سارا دن اس نے انتہائی بے چینی میں گزارا تھا۔ منطق اور دلیل کی جنگ تھی جو اس کے ذہن میں جاری تھی۔"

Seeing is believing

"حقیقت وہی ہے جو آنکھ کو نظر آرہی ہے۔" اس کا دل کہتا۔

"کبھی کسی نئی بات کو اخیر پرکھے اس پر یقین نہ کرو۔" دماغ کہتا۔

کبھی اسے نان بائی سلمان ایک بے ضرر اور معصوم انسان نظر آتا پھر جیسے ہی کوٹھری میں بند اس لڑکی کے زخم نظروں کے سامنے گھومتے تو اسے سلمان انسان کے بجائے شیطان لگنے لگتا۔

"مگر وہ لڑکی جو ساری دنیا کے سامنے سلمان سے اتنی زبان چلاتی ہے' وہ مظلوم اور معصوم کیسے ہو سکتی ہے۔" اس کا دماغ کہتا۔ "دو جمع دو چار' چار جمع چار آٹھ کے ترازو پر چیزوں کو تولنے والی لڑکی جو سلمان کو یاد دلاتی رہتی تھی کہ کاروبار میں نقصان ہو جانے کا ذمہ دار وہ ہوگا' وہ کیسے اسی سلمان سے چار چوٹ کی مار کھا سکتی تھی۔"

"میری ماں ڈینش تھی' وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ ٹل برگ میں رہتی تھی' میرا نانا شہر کا سب سے بڑا بیکر تھا اور سب سے اچھی بیکری چلا رہا تھا۔ میرے باپ وقار احمد نے میری ماں کو ٹل برگ میں پھنسایا تھا اور میرے نانا سے بیکنگ کے سارے گر سیکھنے کے بعد میری ماں کو وہاں سے یہاں لے آیا۔ میرا باپ اور اس کا خاندان بہت گھٹیا اور چال باز ہے' اس کا بھائی سلمان ان سب کا باپ ہے۔ میرے باپ نے روزیٹا بیکری جو پہلے تاج دین نان بائی کا تندور کہلاتی تھی کو بیکری کی شکل دی' یہ سلمان جو اپنے باپ کے تندور کی بنی خطائیاں ٹرے میں سجائے گلی گلی محلے محلے بیچتا پھرتا تھا اس بیکری کا منیجر بن بیٹھا۔ میرا باپ اور میری ماں کے تربیت یافتہ ماہر بیکر تھے۔ میری ممی بیکنگ کا سب سامان نانا سے منگواتی تھی' جب ہی تو روزیٹا ایک اعلا بیکری بن کر سامنے آئی مگر پھر میرا باپ مر گیا۔" وہ مضبوط ڈیل ڈول اور کھلے ہاتھ پاؤں کی ایک صحت مند لڑکی تھی۔ اسے دیکھ کر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ خاموشی سے کسی سے مار کھا سکتی تھی۔

"میرے باپ کے بعد سلمان بیکری پر قابض ہو گیا۔ اس نے میری ماں کا پاسپورٹ اور شناختی کارڈ چھین لیا۔ وہ اسے گھر سے نکلنے تک کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ سارا دن وہ بیکنگ میں جتی رہتی اور اس کی بنائی چیزوں پر یہ نام کماتا۔ مجھے اور میری ماں کو یہ دن میں ایک وقت کھانے کو روٹی دیا کرتا تھا۔ پھر اس نے میری ماں کو اس شرط پر پاسپورٹ واپس کرنے کی ہامی بھری کہ وہ اس سے شادی کر لے میری مجبور ماں اس خبیث کے تمام کرتوت جانتے ہوئے بھی صرف اس لیے شادی کرنے پر رضا مند ہو گئی کہ وہ اس سے اپنا پاسپورٹ لے کر واپس اپنے گھر جا سکے گی' مگر اس ظالم نے شادی کے بعد اس سے اس احتجاج کا حق بھی چھین لیا جو وہ کچھ لوگوں کے سامنے کیا کرتی کہ ظالم دیور اس پر ظلم کرتا تھا۔

اب تو وہ اپنی مرضی سے اس سے نکاح کر بیٹھی تھی۔ اپنی بیوی بنانے کے بعد اس نے میری ماں کو مکمل غلام بنا کر رکھا۔ دن بھر کام اور اس کے عوض میرے اور اس کے لیے ایک وقت کی روٹی۔ اپنی ذرا سی حکم عدولی پر یہ اس کی خوب ہڈیاں سینکتا۔ وہ بھی منہ بھر بھر کر اسے گالیاں دیتی۔ اس پر یہ اشتعال میں آکر اسے وہ مار لگاتا کہ اس کے کئی دن زخم سہلاتے نکل جاتے۔

میں اسی صورت حال اور ان ہی حالات میں پلی بڑھی۔ دن بھر ماں کے ساتھ کام کرنے کی وجہ سے بیکنگ خود بخود میرا ہنر بن گئی۔ پھر ایک مرتبہ میری ماں نے کسی طریقے سے یہاں سے بھاگ جانے کی ٹھان لی۔ اس نے کسی سے سازباز کی اور قریب تھا کہ وہ مجھے لے کر یہاں سے نکل جاتی۔ اسی فضلو کم بخت نے بھانڈا پھوڑ دیا۔ سلمان نے میری ماں کو کمرے میں بند کر کے صحیح معنوں میں اس کی چمڑی ادھیڑ دی' اس کے بازو اور ٹانگیں توڑ ڈالیں۔ اس کے بعد وہ چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہی' اس نے پنجوں کے بل ایک جگہ سے دوسری جگہ گھسٹ گھسٹ کر اور موت کی آرزو میں کرتے باقی کی زندگی گزاری۔"

"اوہ!" داؤد نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا تھا۔ "تو اس نے واویلا کیوں نہیں مچایا' پولیس' تھانے کچہری تک کیوں نہیں پہنچی؟ اور چلو وہ تو بیچاری معذور ہو گئی تھی تم تو ٹھیک ہو' ہٹی کٹی ہو' تم کیوں سہہ رہی ہو یہ ظلم' گھر سے باہر نکلو' شور مچاؤ' مدد کو پکارو لوگوں کو' اس سلمان کا کچا چٹھا کھل جائے گا اور تمہیں بھی چھٹکارا مل جائے گا۔"

"میں ایسا کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔" اس کا مضبوط توانا جسم بری طرح کانپ گیا تھا۔ "تم سلمان کو نہیں جانتے' اس کا خوف میری رگ رگ میں سمایا ہوا ہے۔ وہ بہت ظالم ہے' بہت ظالم۔" اس کی نیلی آنکھوں میں خوف اور آنسو ایک ساتھ اترے تھے۔

"تو پھر شاید تمہارے مسائل کا کوئی حل نہیں۔" داؤد نے سر ہلایا۔ "جب تک تم خود کوشش نہیں کرو گی' تمہیں نجات نہیں مل سکتی' اسی لیے تو میں سمجھتا ہوں کہ جو کچھ تم سنا رہی ہو۔ سب جھوٹ ہے' گپ ہے' داستان ہے' تمہاری گھڑی ہوئی۔"

جواب میں وہ بے بسی اور دکھ سے اسے دیکھنے لگی تھی۔

"تو اور کیا۔" داؤد نے اس کی نظروں کی زبان سے نظریں چراتے ہوئے کہا تھا۔ "میری تو یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ اگر وہ اتنا ظالم ہے تو جسے میں نے اس سے بدتمیزی سے بولتے سنا ہے' وہ کون ہے۔"

"وہ بھی میں ہی ہوں۔" وہ تیزی سے بولی تھی۔ "بیکری پر بیٹھا سلمان شہد کی بوتل بن جاتا ہے' یہ محلہ نیا ہے' یہاں ہمیں آئے پانچ سال ہو چکے ہیں۔ روزیٹا بیکری صرف دکھاوے کا کاروبار ہے' سلمان کا اتنے سالوں میں اسمگلروں کے ایک ایسے گروہ سے تعلق بن چکا ہے جن کا آلہ کار بننے کے بعد وہ لاکھوں کماتا ہے اور لاکھوں اڑاتا ہے' یہ بیکری لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے اور مجھے گدھوں کی طرح کام میں جوتے رکھنے کا بہانہ ہے۔ چہرے پر خوشگواری اوڑھے' لہجے اور رویے میں حلاوت گھولے بیکری پر بیٹھا سلمان محض ایک دھوکا ہے۔ اسی طرح کے رویوں سے وہ لوگوں کو پھانستا اور اپنے کالے کاروبار کا حصہ بنا کر ان کو یہاں سے غائب کرواتا ہے۔ فضلو کی ریڑھی پر بکنے والی چیزوں میں نشہ آور چیزوں کی ملاوٹ سے بھی اسے کالجوں اور اسکولوں سے نشے کے عادی لڑکے' لڑکیاں مل جاتے ہیں۔ وہ لوگوں کو بتاتا ہے کہ میں منہ پھٹ'

بدتمیز اور جھگڑالو بھتیجی ہوں جسے سب برائیوں کے باوجود اس نے سہارا دیا ہوا ہے۔ اسی لیے تو دن بھر وہ مجھے لوگوں کی موجودگی میں اونچی آواز میں ایک لفظ بھی نہیں کہتا اور وہ میرے لیے سنہری وقت ہوتا ہے' میں اس کو جلی کٹی سنا کر اپنی بھڑاس نکالتی ہوں مجھے پتا ہوتا ہے لوگوں کے سامنے وہ میری ساری سن لے گا۔"

پوری گفتگو میں وہ فقط اس بات پر مسکرائی تھی۔

"تمہیں بھی وہ کسی ایسے ہی مقصد کے لیے پھنسانے کے چکر میں ہے اس لیے ہوشیار رہنا۔" اس نے اسے بھی تنبیہہ کی تھی۔

"مجھے!" داؤد کو جھٹکا لگا۔

"ہاں ہاں تمہیں۔" اس نے سر ہلا کر کہا تھا "تم سے زیادہ آسان شکار کون ہو سکتا ہے' شہر میں اجنبی ہو' محلے میں تمہیں کوئی نہیں جانتا' اچانک غائب بھی ہو جاؤ تو پوچھے گا کون۔ تمہارے پیچھے والے لوگوں کو تو پتا چلتے دیر ہو چکی ہو گی۔"

"او میرے خدا!" اس نے اس کی باتیں یاد کیں اور بے یقینی سے سر جھٹکا' دنیا میں کیا اور کتنا کچھ ہو رہا ہے ہمیں پتا ہی نہیں چلتا' میں اور میری ماں بہنیں ایک فاروق بھائی کے دھوکے اور لالچ کا شکار ہو کر یہ سمجھتے ہیں کہ جو ہمارے ساتھ ہوا' وہی سب سے برا ہے اگر یہ لڑکی سچ بول رہی تھی تو کیا اس ظلم' زیادتی اور استحصال کے بارے میں ہم سوچ بھی سکتے ہیں۔

"اور وہ سلمان صاحب!" اسے اس نان بائی کی شکل یاد آئی "اسے دیکھتے ہوئے' اس سے ملتے ہوئے گفتگو کرتے ہوئے کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ اس کے اندر ایسا وحشی درندہ چھپا بیٹھا ہوا ہے۔"

پھر اسے خیال آیا "ہو سکتا ہے وہ لڑکی جھوٹ بول رہی ہو۔" لیکن اگر وہ لڑکی کسی بات پر قصور وار بھی ہے تو پھر بھی کیا اس طرح کسی کو مارنا جائز قرار دیا جا سکتا ہے جیسے اسے مارا گیا تھا۔" اسے نیلی آنکھوں سے ٹپکتی بے بسی اور آنسو یاد آنے لگے۔

"کیا مجھے سوچنا پڑے گا کہ میں اس کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟" اس نے خود سے سوال کیا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے سوچنے کی' بھاگ... پیچھا چھڑاؤ ان لوگوں سے' کرنے دو جو یہ کرتے... ہونے دو جو ہو رہا ہے۔" دماغ نے جواب دیا۔

"انسانیت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔" دل دہائی دے... تھا۔ اس نے دل کی طرف سے اپنے کان بند کر لیے... ہر نارمل انسان کی طرح اسے بھی اپنا ذہنی سکون عز... تھا۔

☼ ☼ ☼

اس نے دھلی اور استری شدہ سفید چادریں صوفو... پر ڈالیں۔ بڑے صوفے کے ساتھ رکھی پتلی پتلی ٹانگو... والی گول میز پر کروشیے سے بنا میز پوش ڈال کر اس... سفید مٹی سے بنا روغن کیا ہوا بگلا رکھا' بگلا منہ م... ایک ننھی سی مچھلی دبائے ایک ٹانگ پر کھڑا تھا۔ ا... نے ہاتھ میں پکڑا صفائی کرنے والا کپڑا بگلے کی اوپر... سطح پر پھیرا' یہ بگلا اس وقت سے یونہی ننھی مچھلی منہ... میں دبائے اس میز پر ایک ٹانگ کے سہارے کھڑا تھا... جب وہ غالباً" کلاس دوم کی طالبہ تھی۔

اس کمرے میں موجود ہر چیز سالوں پرانی تھی... لکڑی کا پرانی وضع کا فرنیچر' فرش پر بچھا سنہری رنگ... قالین جس پر بھورے رنگ میں کسی راجے مہارا... کا دربار سجا تھا۔ دیواروں پر سجی روغنی پینٹنگز' سف... تکونے رومال سے ڈھکا آتش دان جس پر ایک طرف... چھوٹے بڑے فریمز جن میں خاندان کے مختلف... بزرگوں اور بچوں کی بلیک اینڈ وائٹ تصویریں جڑی... تھیں اور جس کے وسط میں لکڑی کے نفیس تراش... دو اونٹ رکھے تھے' ایک بڑا اونٹ اور ایک چھوٹے... سائز میں غالباً" اس کا بچہ تھا۔ اسی آتش دان کے... آخری کونے میں وہ سجاوٹی لیمپ تھا جس کے اندر بلب... اور پانی میں موجود رنگا رنگ مچھلیاں سجی تھیں' لیمپ... روشن کیا جاتا تو پانی اور مچھلیوں کا منظر آپ سے آپ... حرکت کرتا چاروں طرف گھومنے لگتا۔ مگر وقت بہت... آگے آ چکا تھا۔ لیمپ کا مچھلیاں اور پانی گھمانے کا... خراب ہو چکا تھا اور اب یہ محض ایک سجاوٹی شے...

آتش دان کے اس کونے پر ٹکا رہتا تھا۔

کمرے کے مشرقی کونے میں رکھی اونچی الماری جس کے چاروں طرف شیشے جڑے تھے اس کے نانا' ابا' امی اور خود اس کے اسکول کالج کے زمانے میں مختلف مقابلوں میں جیتے کپ اور فریمز میں جڑے سرٹیفکیٹس رکھے تھے۔ وہ اٹھ کر آہستہ قدموں سے چلتی اس الماری کے قریب جا کھڑی ہوئی۔ بیڈمنٹن' باسکٹ بال' تیز رفتار دوڑوں کے مختلف مقابلے' تقریری مقابلے' مضمون نویسی' نیلی چڑیا اور گرلز گائیڈ' بے شمار سرٹیفکیٹس اور ان گنت بڑے چھوٹے کپ' میڈلز' اس کا خاندان ہونہار اور محنتی لوگوں سے بھرا پڑا تھا۔ ایک اداس مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی اس کی نظران کے درمیان چھپے ایک ننھے سے ہاتھی پر پڑی۔ لکڑی کا یہ نیلے رنگ میں رنگا ہاتھی اسے اس کی کالج کی دوست واشیکا نے تحفے میں دیا تھا۔ واشیکا کا تعلق سری لنکا سے تھا اور ہاتھی اس کے نزدیک ایک مقدس ترین تحفہ تھا۔ "اور یہ بے چارہ کس ناقدری سے ادھر چھپا پڑا ہے۔" اس نے ہاتھ بڑھا کر ہاتھی نکال لیا اور اس کے اوپر پڑی گرد جھاڑنے لگی یہ ہر اتوار کے دن کا معمول تھا۔ اس کمرے کی تفصیلی صفائی اس کے ذمہ تھی۔

اس نے الماری کے پٹ بند کیے اور ایک بار پھر کمرے پر نظر ڈالی۔ اس کمرے کی ہر چیز پر قدامت اور نیم بوسیدگی طاری تھی۔

"جب یہ چیزیں اتنی پرانی لگتی ہیں تو میں جوان ہی کو دیکھتے دیکھتے چھوٹی بچی سے بڑی ہوتی اس عمر کو آن پہنچی ہوں' میں کتنی پرانی ہو چکی ہوں گی۔" نہانے کے لیے تولیہ' شیمپو اور صابن لے کر غسل خانے کی طرف جاتے ہوئے اسے خیال آیا۔

"اتنی پرانی کہ اب اپنی تاریخ پیدائش بھی یاد کرنے کو دل نہیں چاہتا۔"

گرم پانی کی پھوار کے نیچے کھڑے بالوں میں شیمپو کرتے ہوئے اس نے خود کو جواب دیا تھا۔

غسل کے دوران ہی اسے گھر کا بیرونی دروازہ دھڑ دھڑانے کی آواز سنائی دی اور پھر صحن پار کر کے دروازے تک جاتی اماں کی بڑبڑاہٹ کی آواز۔

"اے ہے اس عذرا نے بھی اتوار کا سارا دن اتوار بازار میں ہی گزار دینا ہوتا ہے۔"

"اماں کو امی کا اتوار بازار جانا کتنا کھلتا ہے' حالانکہ امی اتوار بازار سے خریداری کرنا چھوڑ دیں تو ہفتہ بھر ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہا کریں' نہ گھر میں کچھ پکانے کے لیے موجود ہو نہ کھانے کے لیے۔"

"آؤ بیٹا! آؤ۔ شاباش ادھر آ جاؤ۔" پھر اسے غسل خانے کے قریب سے گزرتی اماں کی پُرتکلف آواز سنائی دی "اطلاعی گھنٹی خراب ہوئے کتنے ہی دن ہو گئے۔ بجلی والا کم بخت نخرے دکھاتا۔" وہ کسی کو وضاحت دیتی آگے بڑھ گئیں۔

"یہ کون آ گیا آج؟" اس نے حیران ہوتے ہوئے سوچا اور کپڑے پہن کر بالوں پر تولیہ لپیٹتی غسل خانے سے باہر آ گئی۔

"ہما! غسل خانے میں وائپر ضرور لگا کر آئیو' مجھ غریب کا پیر پھسل گیا نا کسی روز گیلے فرش پر تو تم دونوں ماں بیٹیوں کو ہی مصیبت پڑے گی۔" غسل خانے کا دروازہ کھلنے کی آواز پر اسے اماں کی آواز آئی۔

"لگا دیا ہے' آپ نہ بھی کہتیں تو مجھے یاد تھا۔" اس نے بالوں سے تولیہ نکال کر الگنی پر پھیلاتے ہوئے کہا۔

"داؤد آیا ہے۔" اسی دم اماں نے اس کے پیچھے آ کر اس کے کان میں سرگوشی کے انداز میں کہا۔ "چائے کے ساتھ کھانے پینے کا کوئی سامان گھر میں ہے یا سب ختم ہو گیا۔"

"مجھے کیا پتا' دن بھر گھر میں آپ ہی تو ہوتی ہیں۔" اس نے گیلے بال جھٹکتے ہوئے کہا۔

"اچھا تم چلو' اندر جا کر اس کے پاس بیٹھ کر باتیں کرو' میں کچھ کرتی ہوں۔" انہوں نے باورچی خانے کا رُخ کرتے ہوئے کہا۔

"آپ بیٹھیں۔ میں بناتی ہوں چائے۔" اس نے ان کا ہاتھ پکڑا۔

"بھئی! میں تو اونچا سنتی ہوں اور وہ اتنا آہستہ بولتا ہے کہ میرے پلے کچھ نہیں پڑتا۔ تم بیٹھو۔ ابھی

تمہاری ماں واپس آتی ہے تو آپ ہی کرلے گی گفتگو اس سے۔" انہوں نے ہاتھ چھڑا کر باورچی خانے میں گھستے ہوئے کہا۔

"واہ آپ جین آسٹن کو پڑھ رہے ہیں ہم نے تو سنا تھا آپ انجینئر ہیں۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی اس کے ہاتھ میں وہ کتاب تھی جو ہما نے پڑھتے پڑھتے رکھی تھی۔

"نہیں تو۔" اسے دیکھ کر وہ کتاب میز پر رکھتے ہوئے بولا۔ "میں نے تو اس رائٹر کا نام بھی پہلی دفعہ پڑھا ہے وہ بھی کتاب رکھی دیکھ کر اٹھانے پر۔۔۔"

"یعنی آپ کو مطالعہ میں کوئی دلچسپی نہیں۔"

"مطالعہ میں تو نہیں مطالعہ پاکستان میں ہوا کرتی تھی۔ اسٹوڈنٹ لائف کے دوران وہ بھی اچھے نمبر لینے کے لیے۔"

"خوب!" وہ مسکرائی "آپ انجینئرنگ کی ادق زبان اور علم کا ہمیں تو دور دور تک کچھ پتا نہیں پھر آپ سے کس موضوع پر بات کی جائے۔"

"جس بھی موضوع پر کرنا چاہیں کرلیں لیکن برائے مہربانی اتنی گاڑھی اور مشکل اردو مت بولیں میرے سر پر سے گزر جائے گی۔" وہ منہ بنا کر بولا "یہ کیا ہوتا ہے ادق۔۔۔ میں نے یہ لفظ پہلی مرتبہ سنا ہے۔"

"حالانکہ آپ دنیا میں نووارد نہیں ہیں خاصے پرانے لگ رہے ہیں۔" وہ ہنسی۔ "کہاں رہے ہیں اب تک؟"

"اوکاڑہ پاکستان میں۔" وہ اطمینان سے بولا۔

"اللہ میاں کے پچھواڑے تو نہیں واقع آپ کا گاؤں۔" وہ مسکرائی۔

"گاؤں نہیں بہت بڑا شہر ہے صرف شہر ہی نہیں اس کے ساتھ چھاؤنی بھی ہے۔" اس نے فوراً تصحیح کی۔

"میں معذرت خواہ ہوں کیونکہ میرا جغرافیہ ذرا کمزور ہے۔" ہما نے کہا۔

"مطالعہ کا کیا فائدہ جب جغرافیہ کمزور ہو۔" اس نے چوٹ کی۔

"صرف جغرافیہ سے کام نہیں چلتا مطالعہ بھی ضروری ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"چلیں ایسا کرتے ہیں میں آپ کو جغرافیہ سمجھا دیتا ہوں آپ مجھے مطالعہ سکھا دیں۔"

"ضرور۔" وہ مسکرائی۔

یہ پہلی تفصیلی ملاقات خوشگوار رہی وہ پورا دن ان کے یہاں گزار کے گیا تھا اور اس کی واپسی تک وہ دونوں ہی یہ فیصلہ کرچکے تھے کہ ان دونوں نے ایک دوسرے کی شخصیت کو دلچسپ پایا تھا اور ان کی آپس میں اچھی دوستی ہوسکتی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ عذرا مامی کی طرف ایک اچھا اور خوشگوار دن گزارنے کے بعد واپس لوٹا تو اس کا موڈ اچھا تھا۔ عذرا مامی کے گھر میں رکھ رکھاؤ اور وضع داری ـــــ کے باوجود ایک نامحسوس سی بے تکلفی کی فضا تھی۔ وہ وہاں جاکر خود کو ان لوگوں سے الگ محسوس نہیں کرتا تھا اور اس روز تو اسے ہما کی کمپنی بھی میسر آئی تھی۔ وہ عمر میں شاید اس سے چند مہینے بڑی تھی اور اسی لیے پہلے پہل کے بعد سارا دن اسے تم کہہ کر مخاطب کرتی رہی تھی۔ اسے ہما کی شخصیت دلچسپ لگی تھی۔ وہ اپنی گفتگو کے دوران قصے کہانیاں واقعات لطیفے اشعار اور اقوال زریں جوڑ جوڑ کر سناتی تھی۔ اس کی حس مزاح بھی اچھی تھی مگر ایک بات یہ بھی تھی کہ ہما کی شخصیت میں ایک عجیب سا رعب تھا۔ خاصا پراعتماد ہونے کے باوجود داؤد کو محسوس ہوتا رہا کہ وہ ہما کے آگے دب رہا تھا۔ اسے ہما کی کچھ باتوں سے اختلاف محسوس ہوا تھا مگر نجانے کیوں وہ خود کو اس کی ہاں میں ہاں ملاتا محسوس کررہا تھا۔

اس نے انگڑائی لینے کے بعد کروٹ بدلی اور لحاف اپنے اردگرد اچھی طرح لپیٹ لیا۔ اسی دم اس کے سرہانے کی کھڑکی پر دستک ہوئی۔

"اوہ!" اسے اچانک گزشتہ رات یاد آگئی۔ اس نے سر جھٹک کر یقین کرنا چاہا کہ دستک محض اس کی

سماعت کا دھوکا تھا۔ لیکن دوبارہ اور سہ بارہ کی دستک نے اسے اپنا دھیان کھڑکی کی طرف کرنے پر مجبور کردیا۔

"صبح سلمان انکل اسے نکال کرلے گئے تھے اب وہاں کون تھا جو دستک دے رہا تھا۔" اس نے سوچا اور پھر دستک کو نظر انداز کرکے سونے کی کوشش کرنے لگا۔

"کھڑکی کھولو پلیز کھڑکی کھولو۔" ایک مظلوم اور ملتجیانہ آواز آئی۔

"اوہ نو۔۔۔ ناٹ اگین۔۔۔" اس نے خود سے کہا "یہ وہ پرایا پھڈا ہے جس میں ٹانگ اڑانا سخت خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔"

"خدا کے واسطے! میری ایک بات سن لو۔" وہ گھٹی گھٹی سی آواز دوبارہ سرگوشی کے انداز میں ابھری۔

"اب کیا ہے؟" اس نے کھڑکی کھولے بغیر اس کے قریب جاتے ہوئے کہا۔

"تم کھڑکی کھولو پلیز۔"

"نہیں۔ میں کھڑکی نہیں کھولوں گا۔" وہ قطعیت سے بولا "تم کو جو کہنا ہے یونہی کہہ دو۔"

"میرا زخم خراب ہورہا ہے پلیز میری مدد کرو۔ میرے ہاتھ میں ریشہ پڑ رہا ہے۔" سسکیوں کے درمیان آواز آئی۔

نہ چاہتے ہوئے بھی داؤد کے ہاتھ نے بڑھ کر کھڑکی کی چٹخنی کھینچی۔

"تم نہاتی نہیں ہو کیا؟" اس کے نیلے وجود کو دیکھتے داؤد نے بے اختیار پہلا سوال کیا۔

"نہا لیتی ہوں کبھی کبھار کیوں کیا ہوا؟" وہ بھاری آواز میں بولی۔

"کبھی کبھار؟" داؤد کو کرنٹ سا لگا۔ "دکھاؤ ہاتھ کدھر ہے تمہارا جو زخمی ہے اور آج بھی کیا تم اس کوٹھری میں بند ہو۔"

"نہیں میں آج بند نہیں ہوں خود آئی ہوں۔"

اس نے سوراخ سے پیچھے ہٹتے ہوئے اپنا بایاں بازو سوراخ سے نکال کر داؤد کی طرف بڑھایا۔ وہ سفید گدگدا پُرگوشت ہاتھ تھا اس کا سائز نارمل زنانہ ہاتھ سے بڑا تھا اس کی موٹی انگلیوں کے ناخن چھوٹے چھوٹے سے تھے اور جلد سے اندر تک کٹے ہوئے تھے۔ ہاتھ کے وسط میں لمبا سا کٹ تھا جس میں پانی پڑتے رہنے کی وجہ سے ریشہ پڑ رہا تھا۔

"اوہو!" داؤد زخم کی نوعیت دیکھ کر پریشان ہوگیا۔ "اسے تم کسی سرجن کو دکھاؤ بھئی یہ ایک بڑا زخم ہے۔"

"سرجن!" اس نے یوں داؤد کو دیکھا جیسے کہنا چاہتی ہو تم مذاق کررہے ہو "سرجن کہاں سے ملے گا مجھے۔ سرجن چھوڑ تمہارے گھر کے نیچے جو ڈاکٹر کلینک چلاتا ہے مجھے تو وہ بھی نہیں ملے گا۔ مجھے گھر سے باہر نکلنے کی اجازت ملے گی تو ڈاکٹر کو دکھاؤں نا!"

"یار! کیا مصیبت ہے۔" داؤد نے جھلا کر ادھر ادھر دیکھا "اچھا رکو میں دیکھتا ہوں ڈاکٹر ادھر ہے یا کلینک بند کرگیا۔" وہ بستر سے نکل کر گرم چادر اوڑھتے ہوئے بولا۔

"تم ڈاکٹر کو بلانے جارہے ہو؟" اس کے چہرے اور لہجے دونوں میں خوف اتر آیا۔

"نہیں" داؤد نے دروازے کے قریب رک کر مڑتے ہوئے اسے دیکھا۔ بکھرے سنہری بال چہرے اور آنکھوں میں خوف لیے وہ اس کی طرف یوں دیکھ رہی تھی جیسے قربانی کا جانور قصائی کی بو پاکر اسے لانے والے کو دیکھتا ہے۔

"میں کوئی دوا لے کر آتا ہوں۔" وہ کہہ کر باہر چلا گیا۔ سیڑھیاں اتر کر نیچے آتے ہوئے وہ خود سے سوال کررہا تھا۔ وہ ڈاکٹر کے پاس دوا لینے کیوں جارہا تھا۔ اس نے غلطی سے کھڑکی کھول ہی لی تھی تو اسے دوبارہ بند کرکے سو کیوں نہیں گیا تھا مگر اسے خود سے یہ جواب نہیں ملا تھا کہ وہ ڈاکٹر کے پاس سے دوا گاز اور پٹی کیوں مانگ لایا۔

جب وہ واپس کمرے لوٹا وہ پہلے کی سی پوزیشن میں دیوار کے کٹے ہوئے حصے سے چہرہ ٹکائے بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ابھی بھی خوف تھا۔

داؤد نے پائیوڈین میں گاز بھگو کر اس کا زخم صاف کیا پھر پٹی باندھ دی۔

"اسے بھگونا مت' اور درد کی دوا بھی دھیان سے کھانا۔" اس نے کسی بڑے کی طرح خود کو اس لڑکی سے کہتے سنا تھا۔

"لیکن تم سلمان انکل سے کیسے چھپاؤ گی کہ تمہارے ہاتھ پر پٹی کیسے بندھی؟" اسے خیال آیا۔

"میں گلوز پہن کر کام کرلوں گی' اس پر وہ دھیان نہیں دے گا۔" وہ اپنا پٹی والا ہاتھ دباتے ہوئے بولی تھی۔

"اچھا چلو' اب جاؤ اور سو جاؤ۔" داؤد نے قدرے نرمی سے کہا۔

"تم بہت اچھے ہو۔" وہ دیوار سے پرے ہٹنے سے پہلے بولی۔ "میری ماں بھی مجھے اسی طرح پٹی کرتی تھی جب بھی مجھے چوٹ لگ جاتی تھی۔ اس کے پاس دوا کے لیے پیسے نہیں ہوتے تھے تو وہ ایلوویرا کے پتے کو گرم کرکے زخم پر باندھ دیا کرتی تھی۔ میری ماں کے بعد میری پٹی کرنے والے تم پہلے شخص ہو۔ تم بہت اچھے ہو۔ کل میں تمہارے لیے کیرامل ٹافی بنا کر لاؤں گی۔"

داؤد کو پہلی مرتبہ محسوس ہوا کہ بدتمیز' منہ پھٹ اور بدزبان نظر آنے والی یہ لڑکی درحقیقت بہت معصوم تھی اور مظلوم بھی۔ اپنی ماں اور اس کی شفقت کا ذکر کرتے ہوئے جو تاثر اس کی آنکھوں میں اترا تھا' داؤد اس کو پہچان سکتا تھا وہ اسے سمجھ بھی سکتا تھا۔

"نہیں۔" اس نے سر جھٹکا "تم کچھ مت لانا' کچھ مت بنانا' میں نے تمہارے لیے کچھ بھی نہیں کیا۔"

"ویسے بھی یہ اچھی بات نہیں ہے۔" اس نے ہارڈ بورڈ کی دیوار کے کٹے ہوئے حصے کی طرف دیکھا "کل رات تم یہاں بند تھیں اور بات تھی آج تم خود آئی ہو' یہ غلط ہے۔ آئندہ یوں مت آنا۔"

"نہیں۔۔۔" اس کے ہونٹ لرزے "میں تو سارا دن رات کے آنے کا انتظار کرتی رہی۔ میں یہاں آکر تم سے بات کرنے کے لیے بے چین تھی' مجھے یقین تھا تم میرے زخم سے لاپروائی نہیں برتو گے۔"

"تمہارے زخم کی پٹی ہوگئی اور تمہیں دوا بھی مل گئی' بس اب اس کوٹھڑی میں یوں مت آنا۔ آئندہ میں یہ کھڑکی نہیں کھولوں گا۔" داؤد نے اس سے نظریں چراتے ہوئے کہا وہ اس کے چہرے پر پھیلی مایوسی نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

"چلو اب تم جاؤ۔" پھر اس نے نظریں اٹھائے بغیر کھڑکی بند کرکے پردہ برابر کردیا۔ اسے دیر تک کھڑکی کے پار سے سسکیوں کی آواز آتی رہی تھی اور وہ پو پھوٹنے تک سو نہیں پایا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس لڑکی زینب وقار کے لیے داؤد کی یہ ہدایت کہ آئندہ وہ اس کھڑکی کے قریب نہ آئے۔ الفاظ میں ڈھلی ہدایت تک ہی محدود رہی' اس پر عمل نہیں ہوسکا۔ زینب وقار جو خود کو زینا بتاتی تھی' کے لیے وہ کھڑکی شاید اس کے ہر درد' دکھ' محرومی اور دل سے اٹھتی چیخوں کا روزن تھی۔ ہر رات وہ کھڑکی پر دستک دیتی۔ داؤد کان لپیٹتا' پہلو بدلتا' دل میں سو پختہ عہد کرتا اسے کھڑکی کی دستک کی طرف دھیان نہیں دینا مگر دوسری جانب سے فریاد کچھ ایسے الفاظ میں کی جاتی کہ اس کا ہاتھ چٹخنی کی طرف بڑھتا اور کھڑکی کھل جاتی۔

"تمہاری وجہ سے میں سو نہیں پاتا' میری ساری روٹین ڈسٹرب ہو کر رہ گئی ہے۔" وہ اسے ڈانٹتا۔

"صرف پندرہ منٹ اور مجھے صرف ایک اور بات سنانی ہے۔" وہ التجا کرتی اور پندرہ منٹ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے تک کھنچ جاتے۔ داؤد کی خود سمجھ میں نہیں آتا تھا وہ اس کی بات کیوں سنتا تھا۔ اس کی باتوں میں ہوتا بھی کیا تھا' اس کی ماں کے ساتھ ہونے والے دھوکے' ماں کی بیکنگ میں مہارتیں' ماں کے اندر کوٹ کوٹ کر بھری وفاداری' معصومیت' شوہر کے مرنے کے بعد سلمان پر بھروسا اور سلمان انور کے پھینکے جال میں قید' اس کی اکثر باتیں اس کی ماں سے شروع ہوتیں اور ماں ہی پر ختم ہوجاتیں۔

"تمہاری ماں' بقول تمہارے پڑھی لکھی بھی تھی' سمجھ دار بھی تھی پھر وہ سلمان انور کے دھوکے میں کیسے آگئی۔ اس نے کسی سے مدد کیوں نہیں مانگی' اپنے والدین سے رابطہ کیوں نہیں کیا' ان کی رہنمائی میں وہ اپنے قونصلیٹ تک پہنچ سکتی تھی۔ سلمان کو مجرم ثابت کرسکتی تھی۔ اس نے اتنی خاموشی سے پھانسی کا پھندا اپنے گلے میں کیسے ڈال لیا۔" داؤد اس کا والدہ نامہ سن کر پوچھتا۔

"ایک بڑی غلطی کا خمیازہ اسے بھگتنا پڑا۔" وہ اپنی نیلی نیلی آنکھیں سامنے خلا میں ٹکاتے ہوئے کہتی۔ "وہ وہاں سے بھی اپنے ماں باپ کو دھوکا دے کر میرے باپ سے شادی کرکے نکلی تھی۔ دونوں نے نانا' نانی کے تین اوون اور دوسرے بیکنگ ٹولز بھی اڑا لیے تھے' شاید ڈیڈی نے اسے مستقبل کے بارے میں' پاکستان کے بارے میں کوئی لمبے سنہرے خواب دکھائے تھے۔"

"پھر بھی۔۔۔ پھر بھی وہ بہت کچھ کرسکتی تھی۔" داؤد نے اصرار کیا۔

"ڈیڈی کی زندگی میں اسے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ ڈیڈی کے بعد سلمان نے ممی کو پاؤڈر پر لگا دیا۔ پاؤڈر تم جانتے ہونا!" اس نے دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی کو انگوٹھے سے مسلتے ہوئے پوچھا۔

"ہوں۔"

"پاؤڈر پر لگنے کے بعد وہ سلمان کے اشاروں پر چلنے لگی۔ وہیں سے اس کا ذہنی زوال شروع ہوگیا' جب بھی وہ پاؤڈر کے نشے سے باہر آتی اسے احساس ہوتا کہ وہ کیا کررہی ہے' وہ سلمان کی منتیں کرتی اسے واپس جانے دے مگر سلمان کو اس کا بڑا فائدہ تھا۔ نشے میں بھی وہ جانوروں کی طرح کام کرتی تھی۔ بیکری کے نام پر روزگار کا ذریعہ چلتا تھا۔ ممی کے بنائے بٹر کوکیز کے ذریعے سلمان اونچے لوگوں تک پہنچا تھا۔ ممی کو واپس بھجوانے کی غلطی وہ کیسے کرسکتا تھا۔ ممی نشے میں اکثر سلمان سے جھگڑا کرنے لگی۔ اسے اپنا وہ پاسپورٹ چاہیے تھا جو سلمان نے اپنے قبضے میں کر رکھا تھا۔ مگر سلمان نے اس سے کہا وہ اسے پاسپورٹ ضرور دے گا اگر وہ اس سے نکاح کرلے۔ وہ سلمان کے اس ٹریپ میں پھنس گئی اور اپنے رہے سہے پر بھی کٹوا بیٹھی۔ نکاح کے بعد ممی سلمان کی بیوی تھی جو اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر سانس بھی نہیں لے سکتی تھی۔ نشے کی عادت' سلمان کی جابر طبیعت' اس کی مار پیٹ اور دھمکیوں نے ممی کو گیدڑ بنا دیا۔ وہ گھگھیانے' ہاتھ جوڑنے' مار کھانے اور اپنی چوٹیں سہلانے سے آگے بڑھ ہی نہیں سکی اور جب بڑھنے کی کوشش کی تو سلمان کے ہاتھوں اپنے بازو اور ٹانگیں تڑوا بیٹھی۔ میری ممی بہت اچھی تھی۔" اس کی نیلی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔

"مت رو! پلیز۔۔۔ میں تمہارے دکھ کو سمجھ سکتا ہوں۔"

داؤد کو پتا ہی نہیں چلا وہ زینب وقار عرف زینا کو نظر انداز کرنے کی کوشش کرتے کرتے اس کا ہمدرد کیسے بنا' وہ اس لڑکی کے دل کے اندر موجود غم کے پھپھولوں کے پھٹنے اور بہہ جانے کا راستہ کیوں اور کیسے بن گیا۔ اس کو اس لڑکی کے آنسوؤں نے زیر کیا یا اس کے جسمانی و روحانی رستے زخموں نے۔ وہ اس سے وہ اس کی باتوں سے کنارا کرنا چاہتا تھا مگر کر نہیں پا رہا تھا۔

اور اس کی باتیں ہوتی بھی کتنی بے ضرور تھیں۔ عموماً "ممی" کی باتوں سے شروع ہونے والی باتیں۔ "ممی بہت پیاری تھی' وہ سخت محنتی عورت تھی' خالص ڈینش عورت۔ اس کے بال پیارے تھے' اس کی آنکھیں ایسی تھی' اس کے ہاتھ ویسے تھے' وہ ڈینش پیسٹری بنانے کی ماہر تھی۔۔۔ لیکن اپنی زندگی کے آخری دنوں میں وہ کچھ بھی نہیں کرسکتی تھی۔ وہ ڈینش پیسٹری کے ذائقے کو یاد کرتی تھی۔ وہ گھر کو یاد کرکے سسکتی تھی۔ وہ دنیا کے بے رحم ترین جانور کے رحم و کرم پر تھی جو اس کو دن بھر کھانے کو سبزیوں کے سوپ

کے ایک پیالے، چند بسکٹس اور ایک آدھ لیمن ٹارٹ کے سوا کچھ نہیں دیتا تھا۔ وہ کہتا تھا اگر یہ معذور، خبیث عورت زیادہ کھائے گی تو اس کا گند کون سمیٹے گا۔ آخر میں ممی کے اوپری اور نچلے دھڑ کا آپس میں تمام حسیاتی تعلق ختم ہو گیا۔ نیچے کا دھڑ بے حس ہو چکا تھا۔" اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگتے۔

"اوہ میرے خدا ایسی بے رحمی!" داؤد صحیح معنوں میں سرتاپا کانپ جاتا۔

"تم ڈینش پیسٹری کھاؤ گے؟" اداسی کی گہرائی میں جاتے جاتے وہ اچانک کوئی ایسی بات کر دیتی اور داؤد کو اس کی معصومیت پر حیرت ہوتی۔ وہ لڑاکا، بدتہذیب اور منہ پھٹ لڑکی جس کو اس نے سلمان کی روزینا بیکری پر بیٹھے سنا تھا اس کے بارے میں اس کا تاثر کیا تھا اور وہ در حقیقت کیا تھی۔

"ڈینش پیسٹری کے لیے جو چیزیں چاہیے ہوتی ہیں وہ تو میرے پاس نہیں ہیں۔" پھر وہ اداسی سے کہتی "لیکن جو کچھ میرے پاس ہے نا اس میں سے تھوڑا چرا کر بچا کر میں تمہارے لیے ایک ڈینش پیسٹری ضرور بناؤں گی۔" اس دن اس نے سرگوشی کے سے انداز میں کہا۔

"میں اپنی ممی کی طرح بہت اچھی بیکر ہوں۔" پھر وہ سر کو ذرا سا اٹھا کر بولی۔

"سلمان تھوڑی چیزیں لا کر دیتا ہے۔ لوگ بیکری پر بیکری آئٹمز کم اور نان، شیرمال اور باقرخانیاں زیادہ لینے آتے ہیں۔ دیسی تندور میں پکی چیزیں، جب ہی تو لوگ سلمان کو نان بائی اور مجھے نان بائی کی بیٹی کہتے ہیں۔" اس نے ہونٹ لٹکاتے ہوئے کہا "مجھے نان بائی والے لفظ پر بھی اعتراض نہیں ہے مگر میں اس کی بیٹی کہلانے سے نفرت کرتی ہوں۔ وہ دنیا میں واحد اور آخری شخص بھی ہو تو بھی میں اس کی بیٹی کہلانا نہ چاہوں۔ تم جانتے ہو نفرت کا ذائقہ کیسا ہوتا ہے۔" اس نے داؤد سے پوچھا۔

"ڈارک چاکلیٹ جیسا تلخ۔" داؤد نے یونہی جواب دیا۔

"نہیں۔" اس نے سر ہلایا "ڈارک چاکلیٹ تو بہت مزے کا ہوتا ہے، نفرت کا ذائقہ شاید سانپ کے زہر کی طرح ہوتا ہے جس کو چکھ کر انسان مر جاتا ہے۔"

"مگر تم تو زندہ ہو۔" داؤد نے اس کے صحت مند چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں زندہ تھوڑی ہوں۔" وہ ذرا پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔ "میں تو مشین ہوں جو بس چلتی رہتی ہے، مشین میں تیل ڈلتا ہے، مجھ میں وہ بھی نہیں ڈلتا۔"

"تم اچھی خاصی صحت مند ہو، پھر بھی کہتی ہو تیل نہیں ڈلتا۔"

"یہ۔" وہ اپنے سراپے کی طرف اشارہ کر کے بولی "یہ تو وراثتی جرثوموں کی وجہ سے ہے، ہم ایسے صحت مند ہی ہوتے ہیں۔ ڈینش کنٹری ویمن کا سراپا۔"

"مگر تم تو پاکستانی ہو۔۔۔ ڈینش تو نہیں ہو۔"

"نہیں میں ایک خالص ڈینش لڑکی ہوں۔"

"حالانکہ تم نے ڈنمارک دیکھا بھی نہیں ہوگا۔"

"میں پانچ سال کی تھی جب وہاں سے آئے تھے۔" اس نے کہا "اور ممی نے کوپن ہیگن کے بارے میں مجھے اتنا کچھ بتا رکھا ہے کہ میں وہاں جاؤں تو کونے کونے کو پہچان لوں کہ وہ کون سی جگہ ہے۔ میں ڈینش ہوں، میں کروک پاکستانی نہیں ہوں، مجھے اس بات پر فخر ہوگا کہ میں ڈینش کہلاؤں، مجھے ڈینش کہلانے سے محبت ہے۔"

وہ فخر اور مسرت کے ملے جلے جذبے کے ساتھ آگے بڑھی۔

"میں تمہیں ایک ڈینش کنٹری سائیڈ گیت سناؤں۔" اور وہ جو اسے کہنا چاہتا تھا کہ وہ اتنی گندی کیوں رہتی ہے، اس کی خوشی سے چمکتی آنکھوں کو دیکھ کر چپ رہ گیا۔

اس کے کمرے سے روشنی کا ایک دائرہ سا اس کوٹھری میں روشن تھا جس میں وہ اپنے ویلنگٹن بوٹوں پر دھپ دھپ کرتی کبھی بائیں ٹانگ اوپر اٹھا کر کبھی دائیں ٹانگ گھما کر اپنے صحت مند گول بازو گھماتی اپنے پسندیدہ ڈینش کنٹری سائیڈ گیت سنا رہی تھی۔

Let's party to drive them
around in cirdes
Let's try to send them
to bed
Let's try some playgroup
things
Yeh its the danish way
to rock

وہ ایک قدم آگے بڑھتے اور پھر دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے داؤد کی طرف دیکھتے ہوئے گا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بے فکری اور مسرت تھی۔ اس کے انداز میں ایک عجیب سا تفاخر تھا۔ پھر اس نے گاتے ہوئے ایک گول چکر لگایا اور چکر مکمل کرنے کے بعد عین داؤد کے سامنے رک گئی۔ اس نے تحسین طلب نظروں سے داؤد کو دیکھا اور اسے خاموش دیکھتے ہوئے خود ہی تالیاں پیٹ کر خود کو داد دیتے ہوئے مسکرا دی۔ یوں گھومتے ناچتے اور گاتے ہوئے اس کے سر پر رکھی ٹوپی نیچے گر گئی تھی اور اس کے کندھوں تک آتے الجھے ہوئے سنہری بال روشنی کے دائرے میں سونے کے ایک چھوٹے سے ڈھیر کی مانند چمک رہے تھے۔

داؤد کو اس لمحے میں وہ دنیا کی سب سے خالص، مظلوم اور بے قصور لڑکی لگی جو اپنے دکھ درد اور اذیت کو بھلا کر صرف اس لمحے کی مسرت میں مست تھی جس میں وہ کسی دوسرے شخص کے سامنے اپنی مرضی کی گفتگو اور حرکتیں کر سکتی تھی۔

"تم بہت خوب صورت ہو زینا!" الفاظ بے اختیار داؤد کے منہ سے پھسلے۔ اس کے الفاظ سن کر اس نے خوش ہوتے ہوئے اپنے شانے سکیڑے اور یوں مسکرائی جیسے اسے شرم آ رہی ہو۔

"اور تم دنیا کی سب سے سویٹ لڑکی ہو۔" داؤد نے مزید کہا۔

"کیا میں اپنی ممی کی طرح سویٹ ہوں۔" اس نے بے یقینی سے داؤد کو دیکھا۔

"میں نے تمہاری ممی کو نہیں دیکھا۔ میں نے تمہیں دیکھا ہے زینا اور یہ حقیقت ہے کہ تم سے پہلے میں نے تم سے زیادہ خوب صورت اور سویٹ لڑکی نہیں دیکھی۔"

"تم میرے ساتھ چکر چلا رہے ہو؟" وہ ایک آنکھ بند کر کے بولی۔ اس کے اس جملے نے داؤد کو پریوں کی دنیا سے حقیقت کی دنیا میں لا پھینکا۔

"چکر؟" اس نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔ "کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"تمہارے گھر کے پرلی طرف جو حاجی صاحب ہیں، ان کی بیوی اپنے گھر والوں کو بتا رہی ہوتی ہے کہ شیخ البانڈی میں کون سا لڑکا کس لڑکی سے چکر چلا رہا ہے۔" وہ فرش سے اپنی ٹوپی اٹھا کر اپنے سر پر رکھتے ہوئے بولی۔

"تم لوگوں کی باتیں سنتی ہو کان لگا کر۔" داؤد نے کہا "یہ کتنی بری بات ہے۔"

"میں جان کے نہیں سنتی اوونز چلانے بند کرنے اور بیکنگ بھٹیوں کو چیک کرنے کے دوران اس کی باتیں آپ ہی سنائی دیتی ہیں۔"

"مت سنا کرو ایسی باتیں۔" داؤد نے کہا۔

"تو کیا میں تمہیں ویسے ہی اچھی لگتی ہوں، کوئی چکر وکر نہیں ہے۔" وہ بولی۔

"زینا۔۔۔ تم کل سے کوٹھری میں مت آیا کرو۔۔۔ تمہارے چچا کو پتا چل گیا نا تمہارا قیمہ کر دے گا۔" داؤد نے بات بدل ڈالی۔

"وہ رات کو نشہ کر کے سوتا ہے، نشے کی گولی کھا کر خراٹے مارتا ہے اسے کچھ پتا نہیں ہوتا۔"

"اور فضلو۔"

"فضلو اپنی ریڑھی کے ساتھ سوتا ہے، وہ گھر کے اندر تھوڑی ہوتا ہے۔" اسے اس وقت کسی کے بارے میں کوئی پروا نہیں تھی شاید اس بات کی بھی نہیں کہ وہ پکڑی جاتی تو کیا ہوتا۔

"پھر بھی تم کبھی کبھار آیا کرو نا۔ روزانہ کیوں آجاتی ہو۔" داؤد نے کہا۔ اسے لگا جیسے اگر وہ فوری طور پر منظر

سے نہ ہٹی تو اسے خود پر اختیار نہیں رہے گا اور اس کے دل میں اس لڑکی کے لیے ایسا جذبہ اُتر آئے گا جو اسے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم کر دے گا۔ اسے دو کے درمیان تیسرا شیطان والی کبھی کی سنی بات اس روز سمجھ آنے لگی تھی۔

"میں نہ آیا کروں؟" وہ جیسے ٹھٹک کر پوچھ رہی تھی۔ داؤد نے اپنی زبردستی اس پر سے ہٹائی نظر دوبارہ اس پر ڈالی۔

کالے ویلنگٹن بوٹ، سرخ اسکرٹ، کالی اور سرخ بند کیوں والا بلاؤز، سرخ بغیر آستین کی اوتی جیکٹ میں ملبوس وہ درمیانے قد، صحت مند سراپے، نیلی آنکھوں، سرخ و سفید چہرے اور سنہری بالوں والی لڑکی اسے انتہائی پریشانی کے عالم میں دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں منع کیے جانے کا خوف تھا۔ اس کے چہرے پر اس بچے کا سا تاثر تھا جسے ہمسائے کی غلطی سے آئی گیند کھیلنے کو مل گئی ہو اور کوئی اس سے وہ گیند چھین لینا چاہتا ہو۔

"یہ ٹھیک نہیں ہے نا۔" اس کے چہرے اور آنکھوں کا خوف و پریشانی پڑھنے کے بعد داؤد نے بے بسی سے کہا۔ "سلمان کو پتا چل گیا تو وہ۔۔۔"

"اس کو نہیں پتا چلے گا پلیز۔" وہ التجا کے سے انداز میں بولی۔

"زینا! تم کوشش کرو کہ تم یہاں سے چلی جاؤ۔" داؤد نے اس سے نظریں چُراتے ہوئے کہا۔ "تم اپنے نانا، نانی کا پتا لگانے کی کوشش کرو۔ مجھ سے بن پڑا تو میں تمہاری مدد ضرور کروں گا۔ تمہیں ان کے پاس پہنچانے میں۔"

"لیکن سلمان مجھے جانے نہیں دے گا۔" اس کی آنکھوں میں آنسو اتر آئے۔ "وہ مجھے کسی سے ملنے تک نہیں دیتا۔ اسے ڈر ہے، میں اس کے کرتوتوں کے متعلق سب کو بتا دوں گی۔ وہ میرے یہاں سے نکلنے سے پہلے مجھے مار دے گا۔"

"یار! تم نے پہلے کبھی کیوں کوشش نہیں کی، تمہارے پاس سو طریقے ہیں۔" وہ جھنجلا کر بولا۔

"مجھے اس سے بہت ڈر لگتا ہے۔ اسے اپنے سامنے اکیلے دیکھ کر میرا جسم کانپنے لگتا ہے۔ میں نے اس کے جبر کے نیچے زندگی گزاری ہے، مجھے اس کے سامنے سر اٹھانا نہیں آتا۔"

"پھر بھی تم اسے پٹ پٹ جواب دیتی ہو۔"

"مجھے پتا ہوتا ہے کہ ہر دن کے اختتام پر کسی نہ کسی بات کے بہانے میں نے اس کے ہاتھوں پٹنا تو ہے ہی دن میں لوگوں کے سامنے وہ مجھے کچھ کہہ نہیں سکتا اسی لیے دن بھر جو منہ میں آتا ہے بولتی جاتی ہوں۔" وہ ہونٹ لٹکاتے ہوئے بولی۔

"تم صاف ستھری رہا کرو زینا! تمہیں نہانے اور کپڑے بدلنے سے چڑ ہے کیا؟" جواب میں کچھ دیر تک اسے دیکھتے رہنے کے بعد داؤد نے بالکل ہی مختلف بات کی۔

"میرے پاس بہت کم کپڑے ہیں۔ جو ہیں ان میں سے بھی اکثر ممی کے چھوڑے ہوئے ہیں۔ میں انہیں زیادہ دن اس لیے پہنے رکھتی ہوں کہ بار بار دھلنے سے وہ پھٹ جائیں گے۔ میرے پاس نہانے کا صابن بھی نہیں ہوتا۔ کبھی کبھار سلمان باتھ روم میں صابن چھوڑ جاتا ہے تو میں نہا لیتی ہوں۔ اس لیے مجھے نہانے دھونے، صاف رہنے کی عادت ہی نہیں ہے۔" اس نے سادگی سے جواب دیا۔

"اوہ۔" داؤد کو جھرجھری سی آگئی۔

اس مہذب دنیا میں جہاں کئی لوگ اپنے کتے تک کو نہلانے کے لیے ملازم رکھتے تھے، اس لڑکی جس کا تعلق ایک حوالے سے معاشی طور پر ایک مضبوط ملک سے بھی بنتا تھا، جبرا" اور استحصال کا اس طرح شکار تھی کہ اس نے اسے اپنا مقدر سمجھ کر کبھی اس سے باہر نکلنے کی کوشش کرنے کا سوچا بھی نہیں تھا۔

"اگر انسانی حقوق کی علمبردار کسی تنظیم کو زینب وقار کے بارے میں علم ہو جاتا تو وہ اس کے لیے کیا کر سکتی تھی۔" داؤد سوچ میں پڑ گیا۔

☼ ☼ ☼
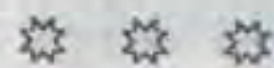
"اف تم جن کا بتا رہے ہو وہ تو کرپشن لگتے ہیں

ساری باتوں سے۔" بہت دن تک سوچ سوچ کر ہارنے کے بعد وہ زینب وقار کا تذکرہ ہما سے کر بیٹھا جس سے اب تک وہ کافی بے تکلف ہو چکا تھا۔

"تم جانتے ہو کہ جس علاقے میں تم رہ رہے ہو اس کی شہرت نہ صرف خراب بلکہ خطرناک بھی ہے۔" کتنا کہتی ہیں تمہیں امی وہاں سے چلے آؤ۔ ادھر ہمارے گھر میں اوپر نیچے اتنے کمرے خالی ہیں، مگر بھئی تمہارا تو دماغ ہی بہت اونچا ہے، خودی، خودداری، عزت نفس اور نجانے کون کون سے بڑے لفظ تمہارے دماغ میں سمائے بیٹھے ہیں، جو تمہیں نہ تو کہیں ڈھنگ سے رہنے دے رہے ہیں نہ خود اپنے لیے اور اپنی امی کے لیے سکون میسر ہونے دے رہے ہیں۔"

اس کی آواز میں استادوں والا رعب تھا اور دبدبہ بھی۔ داؤد کو اس سے بات کر کے ہمیشہ مرعوبیت کا احساس ہوتا تھا۔ اس کے بقول وہ داؤد سے چند ماہ بڑی تھی مگر وہ اس سے یوں بات کرتی اور اسے اس کی کوتاہیوں کا ایسے احساس دلاتی جیسے اس سے نجانے کتنے سال بڑی ہو۔

"اس بات سے علاقے کا کیا تعلق ہے۔" اس نے ہما کی ساری باتیں نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "اس کا تعلق کسی بھی اور چیز سے نہیں صرف انسانیت سے ہے۔"

"اوہو انسانیت۔" وہ مذاق اُڑانے کے سے انداز میں بولی۔ "کوئی بھی لڑکی آدھی رات کو تمہاری کھڑکیاں کھٹکھٹا کر تمہیں بتائے کہ اس پر تو بڑا ظلم ہو رہا ہے تو تم انسانیت کے نام پر اس کی مدد کرنے چل پڑو گے۔ واہ کیا بات ہے۔" اس نے سر جھٹکا "لگتا ہے تمہاری امی کو بتانا ہی پڑے گا کہ جس علاقے میں تم رہ رہے ہو اس کی شہرت یوں ہی خراب نہیں۔ اب تو آپ کا بیٹا بھی اس کی لپیٹ میں آ رہا ہے۔"

"پلیز امی سے تذکرہ مت کرنا۔" داؤد گھبرا گیا۔ "میں نے تم سے یہ بات صرف اس لیے شیئر کی ہے کہ شاید تم مجھے میرے کنفیوژن سے نکلنے میں کوئی مدد

دو، لیکن تم تو مجھے مزید کنفیوز کر رہی ہو۔"

"کنفیوژن۔" اس نے تیوری چڑھاتے ہوئے دہرایا۔ "اس بات میں بھی کوئی کنفیوژن ہے کیا؟ یہ تو سیدھا سیدھا بلیک میلنگ کیس ہے، کریمنل چچا کی بھتیجی اتنی شریف زادی کیسے ہو سکتی ہے جبکہ اسے اس بات میں کوئی عار محسوس نہیں ہوتا کہ وہ آدھی رات کو غیر اور جوان لڑکے کی کھڑکیاں بجا کر اسے اپنے ڈولے اور ٹانگیں اور پشت دکھا دکھا کر یہ بتائے کہ وہ کتنی زخمی ہے اور اسے اس کے چچا نے دن بھر کتنا پیٹا ہے۔۔۔ بتاؤ جو بھی یہ بات سنے گا وہ کیا مجھ سے مختلف رائے دے گا۔"

"کریمنل چچا کی شریف زادی بھتیجی۔۔۔ ڈولے، ٹانگیں اور پشت۔" داؤد کو ہما کے الفاظ کی سفاکی پر حیرت ہوئی۔

سانولی رنگت، دبلے پتلے سراپے اور قطعی معمولی نقوش والی وہ لڑکی اتنی صاف گو بلکہ منہ پھٹ تھی کہ اسے باتوں پر نرمی کا غلاف چڑھانا بالکل نہیں آتا تھا۔ وہ صاف، سیدھے انداز میں بات کرنے کی عادی تھی، چاہے اس کے الفاظ کتنے ہی سخت اور کھردرے کیوں نہ ہوں۔

"کیا تم واقعی ٹیچر ہو اور بچے پڑھاتی ہو؟" اس نے سوال کیا۔

"ہاں میں ٹیچر ہوں اور بچوں کو دنیاوی تعلیم کے ساتھ اخلاقیات اور کردار سازی کے اسباق بھی پڑھاتی ہوں۔" اس نے جواب دیا۔ "مجھے یقین ہے یہ سبق تم نے بھی پڑھے ہوں گے مگر حیرت ہے تم ایک ایسی لڑکی سے اظہار ہمدردی کر رہے ہو جس کی اصلیت ہی کنفرم نہیں۔"

"اچھا ٹھیک ہے نہیں کرتا ہمدردی اس سے۔" داؤد نے اس منطق کے آگے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔ "تو تمہارا کیا خیال ہے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جانا چاہیے۔"

"بالفرض وہ بڑی ہی مظلوم اور دکھی ہے۔" اس نے اپنا کشیدہ کاری کا فریم ایک طرف رکھتے ہوئے

ناصحانہ انداز میں کہا۔ "لیکن اگر تم اسے نہ ملتے تو بھی تو اس نے اسی حال میں رہنا تھا، تم سمجھو تم اس سے ملے ہی نہیں۔"

"کیسے سمجھ لوں۔" وہ جھنجلاتا ہوا بولا۔

"اُفوہ داؤد! تم سمجھتے کیوں نہیں۔ وہ علاقہ ایسے ہی شاطر اور مجرمانہ ذہن کے لوگوں سے بھرا پڑا ہے، تم کیوں خوامخواہ خود کو ان لوگوں کے معاملات میں الجھانا چاہتے ہو۔" اس نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔ "اچھا ٹھیک ہے، تم میری بات نہیں سمجھ رہے نا۔ تو رکو میں امی سے سارا معاملہ کہتی ہوں۔ وہ خود تمہیں گواہی دیں گی کہ اس شہر میں بدنام ترین علاقہ کون سا ہے۔ امی، امی!" اس نے اپنا رخ باورچی خانے کی طرف پھیرتے ہوئے اونچی آواز میں پکار کر کہا۔

"کیا کر رہی ہو؟" داؤد نے تیزی سے کہا "پلیز، یہ مت کرو، میں نے تم سے یہ بات شیئر کی ہے۔ عذرا مامی سے کرنی ہوتی تو ڈائریکٹ ان ہی سے کیوں نہ کرلیتا۔"

"کیسے شیئر نہ کروں؟" وہ سنجیدگی سے بولی۔ "مجھے تمہاری فکر ہونے لگی ہے، تم نہ جانے کس طرح کے لوگوں میں جا پھنسے ہو۔"

"کسی طرح کے لوگوں میں بھی نہیں پھنسا میں"۔ داؤد نے دانت پیستے ہوئے زیر لب کہا۔ "سمجھو میں نے کوئی بات کی ہی نہیں۔ نہ ہی تم مزید آپا جان بننے کی کوشش کرو۔" اسے اپنی حماقت پر غصہ آنے لگا۔ کیوں اس لڑکی سے وہ ذکر کر بیٹھا تھا۔

"اب تو دن بڑے ہوگئے داؤد! تم رات کا کھانا یہیں کھا کر جانا، میں نے یخنی والا پلاؤ دم دیا ہے۔" عذرا مامی باورچی خانے سے نکل کر ادھر آئیں۔

"ساتھ میں کوفتے بھی بنا لیتیں۔" ذرا فاصلے پر تخت پوش پر بیٹھی اماں اپنے سلور گرے بالوں میں چاندی کی کنگھی پھیرتے ہوئے بولیں۔

"وہ بھی بنائے ہیں اماں!" عذرا مامی نے کہا۔ "آپ کون سا میرا ہاتھ بٹانے باورچی خانے تک آگئیں مجھے ہلا شیری دے کر قیمہ پیسنے پر لگا دیا اور خود یہاں آکر اپنے ہار سنگھار میں لگ گئیں۔" عذرا مامی شرارت بھرے انداز میں بولیں۔ اماں نے بال سنوارنے کے بعد اپنے ہاتھی دانت سے بنے جیولری باکس سے سفید موتیوں کی مالا نکال کر پہنی اور سنہری کناروں والا دوپٹا سر پر اوڑھ لیا۔

"ہماری اماں کو اس عمر میں بھی میچنگ اور کوالٹی کا خیال رہتا ہے اور ایک یہ میری بچی ہے۔ اسے خبر ہی نہیں کہ جو شال اس نے اوڑھ رکھی ہے اس کا رنگ کپڑوں کے رنگ سے ملتا بھی ہے کہ نہیں۔" عذرا مامی نے ہما کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہ تو اماں کے بناؤ سنگھار کو کسی نے آکر دیکھنا ہے، نہ ہی میرے رنگ برنگے حلیے کو، اپنی اپنی سوچ کی بات ہے۔" ہما نے جل کر جواب دیا اور اپنا فریم اٹھا کر دوبارہ کپڑے میں سوئی پرونے لگی۔

"سنا ہے، تم اس ہفتے گھر جا رہے ہو بیٹا!" ہما کے نروٹھے پن کو نظر انداز کرتے ہوئے عذرا ممانی نے داؤد کو مخاطب کیا۔

"جی ارادہ تو ہے۔" داؤد نے سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔

"میں نے پرسوں تمہاری اماں سے کہہ دیا تھا کہ داؤد آپ سے ملنے کے لیے آئے تو واپسی پر اس کے ساتھ یہاں چلی آئیے گا، چند دن اکٹھے مل کر رہیں گے۔" انہوں نے کہا۔

"وہ کہاں آئیں گی، انہوں نے تو عمر بھر اپنا گھر اکیلا نہیں چھوڑا۔" داؤد نے کہا۔

"آئیں گی۔ انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا ہے۔" عذرا ممانی نے یقین سے کہا۔

"واہ بھئی۔ آپ کی تو آپس میں خوب دوستی ہوگئی اور مجھے پتا بھی نہیں چلا۔" داؤد مسکرایا۔

"گھنٹہ گھنٹہ بات ہوتی ہے ان کی آپس میں۔" ہما نے دھاگا دانتوں سے کاٹتے ہوئے کہا۔

"کبھی تم ہمارا ٹیلی فون کا بل دیکھو۔ امی کی تو شاید آدھی تنخواہ بل دینے میں ہی چلی جاتی ہو۔"

"مبالغہ کرنا تو کوئی تم سے سیکھے۔" عذرا ممانی نے

ہما کو گھورا۔ "دو گھڑی ہم دونوں آپس میں بات کر لیتی ہیں تو کیا حرج ہے اور وہ جو تم خود داؤد کی امی سے کتنی کتنی لمبی بات کرتی ہو وہ...؟"

"تم بھی امی سے بات کرتی ہو؟" داؤد نے چونک کر پوچھا۔

"ہاں!" وہ بے نیازی سے بولی۔ "وہ مجھے پنجاب کی ریت روایتوں کے بارے میں بتاتی ہیں اور مجھے سننے میں مزا آتا ہے۔"

"کتنا عجیب اتفاق ہے۔" داؤد نے سوچا۔ "عذرا ممانی کو ہمارے خاندان کے اکثر لوگ بھلا چکے تھے صرف میرے اس شہر میں آنے سے یہ تعلق دوبارہ زندہ ہوا اور اب یہ حال ہے کہ میں یہاں آنے کے بعد ابھی واپس جا نہیں پایا اور امی اور ان کے درمیان گاڑھی چھننے لگی۔"

"امی! شہر میں عموماً" اس علاقے کے بارے میں لوگ کیا کہتے ہیں جہاں داؤد رہتا ہے۔" سوئی میں دھاگا ڈالتے ہوئے ہما نے عذرا ممانی سے پوچھا۔ یقیناً" وہ کچھ دیر پہلے ہوئی بات کو چھوڑنے والی نہیں تھی۔

"عام طور پر تو یہ ہی کہا جاتا ہے کہ وہاں کے زیادہ تر لوگ مشکوک سے ہیں۔ انڈر ہینڈ ڈیلنگز کرنے والے لوگ ہیں۔ مگر کہے جانے کا کیا ہے چند لوگوں کی وجہ سے وہاں رہنے والے باقی لوگ یوں ہی بدنام ہیں۔" عذرا ممانی نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"مجھ سے پوچھو۔" عذرا ممانی کی جگہ اماں آکر بیٹھ گئیں۔ "میں تو یہیں کی رہنے والی ہوں۔ میں جو اصرار کرتی ہوں کہ ادھر ہی چلے آؤ تو یوں ہی نہیں کرتی۔ وہ علاقہ ہمیشہ سے اسمگلروں، چوروں اور اٹھائی گیروں کا مرکز مشہور ہے۔ ایک سے ایک چار سو بیس اور لٹیرا وہاں کا رہائشی ہے۔ پوری زندگی میں ایک بار میں وہاں گئی تھی ہمارے ایک ملنے والے چند دن وہاں کرائے کے گھر میں جا بسے تھے ان سے ملنے توبہ توبہ کبھی تم نے اس محلے کے نقشے پر غور کیا ہے۔ کیا پر پیچ گلیاں اور گھومتے پھرتے راستے ہیں وہاں کے اتنا پیچیدہ نقشہ کہ آدمی خود اپنے گھر کا راستہ بھول جائے۔ دیوار سے دیوار جڑی، چھت سے چھت۔ کچھ پتا نہیں چلتا کس کے گھر کی چھت کس کے گھر کا صحن ہے۔ میں تو ابھی بھی کہتی ہوں سامان اٹھاؤ یہاں آجاؤ۔ کیا ہماری محبت اور مہمان نوازی میں کچھ کمی پاتے ہو؟"

"نہیں۔" داؤد ان کی بات سنتے ہوئے چونکا۔ "ایسی بات تو نہیں ہے۔"

"یہ نہیں آئے گا وہاں سے۔" ہما نے داؤد کو جتاتی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس کا وہاں دل لگ گیا ہے۔" اس نے لفظ دل پر زور دیتے ہوئے کہا۔

داؤد نے جھلا کر چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔

☼ ☼ ☼

"کتنی محبت اور مروت والے لوگ ہیں وہ۔" چھٹی پر گھر آنے کے بعد امی کے منہ سے عذرا ممانی، اماں اور ہما کے لیے یہ جملہ اس نے کئی بار ہی سنا۔

"اتنے پیار سے فون کرتی ہیں اور اتنی اپنائیت سے مسئلے شیئر کرتی ہیں کہ مجھے تو مانو کسی اور رشتہ دار کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔"

"میرے متعلق بھی کوئی بات کرلیں امی!" داؤد نے اپنے پالتو طوطے کے پروں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ وہ اس طوطے کے لیے بھی سخت اداس تھا جو اسے دیکھ کر پھدک پھدک کر "داؤد آیا، داؤد آیا" کا شور مچانے لگا تھا۔

"تمہاری وجہ سے ہی تو میں ان کی مشکور ہوں زیادہ۔" امی نے کہا "کتنا وہ تمہارا خیال رکھتی ہیں۔ خود ہی تو خطوں میں ان کی تعریفوں کے پل باندھتے رہے ہو۔ مجھے لانڈری سے کپڑے دھلوانے نہیں دیتیں۔ ویک اینڈ پر میلے کپڑوں کا شاپر ان کے گھر چھوڑ آتا ہوں۔ اگلے ویک پر دھلے دھلائے استری شدہ کپڑے مل جاتے ہیں۔ میری پسند پوچھ پوچھ کر کھانے بناتی ہیں۔ ان کے ہاتھ میں ذائقہ بہت ہے۔ اماں شطرنج بہت اچھا کھیلتی ہیں۔ عذرا ممانی کے پاس بیگم اختر کی غزلوں اور ٹھمریوں کے کیسٹ بڑے زبردست ہیں۔ ہما کے پاس پڑھنے کو بہت اچھی کتابیں ہیں۔ ان

کے گھر کا ماحول بہت اچھا ہے۔" امی کہتے کہتے رک گئیں "کہو تو سارے خطوط لا کر تمہیں دوبارہ سے پڑھادوں میں نے سب سنبھال کر رکھے ہیں۔"
"تو کون سا مکر رہا ہوں۔" اس نے کہا "جو محسوس کیا آپ کو لکھ دیا' آپ کو شاید اندازا نہیں کہ پردیس میں کسی اپنے کی مانوس تصویر بھی نظر آجائے تو آنکھوں کو اچھی لگتی ہے وہ تو جیتے جاگتے لوگ ہیں۔"
"ہاں تو اسی لیے تو ان کی تعریفیں کرتی ہوں۔ میں تمہاری طرف سے بے فکر ہو گئی ہوں صرف ان کی وجہ سے۔"
"اچھا یہ بتاؤ۔ وہ لڑکی کیسی ہے۔ وہ ہما؟" ایک رات امی نے باتوں کے دوران اچانک پوچھا۔
"وہ۔" وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ "اچھی ہے مگر خوامخواہ بڑی بن کر مجھ پر رعب جمانے کی کوشش کرتی ہے۔ تھوڑی بد مزاج بھی ہے۔"
"بد مزاج تو بالکل بھی نہیں ہے۔" امی نے کہا "مجھ سے تو فون پر اکثر باتیں کرتی ہے اور اتنی دلچسپ باتیں سناتی ہے کہ مزا آجاتا ہے۔"
"آپ نے اسے دیکھا نہیں نا ابھی۔ وہ اسکول ٹیچر ہے اور گھر میں بھی اس کا رویہ ٹیچرز والا ہی ہوتا ہے۔ وہ ڈکٹیشن دینے کی عادی ہو چکی ہے شاید۔" داؤد کو ہما سے ہوئی حالیہ بحث ابھی بھولی نہیں تھی۔
لیکن اسے محسوس ہوا کہ امی پر عذرا ممانی' اماں اور ہما کی خوش مزاجی کی دھاک خوب بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی واپسی پر امی نے ان تینوں کے لیے تحائف بھجوائے تھے۔ عذرا ممانی کو امی کے بھیجے تحائف پسند آئے تھے لیکن خود امی کے داؤد کے ساتھ نہ آنے پر افسوس بھی ہو رہا تھا۔
اس رات اتنے دن گھر گزارنے کے بعد اس کمرے کا ماحول ایکدم پھر سے اجنبی لگنے لگا تھا۔ اسے کتنی دیر ہی نیند نہیں آئی۔ پو پھٹنے سے کچھ دیر پہلے اسے خیال آیا کہ اتنے دن بعد گھر سے واپسی کی اداسی کے ساتھ وہ لاشعوری طور پر زینب وقار کی دستک کا بھی انتظار کرتا رہا تھا۔ یہ خیال آنے پر اس نے کھڑکی کھول کر دوسری جانب دیکھا۔ اس طرف مکمل تاریکی تھی' مطلب دوسری جانب کوئی موجود نہیں تھا۔
پتا نہیں وہ کیوں نہیں آئی۔ گھر جانے سے پہلے میں نے اسے بتایا تو تھا کہ کب واپس آؤں گا' پھر بھی وہ نہیں آئی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اس کے بارے میں اور اس کے نہ آنے کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ لیکن اس کے بعد پورا ہفتہ گزر گیا اس کی کھڑکی پر دستک نہیں ہوئی۔
"وہ خیریت سے تو ہے۔" پورا ہفتہ گزر جانے کے بعد اسے وہم ستانے لگا۔ وہ سلمان کی روزیٹا بیکری کا رخ تک نہ کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا لیکن اس کے دل میں زینب وقار سے متعلق اٹھتے وہم اسے ایک بار پھر پرانے راستے پر چلا کر روزیٹا بیکری تک لے گئے تھے۔
مرنجان مرنج بظاہر شریف صورت سلمان انور کالی پتلون پر چیک شرٹ اور اپنے مخصوص گیلس لگائے نرم کپڑے سے شیشے کے کاؤنٹر چمکانے میں مشغول تھا۔
"ارے داؤد صاحب!" داؤد کو سامنے پانے پر وہ جیسے کھل اٹھا تھا۔ گلی کی طرف کھلنے والا چھوٹا سا دروازہ کھول کر وہ اس کے قریب آکر اسے گلے سے لگانا چاہتا تھا۔
"السلام علیکم!" داؤد دانستہ دو قدم پیچھے ہٹا اور اپنا ہاتھ سلمان کی طرف بڑھا دیا۔ سلمان نے ایک نظر اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ پر ڈالی اور پھر کوئی ردِ عمل ظاہر کیے بغیر گرمجوشی سے اس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔ "کدھر غائب ہو گئے تھے' میں سمجھا ناراض ہو گئے ہم سے۔" اس نے چھوٹا دروازہ کھولا اور داؤد کو اندر آنے کی دعوت دی۔
"بس میں سائٹ پر زیادہ مصروف ہو گیا۔ کام تیزی پکڑ گیا ہے اس لیے۔" داؤد نے سلمان کی پیش کردہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ وہ کن اکھیوں سے گھر کے اندر کھلنے والے چھوٹے دروازے کو دیکھ رہا تھا۔
"اچھا اچھا!" سلمان نے مسکرا کر کہا اور جھک کر کاؤنٹر سے پف پیسٹری نکالنے لگا۔

"نہیں سلمان صاحب! میں کچھ نہیں کھاؤں گا۔" داؤد نے اس کا ارادہ بھانپتے ہوئے کہا۔
"ارے چکھو تو۔ ہمارا نیا آئٹم۔" وہ پلیٹ میں پیسٹری نکال لایا "زینا۔۔۔ ارے بھئی زینا!" پھر اس نے گھر کی طرف چہرہ کرتے ہوئے آواز لگائی۔
"او، اس کا مطلب وہ خیریت سے ہے۔" سلمان کی پکار پر داؤد کی پسلیوں کا کھنچاؤ قدرے کم ہوا۔
"چائے کی پتی کا جار کدھر ہے زینا!"
"کیا کرو گے پتی کا۔ دو چٹکی پتی باقی ہے۔" اندر سے کرخت مگر کمزور آواز آئی' داؤد کے کان کھڑے ہو گئے۔
"داؤد صاحب آیا ہے۔ اس کے لیے چائے بناؤں گا۔ تم وہ دو چٹکی پتی ہی دے دو۔ تمہاری تو چٹکیاں بھی اتنی بڑی ہیں کہ دو بندوں کے لیے چائے تو بن ہی جائے گی۔" سلمان نے کہا۔
"تو یہ بھی لے لو۔" اندر سے پتی کا جار سلمان کے بڑھے ہاتھ میں پٹخا گیا۔ "سب ختم کروا ڈالو اپنے دوستوں پر ہم سب چاہے بھوکے مر جائیں۔"
"تم سب ہم سب۔" سلمان عجیب سی ہنسی ہنسا اور مڑ کر اسٹوو جلانے لگا۔ داؤد نے دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازے کے آگے لٹکتے پردے کے پیچھے وہ کھڑی تھی۔ وہ بھی داؤد کو دیکھ رہی تھی۔ داؤد نے بے تابی سے ہاتھ کے اشارے سے پوچھا وہ کہاں غائب تھی۔ جواب میں اس کی نیلی آنکھوں سے دو آنسو ٹپکے اور وہ پردے کے پیچھے سے پرے ہٹ گئی۔ داؤد نے بے ساختہ کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن پھر بے بسی سے بند کر لیا۔ وہ اس تک کس طرح پہنچ سکتا تھا۔ اس سے کیسے اس کے بارے میں پوچھ سکتا تھا۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔
"آپ ٹھیک ہیں نا' گھر میں سب خیریت ہے نا؟" اس نے یونہی سلمان سے پوچھ لیا' جو اس کے سامنے مختلف طرح کے بسکٹ رکھ رہا تھا۔
"ہاں سب ٹھیک ہے۔" وہ چائے میں بسکٹ ڈبو کر کھاتا ہوا بولا۔
"آپ کے پاس پاؤڈر تو ہوتا ہوگا۔" داؤد کو خود پتا نہیں تھا کہ اس نے یہ بات کیوں کہی تھی۔
"پاؤڈر!" سلمان کی کہنی ان دونوں کے درمیان رکھی میز پر سے پھسل گئی "کون سا پاؤڈر؟"
"کوکو پاؤڈر۔" داؤد نے اطمینان سے کہا۔
"او، اچھا!" وہ مسکرایا۔ "زینا او زینا!" پھر اس نے رخ گھر کی طرف موڑا۔
"کتنا چاہیے کوکو پاؤڈر؟" اس نے داؤد کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔
"تھوڑا سا۔"
"زینا! تھوڑا سا کوکو پاؤڈر چھوٹے لفافے میں ڈال کر لے آؤ۔" سلمان نے کہا۔
"خالی کوکو پاؤڈر ڈالوں کہ۔۔۔" اندر سے آواز آئی۔
"کوکو پاؤڈر۔۔۔ سمجھتی نہیں ہو کیا؟" سلمان نے کن اکھیوں سے داؤد کو دیکھا۔
چند لمحوں بعد کوکو پاؤڈر پلاسٹک کی ایک چھوٹی تھیلی میں بندھا داؤد کے سامنے تھا۔
"اب میں چلتا ہوں۔" تھیلی پر ایک نظر ڈالنے کے بعد داؤد نے سلمان سے ہاتھ ملایا۔ "اور ہاں یاد آیا۔" چلتے چلتے وہ مڑا۔ "آپ کے ہاں سے چوہے دان مل سکتا ہے کیا ایک آدھ دن کے لیے۔۔۔"
"چوہے دان!" سلمان نے حیرت سے پوچھا۔
"اس کا کیا کرو گے؟"
"میری کھڑکی کے آس پاس ہر رات ایک چوہا پھدکتا رہتا ہے۔" "اسے پکڑنا ہے۔" وہ دانستہ اونچی آواز میں بولا۔ "ویسے اب تو کئی راتوں سے نہیں آیا حالانکہ میں اس کا انتظار کرتا رہتا ہوں۔"
"مر مرا گیا ہوگا۔" سلمان مسکرایا۔
"لیکن پھر بھی احتیاطاً چوہے دان رکھنا چاہیے مجھے۔ آج رات تو ضرور آئے گا۔ ویک اینڈ کی رات زیادہ تنگ کرتا ہے اور آج ویک اینڈ ہے۔" داؤد ایک بار پھر دانستہ بلند آواز میں بولا۔
"زینا۔۔۔! چوہے دان پکڑاؤ بھئی۔" سلمان نے کہا اور کسی گاہک کی آمد پر کاؤنٹر کے قریب جا کر اس کے

لیے کیک پیس ڈبے میں رکھنے لگا۔

چوہے دان پردے سے باہر آیا۔ داؤد نے چوہے دان پکڑتے ہوئے دانستہ وہ گداز ہاتھ بھی پکڑ لیا اور آہستہ سے دبایا۔ "آج رات میں تمہارا انتظار کروں گا چوہے! تم آج تو نہیں بچ سکتے۔" پھر اس نے چوہے دان آنکھوں کے سامنے کرتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔ سلمان نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

"تھینک یو سلمان صاحب! پاؤڈر اور چوہے دان کے لیے۔" اس نے سلمان سے ایک بار پھر ہاتھ ملاتے ہوئے کہا "میرا مطلب ہے کوکو پاؤڈر کے لیے۔" اس نے وضاحت کی اور وہاں سے چلا آیا۔

☼ ☼ ☼

"تم کہاں غائب تھیں۔ آئیں کیوں نہیں اتنے دن سے۔" اس کی توقع کے عین مطابق وہ اس رات کھڑکی کے پار موجود تھی۔

"تم کہتے تھے مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے۔ میں نے سوچا تم ٹھیک کہتے تھے۔" وہ اداس اور چپ چپ سی لگ رہی تھی۔

"نہیں، میں ٹھیک نہیں کہتا تھا۔ تمہیں آنا چاہیے' روزانہ آنا چاہیے۔" الفاظ خود بخود داؤد کے منہ سے پھسلے۔ زینا نے چونک کر داؤد کو دیکھا۔

"ہاں میں سچ کہہ رہا ہوں۔" وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"اس نے تمہارے پیچھے مجھے دوبار بہت مارا۔" وہ داؤد کا اذن سن کر بچوں کی طرح بلکتے ہوئے بولی۔ اسے جیسے نئی زندگی مل گئی تھی۔ جیسے اس کی زبان اپنا دکھ کسی سے کہنے کو بے چین تھی۔

"کیوں؟" داؤد نے مضطرب ہوتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"پولیس کے ہتھے چڑھ گئی فضلو کی ریڑھی۔ اس کے کونوں کھدروں سے پاؤڈر' انجکشن اور سگریٹ نکلے۔"

"پھر؟"

"پھر سلمان نے مجھے بہت مارا۔"

"فضلو کی ریڑھی پکڑے جانے میں تمہارا کیا قصور تھا؟" داؤد نے بے چینی سے کہا۔

"سلمان کا خیال تھا کہ وہ سب چیزیں ریڑھی میں غلط طریقے سے چھپانے میں میرا قصور تھا۔ اس کا خیال تھا میں نے اس کی مخصوص پوشیدہ جگہوں سے وہ چیزیں نکال کر ان کی جگہ بدلی تھی تاکہ فضلو پکڑا جائے۔ میری ہڈیوں میں بہت درد ہوتا ہے۔" اس نے اپنا ہاتھ اپنے گھٹنے پر رکھتے ہوئے کہا۔ "میرے گھٹنے پر اتنی زور کی چوٹ ہے کہ مجھ سے سیڑھیاں نہیں چڑھی جاتیں' میں بہت مشکل سے آئی ہوں آج۔"

"اوہ!" داؤد کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا وہ کیسے اس کا درد بانٹے۔

"میں نے کسی دن اسی طرح مر جانا ہے' کسی کو پتا بھی نہیں چلنا۔" وہ روتے ہوئے بولی۔ "جیسے میری ماں مری تھی۔ جیسے یہ اس کو خاموشی سے دفن کر آیا تھا' مجھ تک کو نہیں پتا میری ماں کی قبر کدھر ہے۔ ویسے کسی کو میری قبر کا بھی پتا نہیں چلے گا۔" اس نے کہا۔ "میری ماں کو گل داؤدی کے پھول بہت پسند تھے اور مجھے مارننگ گلوری کے پھول بہت پسند ہیں۔ نہ اس کی قبر پر کبھی گل داؤدی کے پھول چڑھے نہ میری قبر پر کبھی مارننگ گلوری کے پھول چڑھیں گے۔"

"اتنی مایوسی کی باتیں مت کرو زینا!" داؤد نے ایک بار پھر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "میں تمہیں اتنی آسانی سے مرنے نہیں دوں گا۔"

"تم!" وہ بے بسی سے مسکرائی۔ "تم کیا کرلو گے؟"

"میں۔" داؤد نے ایک لمحے کے لیے خلا میں دیکھا۔ "میں تمہیں یہاں سے بھگا کر لے جاؤں گا۔ پھر میں تم سے شادی کروں گا۔ تمہاری زندگی کے سارے دکھ درد تمہیں بھول جائیں گے۔ میں تمہیں اتنی خوشیاں دوں گا۔"

زینب وقار کا ہاتھ اس کے ہاتھ سے اچانک نکلا اور وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

"تم بھی میرا مذاق اڑا رہے ہو نا۔" اس کی آنکھوں میں بے یقینی اور دکھ اتر آیا "جیسے ارد گرد کے سب لوگ اڑاتے ہیں۔"

"نہیں' میں تمہارا مذاق ہرگز نہیں اڑا رہا۔ میں سنجیدہ ہوں۔" داؤد نے پر یقین لہجے میں کہا۔

"تم مجھ سے شادی کرو گے؟" اس نے ایک بار پھر کہا۔ اس کے آنکھوں میں دکھ کی جگہ حیرت اتر آئی تھی۔

"ہاں بالکل۔" داؤد نے سر ہلایا۔

"مجھ سے؟" اس نے داؤد کی طرف دیکھا۔ "میں جو اتنی موٹی ہوں' گندی ہوں' میلی ہوں۔"

"ہاں تم سے۔" داؤد نے اسے یقین دلایا۔

"قسم کھاؤ۔" اس نے سر ہلا کر کہا۔

"جس کی چاہے قسم لے لو۔" داؤد نے بھی سر ہلایا۔ اس وقت زینب وقار اسے دنیا کی سب سے معصوم' بے ریا' سچی اور کھری لڑکی لگ رہی تھی۔ جس کے چہرے پر پھیلی مسرت' حیرت' بے یقینی اور یقین کا ملا جلا امتزاج دنیا کا سب سے خوب صورت رنگ تھا۔ اس کے صحت مند سرخ و سفید چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ وہ ایک دم شاید شرما بھی گئی تھی۔ اس کے چہرے کی سرخ بڑھنے لگی تھی۔ اپنی ہنسی اور مسکراہٹ کو چھپانے کی کوشش میں اس کے ہونٹوں اور رخساروں کے خم نمایاں ہو رہے تھے۔

داؤد نے دلچسپی سے اس کے چہرے کے تاثر کو دیکھا اور اس کے سنہری بکھرے بالوں پر نظریں جمادیں جو روشنی کے ہالے میں چمک رہے تھے۔

"تم تو مجھے پہلے ہی بہت اچھے لگتے ہو۔" وہ جھکی جھکی نظریں اٹھا کر شرماتے ہوئے بولی۔

"تم تو مجھے گولی مار دینا چاہتی تھیں۔ یاد کرو۔"

"نہیں جی۔" وہ تیزی سے بولی۔ "اس بندوق سے کارتوس کبھی باہر ہی نہیں آتا۔" داؤد بے اختیار ہنس دیا۔

"ایک بات بتاؤ!" اس نے کہا۔

"ہاں پوچھو۔" داؤد نے جواب دیا۔

"سچ؟" وہ بے یقینی سے بولی۔

"ہاں بالکل سچ۔" داؤد نے اسے یقین دلایا۔

☼ ☼ ☼

"تم ہوش میں تو ہو۔" وہ کہہ رہی تھی۔ "مجھے پہلے ہی پتا تھا۔ پہلے ہی اندازہ تھا مجھے اس جرائم پیشہ انسانوں کے علاقے میں رہ کر تم کوئی چاند ضرور چڑھاؤ گے۔"

اس کا بس نہیں چل رہا تھا' وہ داؤد کا سر پھاڑ ڈالے۔

"توبہ استغفار! تم اور اس سے شادی کرو گے۔ اس سے۔ اس نان بائی کی بیٹی سے۔ تم جو ایک اعلا نسب خاندان سے تعلق رکھتے ہو' جس کا ہر فرد اپنی خاندانی نجابت پر فخر کرتا ہے۔ چاہے وہ بچہ ہو' جوان ہو یا بوڑھا۔ اسی خاندان کے ایک فرد تم۔ اس نان بائی کی بیٹی سے شادی کرو گے جس کے بارے میں بغیر پوچھے ہی پتا چلتا ہے کہ کریمنل ہے' بدمعاش ہے' دو نمبری آدمی ہے۔ اوہ میرے اللہ داؤد۔ تم نے اپنے متعلق میری ساری فینٹسیز تباہ کرکے رکھ دیں۔"

وہ واویلا کر رہی تھی' زینا کو برا بھلا رہی تھی۔ داؤد کو برا بھلا کہہ رہی تھی۔ مگر وہ خاموشی سے اس کے سامنے بیٹھا اس کی سن رہا تھا۔

اسے ہما کے سارے ردِ عمل برداشت کرنا تھے کیونکہ اس وقت اور اس معاملے میں صرف وہی تھی' جو اس کی مدد کر سکتی تھی۔ وہ زینب وقار عرف زینا سے شادی کرنے کا مصمم ارادہ کر چکا تھا۔

اسے زینا کے چند دن مخصوص وقت پر کھڑکی پر دستک نہ دینے نے۔ اچانک احساس دلایا تھا کہ اس کا لاشعور' اس کی باتوں' اس کے لہجے اس کے چہرے پر پھیلی معصوم مسکراہٹ اور اس کی میٹھی ہوئی آواز کا اسیر ہو چکا تھا۔ زینا سے اس کی ہمدردی' لگاؤ اور لگاؤ محبت میں کب ڈھلا' اسے خود پتا نہیں چلا تھا اور اب یہ عالم تھا کہ وہ اسے جلد سے جلد اذیت کے اس سمندر سے نکال کر اپنے ساتھ انسانوں کی بستی میں لے جانا چاہتا تھا۔ وہ اسے زندگی کی خوب صورتی کا احساس دلانا

چاہتا تھا' اس کی بے بسی اور مایوسی کو امید' یقین اور خوشی میں بدل ڈالنا چاہتا تھا۔ لیکن اسے اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ اس کام کے لیے اسے کسی نہ کسی کی مدد کی ضرورت تھی۔ وہ یہ مدد کس سے حاصل کرے نادرے یا ہما سے۔

وہ کئی دن تک سوچتا رہا تھا اور پھر اس کا قرعہ ہما کے نام پر نکلا تھا۔ ہما سے پہلے بھی وہ زینا کا ذکر کر چکا تھا اور وہ اسی سے کافی دوستی بھی گانٹھ چکی تھی۔ وہ اس شہر کی رہنے والی تھی اور سمجھ دار بھی تھی۔

"میں ایک بالکل عام سا انسان ہوں' میرے کریڈٹ پر کوئی بڑے کارنامے اور معرکے نہیں ہیں' جو میرے بارے میں تمہارے ذہن کوئی فینٹسی ہو' نہ ہی میرا امیج عظیم انسانوں والا ہے' جو ایک ایسا قدم اٹھانے سے تباہ ہو جائے گا۔" اس نے پر سکون لہجے میں کہا۔

"میں تمہاری نہیں اس خاندان کی بات کر رہی ہوں جس سے تمہارا تعلق ہے۔" ہما نے دہرایا۔

"خاندان' ذات' قبیلے' یہ سب البتہ فینٹسیز میں ضرور شمار ہوتے ہیں۔" داؤد نے کہا۔ "انسانوں کے خود کے بنائے ہوئے بے مقصد معیار۔ انسان کو تو بس اترانے کا کوئی سبب چاہیے ہوتا ہے' کسی اور طرح نہ سہی اعلا حسب نسب کے نام پر ہی سہی۔" اس روز وہ ہما سے کسی طور بھی مرعوب نہ ہونے کا فیصلہ کر کے آیا تھا۔

"تم بس یہ بتاؤ کہ تم میری مدد کرو گی یا نہیں ؟"

"تمہیں میری مدد کی ضرورت کیوں ہے؟" وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ "انسانی خدمت کی ایک منفرد اور اعلا ترین انسانیت کی تاریخ رقم کرنے چلے ہو تو اپنے زور بازو پر بھروسا کرو۔ دوسروں کو مدد کے لیے کیوں پکارتے ہو۔"

"مجھے اپنے زور بازو پر مکمل بھروسا ہے۔" داؤد نے کہا۔ "اور میں جانتا ہوں کہ یہ کام میں خود اکیلے بھی کر سکتا ہوں۔ تم سے صرف اتنا چاہتا ہوں کہ امی تک یہ خبر تم پہنچا دو۔"

"کیا بتاؤں ان کو۔" اس کے لہجے میں طنز کچھ اور بھی شدت سے جھلکا۔ "یہ کہ ان کا بیٹا انسانیت کے نام پر ایک نان بائی کی بیٹی کو اس کی مصیبتوں سے نکالنے کے لیے اس کو بھگا کر اس سے شادی کرنے چلا ہے۔" اس کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ ابھری۔ "انسانیت کا جھنڈا ہی اٹھانا ہے تو ارد گرد آنکھیں کھول کر دیکھو۔ انسانیت تو قدم قدم پر پڑی سسک رہی ہے۔"

"میں قدم قدم پر پڑی سسکتی انسانیت کے دکھ بٹانے کے فی الحال قابل نہیں ہوں لیکن جس ایک دکھ اور اذیت کا مداوا کر سکتا ہوں وہ ضرور کروں گا۔" داؤد کے لہجے میں قطعیت تھی۔ "ٹھیک ہے تم میری مدد نہ کرو۔ تم پر میرا کوئی زور تو نہیں ہے نا' میں خود ہی کچھ سوچتا ہوں۔"

"اچھا رکو۔" وہ اچانک کچھ ڈھیلی پڑی۔ "مجھے کچھ سوچنے دو' میں کرتی ہوں کچھ۔ ایسے کام جلدی میں کرنا حماقت کہلاتی ہے۔" اس کا لہجہ اچانک نرم ہو گیا۔

داؤد کا دل مسکرایا۔ وہ ہما کو قائل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"میں نے اپنا پلان بنا لیا ہے' میں نے سوچ لیا ہے کہ مجھے تم کو یہاں سے کیسے نکالنا ہے۔" اس رات داؤد نے زینا سے کہا۔

"کیسے؟" وہ شاید سخت بے یقینی کا شکار تھی۔ اس روز اس نے سارا دن سوچا تھا اور اسے ایک لمحہ کے لیے بھی یقین نہیں آیا تھا کہ جو اس نے داؤد سے سنا تھا' وہ سچ تھا۔ اسے ایسا ہی لگتا رہا تھا کہ داؤد کی بات بچے کا بہلاوا تھا۔ وہ چند لمحوں کے لیے خوش ہو گئی تھی بس یہ ہی کافی تھا۔

"تمہیں میں اسی سوراخ سے دیوار کے پار نکال کر بھگا لے جاؤں گا۔" داؤد نے مسکرا کر کہا۔

"اس سوراخ سے۔" اس کی نظریں ہارڈ بورڈ کے کٹے ہوئے حصے پر پڑیں۔ "میں اس میں سے کیسے گزر

سکتی ہوں' میں اتنی تو صحت مند ہوں۔"

"کچھ دن کھانا پینا بند کر دو' دبلی ہو جاؤ گی تو آسانی سے نکل آؤ گی۔" اسے زینا کو چھیڑنے میں مزا آ رہا تھا' وہ ایک ایسا کام کرنے جا رہا تھا جس سے اس کی زندگی بامعنی ہو جانے والی تھی۔ "زندگی کسی مقصد کے تحت" کے نعرے پر عمل کرنے والا کام' کسی مصیبت زدہ بے بس انسان کو اس کی عذاب سے نکالنا بھی تو زندگی کا مقصد ہو سکتا تھا۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" اس نے سر ہلایا۔ "میں کل سے کچھ نہیں کھاؤں گی۔"

"بے وقوف! یہ مت کرنا۔" وہ ہنس دیا۔ "میرے پاس تمہیں بھگانے کے کئی طریقے ہیں۔"

"سلمان مجھے گولی مار دے گا۔" اس کا لہجہ خوف سے لرزا۔

"سلمان کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہو گی۔"

"کیا تم واقعی مجھ سے محبت کرتے ہو؟" اس نے اپنی آنکھیں داؤد کے چہرے پر گاڑ دیں۔

"ہاں میں تم سے واقعی محبت کرتا ہوں' کیونکہ تم محبت کیے جانے کے لائق ہو۔" داؤد نے کہا۔

"میں نے آج بالوں میں صابن مل مل کر انہیں دھویا ہے۔ دیکھو!" اس ایک جملے نے جیسے اس میں نئی توانائی بھر دی۔ وہ اپنے سنہرے گھنگھریالے بال سوراخ سے قریب لا کر بولی۔ ان سے کسی نا مکون سوپ کی خوشبو آ رہی تھی۔

"ہوں۔" داؤد نے اس کے بالوں کو سونگھا اور بے ساختہ جھجکا سا کھا کر پیچھے ہٹا۔

"میں نہائی بھی تھی آج۔" اس نے اپنا گدبدا ہاتھ آگے بڑھایا۔ "آج میں نے بہار کے موسم کے کپڑے بھی پہنے ہیں۔" اس نے سفید کپڑے پر ہلکے سبز پتوں کے پرنٹ والا اسکرٹ لہرایا۔ یہ اسکرٹ پرانا اور گھسا ہوا مگر دھلا ہوا تھا۔

"تمہارے زخم ٹھیک ہوئے؟" داؤد کو اس کے بازوؤں پر پڑے چوٹوں کے نشان دیکھ کر یاد آیا۔

"میرے زخم بڑے ڈھیٹ ہیں' خود ہی ٹھیک ہو جاتے ہیں۔" وہ مسکرا کر بولی۔ "یہ دیکھو میں نے تمہارے لیے کیرامل ٹافی بنائی ہے اور ایپل پائی بھی۔" اس نے اندھیرے میں ڈوبے فرش سے ایک ڈبا اٹھا کر داؤد کی طرف بڑھایا۔ "میرے پاس صرف ایک سبز سیب تھا۔" اس نے انگلی سے اشارہ کیا۔ "لیکن ایک چھوٹی ایپل پائی بنانے کے لیے کافی تھا۔" وہ شرما کر بولی۔

"بہت مزے کی ہے۔" داؤد نے ایپل پائی کا ایک ٹکڑا منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔

"چلو تم سے شادی کرنے کا ایک فائدہ یہ بھی ہو گا' میرے گھر میں بیکنگ خوب مزے کی ہوا کرے گی۔" وہ مسکرایا۔

"شادی۔" اس کا چہرہ مزید لال ہونے لگا۔ "کیا تم میرے لیے ایک الیکٹرک اوون خرید سکو گے۔"

"ضرور۔"

وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

"اچھا کوئی اچھا سا ڈینش گیت تو سناؤ۔" داؤد کو اس کی خوشی پر پیار آ رہا تھا۔

"گیت!" وہ آنکھیں میچ کر یاد کرتے ہوئے بولی۔

"ہاں!" پھر اسے یاد آیا اور وہ دو قدم پیچھے ہٹی۔

Oh what a taxa trimuph
To the sky
They can not overcome
A taximetes escaping through
the sky
Oh what a taxa trimuph
To the sky to the sky

وہ ہوا میں بازو گھماتی' ٹانگ اٹھا کر لہراتی' گھومتی گا رہی تھی۔ گیت ختم کر کے سیدھی ہوتے ہوئے وہ زور سے ہنسی تھی اور پھر ہنستی ہی چلی گئی۔ وہ بہت خوش تھی۔ اس کی خوشی اتنی سچی تھی کہ اس پر بناوٹ کا گمان کیا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ اس کی بے ساختہ ہنسی اور لال گلابی چہرے کو دیکھتے ہوئے داؤد سوچ رہا تھا۔

"اس کی زندگی کیسی جہت اختیار کرنے والی تھی۔"

☆ ☆ ☆

"تمہیں پتا ہے آج میں اسکول سے واپسی پر ادھر گئی۔ اس علاقے میں جہاں تم رہتے ہو۔" اگلے ہفتے دن ہما نے اسے بتایا۔ "صرف تمہارے لیے' ورنہ عمر بھر ہم نے اس طرف قدم نہیں اٹھایا۔" وہ احسان جتانا چاہ رہی تھی۔

"ارے میں ممنون ہوں۔" داؤد خوش ہو گیا۔ "پھر تم نے وہاں جا کر کیا کیا۔"

"کرنا کیا تھا۔" وہ ہاتھ ہلاتے ہوئے بولی۔ "اس کم بخت نان بائی کے تندور کو ڈھونڈتی ڈھانڈتی اس تک پہنچی۔"

"صرف تندور نہیں بیکری بھی۔" داؤد نے تصحیح کی۔

"چلو بیکری ہی سہی۔" اس نے سر جھٹکا۔ "اب تو تم اس جگہ کو جتنا بھی آنر دینے کی کوشش کرو' کم ہے۔"

"آگے بتاؤ' تم نے کیا کیا"

"تمہارا نان بائی تو دکان پر تھا نہیں۔ ایک احمق سا گدھوں رالیں ٹپکا رہا تھا وہاں کھڑا۔" اس نے درست لہجے میں بتایا۔

"وہ فضلو ہو گا۔۔۔ پھر؟"

"پھر میں نے اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ کس راستے اور کس طریقے سے اس پیچیدہ ترین علاقے سے لڑکی کو بھگایا جا سکتا ہے۔" اس کی اگلی بات نے داؤد کو مزید خوش کر دیا۔ وہ سنجیدگی سے اس کی مدد کرنے پر خود کو آمادہ کر چکی تھی۔

"پھر۔۔۔؟"

"پھر کیا۔" اس نے سر جھٹکا۔ "ابھی میں سوچ رہی تھی کہ تمہاری انسانیت اور محبوبہ مجسم میری نظروں کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ اس کو دیکھ کر میرا دل ڈول گیا۔"

"کیوں؟"

"پوچھتے ہو کیا وہ ڈپٹ کر بولی۔ "داؤد تمہاری کوئی استھیٹک سینس پہلے بھی تھی کہ اب مری ہے۔"

"کیا مطلب۔" وہ چونکا۔

"تم ایک لڑکی کو بھگانے کا منصوبہ بنا رہے ہو یا ایک ڈینش گائے کو۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہو۔"

"تو اور کیا۔" وہ پہلو بدلتے ہوئے بولی۔ "اس کو دیکھ کر مجھے عرصے بعد ریڈ ڈینش گائے کا خیال آ گیا جس کی تصویریں میں نے ایک رسالے میں دیکھی تھیں۔ لڑکی تو وہ کہیں سے بھی نہیں لگتی۔" اس نے داؤد کی طرف دیکھا۔

"کیا! تم اس کی انسلٹ کر رہی ہو۔" داؤد یکدم برا مانتے ہوئے بولا۔

"برا مانتے ہو تو مانتے رہو۔ وہ لڑکی تو کہیں سے بھی نہیں لگتی' سرخ ڈینش گائے جس پر کہیں کہیں سفید چتریاں پڑی ہوں۔"

"آئی ایم سوری ہما! تمہاری سوچ۔۔۔" داؤد بالکل برا مان گیا۔

"کیا میری سوچ بھئی۔" اس نے داؤد کی طرف دیکھا۔ "میں بالکل سچ کہہ رہی ہوں۔ تمہاری امی تو اسے دیکھیں تو بالکل بے ہوش ہو جائیں۔ اسے بھگانے کے لیے تو تمہیں ٹرک بک کرانا پڑے گا اور ٹرک کے پچھلے کھلے حصے میں رسیاں باندھنی ہوں گی۔ مبادا ڈینش گائے چھلانگ لگا کر سڑک پر نہ جا پڑے۔"

"ول یو پلیز شٹ اپ۔" داؤد کو تاؤ آنے لگا۔

"میرا منہ بند کرانے سے کیا ہو گا' جو بھی دیکھے گا یہ ہی کہے گا۔"

"تم نے کبھی انسان کے اندر کی خوب صورتی دیکھنے کی کوشش کی ہوتی تو شاید یہ بکواس نہ کر رہی ہوتیں۔" وہ بھنا کر بولا اور وہاں سے اٹھ گیا۔

"لیکن میں تمہاری امی کو ہرگز نہیں بتا رہی کہ ان کا بیٹا ایک ڈینش گائے کو بھگا کر اس سے شادی کر رہا ہے۔ میں اتنا بڑا صدمہ انہیں پہنچانے کا گناہ نہیں کر سکتی۔" وہ پیچھے سے پکار کر بولی۔

"نہ بتاؤ۔ میں خود بتا دوں گا۔" اس نے غصے میں کہا اور وہاں سے آ گیا۔

☆ ☆ ☆

"میں نے سلمان بیکری والے کے بارے میں پوری معلومات لے لی ہیں بھائی جان! وہ تو پورا بدمعاش آدمی ہے؟ جناب! ادھر جو افغان بستیاں ہیں نا ادھر اس کا آنا جانا ہے۔ اسلحے کا کاروبار بھی کرتا ہے۔ یہ بیکری' تندور سب نظر کا دھوکا ہے بھائی جان! اس آدمی سے بچ کر رہیں۔" نادر اسے بتا رہا تھا۔

"اس کے کاروبار اور تعلقات کے بارے میں مجھے پوری خبر ہے نادر! میرے پاس اس کے کوکو پاؤڈر کا سیمپل ابھی بھی رکھا ہے۔" داؤد نے کہا۔ "مجھے صرف معلوم کرنا ہے کہ کیا سال کا کوئی ایسا دن بھی ہوتا ہے جب وہ گھر پر یا بیکری پر نہیں ہوتا' مطلب وہ کہیں جاتا آتا نہیں گیا۔"

"جاتا ہے بھائی جان!" نادر نے معلومات کی تھیلی سے اور خبر نکالی۔ "ان کے پھیرے ہوتے ہیں۔ مطلب یہ جس نیٹ ورک کے لیے کام کرتے ہیں اس کا ہر رکن اپنی باری پر سرحد پار کرتا ہے اور اپنا ٹاسک مکمل کرنے کے بعد واپس آتا ہے۔ اس کو یہ لوگ پھیرا کہتے ہیں۔ سلمان بھی پھیرے پر جاتا ہے۔"

"بس پھر مجھے یہ پتا کر کے بتاؤ کہ سلمان کا پھیرا کب آنے والا ہے۔"

"خیر تو ہے نا بھائی جان! سلمان کے پھیرے میں آپ کو کیوں دلچسپی ہے۔" نادر نے تجسس ظاہر کیا۔

"یہ میں تمہیں اس وقت بتاؤں گا جب سلمان پھیرے پر جائے گا۔" اس کا ذہن الجھی ہوئی چیزوں کو ترتیب دینے میں مشغول تھا۔

"تم مجھے بتا سکتی ہو کہ سلمان کہیں کب غائب ہوتا ہے۔" اس نے زینا سے پوچھا۔ جواب میں اس نے زبان سے کچھ کہنے کے بجائے نفی میں سر ہلا دیا تھا۔

"کیا تمہیں پتا نہیں چلتا کہ وہ گھر پر ہے یا نہیں۔"

"وہ باہر والے کمرے میں سوتا ہے اور وہاں رات کے وقت کبھی کبھی اس کے پاس اور لوگ بھی آ جاتے ہیں۔ ان دنوں وہ بیکری پر نہیں بیٹھتا' ان دنوں فضلو ریڑھی لے کر جانے کے بجائے بیکری پر بیٹھتا ہے۔ مجھے نہیں پتا وہ یہیں ہوتا ہے یا کہیں چلا جاتا ہے۔" پھر اس نے گھٹی ہوئی آواز میں بتایا۔

"وہ کئی دن غائب رہتا ہے' یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تمہیں پتا نہ ہو' وہ کب غائب ہوتا ہے اور کتنے دن۔" داؤد اپنی الجھن سلجھانے کے چکر میں اس کے لہجے اور انداز پر دھیان نہیں دے رہا تھا۔

"اس کا ہمارے دلوں پر خوف ہی اتنا ہے کہ ہمیں ہر دم اس کے آ جانے کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔ ہمیں کبھی محسوس ہی نہیں ہوا کہ وہ یہاں نہیں ہے۔" وہ آہستہ آواز میں بول رہی تھی۔

"کیا بات ہے زینا! تم اتنی خاموش کیوں ہو آج۔" اچانک داؤد کو خیال آیا۔ وہ اداس بھی تھی اور خاموش بھی۔

"کوئی بھی بات نہیں ہے۔" اس نے سر ہلایا۔ "صرف آج مجھے ممی بہت یاد آ رہی ہیں۔ اس نے آنکھ پر انگلی پھیری اور پھر داؤد کی طرف دیکھا۔ "اس میں انسان کا اپنا تو کوئی قصور نہیں ہوتا نا کہ اس کے ماں باپ مر جاتے ہیں۔ انسان کس خاندان میں پیدا ہوتا ہے۔ یہ بھی خدا کی مرضی ہوتی ہے نا' انسان اپنی مرضی سے تو کسی خاندان میں پیدا نہیں ہوتا۔ پھر بن ماں باپ کے بچے کو معیار سے کم تر خاندانوں کو' بری شکل و صورت کو اتنی حقارت کی نظر سے کیوں دیکھا جاتا ہے۔"

"کس نے دیکھ لیا تمہیں ایسے؟" داؤد نے دیوار کے سوراخ پر رکھے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"کسی نے نہیں۔" اس نے اپنا ہاتھ داؤد کے ہاتھ کے نیچے سے نکالتے ہوئے کہا۔

"زینا!" داؤد نے نرمی سے کہا۔ "کیا بات ہے؟"

"کوئی بات نہیں ہے۔" اس نے سر ہلایا اور پھر داؤد کی طرف دیکھا۔ "وہ لڑکی تمہاری کزن تھی؟"

"کون سی لڑکی؟"

"وہ جو اس روز آئی تھی۔"

"اوہ ہاں!" داؤد کو کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگی۔

"وہ بہت پیاری تھی۔ وہ کہہ رہی تھی مجھے ملنے آئی ہے۔ وہ مجھے دیکھنا چاہتی تھی کیونکہ تم نے اسے بتایا تھا کہ تم مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو۔"

"میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہی نہیں زینا! میں تم سے شادی کرنے والا ہوں۔" داؤد تصحیح کرتے ہوئے کہا۔ "اس لڑکی نے تم سے کوئی اوٹ پٹانگ بات تو نہیں کی؟" اسے خیال آیا۔

"نہیں... اس نے مجھ سے زیادہ بات نہیں کی۔ وہ بس مجھے دیکھے جارہی تھی۔"

"تو تم کو برا لگا وہ تمہیں دیکھے جارہی تھی۔"

"نہیں بلکہ مجھے اچھا لگا۔" اس نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے یقین آگیا کہ تم نے جو شادی کی بات کی تھی، وہ مذاق نہیں تھی۔"

"بہت غلط بات ہے۔" داؤد نے منہ بنایا۔ "تم اس سے پہلے تک میری بات کو سیریس نہیں لے رہی تھیں۔" جواب میں وہ خاموش رہی۔

"آج مجھ سے اسٹون اوون کا ایک حصہ خراب ہوگیا... صبح میری شامت آنے والی ہے۔" پھر جیسے وہ انجانے خوف سے کانپ کر بولی۔

"کیسے خراب ہوگیا اوون۔" داؤد نے گھبرا کر کہا۔

"اس کا ایک حصہ نیچے سے ٹوٹ رہا تھا، میں نے سلمان کو ڈر کے مارے بتایا ہی نہیں اور آج وہ توازن نہ ہونے کی وجہ سے ایک سائڈ سے گر گیا اور بس اب۔" اس کی آواز گھٹ گئی۔ اسی وقت شاید نیچے سے اسے کوئی آواز آئی تھی۔ وہ ایک سیکنڈ میں سوراخ سے پرے ہٹی اور تیزی سے کوٹھڑی سے باہر نکل آگئی۔

"یا اللہ! یہ کیسا پزل ہے میں اسے کیسے کامیابی سے حل کرسکتا ہوں۔" وہ وہیں کھڑا سوچ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"آج سے ڈیڑھ ہفتے کے بعد سلمان کا پھیرا شروع ہونے والا ہے بھائی جان!" چند دن بعد نادر نے اسے بتایا تھا۔ "اب بتائیں اس کے پھیرے میں آپ کا کیا انٹرسٹ ہے۔"

داؤد نے اسے اپنا پلان بتانے میں اس بار ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی تھی۔ اسے کسی کی مدد ہر صورت درکار تھی۔

"آپ تو بہت شریف لگتے ہو بھائی جان! آپ لڑکی بھگاؤ گے؟" نادر بے اختیار ہنس پڑا تھا۔

"پلیز نادر! میں سیریس ہوں۔"

"داؤد بھائی جان! ہے تو یہ نیکی کا کام مگر آپ دیکھیں آپ ابھی ناتجربہ کار ہیں۔ یہاں ملازمت کے لیے آئے ہیں، آپ کن کاموں میں پڑ گئے ہیں۔ اس سلمان اور اس کے ساتھیوں کے ہاتھ بڑے لمبے ہیں۔" نادر نے اسے سمجھایا۔

"تم میرا ساتھ دے رہے ہو یا نہیں؟" داؤد نے اس کی بات کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے کہا۔

"میں دل جان سے حاضر ہوں بھائی جان! آپ سیریس ہیں تو اچھی بات ہے۔ ہم بھی ساتھ کوئی نیکی کما لیں گے۔" وہ بولا۔

"بس تو پھر ڈن ہے، ہم اسے وہاں سے نکال رہے ہیں۔"

"ڈن ہے۔" نادر نے اس سے ہاتھ ملایا۔

☼ ☼ ☼

"کیا واقعی تم مجھے لے جاؤ گے۔" اگلی رات زینا نے داؤد کا پلان سننے کے بعد کہا۔ اس کے بازو پر آستین نہیں تھی۔ سلمان نے اوون ٹوٹنے کی پاداش میں اس کا بازو گرم اوون میں جھونک دیا تھا۔ اس کے بازو پر آبلے پڑے تھے۔ جن پر اس نے ہلدی کا لیپ سا لگایا ہوا تھا۔ داؤد اس کے بازو کی طرف دیکھ نہیں پا رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے اس کا دل چاہا وہ سب احتیاطیں بھول کر اسی وقت ہارڈ بورڈ کی وہ دیوار گرا کر کھڑکی کے راستے اسے اپنے کمرے میں لے آئے اور وہاں سے اسے لے کر اپنے شہر کی طرف کوچ کر جائے۔ مگر اس سوچ پر عمل اور اس کے درمیان مصلحتیں حائل تھیں۔ کمپنی سے اس کا کانٹریکٹ ختم ہونے میں کچھ ٹائم باقی تھا۔ کمپنی کا تجربہ اس کے مستقبل کے لیے بہت اہم تھا۔ سلمان کے یہاں سے غائب ہونے میں کچھ دن باقی تھے۔ "کام منطقی انداز میں ہو تو بہتر ہوتا ہے" اسے یہ زریں قول بھی یاد تھا۔ اسی لیے اس نے زینب وقار کے جلے ہوئے بازو، سسکیوں اور تکلیف کے اظہار پر فی الحال صبر کرلیا تھا۔

"تم ذہنی طور پر تیار رہو، میں جب تمہیں اشارہ دوں، بس تم میرے ساتھ چل دو گی یاد رکھنا!"

اس نے زینا کو سمجھایا۔ "یہاں سے ایک بار نکل جانے کے بعد زندگی تم پر مہربان ہوگی۔ تم دیکھ لینا... پھر آہستہ آہستہ تم بھول جاؤ گی کہ کبھی تم نے یہ تکلیف دہ اذیت بھرے دن دیکھے بھی تھے۔" وہ اسے تسلی دے رہا تھا۔

"ہم اپنے گھر میں کنونشن اوون بھی رکھیں گے اور ریفلنک کیبنٹ بھی۔" وہ اسے مستقبل کے خواب دکھانے لگا۔

"ڈوشیٹر اور ڈورولز بھی۔" وہ اپنی تکلیف بھلا کر خواب دیکھنے لگی۔ "اور ایک اسٹون اوون بھی۔"

"بالکل" داؤد نے کہا۔ "ہم اپنے گھر میں مارننگ گلوری کی بیل بھی لگائیں گے اور گل داؤدی بھی کھلائیں گے۔"

"ہر رنگ میں۔" وہ مسکرائی۔ "ڈیلیا اور للی بھی، اور ارنج میگنولیا بھی۔" اس نے شاید ان پھولوں کو کبھی نہیں دیکھا تھا مگر اپنی ماں کے بتائے نام اسے ازبر تھے۔

"سب کچھ... وہ سب کچھ ہوگا جو تم چاہو گی۔ حتیٰ کہ میں بھی اپنی زندگی ویسی ہی گزاروں گا جیسی تم چاہو گی۔" داؤد نے گرمجوشی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر وعدہ کیا تھا۔ اس کی نیلی آنکھیں جسم کا سارا دکھ اور درد بھلا کر خواب دیکھنے لگی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"میں نے عذرا بھابھی سے وعدہ کرلیا ہے۔ بس تم اس بار آؤ اور مجھے بھی اپنے ساتھ وہاں لے جاؤ۔" امی نے فون پر اسے بتایا تھا۔

"لیکن امی! آپ یہاں آکر کیا کریں گی۔" وہ حیران ہوا۔

"ان لوگوں سے ملوں گی اور کیا کروں گی۔" امی نے بے نیازی سے کہا۔ "روبی دبئی چلی گئی ہے اور اب ادھر آکر مجھے دیکھنے والا کوئی نہیں رہا۔ فاروق اپنی فیملی سمیت کینیڈا جانے کی بھاگ دوڑ کر رہا ہے۔ اس کے متعلق لوگ مجھے آکر خبریں سناتے ہیں۔ مجھ سے وہ سنی نہیں جاتیں۔ بہتر ہے میں کچھ دن کے لیے یہاں سے چلی جاؤں۔" امی اپنے فیصلے پر قائم تھیں۔

"لیکن میں شاید اتنی جلدی نہ آسکوں۔" اس نے اٹکتے ہوئے کہا۔

"پھر میں اکیلی ہی گاڑی پر بیٹھ جاتی ہوں۔ مجھ سے تنہائی اب برداشت نہیں ہوتی۔"

"اکیلی آنے کا تو سوچیے گا بھی نہیں۔" وہ گھبرا گیا۔ "ٹھیک ہے میں آتا ہوں آپ کو لینے۔" اسے امی کی بات ماننی ہی پڑی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ صبح کا وقت تھا اور زینا سے ملاقات ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اسے سہ پہر کی گاڑی سے گھر جانا تھا۔ وہ زینا تک کس طرح یہ پیغام پہنچائے کہ وہ جا رہا تھا۔ اس نے کتنی ہی دیر سوچنے کے بعد کھڑکی کھول کر دیوار کے سوراخ میں ایک رقعہ رکھ دیا۔ رقعے پر اس کے گھر کا ایڈریس، فون نمبر، جانے اور واپس آنے کی تاریخ درج تھی۔

کیا پتا وہ اوپر آبھی پائے کہ نہیں اسے خیال آیا۔ آئے مگر اسے اس رقعے کا پتا نہ چلے۔ کئی طرح کے خیال تھے مگر اس کے پاس اس کے سوا کوئی طریقہ بھی نہیں تھا۔ زینا تک اپنا پیغام پہنچانے کا۔ سلمان کے جانے سے پہلے تو اسے واپس آہی جانا تھا۔ وہ صرف اس کو تسلی دینا چاہتا تھا۔ وہ غائب نہیں ہو رہا تھا واپس آنے والا تھا۔

☼ ☼ ☼

ہمانے سوزوکی سے اتر کر اپنے سامنے کا منظر دیکھا۔ سڑک کے ساتھ جڑی گلی اندر جا رہی تھی۔ وہ کچھ دن پہلے بھی یہ منظر دیکھ چکی تھی۔ اندر جاتی گلی سے جڑی ان گنت داخلی اور بغلی گلیاں تھیں، تنگ اور پر پیچ۔ اونچی نیچی ٹوٹی پھوٹی اینٹوں والی گلیاں جن کے ساتھ ابلتی ہوئی نالیاں تھیں اور جن میں آدھے پورے کپڑے پہنے بچے کھیلتے تھے۔ اسے کئی تنگ گلیوں سے گزر کر ایک نسبتاً کھلی گلی میں جانا تھا، جہاں روزیٹا بیکری قائم شدہ 1971ء کا بیکری ڈسپلے کیس تھا۔ جس کے پیچھے گرے پتلون پر خاکی شرٹ پہنے گیلس لگائے وہ آدمی کھڑا تھا جس سے اسے ملنا تھا۔

☼ ☼ ☼

صحن سے دھوپ ڈھل چکی تھی لیکن وہ ابھی بھی صحن کے کچے فرش پر پاؤں پھیلائے بیٹھی تھی۔ سارے میں مرغیاں کڑ کڑ کرتی پھر رہی تھیں اور بطخیں اپنی چونچوں سے مٹی ادھیڑتی تھیں۔ ٹرکی برتنوں میں اور کھانے کی کھلی چیزوں پر کودتے گزرتے تھے مگر وہ ان میں سے کسی کو نہ تو کوس رہی تھی نہ ہی منع کر رہی تھی۔

اس کی کھلی آنکھیں سامنے دیکھتے ہوئے خلا میں سپنے بن رہی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا جس پر سپنوں کے گھر کا پتا درج تھا اور فون نمبر بھی۔ اسے جلد اس اذیت ناک زندگی سے چھوٹ کر سپنوں کے اس گھر میں جانا تھا، ایک خوش گوار زندگی جس میں وہ سب ہونے والا تھا جو وہ چاہتی تھی۔ وہ اپنی سوچوں میں اتنی گم تھی کہ اسے یہ بھی پتا نہیں چلا کہ ایسا کیا ہوا تھا جو مرغیاں، بطخیں، ٹرکی اور مور اپنی اپنی مخصوص آوازیں لگاتے ادھر ادھر کیوں اڑے اور بھاگے تھے۔ اسے کسی کے بھاری اور تیز قدموں کی آواز بھی سنائی نہیں دی تھی نہ ہی اس نے کسی کو سیڑھیاں چڑھ کر اوپر کوٹھری میں جاتے دیکھا تھا۔ وہ تو بس اس وقت چونک کر اپنے خیالوں سے باہر آئی تھی جب اس نے سلمان کو سیڑھیاں اتر کر تیزی سے اپنی طرف آتے دیکھا تھا۔

☼ ☼ ☼

داؤد کی امی کتنی پیاری اور سوئٹ تھیں۔ وہ جس دن سے ہمارے گھر آئی تھیں، گھر میں کتنی رونق سی ہو گئی تھی۔ وہ اتنی جلدی گھل مل گئی تھیں کہ لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ ہمارے گھر پہلی بار آئی ہیں، لگتا تھا وہ ہمیشہ سے یہیں رہتی رہی تھیں۔ انہیں ہمارا گھر بھی کتنا اچھا لگا تھا۔ اور وہ اتنی ہنرمند تھیں کہ انہوں نے مجھ کو کتنے ہی نئے ہنر بھی سکھا دیے تھے۔ مگر یہ داؤد کتنا عجیب سا ہو گیا تھا، یوں رہتا تھا جیسے جلتے توے پر بیٹھا ہو، ہر وقت ناراض، جلا بھنا، کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا۔ اس کو ہنستے دیکھنے کے لیے دل خواہش ہی کرتا رہ جاتا تھا، وہ تو اس دن بھی کھل کر خوش نہیں ہوا تھا جب اس کا اس کمپنی سے معاہدہ کامیابی سے ختم ہوا تھا جس کے لیے کام کرنے وہ اس شہر میں آیا تھا۔ داؤد کے اس شہر میں آنے سے کتنا کچھ بدل گیا تھا اور ان دو سالوں میں کیا کچھ ہوا تھا۔

میں نے اپنی نظروں کے سامنے داؤد کو ایک ناتجربہ کار، جھینپو اور شرمیلے انسان سے خود اعتماد، ذمہ دار اور سمجھ دار مرد میں ڈھلتے دیکھا تھا۔ شاید داؤد کا وہ تجربہ ناکام رہا تھا جس میں وہ انسانیت کی ایک تاریخی خدمت کرنے چلا تھا کیونکہ اوکاڑہ سے واپس آنے کے بعد اس نے اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کوئی قدم اٹھایا تھا نہ اس کا کبھی تذکرہ کیا تھا۔ شاید جذباتی محبتوں کی عمر ہوتی ہی اتنی کم ہے، کچے جذبے اور کچی محبتیں۔ داؤد کو یہ بات شاید اس تجربے سے گزر کر ہی سمجھ میں آنا تھی، مگر تجربہ تھا تلخ جب ہی تو اس کے بعد وہ ایک خاموش طبع، لیے دیے رہنے والا شخص بن گیا تھا۔

وہ اس وقت بھی کھل کر خوش نہیں ہوا تھا جب اسے ایک بین الاقوامی کنسٹرکشن فرم میں مستقل نوکری کی چٹھی وصول ہوئی تھی۔ پرکشش تنخواہ، گھر ملازم اسے سب مراعات بھی ساتھ مل رہی تھیں، کتنا بے وقوف تھا، وقتی دھچکے کی بنا پر اتنی بڑی خوشی بھی ڈھنگ سے منا نہیں پایا تھا۔

داؤد نے نوکری جوائن کر لی تو اس کی امی دوبارہ اوکاڑہ سے ہمارے یہاں آئیں۔ اس بار وہ ایک حیرت انگیز درخواست کے ساتھ ہمارے یہاں آئی تھیں۔ میں جس کی شادی کی عمر نکل رہی تھی جس کی وجہ سے اماں اور ابا کی نیندیں اڑی ہوئی تھیں، میں شکل و صورت میں بھی کچھ خاص اچھی نہیں تھی۔ گریجویشن کے بعد اسکول ٹیچر بن گئی اور کتنی جلدی اپنی عمر سے بڑی لگنے لگی۔ ہمارے گھر بہت زیادہ لوگوں کا آنا جانا تھا نہ میل ملاقات، تو اہنسا (شادی کا شگون) بھی تو کس طرح۔

داؤد کی آمد انقلابی ثابت ہوئی۔ داؤد تھا بھی تو کتنا ہینڈسم اس کا بات کرنے کا انداز بھی کتنا منفرد اور اعلا تھا اور اب تو اس کی نوکری بھی اتنی پرکشش تھی۔

داؤد کی امی کا میرے لیے شادی کا پیغام لانا یوں ہی تھا جیسے سورج مغرب کے بجائے مشرق سے نکلا ہو۔ تو اہنسا تھا اور کتنے زور سے ہنسا تھا۔ اماں اور امی کو پیام قبول کرنے میں کیا تامل ہو سکتا تھا۔ میں نہیں جانتی کہ اس پیام میں داؤد کی کتنی مرضی شامل تھی، تھی بھی یا نہیں، لیکن مجھے اپنا پتا تھا میں نے جیسے جہان فتح کر لیا تھا۔

داؤد مجھ سے عمر میں چند ماہ چھوٹا تھا مگر اس کی شخصیت میں نجانے کیا جادو تھا کہ میں اپنی پختہ سوچ، ذمہ دارانہ رویوں اور عمر میں کچھ بڑے ہونے کے احساس کے باوجود خود کو اس کے سحر سے بچا نہ پائی تھی۔

آنے والے دنوں میں داؤد کی بیوی بننے کے بعد مجھے اسے یہ باور کرانا تھا کہ ایک خاندانی، اعلا نسب، پڑھی لکھی بیوی اور ڈینش گائے جیسی نانبائی کی بیٹی میں کیا فرق ہوتا ہے۔ مجھے داؤد کے دل کو ٹٹول کر دیکھنا تھا کیا وہاں اب بھی روزیٹا بیکرز کے نانبائی کی بیٹی کا کوئی رنگ باقی تھا۔ اگر تھا تو مجھے اپنے رنگ کے ساتھ اس رنگ پر غالب آنا تھا، یوں کہ بیتے دنوں کی کوئی گرد اس کے دل پر باقی نہ رہے۔

زندگی اتنی آسان تو نہ ہوگی لیکن اسے آسان ہونا بھی نہیں چاہیے۔

آخر میں نے داؤد تک رسائی حاصل کرنے کے لیے کچھ کم خطرہ تو نہیں مول لیا تھا۔ زندگی میں بڑے اور من چاہے کاموں کو کرنے کے لیے کبھی کبھار بڑے رسک بھی لینے پڑ ہی جاتے ہیں۔ ایڈونچر پسند داؤد کی بیوی کو بھی ایڈونچر پسند ہی ہونا چاہیے تھا نا۔

☼ ☼ ☼

Ah haviken taxa trimuph
De kan ikke fa bugt
Oh what a taya trimuph
To the sky
To the sky

دانیہ اسکول میں ہونے والے کسی فنکشن کے لیے اپنی لائنز یاد کر رہی تھی۔ دانیہ کو غیر نصابی سرگرمیوں میں نصابی سرگرمیوں سے زیادہ دلچسپی تھی۔ وہ اس کی سب سے چھیتی بھانجی تھی۔ دانیہ کے پاس سب سے زیادہ سرٹیفکیٹس اور پرائز تھے، لیکن اس کی وجہ امتحانوں میں پوزیشن ہولڈر ہونا نہیں تھا۔ اس بار بھی وہ اسکول میں ہونے والے فنکشن کے لیے سیکنڈے نیوین کنٹری گرل کا رول منتخب کیے بیٹھی کوئی لائنز یاد کر رہی تھی۔

Ah haviken taxa trimuph
Da kan ikke fa bugt

اس نے پڑھتے پڑھتے داؤد کی طرف دیکھا۔

"ماموں! آپ کو اس کا ترجمہ آتا ہے؟" اس نے یونہی ماموں سے پوچھا جو اس کے بار بار یہ لائنز دہرانے پر بری طرح چونک کر اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جواب میں وہ کچھ دیر اسے خالی نظروں سے دیکھتا رہا تھا۔ پھر اس نے سامنے صوفے پر بیٹھی ہما کو دیکھا تھا۔

"نہیں۔" اس نے ہما کو دیکھتے ہوئے کہا تھا اور اپنا

دھیان ٹی وی کی طرف کرلیا۔

"ماموں کا بھی پتا نہیں چلتا' اتنے ریزروڈ' اتنے کم گو' کبھی کبھی تو بالکل ہی ٹرانس میں بیٹھے لگتے ہیں۔ مامی کہتی ہیں تمہارے ماموں نے کچھ زیادہ ہی اسٹڈی کرلی ہے۔" دانیہ نے سر جھٹکا اور اپنی لائنز دہرانے لگی۔

☆ ☆ ☆

زندگی بہت مزے میں گزر رہی ہے سوائے ایک کمی کے زندگی میں کوئی کمی نہیں۔ وقت نے بہت کچھ دیا ہے لیکن ہمارا آنگن سُونا ہے۔ اس میں بچوں کی چہکار نہیں' کبھی کبھی یہ کمی بہت شدت سے محسوس ہوتی ہے لیکن داؤد نے کبھی مجھے اس کا احساس نہیں دلایا۔

داؤد نے زندگی میں محنت کی اور اب وہ گریڈ بائیس پر کام کررہا ہے ہم وفاقی دارالحکومت میں ایک بڑے سرکاری گھر میں رہائش پذیر ہیں۔ اماں اور امی میری قسمت کو دیر سے مگر خوش آئی کہا کرتی تھیں۔

اماں میری شادی کے پانچ سال بعد دنیا سے چلی گئیں۔ امی اور داؤد کی امی دونوں ہمارے ساتھ رہنے لگیں۔ میں نے اور داؤد نے دونوں کی خدمت میں کبھی کوئی کوتاہی نہیں کی۔ میں جب بھی داؤد کو غور سے دیکھتی ہوں میری نظروں کے سامنے بیتے دنوں کے کئی لمحے گھوم جاتے ہیں۔ آج داؤد ایک گریس فل شخصیت' عہدے کے رعب داب اور زندگی کے ٹھاٹھ باٹھ کے ساتھ ایک کامیاب انسان نظر آتا ہے۔

میں نے شادی سے پہلے خود سے عہد کیا تھا کہ میں داؤد کو باور کرادوں گی کہ ایک خاندانی' اعلا نسب' پڑھی لکھی بیوی اور ڈینش گائے جیسی نانبائی کی بیٹی میں کیا فرق ہوتا ہے۔

آج جب میں داؤد کے دل کو ٹٹولتی ہوں تو مجھے اپنے عہد پر ہنسی آتی ہے' ڈینش گائے جیسی نانبائی کی بیٹی تو شاید اسے کبھی بھول کر بھی یاد نہیں آئی۔ اس کا تو کوئی رنگ مجھے کبھی داؤد کی شخصیت کی کسی جھلک میں نظر نہیں آتا۔

آہ میں کتنی احمق تھی۔ یونہی اس بات کے پیچھے خوار ہوئی کہ داؤد کی زندگی میں وہ ڈینش گائے کیسی لگے گی۔ اتنے سالوں بعد میرے اور داؤد کے درمیان ذہنی ہم آہنگی' محبت' احترام اور آسودگی کا رنگ ہے' جس میں کوئی ڈینش گائے' کسی نانبائی کی بیٹی دور دور تک نظر نہیں آتی۔

ہماری شادی میں داؤد کی مرضی شامل تھی یا نہیں تھی' اس سے کیا فرق پڑتا ہے' کیونکہ اتنے سالوں میں' میں نے داؤد کو اپنے سلیقے' محبت' وفاداری اور اطاعت شعاری سے مکمل طور پر پالیا۔ ہے کوئی میرے جیسا دوسرا فاتح تو سامنے آئے۔

☆ ☆ ☆

میں شادی کے بعد صرف ایک دفعہ اوکاڑہ گئی تھی۔ ہم چند دن داؤد کے آبائی گھر میں رہے اور پھر داؤد کی امی ہمارے ساتھ وہاں آگئیں۔ جہاں داؤد کو نئی جاب ملی تھی۔ داؤد کا آبائی گھر بند کردیا گیا۔ داؤد کا بھائی اپنی فیملی کے ساتھ کینیڈا چلا گیا' ایک بہن دبئی اور دوسری کراچی شفٹ ہوگئی۔ اوکاڑہ والا گھر بند ہی رہا۔ داؤد کی امی کو اپنی بیماری اور آخری دنوں کے دوران اوکاڑہ والا گھر بہت یاد آتا تھا۔ مگر وہ سفر کرکے وہاں جا نہیں سکتی تھیں۔ ان کے انتقال کے بعد ان کو اسلام آباد میں ہی دفن کیا گیا۔ داؤد اور اس کی بہنوں کا خیال تھا کہ اوکاڑہ میں ان کی تدفین کے بعد شاید وہ اکثر ان کی قبر پر نہ جا پائیں۔ لہٰذا اسلام آباد ہی میں تدفین کی جائے۔

اوکاڑہ سے داؤد کا تعلق صرف ایک یاد بن کر رہ چکا تھا۔ لیکن کچھ دن پہلے داؤد کے اوکاڑہ میں مقیم ایک عزیز کا فون آیا جنہوں نے اسے بتایا کہ گھر بند رہنے کی وجہ سے خراب ہورہا ہے اور اس کی ایک چھت گر رہی ہے۔ انہوں نے گھر کا ایک خریدار بھی تلاش کر رکھا تھا اور داؤد کو اسی سلسلے میں اوکاڑہ آنے کا کہا تھا۔ آج ہم ان ہی کے بلانے پر اوکاڑہ آئے تھے۔ داؤد آرہا تھا۔ میں یوں ہی اس کے ساتھ ہولی۔ میرا دل چاہا اس گھر کو میں بھی آخری دفعہ ایک نظر دیکھ لوں جہاں میں شادی کے بعد رخصت ہوکر گئی تھی۔

گھر کے تالے کی چابی داؤد ہی کے پاس تھی۔ گھر کا دروازہ اور تالا گرد آلود تھے اور دروازہ کھلنے پر تاریک ڈیوڑھی میں باہر سے آتی روشنی کی لکیر گرد کی ایک واضح تہہ دکھا رہی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر گھر کے صحن کی طرف کھلنے والا دروازہ کھولا۔ صحن کے چاروں طرف برآمدے اور برآمدے سے جڑے مختلف کمرے ویسے کے ویسے تھے جیسے ہم چھوڑ کر گئے تھے۔ میں نے ایک ایک کمرے کا دروازہ کھولا۔ بند کواڑوں کے پیچھے چھپی ہوا دروازے کھلتے ہی اپنی مخصوص مہک کے ساتھ باہر نکلی۔ کچھ کمروں میں چادروں سے ڈھکا سامان رکھا تھا۔

"گھر تو بک جائے گا' اس سامان کا کیا کریں گے۔" میں سوچ رہی تھی۔ پھر میں نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ داؤد باہر ہی کھڑا تھا۔ شاید اسے کوئی پرانا شناسا مل گیا تھا۔ میں داؤد کو دیکھنے واپس ڈیوڑھی میں آئی۔ اسے ڈیوڑھی سے اوپر جاتی گرد آلود سیڑھیوں پر بیٹھے دیکھ کر میں چونک کر آگے بڑھی تھی۔ داؤد کا قیمتی سنہری فریم کا چشمہ سیڑھی کے لکڑی کے کنارے پر رکھا تھا اور وہ آنکھوں پر انگلیاں رکھے دیوار سے سر ٹکائے بیٹھا تھا۔

میں نے حیرت سے داخلی دروازے کی طرف دیکھا۔ جس کا ایک پٹ کھلا اور ایک بند تھا۔ وہاں کوئی موجود نہیں تھا۔ دروازے سے داؤد تک واپس آتی میری نظر دروازے کے بند پٹ میں لگے لیٹر باکس پر پڑی' جس کا ڈھکن کھلا تھا۔

میں نے داؤد کی طرف دیکھا' جس کے قریب ڈاک کے کئی لفافے رکھے تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر وہ لفافے اٹھائے۔ ہر لفافے پر ٹوٹی پھوٹی اردو تحریر میں گھر کا پتا لکھا تھا' ہر چٹھی داؤد کے نام بھیجی گئی تھی۔

"میں تمہیں دو خط پہلے بھی لکھ چکی ہوں' تم نے مجھے جواب دیا' نہ خود آئے۔ میں بہت اذیت میں ہوں۔ تمہاری کزن کی مخبری کے بعد سلمان نے مجھے اور فضلو کو اٹھا کر ایک کیمپ میں لا پھینکا ہے۔ اس نے میری ٹانگوں پر دو' دو فائر کیے۔ میں معذور ہوچکی ہوں۔ اس نے میری جلد سے میرے ناخن اکھاڑ پھینکے ہیں۔ میں ایک عذاب سے گزر کر تمہیں خط لکھ رہی ہوں۔ یہ خط میں شیر دل کو دوں گی' وہ کہتا ہے' وہ یہ خط ڈاک میں ڈال دے گا۔ شیر دل بے چارہ میرا بہت خیال رکھتا ہے۔ مگر تم کہاں ہو۔ تم تو مجھے اپنے گھر لے جانے کے لیے گئے تھے۔ تم نے مجھے لینے آنا تھا۔ تم کہاں ہو داؤد؟"

خط میرے ہاتھ میں لرز رہا تھا۔

میرا دماغ گھوم گیا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے تھے۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے دوسرے لفافے سے چٹھی نکالی۔

"تم نے مجھے جواب نہیں بھیجا۔ پتا نہیں تم تک میرا خط پہنچا کہ نہیں؟ تمہاری کزن کہتی تھی کہ میں بے ماں' باپ کی اولاد ہوں اور میرا تعلق ایک نیچ خاندان سے ہے۔ اس نے کہا کہ مجھ سے شادی کرکے تم اپنے خاندان سے کٹ کر رہ جاؤ گے۔ وہ شاید ٹھیک کہتی تھی۔ مجھ جیسی لڑکی کا زندگی کی کسی خوشی پر شاید کوئی حق نہیں ہوتا۔ میرا کوئی اتا پتا جو نہیں۔ میں ایک نانبائی کی بیٹی جو ہوں۔ میرا چچا ایک کرمنل ہے۔ مجھ سے تعلق جوڑنے پر شاید تم بہت خسارے میں رہتے۔ تم مجھ سے شادی نہ کرتے۔ مگر ایک بار مجھ سے مل تو لو۔ ایک بار آؤ تو سہی۔"

میں نے خوف زدہ نظروں سے داؤد کی طرف دیکھا' جواب بھی آنکھیں بند کیے دیوار سے سر ٹکائے بیٹھا تھا۔

تیسرا خط۔

"میں مر رہی ہوں۔ شاید میں زیادہ دن زندہ نہ رہوں۔ ٹانگوں کے زخموں کا زہر میرے جسم میں پھیل چکا ہے۔ مجھے اپنی ماں کی شکل یاد آتی ہے اور اس کی آواز سنائی دیتی ہے۔

To the sky
To the Sky
what a taxa trimuph

وہ مجھے آسمانوں کی طرف بلاتی ہے۔

______ آسمان کی طرف۔ میں تمہیں یہ خط اس لیے لکھ رہی ہوں کہ ہو سکے تو کبھی آنا۔ میری قبر کا پتا کرنا اور اس پر مارننگ گلوری اور کارنیشن کے پھول رکھنا گل داؤدی اور اورنج میگنولیا لے کر آنا۔ کیا پتا میری ماں کی طرح میری قبر بھی کسی کے علم میں نہ ہو۔ مگر ہو سکے تو آنا۔ تم نے وعدہ کیا تھا نا مارننگ گلوری کا گل داؤدی اور میگنولیا کا۔ ضرور آنا ضرور پتا کرنا۔"

چوتھا خط۔

"آسمانوں کی طرف جانے میں چند ہی دن باقی ہیں۔ اب اپنی ماں کی آواز کے ساتھ مجھے تمہاری آواز بھی آتی ہے تم جو کہتے تھے۔ زینا! تم دنیا کی سب سے سویٹ لڑکی ہو۔ تم جو کہتے تھے۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہی نہیں ہم تم سے شادی کرنے والا ہوں زینا!

میری پوری زندگی میں سنے جانے والے دو خوب صورت ترین دو میٹھے ترین جملے۔ میں سوچتی ہوں کیا ہوتا جو تمہاری کزن کو میں اتنی بری نہ لگتی کیا تھا جو وہ مجھ سے نفرت نہ کرتی اور کیا ہوتا جو وہ سلمان کو ہمارے تعلق کا نہ بتاتی۔ کیا ہوتا جو وہ ثبوت کے طور پر دیوار کا سوراخ اسے نہ دکھاتی۔ مگر شاید میرے جیسی لڑکی کے لیے خوشی لکھی ہی نہیں گئی تھی۔ جب ہی تو اس نے وہ سب کردیا جو میری موت پر ختم ہوگا۔ لیکن زیادہ نہیں صرف ایک پھول پلیز ایک پھول ضرور لے کر آنا۔"

میرے منصوبے میں تو کہیں کوئی جھول ہی نہیں تھا۔ اوکاڑہ سے واپسی پر داؤد کو اس محلے میں روزینا بیکری ملنی تھی نہ ہی سلمان اور اس کی بیٹی۔ سلمان کو میں نے ایسا ہی تو بھڑکایا تھا وہ یا تو اسی روز زینا کو گولی مار دیتا یا اسے وہاں سے غائب کردیتا اور ہوا بھی ایسے ہی۔ اوکاڑہ سے واپسی کے بعد سے آج تک اگرچہ میں نے داؤد کی زبان پر زینا کا تذکرہ کبھی سنا نہ ہی اسے اس کی یاد میں کبھی کھوئے پایا۔ لیکن میں جانتی تھی وہ تذکرہ کرتا بھی کیسے ؟نان بائی کی بیٹی کو بھگا کر اس سے شادی کرنے کا سوال تو جب پیدا ہوتا اگر اس کا اس محلے میں کوئی نام و نشان باقی رہا ہوتا۔

سلمان میرے دیے اس ڈراوے پر ہی تو وہاں سے ایک دن میں بھاگا تھا کہ داؤد اس کے کرتوت اپنی اتھارٹیز کے علم میں لانے والا تھا۔ داؤد کو اوکاڑہ سے واپسی پر نہ نانبائی ملا نہ ہی اس کی بیٹی۔ جب ہی تو وہ گم صم ہوگیا اور زینب وقار کا تذکرہ کرنا ہی بھول گیا۔ میں اپنے پلان کی کامیابی پر خوش اور مطمئن تھی۔ اس کے فیل ہونے کا سوال ہی کیا تھا۔ میں نے کوئی جھول ایسا چھوڑا ہی نہیں تھا کہ داؤد کو میری ذات پر کوئی شک ہوتا۔

میں نے اپنے کانپتے وجود کو قابو میں لانے کی کوشش کرتے ہوئے ڈرتے ڈرتے داؤد کی طرف دیکھا۔ اب وہ بھی سیڑھیوں کی دیوار سے سر ٹکائے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظروں میں میرے لیے ایک واضح پیغام تھا۔ ایک واضح جذبہ۔ کیا کوئی سمجھ سکتا ہے۔ اس جذبے کا نام کیا تھا۔ اتنے برس میں نے اس اطمینان میں گزار دیے کہ میرے اور داؤد کے رشتے میں ذہنی ہم آہنگی محبت آسودگی اور سکون کے سوا کچھ نہیں ہے۔

مگر داؤد کی یہ نظریں مجھے یہ بات کیوں سمجھا رہی تھیں کہ میرے اور اس کے درمیان ہمیشہ سے کوئی موجود تھا اور آج وہ غیر مرئی وجود چھم سے ہمارے درمیان صاف آن کھڑا ہوا تھا۔ اس وجود کے ہاتھ میں میرا گزشتہ اعمال نامہ تھا اور میرے آنے والے دنوں کی تصویریں بھی۔ وقتی جذبہ اور کچی محبت ایک ان مٹ نقش کی طرح اس دل پر گڑی تھی جس کو میں اپنے رنگ میں رنگا دل کہتی تھی۔

میں نے گھبرا کر نظریں چرانے کے بعد ایک بار پھر داؤد کی طرف دیکھا۔ اپنے اور اس کے درمیان ایک طویل فاصلے کے درمیان مجھے سالوں بعد ڈینش گائے کے جیسی نانبائی کی بیٹی پورے استحقاق کے ساتھ کھڑی نظر آرہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"میں جانتا ہوں جو کچھ ہوا تمہارے لیے غیر متوقع ہوگا۔ میں ایک لمحہ کے لیے رک کر سوچوں تو مجھے لگتا ہے کہ یہ میری اپنی توقع کے بھی برعکس ہوا ہے۔

جس دن میں تم سے رخصت ہو رہا تھا میں نے دیکھا شدید دکھ صدمہ حیرانی اور بے یقینی کے رنگ تمہاری آنکھوں میں جم کر رہ گئے تھے۔ حیرانی اور بے یقینی وہاں موجود میری دونوں بہنوں کی آنکھوں میں بھی تھی۔

"یہ کیا؟ یہ کیوں؟ یہ کیسے اور اب کیسے؟"

جیسے ان گنت سوال تھے جو ان دونوں کے لبوں پر آنے کے لیے مچل رہے تھے مگر جانتی تھیں کہ میں زندگی میں کوئی کام بلاوجہ اور بغیر سوچے سمجھے نہیں کیا کرتا اس لیے خاموش رہیں۔

ان کو پتا تھا کہ میری طبیعت کا وہ جذباتی پن لیڈو بچرز کا شوق اور کچھ انوکھا کر دکھانے کی لگن عرصہ ہوا میرے اندر سسکیاں لیتے دم توڑ چکی ہے۔

ان کو یاد تھا جب شادی کے تیسرے سال ہی سے ہماری اولاد نہ ہونے کے باعث انہوں نے دوسری شادی کے لیے اصرار کرنا شروع کردیا تھا۔ گھر کے سونے پن کی وجہ سے انہوں نے کون کون سے الفاظ میں مجھے دوسری شادی کرلینے کے مشورے نہیں دیے تھے۔

تم ان باتوں سے ابھی تک بے خبر تھیں میرا بھی تمہیں ایسی کوئی بات بتانے کا ارادہ نہیں تھا لیکن اب مجبوری یہ ہے کہ زندگی کے چند تلخ حقائق کا تذکرہ کیے بغیر میری بات مکمل نہ ہو سکے گی۔ اسی لیے مجھے یہ بات بھی یاد کرانی پڑ رہی ہے۔

تم جانتی ہو میں اپنی بہنوں کے ان مشوروں پر میں نے کیا جواب دیا تھا۔ میں نے کہا تھا۔

"اگر میرے مقدر میں اولاد ہے تو تم سے ہی ہوگی اور اگر نصیب میں نہیں ہے تو ایک چھوڑ دس اور شادیاں کرلوں اولاد نہیں ہوگی۔"

جانتی ہو میں نے ایسا کیوں کہا تھا میں نے ان کی بات نہ مانتے ہوئے انہیں مایوس کیوں لوٹا دیا تھا؟ اس لیے کہ میں سوچتا تھا۔ خوابوں کے خوب صورت جزیروں میں رہنے والی نرم گرم سپنے بنتی دنیا کے بہترین ادب کی رسیا تاریخ کے خوب صورت ترین کرداروں کی شیدائی حافظ و سعدی کی کانوں میں رس گھولتی شاعری کی پرستار تلک کمود اور بھیرویں کے راگ سننے کی شوقین نرم دل حساس نازک خیالات کی مالک لڑکی اتنا بڑا جذباتی صدمہ کیسے سہ پائے گی کہ وہ شخص جو اس کی سوچوں کا محور اس کی زندگی کی ہر خوشی کا آغاز اور اختتام ہے اسے ایک محض ایک کمی کی وجہ سے چھوڑ کر کسی اور کا ہو جائے۔

ہاں! میں یہ ہی سوچتا تھا کہ میرے نہ ہونے سے تمہاری زندگی کی زمین سے احساس خیالات علم تاریخ شاعری ادب پھول خوشبو راگ اور رنگ کے سارے سوتے خشک ہو جائیں گے۔ تم ایک کتاب To kill a mocking Bird اور نغمے کا قتل اکثر پڑھا کرتی تھیں نا۔ مجھے نجانے کیوں لگتا کہ تم جیسی حساس دل لڑکی کو دکھ دے کر میں بھی کسی mocking bird کسی نغمے کے قتل کا مرتکب ہو جاؤں گا۔

تم جو میرے خیال میں آدمیوں سے بھری دنیا میں چند گنے چنے انسانوں میں سے ایک تھیں۔ تمہیں میں کیسے کوئی دکھ دے سکتا تھا میری زندگی کی ساتھی میرے دکھ سکھ کی ساتھی اپنی محبت کے احساس میں مجھے پور پور بھگو دینے والی۔۔ ایک سراپا محبت عورت۔۔

اور اسی سوچ کے اثر میں میں نے ایک مضبوط فطری خواہش ایک جان دار احساس کا گلا اپنے ہاتھوں سے گھونٹ دیا۔ میں نے اولاد سے محرومی عمر بھر کے لیے قبول کرلی میں نے تمہاری محبت کی زندگی تمہارے احساس کی حیات کے لیے سب کے مشورے ٹھکرا دیے۔

میں نے صرف تمہیں دیکھ کر جینا شروع کردیا' جینا بھی کہاں یوں جانو کہ جینے کی سعی کرتا رہا۔۔۔ کیونکہ میری زندگی تو کئی سال پہلے مجھ سے اس وقت دغا کرگئی تھی جب گھر سے واپسی پر مجھے شیخ البانڈی۔۔۔ کی روزیٹا بیکری قائم شدہ 1971 کے بجائے ایک ڈھنڈار' ویران گھر دیکھنے کو ملا تھا۔ اب وہاں نہ کوئی سلمان تھا' نہ فضلو نہ ان کی بیکری نہ ہی زینب وقار۔۔۔ وہ سب کہاں گئے تھے' ان کو زمین نگل گئی تھی کہ آسمان کھا گیا تھا' میں جتنی کھوج لگاتا اتنا ہی الجھتا جاتا۔ میں بے بسی کی آخری حد پر کھڑا تھا جس سے آگے نہ پانی تھا' نہ ریت' نہ مٹی' نہ ہی پہاڑ' بس ایک خلا تھا اور مہیب سناٹا' جہاں میری پکار گونجتی' بازگشت کی صورت پھیلتی اور پھر مجھ ہی تک واپس لوٹ آتی ہے اسے سننے والا کوئی نہیں اس کا جواب دینے والا کوئی نہیں۔۔۔

زندگی کی سب سے بڑی خواہش کا گلا گھونٹ دیا جائے' زندگی میں ہی زندگی مرجائے نا تو پھر جینے کی صرف سعی باقی رہ جاتی ہے۔ سو میں نے جینے کی سعی کرنا شروع کردی۔ یہ ان ہی دنوں کی بات ہے جب امی نے اپنی انگلی سے تمہاری طرف اشارہ کرکے مجھے خاک جزیرے سے زریں محل کا راستہ دکھانا شروع کیا۔ تمہیں پتا ہے میرے ذہن و دل کا اس وقت یہ عالم تھا کہ میں صورتیں دیکھتا تھا مگر مجھے نظر کچھ نہیں آتا تھا' میں آوازیں سنتا تھا مگر مجھے سنائی کچھ نہیں دیتا تھا۔ میری بصارتوں اور میری سماعتوں میں بس ایک ہی چہرہ بسا تھا' ایک ہی آواز ٹھہر گئی تھی' سرخ سفید رنگ کے امتزاج کی چھب دکھلاتا بھورے تلوں والا چہرہ اور Taxa Trimuph گاتی آواز۔۔۔

میں نے امی کے اشارے پر تمہاری سمت دیکھا' تم مجھے نظر آئیں یا نہیں۔۔۔ مجھے پتا نہیں' لیکن تم امی کی خواہش تھیں اور میں خلا میں ٹامک ٹوئیاں مار رہا تھا' ان ہی ٹامک ٹوئیوں کے دوران میرا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں تھما دیا گیا۔

میں نے بالکل بھی مزاحمت نہیں کی۔ تمہارے ہاتھ پر اپنے ہاتھ کی گرفت مجھے ایسی لگی جیسے نابینا کے ہاتھ سفید چھڑی لگ جائے۔ میں نے اس کے بعد سفر تمہارے ساتھ یونہی طے کیا جیسے سفید چھڑی ہاتھ میں پکڑے' جس سمت حالات لے جائیں چلا جائے مگر ان سالوں میں' میں نے نجانے کتنی ہی بار تمہاری اپنے لیے محبت' وارفتگی' شوق اور جنون کی اپنے سامنے گواہی دی۔

تم نے کتنی خوبی سے میری بے اعتنائیوں' بے نیازیوں اور لاپروائیوں سے سمجھوتا کیا' میرے مکان کو گھر بنایا' سیمنٹ اور گارے سے بنے ڈھانچے کو محبت کے لمس سے سنوارا۔۔۔ تم ہر کسی کے لیے محبت تھیں' سراپا محبت' میں دیکھتا اور دل ہی دل میں سراہتا' کیا میرے گھر والے' کیا تمہارے رشتہ دار' کیا دوست کیا غیر۔۔۔ تم سب کے لیے سراپا ایثار تھیں۔

پھر تم دنیا کی سب سے بڑی نعمت سے محروم کردی گئیں' میں یہ بھی سوچتا سوائے ایک لفظ آزمائش کے مجھے خود سے کوئی جواب نہیں ملتا تھا۔ اللہ تعالیٰ شاید اپنے نیک بندوں کو ہی ان چھوٹی بڑی آزمائشوں سے آزماتا ہے' میں خود سے زیادہ اولاد سے محرومی پر تمہارے دکھ پر دکھی ہوتا۔ تم ایسے اچھے' نیک دل مہربان انسانوں کے لیے بھی اتنی لمبی آزمائش' اتنا بے حد و حساب صبر' میں سوچتا اور تمہارے لیے دعا کرتا رہتا۔

مگر پھر وہ ہوا جو نہ تمہارے گمان میں تھا نہ میرے گمان میں۔ کیا تم سمجھ سکتی ہو کہ سالوں بعد لکڑی کے سال خوردہ لیٹر بکس میں سے نکلنے والے زرد پڑتے صفحات پر لکھے خطوط کی شکل میں وہ الم نامے دیکھنے اور پڑھنے کے بعد میرے دل و دماغ کی کیا کیفیت تھی۔ تم سمجھ سکتی ہو کہ اپنے احساسات محبت کی ایسی غلط تشریح' میرے دل پر کس تیز دھار آلے کی طرح زخم لگا رہی ہوگی۔ کیا تم سوچ سکتی ہو کہ زخم زخم وجود کے ساتھ ایک ٹانگ پر اچھلتی کودتی' سرخوشی کے عالم میں Taxa Trimph — گاتی اس لڑکی کا زندگی سے بھرپور ان آنکھوں کا تصور میرے لیے کتنا جان لیوا ہوگا۔ جو درد کی شدت کی تاب نہ لاتے ہوئے ہمیشہ کے لیے بند ہوگئیں۔

پتا نہیں کب کہاں اور کیا غلط ہوا تھا گئے دنوں میں جو تمہارے دل کو گمان گزرا کہ زینب وقار کے لیے میرے جذبات وقتی ہمدردی کا نتیجہ تھے' نجانے کیسے تم نے سوچ لیا کہ سلمان کو سب بتا کر روزیٹا بیکری کو' اس کے چلانے والوں سمیت غائب کرا کے' تم میرے دل سے اتفاقاً" ٹکرا جانے والی اس لڑکی کو ہمیشہ کے لیے نکال باہر پھینک سکوگی جو سراپا معصومیت تھی' جو سراپا مظلومیت تھی اور جو سراپا محبت تھی۔

میں نہیں جانتا تھا کہ میری طلب تم ایسی بصارت سے مالا مال لڑکی کو اس طرح اندھا کرسکتی ہے کہ تم ہوا میں تلوار چلاتے چلاتے ایک محبوب ترین مترنم نغمے کا قتل کر بیٹھوگی۔

ہاں۔ کیا کبھی تم نے اپنے خون آلود ہاتھوں کو دیکھا ہے' کیا تم نے اپنے چہرے پر چھائی سفاکی آئینے میں دیکھی ہے' کیا تم نے کبھی اپنے اس دل میں جھانکنے کی کوشش کی ہے جو گوشت پوست کے بجائے کسی بھاری پتھر سے بنا ہے؟

تم نے نہیں دیکھا تا یہ سب کچھ' میں نے دیکھا ہے اوکاڑہ والے آبائی گھر کی گرد آلود سیڑھیوں پر بیٹھے بیٹھے لیٹر بکس سے نکلنے والے دیمک لگے زرد صفحات کے پیچھے اچانک مجھے نرم گرم دستانوں کے نیچے مجھے تمہارے خون آلود ہاتھ نظر آئے' میں نے خود اپنی ان آنکھوں سے تمہیں ہواؤں میں اندھا دھند تلوار چلاتے دیکھا اور یقین جانو مجھے اس روز تمہارے سینے میں چھپا یکی' انسانیت' محبت اور ہمدردی کی مصنوعی چادر میں چھپا وہ پتھر سے بنا دل بھی نظر آگیا جو لب ڈب' لب ڈب کرتا دھڑکتا نہیں تھا بلکہ وہ بالکل ساکت تھا' نہ وہ کسی کی چیخ پر تڑپتا تھا' نہ کسی کی منتوں پر پسیجتا تھا' نہ ہی کسی کی بے بسی پر روتا تھا۔ اس پتھر دل پر خود غرضی کی آنکھ جڑی تھی۔

اور تمہیں پتا ہے اس پتھر دل سے اچانک اور غیر متوقع تعارف کے دوران ان لمحوں میں برسوں سے نہ حل ہونے والے راز کا عقدہ بھی کھل گیا۔ میں نے لمحوں میں سالوں سے چھپے راز کو دریافت کرلیا۔ ایک چنگیز خانی پتھر دل جہاں سفاکی' بربریت' خود غرضی' ظلم اور صرف اپنی فتح کے جھنڈے گاڑنے کے زعم کا راج تھا اس کے کہیں کسی کونے میں کہیں ممتا کے جذبے اتارنے کی گنجائش تھی' کیا وہ دل جو بن ماں باپ کی ایک دربدر' مظلوم بچی کے خوابوں' خواہشوں اور زندگی سے بھرپور جسم کا قاتل تھا۔ اللہ تعالیٰ کبھی اپنی شفقت' محبت اور رحمت کا پرتو ممتا کا جذبہ اتار سکتا تھا۔

نہیں ہرگز نہیں۔۔۔" میرے دل نے لمحوں میں فیصلہ صادر کیا۔ اتنے سفاک دل میں اتنے قیمتی جذبے کی کوئی گنجائش ہوسکتی ہے نہ ہی وہ اس کا اہل ہوسکتا ہے۔ ان ہی گنے چنے لمحوں میں' میں نے جان لیا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں اولاد سے کیوں نہیں نوازا۔ جانتی ہو کیوں۔ اس لیے کہ ممتا تو سراپا رحمت ہوتی ہے' وہ تو صرف اس دل کی مکین ہوتی ہے جو بے غرض اور کھوٹ سے پاک ہوتا ہے اور تم نے ایک انسان کو

پانے کے لیے۔ اس کے ایک بندے کو حاصل کرنے کے لیے اس کے دوسرے بندے کو قتل کر ڈالا۔ ضرور سوچنا کہ جو قتل تم کر چکی ہو۔۔۔ اس کی سزا پھانسی کا پھندا ہونی چاہیے' یا آئرن چیئر کا الیکٹرک شاک یا پھر زہر کا پیالہ۔۔۔

میں جانتا ہوں کہ دنیا کی کوئی عدالت۔۔۔ تمہیں کسی قتل کا ملزم نامزد کر کے تم پر مقدمہ چلائے گی نہ ہی کسی سزا کا اعلان کیا جا سکے گا کیونکہ تمہارے شاطر ذہن نے قتل کا کوئی ثبوت چھوڑا ہے نہ ہی اس قتل میں اپنے ملوث ہونے کا کوئی ایسا نشان یا جو زینب وقار تک جاتا ہو۔ لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ آج کے بعد تمہارا ضمیر تمہاری عدالت بن جائے گا۔ تمہاری نظروں کے سامنے وہ زخم زخم وجود آ کے تم سے سوال کرتا رہے گا کہ وہ مرگ مفاجات بس ایک جرم محبت کی سزا کے طور پر دینے کا اختیار تم کو کس نے دیا تھا۔

تم اپنی سماعتوں میں انگلیاں ٹھونسو گی اپنی بصارتوں پر ہاتھ رکھو گی' بہری اور گونگی ہو جانا چاہو گی' دل' دماغ اور ضمیر کے سوالوں کے بوجھ سے گھبرا کر مرجانے کی دعا کرو گی مگر ان میں سے کوئی چیز بھی تم پر مہربان نہ ہو گی۔ ناکردہ جرم کی سزا پانے والی تو مر چکی' اب کردہ جرم کی سزا بھگتنے کا وقت آ چکا ہے۔

اور میں' جو آج تم سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو آیا ہوں۔۔۔ کبھی تمہارے لیے دعا گو نہیں رہوں گا۔ تمہاری بے سکونی' اذیت اور سزا۔۔۔ میری زینا کا سکون اور چین بنتی رہے گی۔ وہ جسے زندگی میں دوا ملی نہ کوئی مسیحا' اور کون جانے مرنے کے بعد کوئی قبر بھی اس کا ٹھکانا بنی کہ نہیں۔۔۔ اس کی قاتل۔۔۔ یوں بے سکون رہے گی تو شاید میرے اندر بھڑکتے الاؤ بھی کہیں کبھی بجھنے لگیں۔

مجھے یقین ہے۔ تم سے علیحدگی کا سبب بتاتے ہوئے میرے وہ الفاظ۔۔۔

"مجھے اپنی نسل' اپنی بقا کے لیے اولاد چاہیے۔"

تمہاری سماعت کے لیے غیر متوقع تھے۔۔۔ یہ اس سزا کی ایک کڑی ہے تا ہما جو تمہارا مقدر ہے کہ خود کو تم سے جدا کرنے کی وجہ میں نے بتائی جو تم سمجھ رہی تھیں۔ یہ اذیت بھی تو نہ ختم والی سزا ہے کہ میں نے اتنے سالوں بعد "اولاد" بنا کر تمہیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا اس روپے شاید یہ آخری بات ہو جس کی تم مجھ سے توقع کر تھیں۔۔۔ مگر اس غیر متوقع وجہ پر ماتم کرنے کے صرف ایک بار یاد کر لینا کہ تم سے یہ غیر متوقع تمہارے محبوب شوہر نے نہیں بلکہ نان بائی کی بیٹی عاشق نے کہی ہے ایک غیر روایتی اور غیر معمولی کے قتل کی سزا بھی تو اتنی ہی غیر روایتی اور غیر ہونی چاہیے۔۔۔ ہے نا؟"

میں نے یہ طویل خط پڑھا اور کمرے میں جلتی روشنی میں دیوار پر بنتے اپنے سائے کو دیکھا۔ مجھے سائے سے قدرے بلند ایک صحت مند وجود کا سایہ آیا جس کے اسکرٹ کا عکس نامحسوس ہوا سے لرز تھا۔ اس سائے کے مضبوط بڑے ہاتھوں میں رسی پھندا تھا جو وہ ہولے ہولے میری طرف بڑھا رہے تھے۔ کمرے میں ایک ایسے نغمے کی آواز گونج رہی جو میں نے کبھی نہیں سنا تھا۔

وہ آواز گنگنا رہی تھی' نان بائی کی بیٹی کی روح اور میرے تعلق کو پھانسی کا پھندا پہنانے وہاں موجود تھی۔

سائرہ رضا

فرماں بردار

"ممما جی! اب ہم دوبارہ کب آئیں گے؟"
عروہ نے کھلے بیگ میں اپنا اسکول بیگ رکھتے ہوئے بہت اشتیاق سے پوچھا۔ ارم کا قمیص تہہ کرتا ہاتھ رک گیا۔ اس کے ماتھے پر سوچ کی لکیریں، آنکھوں میں سرد مہری اور انداز میں جھلاہٹ تھی۔

"پتا نہیں۔" اس نے تڑخ کر کہا۔ "اور تم بار بار الٹے سیدھے سوالات مت کیا کرو۔ جاؤ اور چیک کرلو۔ تم لوگوں کی کتابوں میں سے کوئی چیز رہ گئی تو کون لائے گا چھٹیوں کے کام والی کاپیاں۔ اب جاؤ۔"

عروہ وضاحت دینا چاہتی تھی کہ وہ سب کر چکی ہے، مگر ارم اس وقت صرف اور صرف خاموش اور تنہا رہنا چاہتی تھی۔ بچی کو جھاڑ کر بھگا دیا۔ اب بچی تو بھاگ گئی۔ اسے چاہیے تھا کہ تیزی سے ہاتھ چلائے۔ مگر قمیص وہیں چھوڑ کر کھڑی رہ گئی۔

بچی کو تو پتا نہیں" کہہ کر جان چھڑالی، مگر ا
ذہن کا کیا کرتی، جو مستقل شعوری لاشعوری طور پر
سوچ رہا تھا۔ دس ماہ بعد، پورے دس ماہ بعد، دوبار
بے فکری، شانتی، ہنسی خوشی کا چٹکی بجاتے گزر جا
والا زمانہ لوٹے گا۔ بے بسی کے شدید احساس نے حل
میں پھندا اور آنکھوں پر نمی کی چادر تان دی تھی۔ ا
نے بمشکل ان کے بہنے کو روکا۔

"ہیلو ینگ گرلز! بلکہ مائی سوئٹ ہارٹ! ویری آر
ذرا جلدی سے سامنے آئیے۔" شہزاد کی آواز کانوں م
پڑی تو ارم نے سختی سے آنکھیں رگڑلیں۔ یہ آن
شہزاد کے سامنے ہی بہنے کے لیے بچائے تھے مگر بچیا
نہ دیکھیں۔ اس نے بیگ پر گہری نگاہ ڈالی پھر اطرا
میں اور یادداشت کو ٹٹول کر تسلی کی۔ اب کچھ نہیں
گیا تھا۔ بیگ کی زپ بند کی۔ نمبر سیٹ کیے اور کم

ناولٹ

WWW.PAKSOCIETY.COM

سے نکلنے سے پہلے دیوار گیر آئینے میں خود پر تفصیلی نگاہ کی۔ اس کے کمر تک لمبے اور بے حد گھنے بال گیلے ہی تھے اور انہیں برش کر کے سوکھنے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ وہ شہزاد کے پسندیدہ گہرے نارنجی اور خاکی رنگ کے امتزاج کے چکن کے سوٹ میں اتنی ہی دلکش لگ رہی تھی، جتنی گیارہ سال پہلے تھی۔ اس کے ہونٹوں پر نیچرل لپ اسٹک تھی اور پیروں میں انگوٹھے والی چپل۔۔۔ دوپٹا دروازے پر استری شدہ لٹک رہا تھا۔ جاتے وقت اوڑھنا تھا۔ عروہ اور ارفع دائیں بائیں چپکی بیٹھی تھیں۔ پانچ سالہ اسریٰ گود میں تھی اور سامنے ٹیبل پر وہ بڑے بڑے شاپرز تھے، جو شہزاد ان کے لیے لائے تھے۔ اسریٰ تتلا کر بولتی تھی اور اس وقت بھی اس کے قصے نے شہزاد کے چہرے پر روشنیاں بکھیر دی تھیں۔ وہ باپ کی پوری توجہ چاہتی تھی۔ اس لیے چہرہ ہاتھوں میں تھام رکھا تھا اور اس پر ہاتھ پھیر پھیر کے باپ کے لمس کو محسوس کرتی تھی۔

"ہو گئی ساری پیکنگ؟"

"جی۔۔۔!" ارم نے اختصار سے کام لیا۔

"تم نے اور بچوں نے کھانا کھا لیا؟"

"نہیں۔۔۔ بچیاں آپ کے ساتھ کھانے کا کہہ رہی تھیں، لگا دوں؟"

"بالکل لگا دو، مگر یہ دھیان رہے۔ آدھے گھنٹے بعد گاڑی آ جائے گی، پھر تمہیں برتن دھونے کی فکر ہو گی۔۔۔ ایک ہی پلیٹ میں کھا لیتے ہیں۔"

تینوں باپ سے چپکی بیٹھی تھیں۔ شہزاد کے بڑے بڑے ہاتھ عروہ اور ارفع کے چھوٹے ہاتھوں میں تھے۔ اسریٰ تو گودی چڑھی ہی تھی۔ اس نے سفید چنوں کا پلاؤ، شامی کباب، رائتہ اور سلاد تپائی پر رکھ دیا۔ وہ بڑی ٹرے میں چاول ڈال کر لائی تھی، نکلتے وقت بس چار برتن دھونے پڑتے۔

اس نے عروہ کو سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود شہزاد کے برابر بیٹھ گئی۔ خوشبودار صابن، شیمپو، بے حد دلفریب مائل کرتی خوشبو والا پرفیوم اور جسم سے پھوٹتی قدرتی مہک۔ شہزاد نے مسکرا کر ہر چیز کو محسوس کیا۔ ساتھ تو بیٹھی تھی، مگر ناراضی کا تاثر دینے کے لیے فاصلہ برقرار رکھا تھا۔

"ہوں! مزے دار۔" اگلے پل کھانے کی اشتہا انگیز خوشبو سب پر حاوی ہو گئی۔

"چلو بھئی، شہزاد صاحب! کھا لو جی بھر کے، پھر نہ جانے کب نصیب ہو، یہ اتنا مزے دار کھانا۔"

وہ کف موڑتا پھیل کر بیٹھ گیا۔ کندھے سے کندھے اور گھٹنے سے گھٹنے ٹکرا گئے۔ ارم نے بے حد خفگی بھری نگاہوں سے شہزاد کا چہرہ دیکھا اور دور کھسک گئی۔ وہ دور کھسک جانے کے لیے ہی عروہ کو اٹھا کر بیٹھی تھی۔ شہزاد کی آنکھوں میں شرارت اور سب سمجھ لینے کا دعوا تھا۔ اس کی جان جل گئی۔ دل چاہا سب چھوڑ کر بھاگ جائے اور پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دے، چیخ چیخ کر لڑے۔۔۔ مگر۔۔۔ اس نے ضبط سے کام لیا۔ شہزاد کے سامنے کباب رکھا۔ رائتہ پھیلایا۔ سلاد بچھایا۔۔۔ پانی کا گلاس بہ صد احترام رکھا۔ انداز انتہائی فرماں برداری کا تھا۔ مگر نروٹھا پن سب پر حاوی۔ وہ نہ چاہتے ہوئے نوالے لے رہی تھی۔

"صحیح طرح سے کھاؤ۔"

"مجھے بھوک نہیں ہے۔" اس کا جواب تیار تھا۔

"بیٹا! آپ لوگ پیٹ بھر کے کھاؤ۔ پھر ٹرین میں کھانا ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ میں بیگ اکٹھے کر لوں ذرا۔"

وہ بچیوں کو ہدایت دیتی کمرے سے نکل گئی۔ کھانے کی خوشبو سارے کمرے میں چکرا رہی تھی۔۔۔ بھلے۔۔۔ مگر ارم کے وجود سے پھوٹتی خوشبو۔۔۔ اس نے پانی کا گلاس چڑھا کر جیسے صبر کا گھونٹ پیا۔ گویا گرم توے پر گلاس انڈیلا۔

☼ ☼ ☼

وہ دبے قدموں کچن میں آیا۔ ارم کو تب پتا لگا، جب اس کے شانے پر اس نے ہاتھ رکھا تھا۔۔۔ وہ پہلے ہی برتن پٹخ رہی

تھی اب اور تیزی آ گئی۔

"رو رہی ہو؟"

"کم از کم آپ کے لیے نہیں۔"

"کسی کے لیے بھی۔۔۔ مگر یار! میں تمہیں روتا نہیں دیکھ سکتا۔"

"تو مت دیکھیں۔ باہر جائیں۔ مجھے کام کرنے دیں۔"

"کام تو ہو جائیں گے۔ تم ادھر تو منہ کرو۔ گھومو۔۔۔ گھومو۔۔۔ ادھر میری طرف۔" اس نے زبردستی اس کا رخ اپنی جانب کیا۔ "ارے۔۔۔ چچ۔۔۔ چچ۔۔۔ اتنے سارے آنسو۔"

"آپ سے مطلب؟ آپ کے لیے بھلا ان کی کیا اہمیت۔" وہ بولی تو آواز بوجھل تھی۔

"اہمیت تو خیر ہے۔ اب تم چلی جاؤ گی۔ مجھے پیچھے یہی روتا چہرہ یاد رہے گا۔ یہ بھیگی آنکھیں، گیلے گال اور یہ ہونٹ۔" اس نے اس کا نچلا ہونٹ چٹکی میں پکڑ کے چھوڑ دیا۔

"سی۔۔۔" اس نے کراہ کر دونوں ہاتھوں سے اسے اچانک دھکیلا۔ "میرے سامنے کم از کم جھوٹ مت بولیں۔ ہنستا رہے یا روتا، آپ کو اس سے کون سا فرق پڑے گا اور ویسے بھی۔۔۔"

"مما جی۔۔۔ پپا جی۔۔۔ حیات انکل گاڑی لے آئے۔" ارفع نے خوشی سے آواز دی۔

"بیٹا! ان سے کہو، سامان گاڑی میں رکھیں۔ ہم آ رہے ہیں۔" ارم پلٹ کر برتن کیبنٹ میں لگانے لگی۔ آنسو تھے کہ بہے چلے جا رہے تھے۔ شہزاد نے سسکیوں کی آواز پر تاسف سے اس کی پشت کو دیکھا۔

"اب کیا کرنے لگی ہو؟ چھوڑ دو سب۔ باہر آ جاؤ۔" اس نے اس کے ہاتھ سے صافی لی۔

"چھوڑیں ذرا۔۔۔ ایک منٹ۔" وہ جھنجلائی۔ "شامی کباب فریز کر دیے ہیں۔ ماش کی دال کی پھلکیاں بھی فریز کر دی ہیں اور کوفتے بھی۔" اس نے آگے بڑھ کر فریزر کھول دیا۔

"ارے یار رو! چھوڑو۔ بیٹ مین سب کر لیتا ہے۔ تم نے خواہ مخواہ مشقت کی۔"

ارم کے مانو تلووں لگی، سر پر بجھی۔ "مجھے خبر ہے آپ کے سب کام ہو جاتے ہیں۔ میں ہی پاگل ہوں۔ جو سوچا میرے ہاتھوں کے کباب اور یہ سب آپ کو پسند ہوں گے۔ مت کھائیے گا۔ بانٹ دیجیے گا۔ میں نے تو بہرحال اپنا فرض پورا کیا، جتنا کر سکتی تھی۔" وہ چیخ کر بولی۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔

"ارم۔۔۔ ارم۔۔۔ یہ کیا بچپنا ہے۔ بچیاں دیکھیں گی یار! کیا سوچیں گی وہ۔۔۔ تت تت۔" شہزاد جھلا اٹھا۔ "رات سے تم نے بلکہ تین، چار دن سے تمہارا یہی موڈ ہے۔ اب تک تو تمہیں عادی ہو جانا چاہیے۔"

"ہاں جیسے آپ ہو چکے ہیں۔ آپ ہو سکتے ہیں، دل نہیں ہے، پتھر ہے اندر، بلکہ پتھر بھی نہیں۔ قطرہ قطرہ پانی سے سوراخ ہو جاتا ہے اس میں بھی۔ روبوٹ کی طرح مشینیں فٹ ہیں اندر۔۔۔ جن میں ایک ہی پروگرام فیڈ کر دیا گیا ہے اور میں پاگل۔۔۔ مشین سے جذبات مانگ رہی ہوں، ڈھیٹ ہوں، بلکہ بے غیرت ہیں۔ اپنے منہ سے کہتی ہوں کہ میں۔۔۔" (میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ مجھے آپ کے ساتھ رہنا ہے۔ ہر پل، صبح، دوپہر، شام۔۔۔ ہر پل۔)

اس نے اپنی آواز گھونٹ لی۔ بقیہ کا جملہ دل میں دہرایا۔ اپنی نسوانی انا سب سے زیادہ عزیز تھی۔ اب بھلے سامنے شوہر تھا، محرم و ہمراز۔۔۔ مگر جب وہ اس کے روم روم سے جھلکتے محبت کے جذبے کو ان دیکھا کر رہا تھا تو وہ کم از کم اپنا بھرم تو نہ کھوئے۔

"بلاوجہ کا رونا ہے ارم۔۔۔ تم جانتے بوجھتے مجھے اذیت دیتی ہو اور خود کو۔۔۔"

"کون سی اذیت؟ آپ کو پتا ہے اذیت کیا ہوتی ہے؟" وہ چیخ ہی پڑی۔

"میں جاتے سمے کچھ کری ایٹ نہیں کرنا چاہتا، ورنہ پھر۔۔۔" شہزاد نے جبڑے سختی سے بھینچے۔ اب اس کا موڈ خراب ہو چکا تھا۔ "جب ایک بات طے شدہ ہے تو پھر؟ میں پھر یہی کہوں گا تم مصلے پر بیٹھ کر ان

کے مرنے کی دعا مانگو۔۔۔ یا پھر۔" شہزاد کا لہجہ زہریلا ہو گیا۔ "کھانے میں کچھ ملا کر معاملہ نپٹا دو۔" وہ بے حد غصیلے انداز میں کہتا باہر نکلا۔ دروازہ اتنی زور سے مارا کہ وہ ہلتا رہ گیا۔

"شہزاد۔۔۔" وہ اس کے پیچھے لپکنا چاہتی تھی۔ مگر پھر جیسے تھک کر کرسی پر گر گئی۔ اس نے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر آواز روکی تھی۔ مگر آنسوؤں کو بہنے دیا۔

☼ ☼ ☼

ویسے یہ معجزہ ہی ہوا کہ ٹرین بالکل ٹائم پر چل پڑی، نہ ایک منٹ آگے، نہ ایک منٹ پیچھے۔

"اگر اسی طرح چلی نا تو ہم صبح سویرے گھر میں ہوں گے۔ تھینک گاڈ ہوم سوئٹ ہوم۔۔۔ اور دیکھو بچو! سورج ہمارے ساتھ ساتھ بھاگ رہا ہے۔ ہمارا پیچھا کر رہا ہے کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔" نزہت کی شوخ و شنگ آواز میں خوشی نے اور موسیقی بھر دی تھی۔ اس نے اپنا کدو جیسا موٹا گولو بچہ شوہر کی گود میں ڈال دیا تھا اور اب عروہ، ارفع اور اسریٰ کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔

"دریائے سندھ کب آئے گا نزہت آنٹی؟" ارفع نے پوچھا۔

"بس! تھوڑی دیر میں کوٹری گزرنے کے فوراً بعد۔۔۔ ہم حیدر آباد پر اتریں گے۔ ربڑی خریدیں گے۔"

"پپا جی نے منع کیا ہے۔" عروہ کو ہدایت یاد تھی۔

"پپا جی پیچھے رہ گئے۔ اب ہم کریں گے، جو کریں گے۔ سمجھے تم لوگ؟" نزہت نے چلبلے پن سے ہاتھ چلائے۔

"اور مما جی!" ارفع نے برتھ پر آنکھوں پر ہاتھ رکھ کے لیٹی ماں کی طرف دھیان دلایا۔

"وہ کون سی یہاں بیٹھی ہیں۔ کہیں اور ہی پہنچی ہوئی ہیں۔ ان کی فکر آپ نہ کرو۔" ارم نے کہنی کی آڑ سے دیکھا۔ نزہت، شہزاد کے دوست کی بیوی تھی۔

شادی کو ڈیڑھ سال ہوا تھا۔ چھ ماہ کا پیارا سا بیٹا تھا۔ نزہت کی عمر فقط بیس برس تھی۔ اپنی عمر کے حساب سے وہ بہت چلبلی، شوخ و شنگ، لاپروا اور ہلے گلے کی شوقین تھی۔

ارم اور اس کا معاملہ بالکل الٹ تھا۔ نعمان اسے پاس بلا بلا کر تھک جاتا تھا۔ وہ مارے باندھے آ بھی جاتی تو اگلے ہی روز بھاگنے کو تیار۔۔۔ نعمان سے بہت محبت تھی۔ مگر ایسے ٹف ماحول میں رہنا اس کے بس سے باہر تھا۔ سخت بااصول زندگی "تو! فوجی صاحب تو صبح سویرے غائب۔۔۔ شام کو واپس۔۔۔ میں اکیلی۔۔۔ توبہ توبہ۔۔۔ دیواروں سے باتیں کرنا اچھا لگتا ہے۔ یہ رہائشی ایریا۔۔۔ یہ بیرک ہے۔ بیرک بس نام بدل دیا۔ خوامخواہ پکڑ کر میری شادی کر دی۔ میں نے بھی ہاں کر دی کہ بھئی ایک ہی گھر ہے، وہی دادو وہی تایا، تائی، امی، ابا سب سامنے تو چلو، بس نیچے سے اوپر کے پورشن میں جانا پڑے گا۔ مجھے تو کسی نے نہیں کہا تھا، مجھے ساتھ کراچی جا کر رہنا ہو گا۔ میں وہیں سب کے ساتھ رہوں گی۔ تمہیں ملنا ہو تو گھر آ جایا کرو۔ مجھے نہیں بلوایا کرو ادھر۔۔۔ الو بولتے ہیں یہاں۔"

نعمان سر پیٹ لیتا۔ "لڑکیاں خواب دیکھتی ہیں، ایسی آئیڈیل زندگی کے۔"

"تو ان ہی میں سے کسی سے کر لینی تھی۔ میرا تو کوئی خواب نہیں۔ میں وہیں رہوں گی، سب کے ساتھ۔ تم چھٹیاں لے کر آیا کرو۔" نعمان کی ہزاروں منتوں اور ترلوں کے بعد وہ بمشکل پندرہ دن رہ پاتی۔ یہ پہلی بار تھا کہ وہ ڈیڑھ ماہ رہ پائی تھی۔

"یہ تو میں ارم بھابھی اور اپنی منی فرینڈ کی وجہ سے رہ لی۔۔۔ ورنہ مجھے تو رونا آتا ہے۔"

"شہزاد بھائی۔۔۔ آپ بھابھی کو یہیں رکھ لیں۔ اس بہانے میری گرہستی بھی بچ جائے گی۔" نعمان نے ملتجی لہجے میں درخواست دی۔

"پچ! یہ جانتی ہے، میں اس کے بغیر اور اب شایان کے بغیر ایک منٹ نہیں رہ پاتا۔ مگر وہی ضد کی پکی۔

میں یہاں نہیں رہوں گی۔ مجھے گھر بھجواؤ۔۔۔ میں تو یہ طعنہ بھی نہیں مار سکتا کہ ماں، باپ کے پلو سے بندھے رہنے کا شوق تھا تو شادی کیوں کی؟ یہ تائی اور تایا جی کے بغیر نہیں رہ پاتی، انہیں دو دن نہ دیکھے تو دل ڈوبنے لگتا ہے اور زور زبردستی کروں تو کیا شایان کا رونا ہے، جو یہ روتی ہے۔۔۔ اور اس پر ستم میرے اپنے ابا کہتے ہیں۔ جاؤ جا کر نوکری کرو۔ جب بچی کا دل نہیں لگتا تو زبردستی کیوں؟ اور ویسے بھی ہم شایان کے بغیر نہیں رہ سکتے۔۔۔ اور یہ ان سب کی شہہ پر یہ سب کرتی ہے۔" وہ اپنے بال نوچ لیتا۔

"غلط بندے سے وکالت کی امید کر رہے ہیں آپ نعمان بھائی۔۔۔ یہ آپ کی فیلنگز کو کب سمجھیں گے۔ ان کا تو اپنا گیارہ سال کا تنہا رہنے کا تجربہ ہے۔ ہاں! آپ ان سے یہ ٹپ لیں کہ کسی بھی شے کو محسوس کیے بنا کیسے رہ سکتے ہیں۔ لیکن خیر! آپ کے لیے خوش خبری یہ ہے کہ کچھ عرصہ مزید ان کے ساتھ رہے تو آپ بھی اثر پروف ہو جائیں گے۔ پھر نزہت یہاں رہے یا وہاں، آپ کو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

نعمان ہنس پڑا۔ نزہت برے منہ بناتی رہی۔ پھر صرف شہزاد تھا۔ جو چہرے پر مسکراہٹ سجائے خاموش تھا۔ وہ ارم کے کیے طنز کو بخوبی سمجھ رہا تھا۔ وہ جو اس نے زبان سے کہا اور وہ جو آنکھوں سے اور وہ جو اس نے کبھی کہا نہیں۔ مگر اس کے رویئں رویئں سے چھلکتا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ نیٹی جیٹی جیسے بھرے پرے ٹریفک والے روڈ کے بالکل نیچے نیول کا ریذیڈنشل ایریا ہے اور اتنے شور ہنگامے سے دور پرسکون صاف ستھرا، چپہ چپہ نکھرا ستھرا۔۔۔ وہ گھوم گھوم کر سفید سفید دیواروں اور ہریالی کو دیکھتی رہی۔ بھیگی سمندر کی ہوائیں، ٹھنڈک، نمی، خوشبو وہ اپنی فیملی کے ہمراہ نیٹی جیٹی کے پل پر یوں ہی ڈوبتا سورج دیکھنے آئی تھی۔ تب ہی چھوٹی بھابھی چیخ مار کے کسی سے لپٹ گئیں۔ انہیں ان کے کالج کی دوست کوئی بارہ سال بعد ملی تھی۔ وہ اپنے بچوں کے ہمراہ تھی۔ اگلے پل وہ سب گاڑی میں بھر کے اس دوست کے گھر روانہ ہوئے۔ وہیں قریب نیوی ریذیڈنشل ایریا تھا، وہ سحر زدہ سی تھی۔ اس نے بارہا کہا۔

"مجھے تو کبھی اندازہ ہی نہ ہوا، اتنے پلوشن والے روڈ کے پیچھے اتنا پیارا علاقہ ہے۔" اسے ہر چیز اچھی لگ رہی تھی اور وہ کسی اور کو بہت اچھی لگ رہی تھی۔ ہر گزرتا پل تاثر کو گہرا کر رہا تھا۔ بینڈ میں جکڑے گھنے سیاہ بال گندمی رنگت پر حیرانی و خوشی کے رنگوں سے بھری سیاہ گھور آنکھیں، اس پر اس کی دراز قامتی اور جب وہ ہنسی تو موتیوں کی قطار۔۔۔ بس۔۔۔ کیپٹن شہزاد کے سینے سے دل نکل کر کب اس کے قدموں میں لوٹنیاں لگانے لگا، خبر ہی نہ ہوئی۔ بیچ میں بس دو دن تھے۔ بھابھی کی دوست دردانہ اپنے میاں دلاور اور اس کے میاں اپنے جونیئر کیپٹن شہزاد کے ہمراہ حاضر خدمت تھے۔ سب کچھ اتنا واضح اور خوش کن تھا اور اس پر ارم کے چہرے پر پھیلتے رنگ۔۔۔ اس نے اس بے حد وجیہہ کیپٹن کو اس روز دیکھا تھا۔ چوڑے شانے، منفرد انداز، دراز قد۔ سچی بات تو یہ تھی کہ اس نے زندگی میں پہلی بار کسی نیوی آفیسر کو مکمل یونی فارم میں اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ سرتاپا سفید لباس۔ وہ دردانہ کے بچوں کے ساتھ بیٹھا تھا اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد اجازت طلب کرتا تھا۔ جو دلاور صاحب دیتے نہیں تھے۔

"تم بھلے اپنے کام سے آئے ہو۔ مگر اب کھانا کھا کر جاؤ گے۔" دردانہ بھابھی نے حکم دیا۔

"میں نے چیلنج تک نہیں کیا۔" اس نے اپنی الجھن جتائی۔

"کھانا کھاتے وقت تم بھی میرے ٹیپو کی طرح گردن میں تولیہ لگا لینا، سمجھے۔" وہ ذرا اثر نہ لیتے ہوئے تیزی سے کھانا بنا رہی تھیں۔

ارم نے کن اکھیوں سے کئی بار اسے دیکھا تھا۔ وہ

کیپٹن شہزاد کی طرح فیصلہ کن دل تو نہیں ہاری تھی مگر یونہی چلتے پھرتے کیپٹن کا دھیان آنے پر دل کی دھڑکن تھوڑی مدہم، تھوڑی بے ہنگم ضرور ہوئی تھی۔

☼ ☼ ☼

رشتہ اتنا اچھا اور بے عیب تھا کہ امی تمام رسمی باتوں کو چھوڑ چھاڑ فوراً "ہاں" کر دینا چاہتی تھیں۔ فیصلہ کا کلی اختیار کیپٹن کے پاس تھا۔ مگر آج ان کی والدہ کا پہلا اور آخری دورہ تھا۔ گھر بھر میں ایمرجنسی لاگو تھی۔ سب کے دماغوں میں کیپٹن کی والدہ کے حوالے سے مختلف خاکے بن اور بگڑ رہے تھے۔ جب وہ اتنا عالی شان دکھتا ہے تو اس کی ماں کیسی ہوں گی۔ کیپٹن کی سحر انگیز شخصیت کا فسوں سب پر غالب تھا تو والدہ صاحبہ کو دیکھ کر سب کے منہ کھلے رہ گئے۔ وہ لمبے قد کی سانولی بہت مردمار ہاتھوں پیروں والی، کھچڑی بال، اس پر ملگجے سرمئی مردانہ اسٹائل کے کرتے اور شلوار میں ملبوس، بے تاثر چہرے والی بزرگ خاتون تھیں۔

ارم کے گھر والوں نے انواع و اقسام کے کھانے میز پر چن دیے تھے۔ امی، بھابھی، اپیا سب ان کے آگے ڈونگے کرنے لگیں۔ بیٹے نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔

"اماں اپنی پسند کا لیں گی۔" اب سب اماں کو دیکھ رہے تھے۔ وہ مہمان خصوصی تھیں۔ وہ شروع کریں تو آغاز ہو۔ اماں طائرانہ نگاہوں سے میز کو جانچتی رہیں۔ بریانی، کڑاہی، کباب، کوفتے، کھیر، سلاد اور تین طرح کے رائتے اچار۔

اماں نے ہاتھ پر روٹی رکھی۔ روٹی پر کوفتہ۔ کوفتے پر چن کر پیاز اور چنگیر کی تلاش میں نگاہ دوڑائی۔ اپیا نے چنگیر لا کر دی تو ڈائننگ ٹیبل سے اٹھ کر سامنے آرائشی تخت پر چوکڑی مار کر بیٹھ گئیں۔

"مجھے مگ میں پانی دینا اور بعد میں کھیر۔ بس۔" ادھر سارے گھر والے "ارے، ارے" کرتے رہ گئے۔ وہ ان کے اگلے سانس کے آنے تک کھانے سے فارغ۔

بھابھی نے کھیر کا ڈونگا رکھا تو وہ کافی زیادہ مقدار میں نکالی۔ اور مزے سے کھائی۔

"آپ سب اطمینان سے کھائیے اماں ایسے ہی کھاتی ہیں۔" کیپٹن نے کانٹے چھری کا استعمال کرتے ہوئے سب کو دلاسا دیا۔

"اتنا سب کچھ ہے۔ کچھ تو کھائیں۔" امی کا صدمہ کم نہ ہو رہا تھا۔

"آپ گلٹی فیل نہ کریں آنٹی! اماں ایسی ہی ہیں۔ میں کھا رہا ہوں ناں! آپ کیوں ٹینشن لیتی ہیں؟"

وہ ہر چیز سے انصاف کر رہا تھا۔ سب نے اماں کو دیکھا۔ وہ واکر میں کھیلتے ارم کے بھانجے کو پچکارتی تھیں اور کھیر کھلاتی جاتی تھیں۔ اتنا مگن انداز تھا جیسے کمرے میں اور کوئی نہ ہو۔ ان کے چہرے سے کچھ معلوم نہ ہوتا تھا۔ ارم بھابھی کی ہدایت موجب اندر رہی کہ اماں گاؤں کی عورت ہیں۔ مبادا انہیں ناگوار گزرے۔

اماں نے کھانے کے بعد ارم کو بلوالیا۔ اپنے ساتھ تخت پر بٹھالیا۔ پھر جیب ٹٹول کر ایک انگوٹھی برآمد کی جو ارم کے انگوٹھے میں بھی کھلی تھی اور بے حد ڈھیلی بھی۔ بیٹے کو دوسری جانب بٹھایا۔ پھر دونوں کو بازوؤں کے حلقے میں بھرلیا۔ پہلے بیٹے کے گال چومے۔ پھر ارم کے۔

"مبارک ہو بہن! آپ کی بیٹی میری نوں بن گئی۔"

امی بھیا بھابھی جو منگنی کا دن، تاریخ، رسم و رواج ایسے ویسے سوچ رہے تھے۔ حق دق تھے۔

"پکی تاریخ ابھی بتا دیں۔ میں نے بری بھی بنالی ہے۔ آپ اپنا صلاح مشورہ کرلو۔ میں تب تک نماز پڑھ لوں۔ کدھر ہے میری جوتی؟"

اماں نے پیر نیچے لٹکائے۔ شہزاد تیزی سے نیچے جھکا۔ اپنے ہاتھوں سے جوتا چڑھایا۔ پھر ہاتھ پکڑ کے اٹھاتے ہوئے بھابھی کو اشارہ کیا کہ انہیں وضو کرادیں۔

اماں اندر چلی گئیں۔ شہزاد بھائیوں کے ساتھ اب

چائے سے شغل کر رہا تھا۔

ارم بھو بچکی بیٹھی تھی۔ وہ دزدیدہ نگاہوں سے شہزاد کو دیکھ لیتی تھی، جو گہری براؤن پینٹ پر بسکٹی شرٹ کے ساتھ دل کے اندر گھستا جا رہا تھا۔ یہ اتنا خوب صورت، لمبا مرد اللہ نے اسے بس ایک نظر بھر کے دیکھ لینے کے بعد ہی دے دیا تھا۔ بنا مانگے، روئے تڑپے بنا۔ محض سانس بھرنے کے وقفے میں اسے اتنا خوب صورت خواب تعبیر بنا کے رب نے دے دیا۔ اب وہ زندگی میں اور کیا مانگے اور کیوں مانگے۔ اس نے اپنی گیلی ہتھیلی سختی سے بند کرلی۔ انگوٹھی گر جانے کا خدشہ بھی تھا۔

☼ ☼ ☼

اس نے یہ تو جان لیا تھا کہ وہ شہزاد کی پسند سے اس کی زندگی میں شامل ہوئی ہے۔ مگر وہ پسندیدگی اتنی زیادہ ہوگی اس کا اندازہ نہیں تھا۔ خلوت کے لمحات میں اسے اپنی بانہوں کے گھیرے میں بھر کے وہ جب اپنی وارفتگی کے قصے سناتا تو ارم کے لیے پہلو بچانا مشکل ہو جاتا۔ وہ مرد تھا اور اظہار میں بے شرم۔ اور وہ عورت تھی لاج کی ماری۔ محبت کی اس بارش نے اسے ہرا بھرا کر دیا تھا۔ عورت فطرتاً شرمیلی ہوتی ہے۔ اسے خود سے تو کیا اظہار کرنا تھا، وہ اس کی بے تابیوں سے گھبرا جاتی۔ دامن بچاتی وہ اسے مسلسل اکساتا کہ وہ بھی کچھ کہے۔ مگر وہ کچھ نہیں کہنا چاہتی تھی۔ اس نے اپنی ساری توانائی سننے میں وقف کر دی تھی۔ اس کا دامن تنگ پڑ جاتا۔ اگر وہ خود سے بھی کچھ کہنا شروع کر دیتی اور نہیں غلطی ہو گئی وہ لاکھ ہمت پیدا کر کے بھی کبھی بتا نہیں سکی کہ وہ۔

کیپٹن شہزاد نے اسے سب کچھ دے دیا۔ بدلے میں اس کی فقط ایک خواہش یا شرط کچھ بھی کہیں، تھی کہ۔

"میری ماں کا خیال رکھنا! وہ ہمارے ساتھ رہیں گی۔ ہمیشہ تاحیات۔ تم سے محبت چادر کی طرح اوڑھ رکھی ہے۔ چادر پھٹ سکتی ہے، اتر سکتی ہے۔ مگر میں زندہ رہوں گا۔ ماں کی محبت عشق ہے، جو خون میں دوڑتا ہے۔ اس میں کمی بیشی ہوئی تو کھڑا نہیں رہ سکوں گا۔ تم صرف میرا سب کچھ لے لینا بدلے میں بس میری ماں سے محبت، احترام، فرماں برداری اور کچھ نہیں۔"

اور یہ کوئی اتنی مشکل فرمائش نہیں تھی۔ ارم کو خود اپنی ماں سے بہت محبت تھی۔ دنیا کی واحد خالص، بے ریا، بے لوث محبت۔ اماں بظاہر جتنی سخت، دو ٹوک اور مشکل نظر آتی تھیں، وہ اتنی ہی بے ضرر عورت تھیں۔ سیدھی سادی، کم گو، دعائیں دینے والی، شکر ادا کرنے والی۔ ارم نے ان کی خاک خدمت کرنی تھی، وہ بے حد کار گزار تھیں۔ ان کی موجودگی کا پتا تک نہ چلتا۔ پاک صاف نہانے، اٹھتیں تو بدن کا جوڑا دھو کر نکلتیں۔ تہجد کے وقت اٹھتیں تو فجر تک قرآن و وظیفے پڑھتی رہتیں۔ اپنا چائے کا مگ، ایک پراٹھا، تھوڑا سا سالن، برتن دھو کر رکھے ہوئے، ارم کے لیے ان کا کوئی حکم، کوئی فیصلہ کچھ نہیں تھا۔ وہ تیار ہو کر نکلتی تو ان کی آنکھوں میں توصیف ابھر آتی بیٹھے بیٹھے پھونکیں مارتیں۔ ارم کے لیے زندگی واقعی جنت تھی اور شہزاد کے لیے بھی۔ مگر۔

☼ ☼ ☼

بے حد سادہ دیہاتی نظر آنے والی اماں بہت زیادہ قابل بچوں کی ماں تھیں۔ شہزاد کے سب سے بڑے بھائی بہزاد اعلا فوجی افسر تھے اور ان کی بیگم کالج کی پرنسپل۔ اعتزاز ملک سے باہر تھے۔ ان کی بیگم انگریز تھیں۔ وہ پانچ سال بعد چکر لگا پاتے۔ دو بہنیں تھیں۔ ایک کراچی میں اور دوسری وہیں گاؤں کے پاس بیاہی ہوئی تھی۔ فوجی کالج میں پڑھاتی تھی۔ اس کے دو بچے تھے۔

وہ چاروں بہن بھائی اوپر تلے کے تھے۔ شہزاد کا دیگ کی کھرچن والا معاملہ تھا۔ وہ اپنے بڑے بھتیجے سے

فقط چار سال بڑا تھا۔ والد کے انتقال کے بعد بہن بھائی اپنی زندگیوں میں مگن تھے۔ وہ ڈرنے والا بچہ ہر وقت ماں کا پلو تھامے پیچھے پیچھے رہتا۔ یہاں تک کہ اماں نہانے جاتیں تو دروازے کے پاس پیڑھا رکھ کے بیٹھ جاتا۔

"اماں! مجھ سے باتیں کرتی رہو۔"

شوہر کی اچانک موت اور اپنی زندگیوں کا نیا آغاز کرتے ہوئے اڑان بھرنے والے بڑے بیٹے۔ بیٹیاں بھی اپنے گھر سسرال والی۔ شہزاد کے لیے اماں جتنی ضروری تھیں اماں کے لیے شہزاد شاید اس سے زیادہ۔ انہیں یاد تھا۔ بڑے بیٹے بہزاد کا اپنے بھائی کے گھر رشتہ طے کر کے آئی تھیں اور جلد شادی پر زور دے رہی تھیں۔ بہزاد اپنی سخت ٹریننگ کے باعث آنا کانی کر رہا تھا تو دوسری طرف بھانجی۔ وہ ہر قیمت پر سولہ جماعتیں پڑھنا چاہتی تھی۔ اماں نے اپنے بھائی کے گھر جا کر باقاعدہ جنگ کر ڈالی کہ مجھے بس چار ماہ کی تاریخ دو۔ بھائی کے لیے بیٹی کے بھل بھل بہتے آنسو دیکھنے مشکل تھے۔

"میرے گھر آ کر پڑھ لے گی۔" وہ ہٹ دھرمی سے سر ہلاتی جاتیں۔

"ابھی ان کی عمریں کیا ہیں۔ تھوڑی عقل تو آنے دو آپا!" بھائی نے سر پیٹ لیا۔

"میں پنچایت میں بٹھانے کو نہیں کہہ رہی۔ بیاہ کرنے کا کہہ رہی ہوں۔ اور بیاہ عقلے، بے عقلے سب کے ہوتے ہیں۔" وہ بکتی جھکتی گھر آئیں اور لگیں منصوبہ بندی کرنے کہ کس کس طرح زور ڈلوائیں گی۔ مگر خود کے پیر منوں وزنی ہو گئے کہ "بھاری ہو گئے" شہزاد کی آمد۔ ان کے فرشتے بھی بے خبر تھے۔ وہ تو یہ سمجھ بیٹھی تھیں کہ اب سن یاس شروع ہو رہا ہے۔ مگر ادھر نئی کہانی۔ وہ چار ماہ بعد بہزاد کی بارات چڑھانے جا رہی تھیں۔ اب چار ماہ بعد چھلا کرتیں۔

چپکی۔

"ہائے! میں کسی کو منہ دکھانے جوگی نہ رہی۔"

ایک روز بھائی بھاوج آ گئے۔

"اب تو ناراض ہو کر بیٹھی ہے۔ لے آنا بارات جب دل چاہے۔"

اماں نے کمبل میں خود کو چھپایا۔ منہ بھی موڑ لیا۔

"آپا! ناراض نہ ہو۔" بھائی فکر مند ہو گیا۔

"نہیں! اب تو رہن دے۔ پڑھنے دے اس کو۔"

"نہ آپا! آپ خود پڑھائیں۔" بھائی نے پیر داب۔

"نہ میں نے کوئی اسکول کھول رکھا ہے۔ جو پڑھانا پڑھوانا ہے' اپنے گھر سے کراؤ۔" شہزاد کے ابا نے بیچ جھوٹ ملا کر انہیں بھیجا۔

"تو ایسے منہ چھپا کر بیٹھی ہے جیسے گناہ کر لیا ہو۔"

"میری پوترے کھلانے کی عمر ہے کہ پتر۔ ہائے ہائے میں شرماں والی۔ ہائے۔" منہ میں دوپٹا ڈال کر رونا شروع کر دیا۔

"او جھلیے لوکے! میری بات سن۔ جس روح نے آنا ہے اس نے آنا ہے۔"

"میرا ٹبر پورا ہے۔ دو منڈے اور دو کڑیاں۔ میں چھوں گی کا کا چک کے۔"

"اللہ کے ہر کام میں مصلحت ہے۔ اوئے! ہو سکتا ہے یہی وہ بچہ ہو' جس نے مرتے ٹیم تیرے منہ میں پانی کا قطرہ ٹپکانا ہو' مجھے کندھا دینا ہو۔ اوئے! ہو سکتا ہے مٹی اسی کے ہاتھوں سے ڈلنی ہو۔ اللہ بھیج رہا ہے تو کام ہی سے بھیجے گا۔ اوئے! دنیا میں ویلیاں رہ کے کوئی نہیں کھاتا۔" (فارغ رہ کر روٹی نہیں ملتی)

"تو وہ جو باقی دو کام سے لگائے ہیں' وہ دو بوند پانی نہیں دیں گے؟" اماں کو آگ لگ گئی۔

"اوئے! ان کے پر پورے ہو گئے ہیں۔ بھلا انہوں نے اڑان۔ وہ اعتزاز ملک سے باہر جانے کا شوقین ہے۔ کوئی روز روز آئے گا۔ اس کو خبر ہونے تک تو تیجا ہو جاتا ہے۔ اس وڈے بہزاد نے برفوں (سیاچن) پر جا کر بنے کو مارنا ہے اور کڑیاں تو ہیں ہی پرایا فیر؟"

"اور اگر یہ کڑی ہوئی تے خیر۔"

"او سو بسم اللہ۔ میرے نبی کا سلام۔ او! تیرا ہاتھ بٹائے گی اور تو بھول گئی' مجھے بیٹیاں کتنی پیاری ہیں؟ چھوٹی چھوٹی۔ بھئی واہ۔" ابا کو تصور ہی سے مزا آ گیا۔

اماں کے رونے میں اور شدت آ گئی۔

"دنیا کیا کہے گی بڈھے وارے۔"

"اوئے! اللہ دے رہا ہے۔ چل رونا بند کر دے اور کون بڈھا؟ کوئی نہیں۔" ابا جی نے سینہ پھلا کر مونچھیں مروڑی تھیں۔ اماں کو حیا آ گئی۔

☼ ☼ ☼

اسٹیشن کی حدود شروع ہوتے ہی ٹرین نے جب رفتار دھیمی کی' اس نے تب ہی اماں کو بنچ پر بیٹھے دیکھ لیا تھا۔ گیارہ سال پہلے ہی وہ بہت بوڑھی معلوم ہوتی تھیں تو اب تو۔ دراصل وہ عورتوں کے اس قبیل سے تعلق رکھتی تھیں' جو بیٹی کی بلوغت کو اپنے بوڑھاپے کی پہلی دستک مانتی ہیں اور اماں تو وہ تھیں جو اڑتیس سال پہلے اپنے "بڑھاپے" پر شہزاد کو گود میں اٹھانے پر لال لال ہو گئیں۔

وہ سفید زمین پر سرمئی پھولوں والے سوٹ میں لاٹھی کے سہارے بیٹھی تھیں۔ ان کا گہرا سانولا رنگ' سفید بال' لمبی ناک جواب گالوں کے گوشت کے ڈھلک جانے کے بعد زیادہ نمایاں ہوئی تھی۔

وہ بہت سرد مہری سے انہیں تک رہی تھی اور اتنی مگن تھی کہ نعمان کے پکارنے پر ہڑبڑا اٹھی۔

نعمان نے اماں کے ساتھ آئے ڈرائیور کی مدد سے سامان اتارا۔ بچیاں پہلے ہی دادی سے لپٹ چکی تھیں۔ نعمان اور نزہت کو آگے لاہور جانا تھا اور انہیں یہاں خانیوال اتر کر آگے ڈیڑھ گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد گھر پہنچنا تھا۔ نزہت' شایان کو لے کر نیچے اتری۔ وہ اماں سے پیار لے رہی تھی۔ اماں نے شایان کو پیار کیا اور بغلی جیب سے کچھ نوٹ نزہت کی مٹھی میں بھر دیے اور دونوں ہاتھوں سے اس کی مٹھی تھام کر اسے نہ کھولنے کی تاکید کی۔

"بس۔ بس۔ میرا پوترا ہو گا تو اس سے زیادہ لے کر آنا۔" نعمان اور نزہت کی خجالت پر انہوں نے جیسے مسئلہ حل کیا۔

ارم نے ایک ٹھنڈی ٹھار سانس بھری۔ وہ جلد از جلد اس منظر سے غائب ہونا چاہتی تھی۔ تھکاوٹ' تھکاوٹ اور بس تھکاوٹ۔ جسمانی بھی ذہنی بھی کل بچیوں کو اسکول جانا تھا۔ وہ چاہتی تو اپنی سہولت کو مدنظر رکھتے ہوئے دو دن پہلے آ جاتی۔ مگر وہ اس طرح آیا کرتی تھیں۔ طوعاً و کرہاً ایک دن پہلے۔ اور جاتی بھی ایسے تھی۔ جس دن بچیاں آخری روز اسکول سے لوٹتیں۔ گھر پہنچ کر بھی وہ میکے کم جاتی۔ جس کو اس سے ملنا ہے' اس کے گھر آئے رات بھی نہ رکتی۔ منہ سے تو اس نے کبھی کہا نہیں۔ مگر سب جانتے تھے شہزاد کی موجودگی میں ارم کے گھر نہیں جانا۔ بیٹیاں کھوکھے جتنی تھیں۔ ورنہ شاید انہیں بھی برداشت نہ کرتی۔ وہ شہزاد کے "ساتھ" کا پل پل ہتھیا لینا چاہتی تھی۔

وہ اب گاڑی میں منہ پر کپڑا ڈال کر بیٹھی تھی۔ راستے کا گرد و غبار' خشکی' ترئی' ہریالی اس نے ساس کو سلام کر کے صرف سر پر پیار لیا تھا۔

اماں اس کی کیفیت سمجھتی تھیں۔ وہ ہر بار اس طرح منہ بسور کر پندرہ پندرہ دن خاموش رہتی۔ اگر بولتی تو کاٹ کھانے کو دوڑتی۔ سب سے خفا۔ کسی ملازمہ کی طرح گھر کے کام دھام دیکھتی۔

پھر جیسے ہار کر دھیرے دھیرے نارمل ہو جاتی۔ انہیں بڑے بیٹے بہزاد کا انداز بھی پسند نہیں آیا تھا۔ اعتزاز نے راستہ ہی وہ اپنایا کہ بندہ کچھ بولنے کے قابل نہ رہے۔ بہزاد کچھ لوگوں کی نظر میں بالکل صحیح تھا تو ادھر شہزاد بھی کچھ لوگوں کے لیے مثال تھا۔ وہ بہزاد کو بھی نہ منا سکی تھیں کہ اسما کو ان کے پاس رہنے دے۔ اتنے سال بعد وہ شہزاد کو بھی قائل نہیں کر پائیں کہ اپنی بیوی کو اپنے ساتھ رکھے۔ انہیں اب بہو کی ضرورت نہیں ہے۔ بہزاد نے قطعیت سے کہا تھا۔

"اماں جی! آپ برا نہیں ماننا۔ اسا میرے ساتھ رہے گی۔ جہاں میری پوسٹنگ ہوئی وہیں وہ بھی۔ اگر بیوی کو اس طرح دور رکھنا تھا تو میں شادی ہی کیوں کرتا۔"

بہزاد کی بات کا نجانے کیا رخ تھا۔ مگر اماں کٹ کے رہ گئیں۔ دوبارہ پھر کبھی نہ کہا۔ نہ خوشی میں نہ غمی میں۔ بہزاد نے تو ملیٹھے پن سے کہتے ہوئے فیصلہ سنایا تھا۔ جس میں شاید کوشش کی جاتی تو ترمیم کی گنجائش نکل جاتی۔

شہزاد نے حد کردی۔ اس نے قسم کھائی۔

"جب تک ماں زندہ ہے۔ میری بیوی کو اگر مجھ سے ذرا سی بھی محبت' لگاؤ' انس ہے یا وہ میرے فیصلے کا ذرا سا بھی احترام کرتی ہے تو ان کے ساتھ رہے گی ان کی خدمت کرے گی۔"

اور ارم کی زندگی کا واحد مسئلہ جس نے بہت سے مسئلوں کو پیدا کیا' وہ یہ کہ وہ شہزاد سے بے حد' بے پناہ' بے حساب' اپنی جان سے گزر جانے کی حد تک محبت کرتی تھی۔ زمانوں سے محبت کی آزمائش کے لیے کڑے سے کڑے امتحان رکھے جاتے ہیں اور عشق گزیدہ سردھڑ کی بازیاں لگاتے ہیں۔ کوئی جنگلوں میں نکلتا ہے۔ دوسرا دودھ کی نہریں نکالنے لگتا ہے۔ کسی نے تاج و تخت کو ٹھوکر ماری۔ سنتے تو یہ بھی ہیں' کوئی اپنی ہی ران کے تکے بنا کر کھلا گیا۔ اب پتا نہیں' وہ کون تھے۔ کیسے تھے۔ سچے تھے یا جھوٹے۔ بھاڑ میں جائیں۔ سننے میں انتہائی عام سی شرط' ایک سراسر بے ضرر' قابل تعریف و تقلید فیصلہ۔ ارم کو لگتا' اس کی محبت دور صحرا کے ویرانے میں کھلنے والا سرخ پھول ہے' جو خوش رنگ ہے خوشبودار ہے' جو ہواؤں کو اپنے نرم وجود پر محسوس کرکے جھومتا ہے۔ اپنے آپ میں سمٹ جاتا ہے۔ مگر توصیف کے دو بول' قدر دانوں کی ایک نگاہ التفات کا پیاسا ہے' جو اپنی ساری خوبروئی سمیت ایک دن دم توڑ دے گا اور کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوگی اور شہزاد نے کہا تھا۔ اگر ارم کو اس سے ذرا سا بھی لگاؤ ہے تو۔۔۔ تو اگر تم مجھ سے پیار کرتی ہو تو۔۔۔؟ اگر میرے کہے کا مان رکھو تو۔۔۔؟

اور ارم کو اس کے ماتھے پر گرنے والے بالوں سے' آنکھوں کی جگمگاہٹوں سے' مونچھوں تلے تبسم بکھیرتے ہونٹوں سے' مضبوط ہاتھوں سے' اس کے قد و قامت سے' اس کے آفٹر شیو لوشن سے' اس کی بنیان سے' اس کے ہاتھ کی گھڑی سے' اس کی نیوی کے مونو گرام سے سجی سفید و نیلی کیپ سے' ہر شے سے لگاؤ تھا' پیار تھا' محبت تھی۔ پھر وہ اس کی ماں سے کیسے محبت نہ کرتی۔ اسے ان سے بھی پیار ہو گیا تھا۔ مگر اس پیار کا خراج اس کے دل پر بڑھئی کے رندے کی طرح زور زور سے چلتا تھا۔ اس نے اپنی آنکھوں سے' اپنے ہر ہر عمل سے شہزاد کو بتانا چاہا تھا کہ وہ اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ نہیں کہا تو منہ سے نہ کہا۔ وہ سب سمجھتا تھا۔ لیکن دنیا کا سب جلدی چبایا جانے والا کھانا "قسم" ہے۔ جس کا ہضم بہت مشکل۔۔۔ لیکن وہ نیلے پانیوں کا باسی تھا اور اس "رہائش" کی پہلی شرط مضبوط قوت ارادی تھی۔

☼ ☼ ☼

شروع میں وہ ارم کے ساتھ کراچی میں رہنے لگیں۔ مگر وہ کھلے دیہاتی ماحول کی باسی یہاں نچڑ کر رہ گئیں۔ شہزاد پہلے انہیں بلاتا تو وہ اکیلے گھر کا کہہ کر ٹال دیتیں کہ "میں سارا دن کیا کروں گی تو وہ چھٹی لے آ۔"

اب وہ چھٹی آ گئی تو بھی ان کا دل نہیں لگتا تھا۔ دل لگانے کو سال بعد عروہ آ گئی تو وہ کافی حد تک بہل گئیں مگر مسئلہ دوسرا تھا۔ سمندر کی جانب سے آتی ہوائیں ان کی ہڈیوں کو جیسے ہتھوڑے مارتیں۔ انہیں یہاں کا موسم راس نہ آتا۔ موسم سے جان بچاتیں تو دوسرا مسئلہ زیادہ توجہ طلب تھا۔

"مجھے یہاں کا پانی راس نہیں۔۔۔ اصل گندم نہیں ہے۔۔۔ سبزیوں میں ذائقہ نہیں۔"

ارم پوری توجہ سے کھانا بھونتی' مگر انہیں یہاں آتے ہی قبض کی شکایت ہو جاتی یا پھر بے تحاشا دست' گیس' تیزابیت' درد' ڈکاریں اور الٹیاں۔ شہزاد کے جسم سے جان نکل جاتی۔ اس کے ہاتھ پیر پھول جاتے۔ ساری قوت ارادی ہوا ہو جاتی ارم نے دیکھا وہ رو رہا ہوتا۔ اماں کو ڈرپ لگی دیکھ کر۔۔۔ طوعاً" و کرہاً" اماں کو گھر لے کر جاتے تو اگلے دن بھلی چنگی۔

چھوٹی نند نے ڈگری کالج میں جب لیکچرر کی حیثیت سے تعینات ہوئی تو اس کے لیے دو بچوں کے ساتھ اب ماں کے لیے وقت نکالنا مشکل تھا۔ شہزاد کے لیے بار بار چھٹی لے کر آنا ایک مسئلہ۔ دوسرے اماں عروہ کے بغیر نہیں رہ پاتیں۔ انہیں اپنی یہ پوتی دنیا جہان سے پیاری تھی۔

بہزاد کے بچوں کا شیر خوارگی اور بعد میں لڑکپن کا زمانہ وہ صحیح طور نہیں دیکھ پائیں کہ وہ ان دنوں کوئٹہ میں تعینات تھا۔ اعتزاز کا اکلوتا بیٹا وہیں لندن میں تھا۔ کراچی والی بڑی بیٹی کے بچے اپنے ددھیال سے مانوس تھے۔ چھوٹی کے دو بیٹے تھے۔

پہلے وہ کراچی آ کر قبض و دست سے لڑتیں اور گاؤں جا کر آرام پاتیں۔ اب یہ ہوا کہ گاؤں جا کر عروہ کی یاد میں زار زار روتیں اور اتنا بیمار پڑ جاتیں کہ ایک بار شہزاد ایمر جنسی میں جہاز میں بیٹھ کر عروہ کو ملانے لے گیا۔ عروہ حاضر۔ بیماری غائب۔ معمولی بات' بہت بڑا مسئلہ بن گئی۔۔۔ بے حد پیچیدہ' حل طلب۔۔۔

اور شہزاد نے حل نکال لیا۔

"ارم اماں کے ساتھ گاؤں میں رہے گی۔ بس۔۔۔ ختم۔۔۔ ری لیٹنف۔۔۔ اور کوئی لفظ نہیں۔"

☼ ☼ ☼
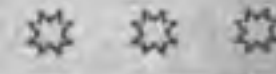
روز روز کی چخ چخ اور شہزاد کی بے حد پریشانی دیکھ کر ارم بھی فوری علاج کے طور پر گاؤں آ گئی۔ اسے یقین تھا کہ شہزاد اس کے بغیر نہیں رہ پائے گا۔ دو مہینے یا چھ مہینے یا حد سے حد سال۔ مگر یہاں گیارہ سال گزر گئے۔ اماں جب کراچی میں بیمار پڑا کرتیں۔ ان کی حالت دیکھ کر عیادت کرنے والے آنکھوں آنکھوں میں کہتے۔ "بچنا مشکل ہے۔" مگر اماں بچتی رہیں اور آج تک ماشاء اللہ چلتے ہاتھ پیروں کے ساتھ بیٹے کی فرماں برداری اور بہو کی تابعداری اور زمانے کی واہ واہ کی مزے لوٹ رہی تھیں۔ ارم نے ان گیارہ سالوں میں تمام حربے آزما کر دیکھ لیے۔ ہنس کر' رو کر' لاڈ سے' انداز سے باور کرایا کہ وہ یہاں نہیں رہ سکتی۔ اس نے سچے جھوٹے بہانے بنائے۔

"یہاں بجلی بہت جاتی ہے۔"

یو پی ایس اور ہیوی جنریٹر حاضر۔

"یہاں اچھے آئٹم نہیں ملتے کھانے پینے کے۔"

شہزاد چھ چھ ماہ کا سامان بھر جاتا۔ چاکلیٹس' نوڈلز' جوسز' تیار کھانے' مسالاجات' بچوں کے لیے اعلا برانڈ کی چیزیں۔

ڈرائیور کے ہمراہ گاڑی رکھ دی۔ ہر کام کے لیے کل وقتی ملازمہ تو اماں نے ہمیشہ رکھی تھی۔

"یہاں اسکول اچھے نہیں ہیں۔" ارم کے ہاتھ ترپ کا پتا لگ گیا۔

"کیوں کیا ہو گیا؟ ابھی نئی عمارت بنی ہے اور نئے ٹیچرز بھی آئے ہیں۔"

"وہ کیا خاک پڑھائیں گے۔ ہماری بچیاں پیچھے رہ جائیں گی۔ کیا بن سکیں گی وہ اس جگہ پر؟"

"یار! میری بات سنو۔ کرنے والی بات کرو۔" اس کے مصنوعی خوف زدہ گمبھیر لہجے پر وہ بہت تحمل سے بولا۔ "شہزاد بھائی کرنل تک پہنچ گئے۔ عنیزہ اسی اسکول سے پڑھ کر کالج پرنسپل بن گئی ہے۔ میں تمہارے سامنے ہوں۔ ہماری بچیاں کیسے پیچھے رہیں گی۔"

"وہ اور زمانہ تھا۔ اس وقت استاد اچھے تھے۔" ارم جلبلا گئی۔

"کوئی نہیں۔ استاد تو اب بھی وہی ہیں۔ وہ میرے ماسٹر جی اللہ یار۔۔۔ کیا استاد ہیں یار۔"

"بڈھے کھوسٹ ہو گئے وہ۔ اب کیا خاک پڑھائیں گے۔"

"پاگل ہو تم جان من! اب تو بلکہ وہ زیادہ "کاریگر" ہو گئے۔ ہمارے زمانے میں تو وہ نئے نئے بھرتی ہوئے تھے۔ خود بھی سیکھنے کے مرحلے میں تھے۔ اب تو وقت کی بھٹی میں تپ تپ کر کندن بن گئے۔ میں تو کہوں گا۔ میری بچیاں خوش نصیب ہیں، جو ان سے پڑھ رہی ہیں۔"

وہ استاد کی محبت میں سرشار منطق بھی ڈھونڈ کے ہی لایا تھا۔ اس کی منطقی بات پر ارم دانت پیس کر رہ گئی۔

"تو ریٹائر ہونے والے ہیں وہ۔ شاید اسی برس۔"

"او ویری سیڈ۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "یار! دیکھو ذرا تم۔۔۔ مجھے صحیح طرح نام تو یاد نہیں۔ کوئی بوڑھے سندھی ایکٹر تھے۔ اسکول ٹیچر بھی شاید نور محمد لاشاری ان کا نام تھا۔ ریٹائر ہونے پر بولے۔

"جب پڑھانا آیا تو اگلوں نے کہا۔ "اب تم کام کرنے کے قابل نہیں ہو۔" ان کے لہجے کا تاسف آج تک یاد ہے۔ میں تو کہتا ہوں ٹیچر کو کبھی ریٹائر نہیں کرنا چاہیے۔ وہ تو پرانے چاول کی طرح ہوتا ہے۔

خوشبودار نکھرا نکھرا۔۔۔ کیوں؟"

ارم کا سر پیٹ لینے کو دل چاہا۔ اس نے عیب ڈھونڈا۔ اگلے نے مدح سرائی میں پل کھڑے کر دیے۔ لیکن بات ارم کی کافی حد تک درست تھی۔ عروہ کے پنجم جماعت میں جاتے ہی گھنٹہ بھر کی مسافت پر قائم فوجی اسکول میں اس کا داخلہ ہو گیا۔ ڈرائیور لاتا، لے جاتا۔ بچیاں خوش۔ یہ پوائنٹ بھی گیا۔ ارم کو کھلی چھوٹ تھی۔ جب جہاں دل چاہے شاپنگ کے لیے چلی جائے۔ خود وہ بھی جب آتا، اسے خوب گھماتا پھراتا۔

"اگر میں کسی عالم دین سے فتویٰ لوں کہ میں اپنے میاں کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں تو؟" اس نے ایک بار یونہی سرسری سا چھیڑا۔

"ارے میری جان!" وہ جھوم گیا۔ اپنے بازوؤں میں کس لیا۔ "عالم دین کو کہو گی۔ کبھی ہم سے تو کہا نہیں۔ ادھر میری طرف دیکھو اور اتنے روکھے لہجے سے کیوں۔۔۔ یہ پلکیں اٹھاؤ۔۔۔ تھوڑے جذبے تو بھرو۔۔۔"

وہ بات کو اپنے مطلب پر لے گیا۔ ارم باقی کے جملے بھول گئی۔ وہ دونوں نارمل طور پر ساتھ ساتھ رہتے تو شاید ارم بھی گیارہ سال گزر جانے پر روزمرہ کے معمول کے مطابق آجاتی۔ مگر اس دوری نے اسے اندر ہی اندر گھائل کر دیا تھا۔

گیارہ سال میں محبت بڑھتی تو ہے۔ مگر اس کی حالت پرسکون ندی کی طرح ہوتی ہے، لیکن ارم کے اندر شوریدہ لہریں تھیں۔ اسے اپنا آپ لہروں کی طرح لگتا۔ جو پوری طاقت سے ساحل سے ٹکراتی ہیں۔ مگر ناکام لوٹ جانا ان کا مقدر ہوتا ہے۔ شہزاد کے لیے اس کی محبت طوفانی لہروں کی طرح تھی۔ جو بہت غضب ناکی سے ساحل کی طرف بڑھتی ہیں۔ مگر پتا نہیں کیوں ساحل پر آکر دم توڑ دیتی تھیں۔ وہ اپنے دل کو ٹٹولتی تو صاف تھا کہ اسے ہرگز اماں کے ساتھ رہنے یا ان کی خدمت پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ مگر اس کی قیمت شہزاد سے دوری؟

آف۔ عید، شب برأت، سالگرہ۔ وہ ہر روز اس کے لیے سنگھار کرنا چاہتی۔ وہ اس کا محبوب تھا اور محبوب کی جانب سے سراہے جانے کی خواہش میں وہ ادھ مری ہو گئی تھی۔ اسے وہم ہو گیا کہ شہزاد کے دل میں اب اس کی محبت نہیں رہی۔ وہ بدل گیا ہے۔ اس کے اندر وہ تڑپ نہیں ہے، جو اسے اندر ہی اندر کھا رہی ہے۔

اس نے شادی کی سالگرہ پر دماغ کے لاکھ سمجھانے پر بھی دل کی مانتے ہوئے اسے فون کیا۔

"آپ کچھ نہیں بولیے گا شہزاد!" اس کی آواز میں نمی تھی۔ لڑکھڑاہٹ تھی۔ "میں کچھ بولنا چاہتی ہوں۔" اس کے گالوں سے آنسو تار کی صورت گر رہے تھے۔ اس کی آواز تھرا رہی تھی۔

"آپ کو آج میرے پاس ہونا چاہیے تھا۔ مجھے اب اپنی خوش نصیبی سے کوئی امید نہیں۔" اس کے الفاظ ٹوٹ رہے تھے۔

"آپ کی کھائی قسم کو نبھانے میں، میں اندر سے ٹوٹ گئی ہوں۔۔۔ کرچی کرچی۔۔۔ میرے ہاتھ لہولہان ہو گئے شہزاد۔۔۔ مم۔۔۔ مم۔۔۔ مگر۔۔۔ بس

بہت ہیں خواب، مگر خواب ہی سے کیا ہوگا
ہمارے بیچ جو حائل ہے، وہ حقیقت ہے
یہ جاگتی ہے تو پھر دیر تک جگاتی ہے
میرے وجود میں سوئی ہوئی جو وحشت ہے
وفا سرشت ہوں، دوری میں بھی محبت ہے
اکیلے رہنے میں، لیکن بڑی اذیت ہے

اکیلے رہنے میں لیکن بڑی اذیت ہے، شہزاد۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی ضبط کی طنابیں چھوٹ گئی تھیں۔ وہ بے دم ہو کر ڈھے گئی۔

اس نے عجب خود اذیتی کے عالم میں رات نجانے کیا، کیوں اور کیسے کہہ دیا تھا۔ مگر اب جو ہوش میں آکر دیکھا۔ سامنے شہزاد تھا۔ رات دو بجے اس کی کال اٹینڈ کرنے کے بعد وہ ایک پل سو نہیں پایا تھا۔ صبح چھ بجے والی ڈائیو پکڑی اور اب وہ اس کے سامنے تھا۔ اس کی شیو معمول سے بڑھی ہوئی تھی اور آنکھیں بے حد سرخ۔۔۔

"میں جانتا ہوں۔۔۔ جان شہزاد۔۔۔ "اکیلے رہنے میں، لیکن بڑی اذیت ہے۔۔۔" اذیت کا لفظ چھوٹا ہے۔ بلکہ ایسا کوئی لفظ ہی نہیں ہے، جو ہماری کیفیت کو بتا سکے۔" اس نے ارم کے حیران چہرے کو اپنے ہاتھوں کے پیالے میں بھر لیا۔

"تم بہادر ہو۔ کم از کم کہہ تو دیا۔ میں بزدل ہوں، کم ظرف ہوں یا کیا ہوں۔۔۔ کہہ نہیں سکتا۔۔۔ میری جان!" ارم کا وجود پتے کی طرح ہل رہا تھا۔ اس نے شہزاد کی آنکھوں میں نمی دیکھی تھی۔

"وہ بہت بوڑھی ہو گئی ہیں۔ لاغر، نحیف۔۔۔ میں انہیں بے آسرا نہیں چھوڑ سکتا۔ میں ان سے بے پناہ محبت کرتا ہوں اور تم سے بھی۔۔۔ مگر فرق یہ ہے کہ میری محبت جواب ہے "اس محبت کا" جو انہوں نے مجھ سے کی۔۔۔ یہ خراج ہے۔۔۔ میں نے تم سے محبت کی تو تم سے اس کا خراج مانگا ہے۔ میں ان سے مانگ نہیں سکتا۔ لوگ میری تعریفیں کرتے ہیں، مثالیں دیتے ہیں۔۔۔ یار! میں نے کیا کیا۔۔۔ کچھ بھی تو نہیں۔ بس بیوی بچے ماں کی دل جوئی کے لیے ان کے پاس رکھ چھوڑے ہیں یہ "ڈگری" لے کر اللہ کے حضور جاؤں تو دھکے مار کے نکالا جاؤں۔ یہ تو ایک رات کے گیلے بستر کو بدلنے کا بدل بھی نہیں۔ میں کہاں کا ایثار کر رہا ہوں۔۔۔ کچھ بھی نہیں۔۔۔ ہاں! احساس ہوا۔۔۔ ساری رات سوچتا رہا ہوں۔ شاید تم سے زیادتی ہو گئی۔ معاف کر دو۔۔۔ پہلے میں نے خود غرضی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فیصلہ کیا تھا۔ میں اب فیصلے کا اختیار تمہیں دیتا ہوں۔"

نجانے کس جملے نے، سوچ نے شہزاد کے آنسوؤں کو من مانی کی اجازت دے دی تھی۔ اس نے ارم کو بازوؤں میں بھینچ لیا۔ وہ کپکپا رہی تھی۔ ارم کے بال اور شہزاد کا شانہ بھیگ بھیگ گیا۔

کسی کے حصے میں گھر آیا یا دکان آئی
میں گھر میں سب سے چھوٹا تھا میرے حصے میں ماں آئی

اور شہزاد کو دل و جان سے تقسیم میں اپنا حصہ پسند آیا تھا۔ اسے یہی چاہیے تھا۔

☼ ☼ ☼

"میری بس یہی ایک دعا رہ گئی ہے۔ تم سے وہ بھی پوری نہیں ہوتی۔" اماں اب کپکپا کر ٹھہر ٹھہر کے بولتی تھیں۔ آواز میں لڑکھڑاہٹ بھی پیدا ہو گئی تھی۔

"اماں! میں اب اور کیا کہتی۔" ارم نے ناکام لہجے میں کہا۔

"بیٹا سکھ ہوتا ہے۔ بیٹیاں بہت پیاری ہیں۔ پھولوں ورگی۔ مگر اپنی ساری خوشبو لے جاتی ہیں۔ کیاری خالی کر دیتی ہیں۔ بوٹا وہیں کا وہیں رہتا ہے۔ پھول توڑ کے اگلی لے جاتے ہیں۔ اب خالی ہرے ہرے کو پانی تو چاہتے نہ چاہتے دے دیتے ہیں۔ مگر نظر بھر کے دیکھتے نہیں۔ بیٹا تنے کی طرح ہوتا ہے۔ کھڑا رہتا ہے۔ سوکھ بھی جائے تو چھت پر ڈالنے کے کام آتا ہے۔ لینٹر ہوتا ہے لینٹر۔"

ارم کا موڈ خراب ہو رہا تھا۔ مگر مثال پر ہنسی نکل گئی۔

"اماں! وہ نہیں مانتے۔ کہتے ہیں، بیٹے بیٹیاں سب برابر ہیں۔ بچے دو ہی اچھے۔ کہہ رہے تھے پہلے ہی میری ضد کی وجہ سے اسریٰ آگئی ہے۔" ارم کو شہزاد سے ڈانٹ پڑی تھی۔

"تو وہ تو تیری ضد تھی نا۔ اب ایک میری مان لے۔" اماں نے بچکانہ انداز میں منہ بسورا۔

"ویسے بڑا تابعدار بنا پھرتا ہے۔ مانتا میری اک نہیں ہے، میں نے دعائیں کی ہیں۔ ان شاء اللہ بیٹا ہوگا۔"

انہوں نے رازدارانہ انداز میں چہرہ آگے کر کے ارم کو بتایا۔ ارم چپ رہ گئی۔ بیٹے کی تمنا اسے بھی تھی۔ مگر شہزاد اٹل تھا۔

"بس! اب اور کچھ نہیں۔" وہ شہزاد کی سب مانتی تھی۔ مگر یہاں وہ بھی اماں کی ہمنوا تھی۔

"آپ خود کہہ دیں اماں! آپ کی تو ضرور مانتے ہیں۔" ارم نے جان چھڑائی۔

"توبہ! اتنی بے شرمی۔ ارے! عورتیں تو اپنی سب منوالیتی ہیں۔"

ارم کو آگ لگ گئی۔ "وہ نہیں ہوں میں عورت۔ اور وہ بڑے میری ماننے والے۔ میری مان کر تو آج تک کا دن آیا ہے۔" وہ پیر پٹختی اندر بڑھ گئی۔ اماں نے لاٹھی پر گال جوڑ لیا۔

"بہو آج کل جھنجلائی ہوئی ہے۔"

☼ ☼ ☼

شہزاد چھٹی پر آیا تو اماں کے یاد دلانے پر ارم نے صاف ہری جھنڈی دکھادی۔

"مجھے کوئی بات نہیں کرنی۔ آپ خود ہی کریں۔"

اماں کی طبیعت خراب تھی۔ وہ ساری رات کھانستیں اور ادھر شہزاد بے چین ہو کر کروٹ بدلتا۔ اماں کا بخار بگڑا تو شہزاد کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ وہ اماں کے ہاتھ چومتا۔ اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلاتا۔ اماں کو گود میں بھر کے بیٹھ جاتا۔ بال سنوارتا۔ پوتیاں دائیں بائیں، رشیداں مائی مستعد اور ارم تو تھی ہی۔

وہ بھی سچ مچ پریشان تھی۔ اماں کی طبیعت پہلے کبھی ایسے خراب نہیں ہوئی تھی۔ شہزاد کی چھٹی کے سارے دن اماں کی بیماری کی نذر ہو گئے۔ وہ اس بار نہ چاہتے ہوئے دوبارہ ڈیوٹی پر گیا۔ وہ دن میں کئی بار فون کرتا۔ نیٹ پر بات کرتا۔ ڈاکٹر کے مستقل چیک اپ۔ مگر اماں کو عمر رسیدگی کا مرض لگ چکا تھا۔ جو لاعلاج ہوتا ہے۔ وہ پہلے ہی کم گو تھیں۔ اب اور چپ رہنے لگیں۔ پوتیاں بہت پیاری تھیں۔ ان کے قصے سنتیں۔

اتنی خراب حالت کا سن کر بیٹے بیٹیاں سب آئے۔ پیسہ، اچھا علاج سب تھا۔ مگر ان کے پاس وقت نہیں تھا۔

"میں وہاں اس طرح پریشان نہیں رہ سکتا۔ اماں! آپ اس بار میرے ساتھ چلیے۔" شہزاد کے جسم پر تھکاوٹ حاوی تھی۔

"وہاں زیادہ اچھے اسپتال ہیں اماں! پلیز۔"

"نہ... نہیں... آخری سانسیں اسی گھر میں۔" وہ ہٹ کی پکی تھیں۔ "میں ٹھیک ہو جاؤں گی، جب پوترے کا منہ دیکھوں گی۔" فرمائش کا اچھا موقع تھا۔

"اماں! بہزاد اور اعتزاز بھائی کے بیٹے آپ کے پوترے ہیں نا۔ میں انہیں بلوا لیتا ہوں۔ ان کا منہ دیکھتی رہیں۔" شہزاد اس فرمائش پر بھنا گیا۔

"مجھے تیرا بیٹا دیکھنا ہے۔"

"تو کیا گارنٹی ہے؟"

"گارنٹی تو تیری بھی نہیں تھی۔ پتا نہیں کہاں سے منہ چک کے آگیا۔ ایسے ہی خوامخواہ۔" اماں نے جل کر کہا۔ شہزاد کی ہنسی نکل گئی۔

"مجھے پانی پلانے کے لیے بھیجا ہے نا اللہ نے۔"

"صحیح کہتے تھے تیرے ابا جی اللہ بخشے۔ تو نے مٹی ڈالنی ہے نا۔" اماں کا انداز دل توڑ دینے کے بعد اب پچکارنے کا سا تھا۔

"اماں!" شہزاد کا اگلا سانس رک گیا۔ وہ پیروں کے پاس بیٹھا تھا۔ اپنے ہونٹ تلووں پر رکھ دیے۔

"بیٹے ایسے کون سے کام کر سکتے ہیں، جو بیٹیاں نہیں کرتیں؟" اس نے بہلانے کو پوچھا۔

"یہ تو پوچھ رہا ہے؟ یہی سب جو تو کر رہا ہے۔ لاکھ اچھی ہوں گی، پرلائن سے چلی جائیں گی۔ بیٹا ہوگا تو پانی پلائے گا۔ عینک ڈھونڈ کے پکڑائے گا۔ لاٹھی دے گا ہاتھ میں۔"

"تو یہ تو بیٹیاں بھی دے سکتی ہیں۔" شہزاد پر ذرا اثر نہ ہوا۔

"ہاں! تو وہ اپنا گھر سنبھالیں گی کہ تو گوڈے سے جوڑ کر رکھے گا؟ میرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک نے بیٹیاں دی تھیں۔" اماں نے خفگی سے منہ پھیرا۔

"بیٹے بڑے ناخلف ہوتے ہیں اماں!" اس نے ڈرایا۔

"میرا تو نہیں ہے۔" اماں نے قطعیت سے انکار کیا۔ "اور تو سن لے۔ بیٹا ہی ہوگا۔ یاد رکھیں ارم۔" وہ مسکرانے لگیں ان کے منہ میں اب دانت نہیں تھے۔

پوپلے گال پر مسکرانے کی کوشش میں چہرہ بڑا ہی مضحکہ خیز لگتا۔

گیارہ سال ارم کو ان کے ساتھ رہنا عذاب لگا تھا۔ مگر اسے اب احساس ہوا، اماں نے اس سے کبھی اپنی ذاتی خدمت تو نہیں لی۔ بلکہ وہ ارم کی مددگار تھیں۔ ارم نے صرف بچیوں کو جنم دیا تھا۔ ان کا پالنا اور دیکھ بھال، ٹھنڈا گرم سب اماں کی فکریں تھیں۔ ارم کو خبر بھی نہ ہوئی اور شیر خوار بچوں کی مالش، موڑھے دیوانا، گنجا کروانا، تیل لگوانا، زود ہضم غذائیت سے بھرپور دیسی کھانے بنانا، وہ خود کرتیں یا کام والی مائی سے کرواتیں۔ ارم کے ہاں بچہ پیدا ہوتا ہوتا تو اسے ہتھیلی کا چھالا بنا لیتیں۔

مگر اس بار صورت حال مختلف تھی۔ ارم اپنی جان سے بےزار ڈھیلے ڈھالے کپڑوں میں بے ہودہ چال چلتی انگڑائیاں، جمائیاں، ابکائیاں لیتی۔ لڑائیاں کرنے کی اب ہمت نہیں تھی اور کرتی بھی کس سے۔

شہزاد کو اماں کی بیماری نے مخبوط الحواس کر دیا تھا وہ دو دن کی چھٹی ہونے پر بھی راتوں رات پہنچ جاتا، اماں کے گھٹنے سے لگنے کے لیے۔ ارم سے رسمی سلام دعا کرتا اور اماں کے کمرے میں غائب۔ مسلسل سفر اور پریشانی نے اس کی صحت پر اثر ڈالا تھا۔ حد تو یہ ہوئی کہ ایسے بھی کئی دورے آئے جب وہ دو دو تین تین دن کے چکر پر آیا اور اس نے اپنے بیڈ روم میں جھانکا تک نہیں۔ ارم کے پاس اب کلسنے تک کی ہمت اور ٹائم نہیں تھا۔ کام کاج کے لیے دو دو ماسیاں آئیں۔ مگر ان کی نگرانی کرنا بھی ایک کام تھا۔

اماں بستر نشین ہو چکی تھیں اور مجبور اس قدر کہ حوائج ضروریہ کے لیے بھی اٹھ نہ سکتی تھیں۔ انہیں پیمپر لگانے پڑتے۔ زبان میں لڑکھڑاہٹ آگئی۔ چہرہ سکڑ گیا۔

بہزاد بھائی نے ایک کل وقتی تربیت یافتہ نرس اچھے پیکج کے ساتھ بھیج دی۔ مگر نرس صرف مشین کی طرح کام کرتی اور اماں جذبوں کی طلب کرتی تھیں۔ ارم کو ان حالوں میں ویسے بھی ہر شے بری لگتی تھی۔

اسے کھانے کی پینے کی پھولوں تک کی مہک سے الٹی آتی تھی اور اماں کے کمرے میں جانے سے تو یوں لگتا جیسے کوئی منہ کے راستے ہاتھ ڈال کر اس کا دل، جگر، گردے سب نکال لینا چاہتا ہو۔ اماں کے کراہنے اور کبھی کبھار اونچا رونے کی آواز پر اگر وہ اندر داخل ہونا چاہتی تو وہ اشارے سے باہر جانے کو کہتیں۔ نرس کپڑے بدلواتی۔ وضو کرواتی۔ وہ اشارے سے نماز و وظائف وغیرہ پڑھتیں۔ ارم کا تصور کرکے پھونکیں مارتیں۔

"پوتا ہوگا میرے شہزاد جیسا، سوہنا منڈا، دیکھیں۔۔۔" وہ اکثر یہی گردان کرتیں۔

اولاد پیسے والی تھی۔ دوائیاں، ڈاکٹرز، نرسیں تمام طبی سہولتیں میسر تھیں۔ مگر وہ دن بہ دن تنزلی کی جانب مائل تھیں۔

"میرے اللہ! اپنے منہ سے موت کی دعا نہیں کرنی چاہیے۔ میں موت نہیں مانگ رہی۔ بس تو آگلوں کو آزمائش سے بچالے۔۔۔"

ارم آخری دنوں کے رت جگے سے گزر رہی تھی۔ وہ ساری رات کمر پر ہاتھ دھرے ٹہلتی اور اماں کی فریادیں سنتی۔ ارم زندگی کو خوش آمدید کہنے کے لیے جاگتی تھی اور اماں "الوداع" مانگنے کے لیے۔

وہ مرض الموت میں گرفتار ہو چکی تھیں۔ فرشتہ دروازے پر نشان لگا گیا تھا اور سب نے یہ دیکھ بھی لیا تھا۔ مگر شہزاد کا کیا کرتے، جو دیوانہ ہو رہا تھا۔ دھاگا ٹوٹ چکا تھا اور سروں کو لاکھ تختی تھامے رہو، موتی ایک ایک کرکے گرتے جاتے ہیں۔ تاوقتیکہ خالی دھاگا ہاتھ میں رہ جائے اور خالی دھاگا آخر کب تک ہاتھ میں رہ سکتا ہے؟ چھوٹ جاتا ہے ایسے کہ۔۔۔ انگلیاں خود ہی مسل مسل کر نیچے گرا دیتی ہیں۔ مگر شہزاد کو لگتا، وہ دوبارہ گانٹھ جوڑ لے گا۔

وہ اچھے صابن سے منہ دھلواتا۔ سر میں تیل ڈال کر چار تنکوں کو سنوارنے لگتا۔ چٹخی ہوئی سیاہی مائل پنڈلیوں پر ساری ساری رات تیل کی مالش کرتا۔ وہ نرس کے ہاتھ سے مائع خوراک لے کر اپنے ہاتھوں سے کھلاتا۔ وہ ذائقے کو ناپسند کرتے ہوئے انکاری ہوتیں تو "ایک چمچہ میں ایک چمچہ آپ" والا کھیل کھیل کے ویسے ہی بہلاتا اور کھلاتا۔ جیسے وہ کبھی بچپن میں کیا کرتی تھیں۔ وہ بہت حلیم، خاموش، باوقار عورت رہی تھیں۔ پتا نہیں کیوں بچوں کی طرح چیخیں مارنے لگتیں اور روتیں۔

وقت پورا ہو جائے تو بچہ ماں کے پیٹ میں سر پٹخنے لگتا ہے۔ ان کا وقت پورا ہو چکا تھا۔ وہ واپسی کے سفر کے لیے اسٹیشن پر کھڑی تھیں۔ بس گاڑی کچھ لیٹ تھی اور انتظار اب بس سے باہر تھا۔

وہ کبھی سنبھل جاتیں۔ اشارے سے نمازیں پڑھتیں۔ ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں کوئی بہت پرانا قصہ بیان کرتیں، جسے سمجھنا کافی مشکل ہوتا۔ مگر شہزاد پوری دلچسپی اور ذوق شوق سے ہمہ تن گوش رہتا۔ کبھی انہیں اپنے ابا، اماں یاد آتے تو زار و قطار روتیں۔ بوڑھے، بے حد بوڑھے بندے کو روتا دیکھنا اور رونا سننا بہت اذیت ناک ہوتا ہے۔ اعصاب کے لیے توڑ پھوڑ شکن۔ یہ ایسی آواز ہوتی ہے جیسے رات کے سناٹے میں بلیاں رو رہی ہوں۔ بین ڈال رہی ہوں۔ چھوٹے بچے کے پھولے گال پر ٹکا آنسو ماں اپنے ہونٹوں کے بوسے سے چوم لیتی ہے، پی جاتی ہے۔ بوڑھے گال کا آنسو انگلی کے سرے پر بھی نہیں ٹکتا۔ وہ وہیں جھریوں میں غائب ہو جاتا ہے اور بہت دیر تک اپنا وجود برقرار رکھتا ہے، گرم گیلا اور ٹھنڈا۔

شہزاد انہیں پچکارتا۔ بانہوں میں جکڑے سینے سے لگاتا اور وہ بھی بغل میں منہ چھپا لیتیں۔ شہزاد کی دنیا ویران تھی۔ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے من پسند کھلونے کو جیسے چکنا چور ہوتے دیکھ رہا تھا۔

ارم کے بیٹے کی ولادت کے محض مہینے بعد وہ خاموشی سے ایک رات روانہ ہو گئیں۔ ہاں۔ انہیں مرنا ہی تھا۔

ہر آنے والے کو جانے کا عہد نبھانا پڑتا ہے۔ زندگی انگریز کا بنایا ہوا جہاز ہوتی ہے۔ وقت پورا ہو جائے تو اچھے خاصے دیوہیکل عالیشان دار جہاز کو شپ بریکنگ بھیج دیتے ہیں۔ کرچی کرچی، پرزہ پرزہ ہونے کے لیے۔ ہم جیسے کہیں "یار ابھی دس سال اور چلے گا"۔ مگر نہیں فائل بند ہو جاتی ہے۔

☆ ☆ ☆

ارم کو حیرت ہوئی۔ بارہ سال تک وہ بے ضرر عورت اس کے ساتھ رہی۔ وہ ساتھ تھی تو وقت کیسے ٹھہر ٹھہر کے گزرتا تھا اور اب یہ چھ ماہ کیسے بھاگے تھے۔ وہ کیسے خوشیوں کی راہ کی رکاوٹ لگا کرتی تھیں۔ راستے میں پڑی جھاڑی جیسی۔ ارم کو شادیانے بجانے چاہیے تھے۔ مگر ایک ملال تھا، جو دل سے ہٹنے نہیں دیتا تھا۔ بے خیالی میں بھی دل بجھا بجھا سا کیوں رہتا تھا۔ ان کی موجودگی میں ان کی عادتیں، باتیں، حرکتیں ارم کو کبھی یاد نہیں رہیں۔ مگر اب ہر سانس کے ساتھ کوئی نہ کوئی یاد جڑی تھی۔

ان کی وفات پر بہت دنیا اکٹھی تھی۔ بیٹے، بیٹیاں، داماد، اگلی نسل سب موجود تھے۔ کسی کے کہے سنے بغیر سب ارم اور شہزاد ہی کو پرسہ دیتے تھے۔ یہاں تک کہ بہزاد بھائی اور اعتزاز بھی شہزاد سے ایسا افسوس کرتے جیسے وہ بس اسی کی ماں تھیں۔ وہ اپنی زندگیوں میں مگن تھے۔ اسما بھابھی کو کالج کی فکر تھی۔ وہ تین روز کی چھٹی لے کر آئی تھیں۔ منیزہ آپا اعتزاز کے بیٹے میں انٹرسٹڈ تھیں، اپنی بیٹی ماریہ کے لیے۔۔۔ وہ مہمانوں کی طرح دس روز تک ایک ہی کمرے میں محدود رہیں۔

عنیزہ، ارم اور شہزاد کے زیادہ نزدیک تھی۔ وہ ماں سے بھی زیادہ قریب تھی۔ اسے وقفے وقفے سے ہول اٹھتے تو شہزاد سے لپٹ جاتی اور شہزاد۔۔۔ شہزاد کی حالت بہت تباہ تھی۔ وہ بچوں کی طرح اکڑوں بیٹھ کر سر پر ہاتھ مار مار کے روتا اور "اماں، اماں" کی صدا لگاتا۔ ان کی زیر استعمال اشیا سے لپٹ جاتا۔ قبر کو بوسے دیتا۔ اس کے اختیار میں ہوتا تو مٹی کی ڈھیری کو ٹھوکر مار کر ان کی لاش کو باہر نکال لیتا۔ وہ اپنے بچپن سے لے کر ان کی وفات تک کے نہ جانے کون کون سے قصے نکال لیتا۔ تب، جب، کب۔ سارا دن لوگوں کی ڈھارس اسے مضبوط رکھتی۔ راتوں کو اٹھ کے بیٹھ جاتا۔ عروہ، ارفع کو بانہوں میں بھر کے زار و قطار روتا۔ دسویں کے بعد اعتزاز بھائی کراچی منیزہ کی طرف چلے گئے۔ بہزاد بھائی چشمے کو ٹشو سے چمکانے کے بعد دور خلاؤں میں تکتے ہوئے شہزاد کے کندھے کو تھپتھپاتے ہوئے "بی بریو۔۔۔ بی پریکٹیکل" کہتے ہوئے رخصت ہو گئے۔

اللہ کی بہت سی نعمتوں میں سے ایک نعمت صبر بھی ہوتی ہے۔ مرنے والوں پر صبر آجاتا ہے۔ دنیا اپنے اندر مقناطیس سے زیادہ کشش رکھتی ہے۔ یہ اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔

وہ اپنے گھر لوٹ آئی۔ اس کا خوابوں جیسا سفید، سرخ، سبز سجا گھر۔۔۔ ساحل کی طرف سے آتی مست ہوائیں۔۔۔ ملنے والے اس کے صبر کو سراہتے۔ ہمت کی داد دیتے۔ اس کا مشکل وقت بھی کٹا۔۔۔ وہ خالی نگاہوں سے کہنے والوں کے چہرے تکتی۔ کوئی صبر، ہمت، مشکل نہیں، یہ محبت تھی، جو اسے شہزاد سے، اپنے محبوب سے، اپنے شوہر سے تھی اور اس کے شوہر کو اپنی ماں سے محبت تھی۔ لوگ ان دونوں کی مدح سرائی کرتے اور بہت سے ثواب اور صلے کی خوش خبری سناتے۔

ارم کو خود پر حیرت ہوتی۔ اسے وہ سب مل گیا تھا، جس کے لیے وہ تڑپتی، روتی اور لڑتی تھی۔ پھر بھی وہ خوش نہیں تھی۔ بارہ سال تک تصور کی آنکھ سے من پسند منظر تخلیق کرتی اور خوش رہتی۔ اب عملی تعبیر سامنے تھی تو دل ناخوش تھا۔ دل نے بہت کچھ سوچنا شروع کر دیا تھا۔ اماں کو بہر حال مرنا ہی تھا۔ وہ کبھی کبھار شہزاد سے آنکھ نہ ملا پاتی۔

(یہ سوچتا ہوگا میں اب اس کی ماں کے مرجانے کے بعد خوش ہوں۔)

لوگ اس کی اعلا ظرفی کی تعریف کرتے۔ اسے بہت اجر ملے گا۔ ارم سوچتی۔ بہزاد، اعتزاز اور دنیا کے دوسرے بہت سے بیٹے، اولادیں اپنے والدین کی حقوق سے نظر چرائے مزے سے کامیاب زندگی گزارتے ہیں۔ انہیں بے یار و مددگار چھوڑ دیتے ہیں، اولڈ ہوم

میں اور خود بھی بہت مطمئن زندگی گزارتے ہیں۔ بہت اچھی' قابل رشک۔ اسے کون سا صلہ ملے گا اور کب ملے گا۔ اس نے صلے کی تمنا کب کی تھی۔ اسے اپنی تعریفیں بھی نہیں سننی تھیں۔ اس نے تو بس صبر کیا تھا۔ خود پر جبر کیا تھا۔ اسے آخر کیا صلہ مل سکتا ہے؟

نوعمری کا جوش و جنوں ٹھہرنے لگا تھا۔ جذبے سرد ہونے لگے تھے۔ ان پر راکھ کی تہ جمنے لگی تھی۔ شہزاد مطمئن تھا کہ اس نے ماں کو راضی رکھا۔ وہ اسے دعائیں دیتی دنیا سے رخصت ہوئی۔ لیکن وہ عورت جو اس کی بیوی تھی' کیا اس کے لیے اس کا کوئی فرض نہ تھا؟ کیا اس کے حقوق نہ تھے؟ شوہر کی قربت کوئی ناجائز یا غیر فطری خواہش تو نہ تھی۔ اس کا حق تھا۔ روز حشر اس کا بھی تو انصاف ہوگا۔ پھر پتا نہیں کون سا پلڑا بھاری ہوگا۔

کراچی آکر اپنے من پسند لائف اسٹائل کو سیٹ کرنے کی مصروفیت' بچوں کے اسکول' شہزاد کے ساتھ ہر جگہ شرکت' میلہ' دوست' بازار' پارک' کھانا پینا' چھوٹا بچہ' بے حد مصروفیت میں جب کوئی اس کے بارہ سالہ جوگ کا ذکر کرتا اور صلے کا اعلان کرتا' وہ ہمیشہ کھو جاتی۔ کیسا صلہ' کب ملے گا' مرنے کے بعد' جنت' انعام کیا' کیا بلا۔

☼ ☼ ☼
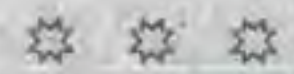
احمد ایک برس کا ہو گیا تھا۔ تین بیٹوں کے بعد بیٹا اس کی خواہش تھا۔ مگر شہزاد کے منع کر دینے پر وہ اپنی خواہش سے دستبردار ہو گئی تھی۔ وہ صرف اماں کی خواہش' ضد اور دعاؤں کے بعد ان کی زندگی کا حصہ بنا تھا۔ ارم کو اپنی تینوں بیٹیاں پیاری تھیں۔ عروہ بڑی ہونے کے باعث' ارفع کی ادائیں اور باتیں' اسریٰ چھوٹو' لاڈو۔ احمد زندگی میں آیا تو اسے لگا' اسے صرف اسی سے پیار ہے۔ وہ طوطا لگتا' جس میں اس کی جان بند تھی۔

اس نے بہت نارمل طریقے سے بچیوں کو پالا تھا۔ مگر احمد کے معاملے میں کچھ جنونی تھی۔ کرا تو نہیں' کھاتا کیوں نہیں' رویا کیوں' گود میں چڑھا کر رکھتی' کسی دوسرے پر اعتبار کم کرتی۔ ہر گزرتا پل اس کے دل میں احمد کی محبت کو بھرتا جا رہا تھا۔ دوسری طرف شہزاد کا پیار زیادہ تر بیٹیوں کے لیے تھا۔ مگر احمد کو وہ اپنی ماں کی دعا مانتا۔ ”میری ماں کی دعا کا نتیجہ ہے۔“

ارم سوچتی۔ ”یہی تو نہیں ہے وہ صلہ' اجر' بدل؟“

احمد بہت چھوٹا تھا۔ اتنے چھوٹے بچے ماں ہی کے نزدیک ہوتے ہیں۔ مگر احمد کا التفات کچھ اور طرح کا تھا۔ وہ سال بھر کا بچہ تھا۔ پاؤں پاؤں چلتا اور کچھ جدوجہد کر کے پلنگ سے اتر جایا کرتا۔ شہزاد اور تینوں بچیاں اس کی توجہ کی منتظر رہتیں۔ مگر وہ ہر وقت اپنی ماں کی طرف ملتفت رہتا' اتنے چھوٹے بچے صرف ماں ہی کے نزدیک ہوتے ہیں۔ مگر احمد کا انداز کچھ الگ چونکا تا ہوا تھا۔ اول تو وہ ماں سے ایک پل کے لیے بھی الگ نہ ہوتا۔ گود میں چڑھنے کی ضد تو کرتا۔ مگر اس کی یہ خواہش ہوتی کہ ماں نظروں کے سامنے رہے۔ ایک شانت' خاموش' بے ضرر بچہ' ارم کو اس کے تحمل پر حیرت ہوتی۔ وہ ماں کی ٹھوڑی چباتا۔ اس کی انگلیاں چوستا۔ چھوٹے بچے کسی کی بھی گود میں جا کر ماں کی طرف ہی ہاتھ بڑھاتے ہیں۔ رو کر' ضد کر کے' چلا کر' مگر وہ بے حد رحم طلب انداز میں اس کی طرف دیکھتا۔ انداز اتنا بے چارگی آمیز ہوتا کہ لینے والا خود احساس جرم میں مبتلا ہو جاتا کہ بچہ' ماں کی گود ہی میں رہے۔ دوسری طرف وہ کسی بھی معاملے میں ضدی نہیں تھا۔ جس طرح رکھو' رہے گا۔ مگر ماں کے نزدیک۔ چلتی پھرتی' سوتی جاگتی۔ مگر اسے ماں اپنے پاس نظر آتی چاہیے۔

☼ ☼ ☼

صبح چار بجے کا وقت ہے۔ وہ روز اس وقت جاگ جاتا ہے۔ اسے بھوک لگ رہی ہے۔ مگر وہ رو' رو کر گلا نہیں پھاڑ رہا۔ وہ بہت متحمل مزاج ہے۔ اس کی آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہیں۔ وہ ہیولے کھوج سکتا ہے۔ یہ گہری نیند کا وقت ہے۔۔۔ یا تو نیک جاگ

رہے ہیں یا بد۔۔۔ وہ بد تو ہرگز نہیں۔ ہاں! نیکی کی تمیز ابھی نہیں رکھتا۔ گوشت کا لوتھڑا' زبان ضروری تو ہے۔ مگر نہ ہو تو رکاوٹ نہیں۔ بعض باتیں زبان سے ادا تھوڑی کی جاتی ہیں۔ اسے ماں کو جگانا ہے۔ مگر وہ روتا ہے تو ماں پریشان ہو جاتی ہے۔ اس نے اس بات کو محسوس کر لیا ہے۔ بول کر کیسے کہے؟ ہاں۔ مگر ہے ناں ایک طریقہ۔ وہ گربہ پائی سے پلنگ سے اترا ہے۔ چلنے کے لیے پلنگ کا سہارا لیتا ہے۔ وہ ماں کے پیروں کے پاس آرکا۔ اس کے چھوٹے گلگلے جیسے ہاتھوں نے پیروں کو تھام لیا۔ کلی جیسے اس کے نازک ہونٹ' ان پیروں کا بوسہ لے رہیں۔ اس کی قامت پلنگ کی اونچائی برابر ہے۔ اس کے گال تلووں سے چپکے ہیں۔ پوت کے پاؤں پالنے ہی میں نظر آجاتے ہیں۔ اس نے چہرہ ارم کا چرایا اور عادتیں باپ کی۔ وہ شہزاد کا بیٹا ہے اور ماں کے پیروں کے بوسے سے لطف اٹھاتا ہے۔ اسے ابھی ماں کہنا نہیں آیا۔ مگر اس نے ماں کو سمجھ ضرور لیا ہے۔ شہزاد کی فرماں برداری حیرت کے ساتھ غصہ لاتی تھی۔ احمد کی فرماں برداری حیرت کے ساتھ حیرت اور پھر خوشی لاتی ہے۔ وہ شہزاد کا بیٹا ہے' تو پھر اسے ایسا ہی ہونا چاہیے۔ شہزاد کا بیٹا ایسا ہی ہو سکتا ہے۔

”باپ پہ پوت' نسل پہ گھوڑا' بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا۔“

ارم کی سوچوں کی پرواز ماضی سے سفر کرتی مستقبل تک پہنچی۔ اچھا یا برا' صحیح یا غلط۔ مگر گزر گیا۔

اس کا بیٹا اس کے لیے ساری دنیا سے بڑھ کر تھا اور بیٹے کے لیے یقیناً ”وہ“۔ لیکن وہ اس اہمیت اور محبت پر خود غرضی کا لیبل کبھی نہیں لگوائے گی۔ وہ بیٹے کی اس بے اندازہ محبت پر فخر کرے گی۔ شان سے غرور بھی۔۔۔ وہ اس سے لطف اندوز بھی ہوگی۔

لیکن وہ بیٹے کو باپ کے چلن کو اختیار کرنے سے روکنا چاہتی ہے۔

وہ اسے محبت کی تقسیم کا درست طریقہ بتائے گی۔ محبت اندھا ہونے کا نام نہیں۔ محبت کو دونوں آنکھوں میں ہونا چاہیے' تاکہ چہار اطراف کا منظر نمایاں ہو۔ محبت کی پٹی ایک آنکھ کو نہ ڈھکے کہ صرف ایک پہلو اجاگر ہو۔

بند آنکھ کے اس سرے میں کچھ بھی ہو رہا ہو' پتا ہی نہ چلے۔

وہ اپنے بیٹے کو محبت میں توازن سکھائے گی۔ وہ اسے اس روش پر چلنا سکھائے گی کہ وہ اس کی صحیح تقسیم کر سکے۔

باپ کی طرح ماں کے حقوق میں اس قدر اندھا ہونے نہیں دے گی کہ وہ کسی کومل جذبات والی نوعمر لڑکی کے جذبات کو روندتا چلا جائے۔

ظاہر سی بات ہے' جو اپنا سب کچھ چھوڑ کر صرف اس کے لیے چلی آئے گی' وہ ہی اس پر زیادہ حق رکھے گی۔ ماں کا حق ختم نہیں ہوگا۔ لیکن بیاہ کے آنے والی کے تمام حقوق کی ذمہ داری اب اس پر زیادہ ہوگی۔

وہ اسے خود سے محبت کرنے سے نہیں روکے گی۔ وہ اس کا خوب لطف اٹھائے گی۔ اس پر اکڑے گی بھی۔۔۔ مگر اس حد تک' جہاں سے اس آنے والی کومل لڑکی کے حقوق شروع ہوتے ہیں۔ وہ اگر اپنی ماں پر جاں نثار کرنا چاہتا ہے تو اپنے آپ کو شش کرے۔ مذہب ایک رات کے بستر بدلنے کی بھرپائی کی جوابدہی کرتا ہے۔

تو وہی مذہب یہ بھی تو کہتا ہے کہ ماں کی خدمت بیٹے کی ذمے داری ہے۔ بہو اپنے شوہر کی محبت و اطاعت میں اگر کرتی ہے تو ماں' بیٹے کو احسان مند ہونا چاہیے۔ تاکہ وہ انہیں خوش رکھنے کے لیے اپنی جوانی اور خواب کو جدائی اور بے کلی کے عذاب میں جھلسا دے۔ وہ اپنے بیٹے کو محبت کرنے کا صحیح طریقہ بتائے گی۔

محبت کی تقسیم کا صحیح فارمولا۔۔۔ وہ اسے اندھا دھند محبت سے روکے گی۔ ماں کی محبت سے بھی اور بیوی کی محبت سے بھی۔

رُخسانہ نگار عدنان

ایک تھی مثال

عدیل اور فوزیہ نسیم بیگم کے بچے ہیں۔ بشریٰ ان کی بہو ہے اور ذکیہ بیگم کی بیٹی عمران بشریٰ کا بھائی ہے۔ مثال ذکیہ بیگم کی نواسی اور نسیم بیگم کی پوتی ہے۔ بشریٰ اور نسیم بیگم میں روایتی ساس بہو کا تعلق ہے۔ نسیم بیگم مصلحتاً "بیٹا بہو سے لگاوٹ دکھاتی ہیں۔ دوسری طرف ذکیہ بیگم کا کہنا ہے۔ ان کی بیٹی بشریٰ کو سسرال میں بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ ذکیہ بیگم اپنے بیٹے عمران کے لیے بھی لڑکیاں دیکھ رہی ہیں۔ پانچ سال کی مسلسل کوششوں کے بعد بشریٰ کی نند فوزیہ کا بالآخر ایک جگہ رشتہ طے پا جاتا ہے۔ نکاح والے روز بشریٰ دولہا ظہیر کو دیکھ کر چونک جاتی ہے۔

عدیل سے شادی سے قبل ظہیر کا بشریٰ کے لیے بھی رشتہ آیا تھا مگر بات نہ بن سکی تھی۔ نکاح والے دن زاہدہ اور ذکیہ بیگم بھی ایک دوسرے کو پہچان لیتی ہیں۔ بشریٰ اپنی ماں سے یہ بات چھپانے کے لیے کہتی ہے مگر عدیل کو پتا چل جاتا ہے۔ وہ ناراض ہوتا ہے مگر فوزیہ اور نسیم بیگم کو بتانے سے منع کر دیتا ہے۔ بشریٰ اور عدیل ایک ہفتے کے لیے اسلام آباد جاتے ہیں۔ وہاں انہیں پتا چلتا ہے کہ بشریٰ کے ہاں سات سال بعد پھر خوش خبری ہے۔

عفان اور عاصمہ اپنے تین بچوں اور والد کے ساتھ کرائے کے گھر میں رہتے ہیں۔ عفان کے والد فاروق صاحب سرکاری نوکری سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ گریجویٹی اور گاؤں کی زمین فروخت کر کے وہ اپنا گھر خریدنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ڈیڑھ کروڑ میں زمین کا سودا کر کے وہ عفان کے ساتھ خوشی خوشی شہر آ رہے ہیں۔ عاصمہ کو فون کے ذریعے کوئی اطلاع ملتی ہے، جسے سن کر وہ بے ہوش ہو جاتی ہے۔

فون پر پتا چلتا ہے کہ شہر آتے ہوئے عفان اور فاروق صاحب ڈکیتی کی واردات میں قتل ہو گئے۔ عفان کے قریبی دوست زبیر کی مدد سے عاصمہ عفان کے آفس سے تین لاکھ روپے اور فاروق صاحب کی گریجویٹی سے سات لاکھ روپے وصول کر پائی ہے۔ زبیر گھر خریدنے میں بھی عاصمہ کی مدد کر رہا ہے۔

اسلام آباد سے واپسی پر عدیل دونوں مقتولین کو دیکھتا ہے۔ زاہدہ، نسیم بیگم سے بیس لاکھ روپے سے مشروط فوزیہ کی رخصتی کی بات کرتی ہیں۔ وہ سب پریشان ہو جاتے ہیں۔ عدیل بشریٰ سے ذکیہ بیگم سے تین لاکھ روپے لانے کو کہتا ہے۔

چوتھی قسط

وہ یک ٹک سامنے دیوار پہ لگے کیلنڈر کو دیکھتی جا رہی تھی۔

آج پندرہ تاریخ تھی اور کل سولہ!

سولہ تاریخ سرخ روشنائی میں چمکتا یوں اس کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے اس پہ ہنس رہا ہو۔ وہ اس دو ہندسی مجموعے کو دیکھتی رہی اور وہ قہقہے لگانے لگا۔

اس نے کرب سے آنکھیں بند کر لیں مگر وہ جانتی تھی آنکھیں بند کر لینے سے یہ سرخ بلا جو کسی خون آشام چڑیل کی طرح اس سفید کیلنڈر پر سیاہ ہندسوں کے بیچ کھڑی ہے اسے معاف نہیں کرے گی۔ ایک روز یہ اسے ضرور نگل جائے گی۔ کاش! یہ سولہ تاریخ اسے اس روز ہی نگل چکی ہوتی جب وہ پیدا ہوئی تھی۔ دنیا میں شاید کسی شخص کو اپنے جنم دن سے اتنی نفرت ہو جتنی اسے تھی۔ سولہ تاریخ اس کا جنم دن تھا۔

اس کے نزدیک مہینے میں دو تاریخیں بدترین ہوتی تھیں۔ یکم تاریخ جب کوئی بھی مہینہ پچھلے مہینے کی کوکھ سے جنم لے کر اپنے تئیں نیا نکور ہو کر نکلتا تھا۔ دنیا والوں کے لیے نئی امیدیں نئی آرزوؤں کی تمہید لے کر طلوع ہونے والا نیا مہینہ۔ اس کے نزدیک یہ پہلی تاریخ اس سولہ کی خوف ناک تمہید ہوتی تھی۔

وہ رونا نہیں چاہتی تھی۔

آنسو بہانا بھی ایک ہنر ہوتا ہے۔ اس نے اتنے سالوں سے اور کچھ بھی نہ سیکھا ہو مگر آنسو چھپانے کرب سہنے خود کو بے حس و بے پروا ثابت کرنے کا ہنر اسے خوب آ گیا تھا۔

یوں بھی رویا تو ان کے سامنے جاتا ہے جن کو آپ کے آنسوؤں کی پروا ہو۔ جو آپ کی آنکھوں میں نمی دیکھ کر ہی بے قرار و بے چین ہو جاتے ہوں۔ جن کو آپ کی سوجی آنکھیں پریشان صورت دیکھ کر بے چینی، ہمدردی کے بجائے غصہ، چڑچڑاہٹ ہوتی ہو ان کے سامنے اپنے قیمتی احساسات جو خالصتاً صرف آپ کے ہیں، برہنہ کرنا اپنی توہین کے برابر تھا اور اسے اپنی توہین کبھی بھی گوارا نہیں تھی۔

اس کے سیاہ بالوں کی لٹیں اس کے چہرے کے اطراف یوں بکھری ہوئی تھیں جیسے انہیں بہت دنوں سے، بہت فرصت سے سنوارا نہ گیا ہو۔ اس کی بڑی بڑی گہری سیاہ آنکھوں کی بے رنگی گواہ تھی کہ ان خوب صورت آنکھوں کو بہت دنوں سے کاجل کی سیاہی سے سجایا نہیں گیا۔ اسے تو اپنی آنکھوں کی موجودگی کا احساس ہر وقت نم رہنے فرش سے ہوتا تھا۔

اس نے گردن کرسی کی پشت سے لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

اس کے سیاہ گھنے کمر سے نیچے تک آتے بال کرسی کی پشت کے ساتھ ہلکورے کھانے لگے۔ اس کی صبیح رنگت میں گلابیاں گھلی ہوئی تھیں۔ اس کا کتابی چہرہ کتنا خوب صورت اور دل آویز تھا۔ اس کا اندازہ تو خود اسے بھی نہیں تھا۔ اس کی خود سے یہ بے پروائی اسے اور بھی پرکشش بناتی تھی۔

وہ کچھ دیر کے لیے آنکھیں موند کر جیسے ہر دکھ، ہر غم سے بے نیاز ہو جانا چاہتی تھی مگر یہ ممکن نہیں تھا۔ اس کے کانوں میں مختلف آوازیں پڑنے لگیں۔

"اف کل سکستھین سے آئی ایم سو ایکسائیٹڈ۔ کل کا دن کتنا خوب صورت کتنا زبردست ہو گا۔ مری کے حسین مرغزار اس کے آگے نتھیا گلی کی برف آلود چوٹیاں اور آگے ایبٹ آباد۔ ہم صبح سویرے نکلیں گے نا؟؟"

دوسری طرف سے کیا جواب آیا وہ سن نہیں سکی۔

"اور ہاں اس بار شاپنگ میں کوئی کنجوسی نہیں ہو گی۔ مجھے وہ سب کچھ چاہیے ہو گا، جس کا میں نے بہت دنوں سے پلان کر رکھا ہے۔" اس کے نازک دل پر پھر کچوکا لگا۔ اس کی آنکھوں میں جیسے کچھ چبھنے لگا۔

وہ زور سے آنکھیں مسلتی کھڑی ہو گئی۔ اسے کچھ نہیں سننا تھا۔ کچھ نہیں سوچنا تھا۔ کچھ بھی ایسا جس سے اس کا درد بڑھتا ہی چلا جائے۔ جس سے اپنی ارزانی کا احساس اور بھی تکلیف دہ ہوتا چلا جائے۔

اس نے کھڑکی سے آتی ہوا کو محسوس کرنے کی کوشش کی، پھر اپنا دھیان کھڑکی سے باہر ہلکی ہوا سے ہلکورے کھاتے پودوں کی سر اٹھاتی شاخوں کی طرف لگائی۔ لیکن اس وقت تو جیسے کچھ بھی مددگار ثابت نہیں ہو رہا تھا جو اسے گدگدی کرنے کے بجائے اس کے اکیلے پن کے احساس کو اور بھی بڑھانے لگی تھی۔ اور شوخیاں کرتے پودے ہولے ہولے ہلتے مہکتے پھول جیسے اس کا ہنسی اڑا رہے تھے۔ اس نے ایک دم سے کھڑکی زور سے بند کر دی۔

"کل سولہ ہے۔ صرف چند گھنٹے ہی تو ہیں میرے پاس اور ابھی بہت سے کام کرنے والے ہیں۔ مجھے اپنے کاموں کی طرف دھیان کرنا چاہیے نہ کہ ان بے کار سوچوں کی طرف میں بار بار بھٹک جاتی ہوں۔ کیوں مجھے ہر بار خود اپنا ہاتھ پکڑ کر واپس اپنے رستے پر لانا پڑتا ہے۔ میں بدل کیوں نہیں جاتی۔ اتنے عرصے کی کوشش جیسے ایک دم سے زیرو ہو جاتی ہیں۔ یہ جذباتیت یہ بے وقوفی کی باتیں۔۔۔۔ کسی کو مجھ سے غرض نہیں، مجھے کسی سے غرض نہیں ہونی چاہیے۔ میں کیوں بار بار اس بات کو بھول جاتی ہوں۔" وہ جیسے غصہ میں خود کو ڈانٹ پلانے لگی۔

باہر کسی نے زور سے قہقہہ لگایا۔ وہ وہیں تھم سی گئی۔

اسے لگا کوئی اس پر ہنسا ہے کہ تم جتنا چاہو خود کو بے نیاز ظاہر کرو تم بے نیاز رہ نہیں سکتیں۔

اس نے اگلی کوئی بھی بات سوچے بغیر الماری کھولی اور میکانکی انداز میں اپنے کپڑے نکال کر الماری سے ایک بدرنگ پرانے بیگ میں رکھنے شروع کر دیے۔

باہر باتوں کا شور بڑھ چکا تھا مگر اب جیسے وہ کان بند کیے اپنے کام میں مصروف تھی۔

☼ ☼ ☼

"السلام علیکم اسلم چچا!" وہ واثق کے ساتھ داخل ہوئی اور فاروق صاحب کے رشتہ دار کو بیٹھے دیکھ کر اسے قدرے تسلی سی ہوئی۔

اسلم چچا نے اٹھ کر شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور دعائیں دینے لگے۔ عاصمہ ایک طرف چادر سے تھوڑا سا چہرہ چھپائے سر جھکا کر بیٹھ گئی۔

"کیا پئیں گے آپ چچا جان! چائے یا ٹھنڈا منگواؤں؟" وہ ان کے خاموش ہونے پر بولی۔ وہ جانتی تھی اسلم چچا گاؤں سے آئے ہیں تو کھانا کھا کر ہی جائیں گے۔

"کاش! ابا جی اور عفان ابھی تک گاؤں ہی میں ہوتے اور اسلم چچا ان کی مصروفیت کا کوئی عذر لے آتے تو میں ان دونوں سے تھوڑی دل میں خفا تو ضرور ہوتی مگر ان کی سلامتی کی خبر پہ مطمئن بھی ہو جاتی۔"

اس کا پگلا دل پھر سے انہونی خواہش کرنے لگا۔

اسلم چچا نے کیا جواب دیا تھا' وہ اپنے ساتھ ہونے والی خود کلامی میں سن ہی نہ سکی۔
"یہ لو بیٹا تمہاری امانت۔" وہ ان کی آواز پر بری طرح سے چونکی۔ انہوں نے سفید رنگ کا لفافہ اس کے آگے کھسکا دیا تھا جو خاصا پھولا ہوا تھا۔
عاصمہ لفافے کو ہاتھ لگائے بغیر سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔
"شاید اللہ کو یہ سب کچھ ایسے ہی ہونا منظور تھا۔" وہ گہرا سانس لے کر بولے۔ عاصمہ ان کی بات کا مطلب سمجھ کر کچھ بول ہی نہ سکی۔ ابھی تو زخم اتنا کچا تھا کہ بغیر ٹھیس کے بھی اس میں سے ٹیسیں اٹھتی ہی رہتی تھیں۔
"میری بیٹی کی شادی تھی۔ میں نے فاروق سے یونہی ذکر کیا کہ اس بار فصل ٹھیک نہیں ہوئی۔ سائرہ کی شادی کا ارادہ اگلے سال کے لیے اٹھا دیا تھا کہ لڑکے والوں نے ایک دم سے اصرار شروع کر دیا۔ وہ بھی کچھ ایسے کہ شادی کیے بغیر چارہ نہیں۔
میں نے فاروق سے نہ کوئی سوال کیا تھا نہ جی کا حال سنایا تھا پھر بھی ایسا محبت کرنے والا اچھی نیک طبیعت کا انسان تھا جیسے ہی زمین کا سودا ہوا اس نے رات میں مجھے خاموشی سے یہ چار لاکھ روپے لا کر دے دیے۔
اسلم چچا بے خوف ہو کر سائرہ کی شادی کے دن رکھیں۔" میں نے لینے سے صاف انکار کر دیا تو کہنے لگا۔ "چلیں اسے ادھار سمجھ کر رکھ لیں جب بھی سہولت ہو لوٹا دیجیے گا۔" وہ رک کر اپنے ڈگمگاتے لہجے کو سنبھالنے لگے آنکھوں کے سامنے رشتے کے بھتیجے کی تصویر بچی تھی جیسے وہ ابھی تک ان کے سامنے بیٹھا محبت بھری باتیں کر رہا تھا۔
"اور یہ خوفناک واقعہ ہو گیا۔ تمہیں تو شاید اس رقم کا علم بھی نہیں ہو گا بیٹی!" وہ اس طرح چپ بیٹھی رہی۔
"سائرہ کے بھائی نے بحرین سے دو لاکھ روپے بھیج دیے۔ اتنی رقم میں میں اپنی بچی کی عزت سے رخصتی کر سکتا ہوں تو میرے ضمیر نے گوارا نہیں کیا کہ میں یہ چار لاکھ استعمال میں لے آؤں جبکہ ان روپوں کی جتنی ضرورت تمہیں اور تمہارے بچوں کو ہے کسی کو بھی نہیں ہو گی۔ اگر وہ ظالم رقم لے جاتے' ان دونوں کی جان بخش جاتے تو بھی میں شاید اتنی جلدی رقم نہیں لوٹا تا مگر اب بیٹی! تم یہ رکھ لو۔ میرے سینے پر بہت بوجھ ہے۔ کئی راتوں سے اس کی وجہ سے سو نہیں پایا۔ رب نے شکر ہے ساتھ ابلیس کو یونہی نہیں لگایا۔ وہ لمحہ لمحہ موقع کی تاک میں رہتا ہے۔ اب جانے کب میری نیت میں فتور آ جائے اور میں مکر ہی جاؤں۔ تم یہ رکھ لو بیٹی۔"
انہوں نے یوں ڈرے ہوئے انداز میں لفافہ مزید عاصمہ کے آگے کھسکایا جیسے وہ اٹھائے گی نہیں تو وہ مکر ہی جائیں گے۔
"اگر آپ کو ضرورت ہے چچا! تو آپ بے شک رکھ لیں۔ ابا جی نے آپ کو دی تھی یہ رقم تو۔" اسے ایک بار تو مروتاً کہنا ہی تھا اور یہ بھی کہ معلوم تھا کہ انہیں رقم کی واقعی ضرورت ہے۔ وہ دو لاکھ کا انتظام ہو جانے کی بات خود سے بنا کر لائے ہوں۔
"نہیں میری بچی! اللہ تیری مشکلیں کم کرے۔ تیری ضرورتوں کے آگے تو میری ہر ضرورت چھوٹی اور جھوٹی ہے۔ تیرے گھر کے چھپر چھاؤں چلے گئے۔ تجھے اپنی ہمت' اپنی طاقت سے اب اپنے بچوں کے لیے چھپر بھی ڈالنا ہے اور ان کی چھاؤں بھی بننا ہے۔" وہ گلوگیر آواز میں بولے اور عاصمہ کی آنکھوں سے ضبط کرتے کرتے بھی آنسو پھوٹ نکلے۔
"بہت مان سے کہہ رہا تھا فاروق مجھ سے چچا! اب اپنا بہت اچھا سا گھر لینا ہے۔ ان پیسوں سے جا کر پھر میں گاؤں سے آپ سب کو بلواؤں گا اور شان دار سی دعوت ہو گی۔ اپنے گھر کی کیا بات ہے۔ اس کا اندازہ تو وہی کر سکتا

ہے جو کچھ عرصے پرائے گھروں میں رہ چکا ہو۔ میری بہو کی بڑی خواہش ہے اپنے گھر کی اللہ کا شکر ہے کہ میں بچوں کو اپنی چار دیواری دے کر جاؤں گا۔ اور دیکھو اس کی یہ حسرت... حسرت ہی رہ گئی۔" وہ آہ سی بھر کر بولے۔
"یہ بڑا بچہ ہے تمہارا؟" وہ واثق کو دیکھ کر بولے۔
"جی۔"
"اور کتنے بچے ہیں؟"
"تین چھوٹی بیٹیاں ہیں۔ واثق بڑا ہے ان تینوں سے۔"
"ظالموں کو اللہ دنیا اور آخرت میں رسوا اور برباد کرے۔ جنہوں نے تھوڑے سے پیسوں کی خاطر اپنی گور کالی کی۔ ان معصوموں کے سر سے باپ دادا کا سایہ چھینا۔"
عاصمہ نے آہستگی سے اپنا چہرہ صاف کیا۔ اب تو اس کا دل ان کو بددعائیں دینے پر بھی راضی نہیں تھا۔ اس نے اپنا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا تھا یقیناً "اللہ سے بڑھ کر کوئی انصاف کرنے والا نہیں۔"
"پولیس کو کچھ پتا نہیں چلا ان کا؟"
عاصمہ نے نفی میں سر ہلا دیا تو وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔
"چچا! کھانا کھا کر جائیے گا نا۔ کھانا تیار ہے۔" عاصمہ اصرار سے بولی۔
"اللہ تمہارے گھر کا چولہا ہمیشہ جلتا رکھے۔ آباد رہو۔ اپنے بچوں کے سر پر سلامت رہو۔ ہر مشکل میں اللہ تمہاری رہنمائی کرے بیٹی! یہ میرا فون نمبر ہے۔ گھر کا نمبر ہے' جب بھی جو بھی پریشانی یا مسئلہ ہو' بلا جھجک مجھے فون کر لینا۔ میں تمہارے لیے فاروق کی طرح ہی تو ہوں بیٹی! باپ سمجھ کر اپنی پریشانی کہہ دینا۔"
"ضرور چچا! لیکن آپ بیٹھیے تو کھانا کھا کر جائیں سب تیار ہے۔"
"خوش رہو آباد رہو۔ میرا فون نمبر سنبھال کر رکھنا۔ اللہ حافظ!"
وہ شفقت سے اس کے سر پہ ہاتھ پھیر کر چلے گئے۔
واثق اس لفافے سے رقم نکال کر ماں کو دکھاتے ہوئے گننے لگا۔
"ابا جی! میں آپ کو کہاں کہاں یاد کروں۔ ابھی تک جتنی رقم کا انتظام ہو سکا۔ وہ سب آپ کی وجہ سے... مگر یہ اکیلا پن... میں کیسے آپ دونوں کے بغیر رہنا سیکھوں گی۔"
"مما! کاؤنٹ کریں نا کتنی رقم ہے۔ کتنی کہہ رہے تھے انکل؟" واثق نے ہاتھ ہلا کر اسے متوجہ کیا۔ شاید نوٹوں کی تعداد دیکھ کر اس سے گننا مشکل ہو رہا تھا۔
"واثق! شاید اب ہم اپنا گھر لے ہی سکیں۔"
"کیا واقعی مما! ایسا ہو سکتا ہے؟ اتنے پیسوں میں گھر لے سکتے ہیں ہم۔"
"دعا کرو ایسا ہو جائے۔" وہ رقم گنتے ہوئے بولی۔

✫ ✫ ✫

بشریٰ حسرت بھرے انداز میں اپنے آگے پڑے زیورات کے خالی ڈبے دیکھ رہی تھی۔ ایک انگوٹھی تک عدیل نے اس کے پاس نہیں چھوڑی تھی۔ صرف اس کے گلے کی چین تھی جو بشریٰ کی رونمائی کا تحفہ تھی۔ جسے نہ بشریٰ دینے کے لیے مانی نہ عدیل نے ہی اصرار کیا۔
"کمائی سب تو چلا گیا نا!" اس کی آنکھوں میں بار بار آنسو آئے جا رہے تھے۔

"ممّا! آپ کی جیولری کہاں گئی۔ آپ نے یہ سارے باکس خالی کیوں کر دیے۔ کیا نانو کے گھر لے کر جائیں گی۔" مشال اپنی اسکول کی کتاب لیے بشریٰ سے کچھ پوچھنے کے لیے آئی تھی کہ بیڈ پر بکھرے ان سرخ جائنی مخملیں ڈبوں کو دیکھ کر متجسس انداز میں کھول کر دیکھنے لگی۔ ایک کے بعد ایک سارے ڈبے خالی تھے تو وہ ماں سے پوچھنے لگی۔

"اٹھا کر رکھ دو انہیں ایک طرف۔" وہ چڑچڑے انداز میں بولی۔

مشال نے بمشکل تمام ڈبے اٹھا کر ایک طرف رکھ دیے۔

"ممّا! آپ رو رہی ہیں؟" وہ ماں کا ہاتھ پکڑ کر ہمدردی سے بولی۔

"نہیں میری جان! میں کیوں روؤں گی۔" بشریٰ آنکھیں رگڑ کر بولی۔ وہ ماں کو غور سے دیکھنے لگی۔

"پھپھو اور دادو بھی رو رہی تھیں۔ میں ان کے پاس جاتی ہوں تو وہ مجھے ڈانٹنے لگتی ہیں۔"

"تو جان! آپ ان کے پاس مت جاؤ۔ اپنے روم میں رہو بس۔" بشریٰ اسے ساتھ لگا کر بولی۔

"بابا بھی اب مجھے پیار نہیں کرتے۔ سب پیسوں کی بات کرتے ہیں ممّا! اگر بابا کو پیسے چاہئیں تو میرے بینک میں اتنے سارے پیسے ہیں۔ میں نے جمع کر رکھے ہیں۔ میں وہ بابا کو دے دوں پھر تو وہ خوش ہو جائیں گے؟" مشال ماں کی طرف دیکھ کر معصومیت سے بولی۔

"میری جان کتنی حساس ہے۔ بیٹا! بابا پریشان ہیں۔ آپ بس اللہ میاں سے دعا کرو کہ ان کی پریشانی دور ہو جائے۔"

"میں دعا کروں گی اور نانو نے کہا تھا ڈھیر ساری دعا اپنے بھائی کے لیے بھی مانگنا۔ تمہارا بھائی آنے والا ہے۔ ممّا! نانو ٹھیک کہہ رہی ہیں؟"

وہ ماں کا چہرہ اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں میں لے کر اشتیاق بھری خوشی سے پوچھنے لگی۔

"ہاں جان! نانو ٹھیک کہتی ہیں۔ آپ بس اللہ تعالیٰ سے ڈھیر ساری دعا کرو کہ پیارا سا بھائی آپ کو مل جائے اور بابا کی ساری پریشانیاں بھی دور ہو جائیں۔" بات کرتے ہوئے وہ کھو سی گئی۔

"اگر سارا زیور بیچ کر بھی مطلوبہ رقم نہ مل سکی تو......

عدیل نے اب تک کی کئی ساری بچت بھی اس جوئے میں جھونک دی ہے۔ انہوں نے تو نہ کچھ ہمارے بارے میں سوچا ہے نہ آنے والے بچے کے بارے میں۔ سب کچھ تو ان چڑیلوں نے داؤ پر لگوا دیا ہے۔ اتنا سارا زیور دوبارہ کبھی بھی نہیں بن سکتا۔ میری مشال کے لیے تو ایک چھلا نہیں بچا۔" وہ چاہتے ہوئے بھی اس تکلیف دہ احساس سے باہر نہیں نکل پا رہی تھی' حالانکہ عدیل نے اس سے بہت دعوے کیے تھے کہ وہ اس سال کے آخر تک لازمی اسے دو چوڑیاں اور ایک لاکٹ سیٹ بنوا دے گا مگر اس کے بے قرار دل کو قرار مل ہی نہیں رہا تھا۔

اس کا سیل فون کافی دیر سے بج رہا تھا۔

"ممّا! نانو کا فون ہے۔ آپ سن کیوں نہیں رہیں۔" مشال ہوم ورک کرتے ہوئے اپنے کمرے سے اٹھ کر آئی اور ایک طرف پڑا فون اٹھا کر اسے دیا۔ بشریٰ گہرا سانس لے کر فون سننے لگی۔

"یہ کیا کہہ رہی ہیں امی آپ!" بشریٰ ان کی بات سن کر ایک دم سے پریشان ہو گئی۔

"بیٹا! میں نے اور عمران نے تو بہتیری کوشش کی۔ صرف ستر ہزار روپے ہیں میرے پاس بینک میں۔ وہ بھی میں نے عمران کی شادی کے لیے اٹھا رکھے ہیں۔ اصل میں عمران نے جس شخص کو ڈھائی لاکھ ادھار دے رکھا تھا۔ یقین کرو میرا بچہ آدھی رات تک اس کمینے کے گھر بیٹھا رہا۔ اس نے اگلے مہینے کا کہہ کر ٹال دیا۔ اب بتاؤ کیا کریں

ایک دم سے تین لاکھ کا انتظام نہیں ہو سکتا نا۔"

وہ لہجے میں زمانے بھر کی مظلومیت سمو کر بولیں۔ بشریٰ سے تو کچھ دیر بولا ہی نہیں گیا۔

"میرا زیور بکنا تو بے کار جائے گا۔ اگر امی کی طرف سے تین لاکھ کا انتظام نہیں ہو گا اور عدیل نے زیور تو بیچ بھی دیا ہو گا شاید ابھی نہ بیچا ہو میں جلدی سے انہیں فون کر کے بتا دیتی ہوں کہ امی نے انکار کر دیا ہے۔"

اس نے جلدی سے ذکیہ کی کال کاٹ کر عدیل کا نمبر ملایا۔

تین بار کال کرنے کے باوجود عدیل نے فون نہیں اٹھایا۔

"شاید میری قسمت ہی خراب ہے' زیور بک کر ہی رہے گا۔" اس نے تھک کر فون ایک طرف ڈال دیا۔

خواہ مخواہ ہی جی بھر بھر آ رہا تھا۔

اس کی ساس نند نے کبھی اس سے محبت بھرا سلوک نہیں کیا۔ کبھی بشریٰ کو دل سے قبول نہیں کیا۔ اگرچہ وہ خود اسے عدیل کے لیے بیاہ کر لے کر لائی تھیں مگر پھر بھی آج بشریٰ کو ان دونوں کی وجہ سے اتنی بڑی قربانی دینا پڑی۔

"وہ ایسی بدلحاظ ہیں ان کے سامنے عدیل سارا زیور سمیٹ کر لے گیا پھر بھی کسی سے توفیق نہیں ہو سکی کہ آکر میرا دل جوئی ہی کر دیں۔ اللہ ان ظالموں کو دکھا بھی رہا ہے۔ ان کے کرتوتوں کی سزا دے بھی رہا ہے پھر بھی یہ نہیں سمجھتیں۔"

وہ جلے دل کے ساتھ بہت برا سوچتی چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

"زبیر بھائی! کیا یہ ممکن ہے؟" عاصمہ کو اپنی ہی آواز کانپتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

واثق بھی زبیر کے کچھ اور قریب ہو کر بیٹھ گیا۔

"بھابھی! اس دنیا میں سب ہی کچھ ممکن ہے بس جیب میں پیسہ ہونا چاہیے' ہر چیز مل سکتی ہے۔" زبیر متانت سے بولا۔

"زبیر بھائی! صرف پندرہ سولہ لاکھ میں گھر... وہ بھی اپنا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا۔ آپ سچ کہہ رہے ہیں نا؟" وہ بے یقین سی ہو رہی تھی۔

"اصل میں بھابھی! وہ شخص گھر جلدی میں بیچ کر ملک سے باہر سیٹل ہو رہا ہے۔ اسے منہ مانگے سے جتنے بھی کم پیسے ملیں گے' وہ لے لے گا۔ یوں بھی گھر کوئی زیادہ بڑا نہیں۔ دو کمرے نیچے دو اوپر ہیں۔ ایک برآمدہ کچن اور صحن۔ گھر اتنا نیا بھی نہیں بنا ہوا علاقہ بھی بس گزارہ سمجھیں۔ مگر ان سب کا پلس پوائنٹ یہی ہے کہ آپ کو اپنی چھت مل جائے گی۔ بچوں کو ایک جگہ لے کر بیٹھ جائیں گی۔"

زبیر آہستہ آہستہ نرمی سے سب بتانے لگا تو عاصمہ کی آنکھوں میں رکے ہوئے آنسو بہہ نکلے۔

"ممّا پلیز..." واثق تو اب ہر لمحہ ماں کے چہرے پر نظریں جمائے رکھتا تھا۔ اسے روتے دیکھ کر آہستگی سے ماں سے بولا تو وہ جلدی سے سنبھل گئی۔

"لیکن بھابھی! ایک مسئلہ ہے؟" زبیر کچھ دیر بعد بولا تو وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

"کیا وہ گھر ہمیں نہیں مل سکتا؟" پاس آتی خوشی ایک دم سے جیسے ہاتھ چھڑا کر دور جا کھڑی ہوئی تھی۔

عاصمہ کو ایسا ہی لگا۔ قسمت آج کل اس کے ساتھ یہی کھیل تو کھیل رہی تھی۔ ادھر خوشی محسوس کرتے وہ تیاری کر رہی ہوتی کہ ایک خوفناک غم......

"اللہ نہ کرے۔" اس نے دہل کر اپنی اذیت ناک سوچ سے ہاتھ چھڑایا۔
"مگر آپ ساری رقم میں گھر خرید لیں گی تو پھر بعد میں کیا کریں گی۔ میرا مطلب ہے' روزمرہ کے اخراجات' بچوں کا اسکول' ان کی تعلیم' دوسرے بے شمار اخراجات کیسے پورے ہوں گے۔"
زبیر رک رک کر بولا جیسے وہ خود ان مسئلوں پر بہت دنوں سے سوچ رہا ہو۔
"اللہ بڑا کرم کرنے والا ہے زبیر بھائی! اس نے اتنی بڑی مشکل میں ڈالا ہے تو وہی ہمیں اس آزمائش سے نکالے گا۔" اسے خود بھی پتا نہیں چلا کب وہ اتنے مضبوط لہجے میں بات کرنے کے قابل ہوئی تھی اور بہت دنوں بعد ایسا ہو سکا تھا کہ ایک مکمل جملہ بولتے ہوئے نہ تو آنسو اس کے لہجے میں گھلے نہ آنکھ سے نکلے۔
"پھر بھی بھابھی!" وہ متذبذب سا تھا۔
"آپ کے ذہن میں کچھ ہے ایسا زبیر بھائی؟" وہ الٹا اس سے پوچھنے لگی۔
"آپ کی کوالیفکیشن کتنی ہے؟" وہ سوچ کر بولا۔
عاصمہ لمحہ بھر کو کچھ بول نہیں سکی۔

"انٹر!" وہ آہستگی سے یوں بولی جیسے اپنی کم تعلیم کو کوتاہی سمجھ کر چھپانا چاہ رہی ہو۔
"چھوٹے بچوں کو تو پڑھا ہی سکتی ہیں نا؟"
عاصمہ فوری طور پر کچھ نہیں بول سکی۔
"ظاہر ہے اپنے بچوں کو بھی تو آپ خود ہی پڑھاتی ہوں گی۔" وہ پھر سے بولا تو عاصمہ سر ہلا کر رہ گئی۔
"میتھس اور انگلش انہیں عفان پڑھا دیا کرتے تھے۔ باقی سبجیکٹس میں دیکھ لیتی تھی۔" وہ افسردگی سے بولی۔
"چلیں پھر تو کچھ ہو سکتا ہے۔ میرے ایک جاننے والے کا چھوٹا سا اسکول ہے۔ میں وہاں آپ کے لیے بات کر سکتا ہوں۔" وہ رک کر بولا۔
"یہ تو بڑی اچھی بات ہو جائے گی..... مگر نہیں زبیر بھائی! ورد ابھی بہت چھوٹی ہے اسے چھوڑ کر۔" وہ اگلی سوچ سے پریشان ہو کر بولی۔
"وہ بھی دیکھ لیں گے۔ آپ ارادہ تو باندھیں۔ میں بات کر لیتا ہوں اپنے دوست سے تو آپ عدت کے بعد وہاں جوائن کر لیں۔"
"اور گھر کا۔"
"ہاں ایسا ہے کہ آپ آج... مگر آپ کیسے جائیں گی عدت کی وجہ سے..... آپ گھر دیکھیں گی تو ہی معاملہ آگے بڑھے گا۔" وہ پریشان ہو کر بولا۔
یہ بات تو عاصمہ نے بھی نہیں سوچی تھی۔
"چلیں میں پھر کسی عالم دین سے اس کی کوئی گنجائش پوچھتا ہوں کیونکہ وہ شخص گھر جلد سے جلد بیچنا چاہتا ہے۔ یہ نہ ہو کہ ہم ذرا دیر کریں اور اتنا اچھا موقع ہاتھ سے نکل جائے۔"
وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد کھڑے ہو کر بولا۔
"اور اس گھر کا ایک اور فائدہ یہ ہے کہ اس کے اوپر والے پورشن کی سیڑھیاں بیرونی گیٹ سے ہیں یعنی اوپر والا پورشن آسانی سے کرائے پر دیا جا سکتا ہے۔ آپ کی آمدنی کا ذریعہ بھی بن جائے گا۔ میں اس لیے بھی یہ گھر ہاتھ سے نکلنے نہیں دینا چاہتا۔"

عاصمہ اس شخص کے خلوص پر شکریہ بھی نہیں بول سکی۔ وہ جتنا بے لوث ہو کر اس کے کام آ رہا تھا' صرف شرت سے اس کے احسانوں کا بدلہ نہیں چکایا جا سکتا تھا۔
"اچھا بھابھی! میں ان شاء اللہ کل آؤں گا تو پھر جو بھی صورت ہو گی اس کے مطابق دیکھ لیں گے۔" وہ جاتے ہوئے بولا۔
"زبیر بھائی! مجھے آپ پر پورا اعتماد ہے۔ اگر میں گھر دیکھنے نہ جا سکی تو واثق آپ کے ساتھ چلا جائے گا۔ اگر اسے گھر پسند آ جاتا ہے تو آپ بے شک سودا کر لیجیے گا۔" وہ اس کام میں مزید تاخیر نہیں کرنا چاہتی تھی۔
"واثق!" زبیر نے کچھ حیرانی سے اسے دیکھا اور پھر ہنس پڑا۔
"ہاں بھئی۔ اب یہی تو اس گھر کا جوان ہے۔ اچھی بات ہے آپ ابھی سے اسے اتنا اعتماد دے رہی ہیں گڈ!" وہ ستائش سے واثق کے سر پر ہاتھ پھیر کر اس کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے باہر نکل گیا۔
عاصمہ دونوں کو جاتا دیکھ کر بے اختیار عفان کو سوچنے لگی۔
وہ بھی بالکل اسی طرح واثق کو ساتھ لگا کر باتیں کرتے ہوئے باہر لے کر جاتا تھا۔
"دیکھو تو بھئی عاصمہ! واثق کا قد میرے کندھوں کے برابر آ رہا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے میرا بیٹا مجھ سے بھی اچھا قد نکالے گا۔ میں اس دن کتنا خوش ہوں گا جب واثق مجھ سے اونچا ہو جائے گا۔ تم اندازہ نہیں لگا سکتیں۔"
"ہاں عفان! اب تو میں بالکل بھی اندازہ نہیں لگا سکتی۔ میں نے مستقبل کے لیے بھی اندازے لگانے چھوڑ دیے ہیں۔ ہمارے اندازے' ہمارے ارادے' ہماری خواہش' ہمارے خواب کتنے بودے کتنے کمزور ہوتے ہیں۔ اس بات کا اندازہ مجھ سے بڑھ کر اور کون لگا سکتا ہے۔" وہ افسردہ ہو گئی۔
"آج سترہ تاریخ ہے۔" اسے ایک دم سے خیال آیا۔ "زبیر بھائی تو کہہ رہے تھے کہ وہ دس تاریخ کو جا رہے ہیں انہیں گیارہ کو اپنے شہر میں جا کر آفس میں جوائننگ دینی ہے تو پھر... اتنے دن اوپر ہو گئے مجھے بھی خیال نہیں آیا نہ میں نے پوچھا۔ شاید بے چارے ہماری وجہ سے رک گئے ہیں۔ اللہ کرے وہ ابھی نہ جائیں۔ ہمیں گھر دلا کر ہی جائیں۔ ورنہ میں اکیلی عورت کیا کر سکوں گی۔ میرا تو ان کے سوا کوئی سہارا ابھی نہیں۔" بے خیالی میں وہ بہت غلط بات سوچ گئی تھی جس کا اندازہ اسے خود بھی نہ ہو سکا تھا ورنہ وہ کم از کم توبہ تو کر لیتی کہ اس نے کتنی بڑی بات سوچی ہے۔
وہ اٹھ کر کچن میں چلی گئی۔ ابھی رات کے لیے کھانا بھی بنانا تھا۔

☼ ☼ ☼

"یہ سارا کیا دھرا تمہاری ساس کا ہے۔ وہ چاہتی ہی نہیں کہ میری بچی کا سلسلہ کسی اچھی جگہ ہو جائے۔" نسیم بیگم تڑپ کر غصے میں چلائیں۔
بشریٰ نے طیش کی اٹھتی لہر بمشکل دبائی تھی۔
"جتنی اچھی جگہ آپ کر رہی ہیں فوزیہ کا اس سے تو میرے خیال میں کوئی احمق ہی جلے گا۔" عدیل' بشریٰ کے غصے سے تو بے خبر تھا مگر اس کے غصے کی ترجمانی ضرور کر گیا۔
"اور میں تو اس دن کو رو رہا ہوں جب ہم ان لالچی حریص کتوں میں پھنسے جنہیں صرف ہڈی نہیں' پورا بکرا چاہیے سالم۔ سارے گھر کا زیور امی! شرم سے ڈوب مرنے کا مقام ہے کہ میں نے کبھی آپ کے' بشریٰ کے زیور کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا اور آج ان ذلیل لوگوں کے لیے مجھے جا کر سارا زیور بیچنا پڑا اور معلوم ہے آپ کو کیا

ملا رہا ہے‘ سارے زیورات کا؟" عدیل بہت غصے میں تھا۔ آج اسے فوزیہ کی روتی صورت پر ترس آرہا تھا نہ اس کے واویلے پہ۔
عدیل کے اتنا اونچا بولنے پر نسیم بیگم ایک دم سے چہرے پہ ڈھیر ساری مظلومیت لیے یوں بیٹھ گئیں جیسے ہمیشہ سے بیٹے کا غصہ سہتی آئی ہیں۔
"ساڑھے بارہ لاکھ..... تین لاکھ ادھر ادھر سے مانگ تانگ کر کیا ہے۔ اب بتائیں..... باقی کے ساڑھے چار لاکھ کہاں سے پورے کروں۔" عدیل کا غصہ‘ کوفت‘ جھنجلاہٹ سب عروج پہ تھے۔
"کس ٹھگ سنار کے پاس چلے گئے تھے تم؟" نسیم بیگم اپنی فطرت سے مجبور تھیں‘ بولنے سے رہ نہ سکیں۔ عدیل نے تیز نظروں سے ماں کو دیکھا۔
"وہی تو میں کہہ رہی ہوں اگر ذکیہ بہن کسی طرح تین چار لاکھ کا انتظام کر دیتیں تو ہمیں اتنی پریشانی تو نہ اٹھانی پڑتی۔" وہ ایک دم یوں نرم اور التجائیہ لہجے میں بولیں جیسے بہت اچھے مراسم ہوں ان کے ذکیہ بہن کے ساتھ۔
"امی! خدانخواستہ اگر ذکیہ آنٹی پر ایسا وقت آیا تو کیا آپ دے دیتیں انہیں چار لاکھ..... آسانی سے۔" عدیل کا غصہ ٹھنڈا ہونے میں نہیں آرہا تھا۔
"عدیل! اس وقت فضول مثالوں اور مفروضوں سے کچھ نہیں ہونے والا۔ تم خود بھی پریشان ہو رہے ہو اور مجھے بھی کر رہے ہو۔" نسیم بیگم نے فضول کے مفروضے پر یوں ہاتھ ہلایا جیسے مکھی کان سے ہٹائی ہو۔
"ہاں مجھے تو کالے کتے نے کاٹا ہے نا‘ جو خوامخواہ پریشان ہو رہا ہوں۔" وہ بھی آج کوئی ادھار رکھنے پر تیار نہیں تھا۔
"اب کرنا کیا ہے؟" نسیم بیگم اسے پٹڑی پہ لانے کے لیے آج ہر ممکن جتن کرنے پر تیار تھیں۔
"یہ بھی آپ مجھ سے پوچھ رہی ہیں کہ کرنا کیا ہے۔" وہ کٹیلے لہجے میں بولا۔
دونوں کے مباحثے کے درمیان فوزیہ کونے میں یوں سمٹی بیٹھی تھی جیسے اسے اس مناظرے میں جج مقرر کیا گیا ہو۔ آخری فیصلہ بہر حال اسے ہی سنانا ہوگا۔ یا قسمت اسے سنائے۔ آنکھیں بھر بھر آرہی تھیں جنہیں وہ بار بار مسل رہی تھی۔ آج کل سارا طمطراق‘ چالاکی‘ ہوشیاری‘ فتنہ پروری سب اڑن چھو ہو چکے تھے۔ بس ایک خوف کا عالم تھا۔ ایک تلوار سی سر پر لٹکی تھی دن رات کہ اب سر پر گری کہ تب۔ اسے زندگی میں پہلی بار پتا چلا تھا کہ آنکھوں میں رات کاٹنا کسے کہتے ہیں۔ دکھ‘ کرب‘ ذلت‘ رسوائی‘ جگ ہنسائی کون سا تکلیف دہ احساس نہیں تھا جو اسے رات بھر کروٹیں لینے پہ مجبور نہیں کرتا تھا۔
ان درد بھرے لمحوں میں بھی اسے خیال تھا تو صرف اپنا‘ اپنی ذلت رسوائی اور خدانخواستہ گھر بیٹھ جانے کا خوف..... بھائی کی ذہنی تکلیف اور پریشانی کا اسے ایک بار بھی بھولے سے خیال نہیں آیا تھا۔ ہاں یہ احساس وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ غصے میں بدلتا جا رہا تھا کہ بھائی جان بوجھ کر رقم اکٹھی کرنے میں دیر کر رہا ہے اور یہ سب بشریٰ کی سازش ہے۔
"ان لوگوں کو صاف بتا دیں کہ ہم پندرہ لاکھ سے زیادہ کا انتظام نہیں کر سکے۔ دیٹس آل۔" عدیل بے لچک لہجے میں ماں سے بولا۔
"پندرہ لاکھ۔" نسیم کی آواز گلے میں ہی گھٹ گئی۔
"امی! کیا! ہم ان کے قرض دار ہیں؟ بس‘ بہت ہو گیا۔ اتنا ڈر خوف جیسے وہ ہمیں پھاڑ کھائیں گے..... میں انہیں فون کرتا ہوں کہ اس سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔ پھر جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ میں آپ کو صاف بتا رہا ہوں۔ میں مزید کسی کے آگے جھولی نہیں پھیلاؤں گا۔"

غصے میں بولتے ہوئے وہ سیل پر زاہدہ کا نمبر ملانے لگا۔
"تم ٹھہر جاؤ۔ رکو! میں خود بات کرتی ہوں۔ آرام تحمل سے۔ جب اتنی تکلیف اٹھائی تو پھر یوں عجلت میں بات بگاڑنے کا فائدہ۔ تم نہا دھو کر‘ تازہ دم ہو۔ میں اتنے میں فون کر لیتی ہوں۔ تم ٹھیک کہتے ہو‘ اب تو انہیں ہٹ دھرمی نہیں دکھانی چاہیے۔ جاؤ میرا بیٹا شاباش۔ فوزیہ! اٹھو بھائی کے لیے چائے بنا کر لاؤ۔" نسیم عدیل کو پیار سے پچکارتے ہوئے بولیں تو اس نے بھی مزید اصرار نہیں کیا۔ یوں بھی وہ زاہدہ جیسی لالچی حریص اور گھٹیا عورت سے بات کرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔
اتنی رقم کا انتظام ہو جانے کے بعد بھی اس کا دل ان لوگوں کی طرف سے بہت کھٹا ہو گیا تھا۔
"یہ رشتہ دار تو نہ ہوئے‘ یہ تو قصائی ہوئے چھری پھیرنے والے۔" وہ جھنجلا کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔
نسیم نے سوچ سوچ کر زاہدہ کا نمبر ملا ہی لیا۔
"اللہ اس عورت کے دل میں رحم ڈال دے۔" وہ فون کان سے لگائے دعا مانگنے لگیں جس کے قبول ہونے کی امید انہیں بھی کم ہی تھی۔

☆ ☆ ☆

شام کے پانچ بج رہے تھے‘ جب وہ تھکا ہارا کمرے میں داخل ہوا۔ کیلنڈر پر سولہ تاریخ سرخ رنگ میں مسکرا رہی تھی۔
اس کی ساری تھکن جیسے اڑن چھو ہو گئی۔
اس نے جوتے بھی نہیں اتارے اور تیزی سے آگے بڑھ کر کھڑکی کھول دی اور جیسے ساری کائنات کی گردش ایک دم سے تھم گئی۔
وہ سامنے ہی تو بیٹھی تھی۔
سرمئی لباس میں سرمئی اڑتے بادلوں کے ٹکڑوں کے درمیان اسی منظر کا کوئی حصہ بنے اردگرد سے بے خبر‘ کسی گہری سوچ میں گم اس کے سیاہ بالوں کی آوارہ لٹیں ادھر ادھر ہوا سے سرگوشیاں کر رہی تھیں مگر وہ تو کسی پتھر کے مجسمے کی طرح یوں ساکت بیٹھی تھی جیسے اب صدیوں تک ہل نہیں سکے گی۔
لیکن نہیں..... وہ جانتا تھا وہ یہاں صرف سترہ منٹ کے لیے بیٹھی تھی۔
اگر وہ چلی گئی تو.....
اس احساس نے اس کے اندر بجلی سی بھر دی۔
اس نے جلدی سے اپنے ٹیبل سے اسکیچ پیپر اور پنسل اٹھائی اور پورے انہماک سے اس منظر میں کھوئی اس انجان لڑکی کا اسکیچ بنانے لگا۔
سرمئی بادل اور گہرے ہوتے جا رہے تھے۔
اس کا حسین چہرہ کچھ دھندلاتا جا رہا تھا۔ وہ تیزی سے ہاتھ چلانے میں مگن تھا۔
اس نے سر اٹھایا اور سناٹے میں رہ گیا۔
وہ خوب صورت شام ایک دم سے ویران ہو گئی تھی۔ اس کی وینس جا چکی تھی۔ ہمیشہ ایسے ہی ہوتا تھا۔ وہ اسکیچ بنانے میں مگن ہوتا تھا۔ اسے پتا بھی نہیں چلتا تھا کب وہ خاموشی سے اٹھ کر چلی جاتی تھی۔
وہ خوب صورت شام‘ سرمئی اڑتے بادلوں کے ٹکڑے اور مست ہوا کے جھونکے سب بے معنی سے ہو کر رہ گئے۔

اس کے ہاتھ یوں ست پڑے کہ بالآخر اس نے پنسل اسکیچ پر ہی رکھ دی۔
"یہ کیا ہے؟" وہ ہر بار اپنی اس دیوانگی کے بارے میں سوال ضرور کرتا تھا اور ہر بار اسے کوئی جواب نہیں ملتا تھا۔
"مجھے اس سے ملنا چاہیے۔" اس کے دل نے مچل کر کہا۔
"کیا کروں گا مل کر۔۔۔۔ وہ میرے پاس ہی ہے۔ اتنے پاس کہ۔۔۔۔" وہ مسکرا کر گود میں پڑے اس کے اسکیچ کو دیکھنے لگا۔ سیاہ بالوں کی لٹوں میں چھپا چاند سا چہرہ۔
اس کی ساری تھکاوٹ ختم ہو چکی تھی۔ وہ بے خود سا کسی اور ہی دنیا میں تھا۔

☼ ☼ ☼

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں خالہ جان!" عاصمہ حیران سی انہیں دیکھے گئی۔
"بیٹا! تم سمجھ دار ہو پھر بہت اچھے خاندان کی۔ فاروق بھائی کی شرافت اور نیکی کی تو لوگ مثالیں دیتے ہیں۔ ان کا بیٹا عفان سمجھو ہماری گودوں میں کھیل کر بڑا ہوا۔ اتنا شریف نیک محبت کرنے والا ہمدرد انسان میرا جی نہیں چاہا کہ ادھر ادھر سے تم کوئی الٹی سیدھی بات سنو۔ تمہارا دل تو یوں بھی آج کل درد کا پھپھولا بنا ہو گا۔ ذرا سی بات پر پھوٹ پڑے گا۔" وہ زمانے بھر کی ہمدردی اور احساس اپنے منتخب کردہ جملوں میں سمو کر بول رہی تھیں۔
مگر عاصمہ کو ان کا ایک ایک جملہ جیسے چبھ رہا تھا۔ وہ بس یک ٹک انہیں دیکھتی جا رہی تھی جیسے فاروق اور عفان کی شرافت و نیکی کی مثال دے کر اسے بہت کچھ سمجھا جا رہا ہے کہ وہ ان کی اتنی قریبی ہوتے ہوئے بھی ان دونوں جیسی نہیں۔
عاصمہ کے اندر جیسے ابال سے اٹھنے لگے۔
"تم عدت میں ہو پھر خیر سے جوان ہو کون سی کوئی بوڑھی یا عمر رسیدہ ہو۔ ایسے میں تو ارد گرد والے، محلے والے اور بھی آنکھیں، کان کھلے رکھتے ہیں۔" وہ اب اس بات کی طرف آ رہی تھیں مگر عاصمہ کے صبر کا پیمانہ جیسے لبریز ہو چلا تھا۔
"آپ بتائیں گی خالہ! آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟" وہ ضبط کر کے بول ہی اٹھی۔
"میری بیٹی کی طرح ہو تم پھر برسوں کا ساتھ ہے۔ تم پہ کوئی انگلی اٹھائے یا کچھ ایسا ویسا کہے تو مجھے اچھا تو نہیں لگے گا؟" وہ پھر بھی تمہید باندھے جا رہی تھیں۔
"لوگ کیا باتیں کر رہے ہیں خالہ جان!" وہ تحمل سے بولی کیونکہ وہ جانتی تھی اب آئندہ کی زندگی میں اس کا یہ تحمل اور لوگوں کی باتیں ساتھ ساتھ چلیں گی۔
"وہ آدمی لاکھ عفان کے ساتھ دفتر میں کام کرنے والا ہو، لاکھ وہ تمہارے مرحوم شوہر اور سسر کے دفتری معاملات کو دیکھنے والا ہو مگر میری بچی! وہ جوان جہان ہے۔ اس کا تمہارے گھر یوں بار بار آنا اور گھنٹوں بیٹھے رہنا۔ اب تو یوں سمجھو کم از کم عدت تک سب کی نظریں تمہاری چوکھٹ سے لگی ہیں۔ کچھ تو اس خیال سے نہ جانے تم کب، کس ضرورت کے تحت کسی کو آواز دے لو اور کچھ کی اس نیت سے، دیکھیں تو مرحوم عفان کی بیوہ خود کو کیسے سنبھالتی ہے۔" وہ رک رک کر اسے صاف لفظوں میں بہت کچھ سمجھا گئیں۔
"سمجھ رہی ہو ناں عاصمہ بیٹی! میری بات؟" وہ اس کے کندھے پر نرمی سے ہاتھ رکھ کر پوچھنے لگیں۔
"تو کون کرے یہ سارے کام خالہ! مجھے اتنا بھی سمجھا دیں۔"

وہ نہ چاہتے ہوئے بھی لہجے کو نم ہونے سے نہ بچا سکی۔
"بھلے وہ کرے مگر اسے دروازے کے باہر تک رکھو یا زیادہ سے زیادہ صحن میں بٹھا لو۔ پھر یوں بھی تم کرائے کے گھر میں رہتی ہو۔ نظر رکھنے کو مالک مکان ہی بہت ہے۔" وہ پھر سے اسے جتا گئیں۔
"میں ایسا کچھ غلط نہیں کر رہی اور میں جو کچھ کر رہی ہوں۔ مجھے اس کا احساس بھی ہے اور خیال بھی کہ مجھے کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں۔" وہ نہ چاہتے ہوئے بھی تلخ سی ہو گئی۔
"میرا مقصد تمہارا جی دکھانا نہیں تھا۔" وہ اس کی تلخی پر بولیں۔ "آگے تم خود سمجھ دار ہو بال بچے والی ہو۔ ابھی کسی کو موقع نہیں دو گی تو کسی کی جرأت نہیں ہو سکے گی کہ خوامخواہ تم پر انگلی اٹھا سکے۔" وہ جانے اسے کیا سمجھانا چاہ رہی تھیں۔
"خالہ جان! میں اکیلی نہیں ہوتی۔ میرا بیٹا میرے ساتھ ہوتا ہے۔" حمیدہ کو شاید اس کے منہ سے ایسی بچکانہ بات کی توقع نہیں تھی پھر بھی انہوں نے جتایا نہیں۔
"اللہ اسے تمہارے ساتھ رکھے۔ تمہارا سہارا بنائے۔ بہرحال میں تمہیں سمجھانے آئی تھی۔ اگر وہ عفان کا دوست بھی ہے تو ظاہر ہے شادی شدہ بال بچے والا بھی ہو گا۔ اپنی بیوی کو ساتھ لے کر آیا کرے اتنا ضروری کام ہوتا ہے تو پھر بھلا کون بات کرے گا۔ تم سمجھ رہی ہو ناں؟"
وہ سر بھی نہ ہلا سکی۔ اب وہ یہ بات زبیر سے تو نہیں کہہ سکتی تھی۔

☼ ☼ ☼

"امی! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔" بشریٰ کچھ بوکھلا سی گئی۔ نسیم بیگم جواب میں ایک دم سے رونے لگیں۔
بشریٰ پریشان ہو کر ساس کو دیکھنے لگی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ انہیں کیسے چپ کرائے۔
"امی! پلیز یوں نہیں روئیں۔ کیا ہوا ہے۔ مجھے بتائیں۔" وہ نرمی سے انہیں اپنے ساتھ لگا کر بولی۔
نسیم بیگم نے ایک دم سے بشریٰ کے آگے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ وہ ششدر رہ گئی۔ ایسا تو اس نے کبھی سوچا تھا، نہ چاہا تھا۔
"امی پلیز یوں مجھے گناہ گار تو نہیں کریں۔ پلیز آپ خود کو سنبھالیں۔" اس نے اٹھ کر انہیں پانی کا گلاس تھمایا۔
دو گھونٹ پانی پی کر نسیم بیگم کا جی کچھ سنبھلا۔
"تم اپنی ماں کی منت کرو۔ کسی بھی طرح سے وہ تین لاکھ کا انتظام کر دیں۔ دو لاکھ میں خود کر لوں گی۔ ان کا یہ احسان میں زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔ تم بات کرو اپنی ماں سے عمران بیٹے سے۔" وہ ملتجی لہجے میں کہہ رہی تھیں جس میں کچھ بھی بناوٹ، ڈراما یا دوغلا پن نہیں تھا۔ صرف ایک ماں کی التجا، اس کی پریشانی تھی کہ کسی طرح ادھ بیاہی بیاہ کر اپنے گھر چلی جائے نہ کہ گھر بیٹھے اسے کسی طرح کا داغ لگ جائے۔ بشریٰ کو ان پر بہت ترس آیا۔
"اچھا! آپ پریشان نہیں ہوں۔ میں ابھی امی سے بات کرتی ہوں۔ خود عمران کی منت کروں گی۔ وہ کہیں سے کوئی کچھ مہینوں کے ادھار پہ رقم لا دے۔ آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی مت روئیں اس طرح۔ میں بات کرتی ہوں۔" بشریٰ کو پہلی بار نسیم بیگم اپنی ماں کی طرح لگی تھیں۔ ایک دکھی ماں جو اس کے آگے رو رہی تھی۔ بشریٰ کا دل پسیج گیا۔
"اس گھٹیا عورت نے صاف انکار کر دیا ہے کہ وہ پندرہ لاکھ نہیں لیں گے۔ اب بتاؤ میں عدیل سے یہ بات کر سکتی ہوں۔ تب ہی تو عدیل سے بہانہ کر دیا کہ وہ گھر پر نہیں تھی تو میری بات نہیں ہو سکی مگر ظاہر ہے میں اسے چھپا تو نہیں سکتی۔" وہ اپنی پریشانی کی وجہ بتانے لگیں۔

"لیکن امی! اگر وہ لوگ ایسے ضدی ہیں تو......"

"سب سمجھ رہی ہوں بیٹی! یہ بہت بڑا جوا ہے۔ اندھا کنواں ہے۔ جس میں فوزیہ کو دھکا دینے جارہی ہوں مگر دل پر ہاتھ رکھ کر کہو اگر اللہ نہ کرے میری بچی پر گھر بیٹھے طلاق کا ٹیکہ لگ گیا تو کیا ہوگا۔ بس یہی خیال مجھے ہولا کیے دے رہا ہے ورنہ میں ایسے لوگوں کے سامنے جھکتی منت کرتی، کبھی نہیں..... یہ تو میری مجبوری مجھے یہاں تک لے آئی کہ اب پیچھے کنواں ہے اور آگے کھائی۔"

"اب تو صرف اللہ عزت رکھنے والا ہے۔" بشریٰ انہیں دیکھتی رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

"بھابھی! میں شام میں آؤں گا۔ میری ایک مفتی صاحب سے بات ہوگئی تھی عدت میں گھر سے نکلنے کے سلسلے میں۔" وہ پریشان سی بیٹھی تھی۔ خالہ حمیدہ کی باتوں پر اسے یوں لگ رہا تھا جیسے سب کی نظریں اس پر جمی ہیں۔ وہ آج سارا دن دروازے میں بھی نہیں گئی تھی مگر پھر بھی عجیب سا احساس تھا۔ اس نے دن بھر چادر یوں لپیٹے رکھی جیسے بازار جارہی ہو۔

"جی!" وہ آہستگی سے بولی۔

"آپ انتہائی ضروری کام سے اچھی طرح پردہ کرکے نکل سکتی ہیں۔" وہ رک کر بولا۔

"ایچوسیلی گھر بہت اچھا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ ہاتھ سے نکل جائے۔ آپ ایک نظر دیکھ لیں گی تو پھر باقی کے کام میں خود ہی نپٹالوں گا۔" اس کے لہجے میں کچھ بھی ایسا نہیں تھا جسے عاصمہ پکڑتی یا وہ اسے بدنیت لگتا۔

"سب حمیدہ خالہ کے ذہن کا فتور ہے۔ خود تو چسکے لینے کے لیے گھر گھر پھرتی رہتی تھیں۔ دوسروں پر انگلی اٹھانا ان کا مشغلہ ہے۔" اسے حمیدہ خالہ پر جی بھر کر غصہ آیا۔

"میں شام میں گاڑی لے آؤں گا۔ آپ واثق کو بھی تیار رکھیے گا۔ ہمارے ساتھ جائے گا۔ بہت سمجھ دار بیٹا ہے آپ کا۔" اس کے دل میں کوئی کھوٹ ہوتا تو وہ ایسا کیوں کہتا۔

"بھائی..... بھابھی کو بھی لے آئیے گا آپ۔ وہ بھی گھر دیکھ لیں گی تو دو رائے ہوجائیں گی۔" اس نے کچھ جھجک کر اصل بات کہہ ہی دی۔

وہ سب تو پچھلے مہینے جاچکے ہیں گھر۔ میں صرف آپ کے کاموں کی وجہ سے رکا ہوا تھا۔ آفس سے بھی میں نے آف لے لی ہے۔ بس یہ گھر والا معاملہ نبٹ جائے پھر میں چلا جاؤں گا۔" وہ بتا رہا تھا اور عاصمہ جی میں خوب شرمندہ ہورہی تھی۔ کیسے اچھے انسان پر وہ شک کرنے جارہی تھی۔ اس نے خود کو لتاڑا۔

"اوکے بھابھی! میں شام میں آؤں گا۔ آپ کو کچھ منگوانا تو نہیں۔"

"نہیں بھائی! ایسا کچھ نہیں منگوانا۔ آپ کا بہت شکریہ۔" اس نے نرمی سے کہہ کر فون بند کردیا۔

واثق اسکول سے آیا تو تیز بخار میں پھنک رہا تھا۔ عاصمہ کے تو ہاتھ پیر پھول گئے۔ اسے جلدی سے یونیفارم تبدیل کرواکے تھوڑا سا دودھ دیا اور بخار کی دوائی دے کر سلادیا۔

"اگر شام کو اسے ڈاکٹر کے پاس لے جانا پڑ گیا تو؟" وہ اسے سلاتے ہوئے سوچنے لگی۔

یوں بھی شام تو ہو ہی چلی تھی۔ چھ بجنے کو تھے۔ زبیر نے چھ سات کے درمیان آنا تھا۔

"واثق کیسے جائے گا میرے ساتھ۔" وہ بے چین سی ہوگئی۔

جلدی سے اریبہ کو خالہ حمیدہ کو بلانے بھیج دیا۔

"ان ہی کو ساتھ لے جاؤں گی۔ یہ ٹھیک رہے گا۔" وہ سادہ سے کپڑے پہنے بڑی سی چادر اوڑھے جانے کے لیے تیار تھی۔

"مما! وہ آنٹی کہہ رہی ہیں۔ خالہ اپنی بیٹی کی طرف گئی ہیں۔ کل آئیں گی۔" اریبہ نے آکر بتایا تو وہ حقیقتاً پریشان ہوگئی۔

"اب کیا کروں گی۔ رات ہونے کو ہے۔ اکیلی میں نہیں جاؤں گی مگر۔ واثق کو بھی نہیں لے جاسکتی۔" وہ بے چین سی ادھر ادھر ٹہلنے جارہی تھی۔

ساڑھے سات ہونے والے تھے۔

ہو سکتا ہے زبیر بھائی کا ارادہ بدل گیا ہو۔" وہ خود ہی کچھ مطمئن سی ہوگئی۔ "اگر آ بھی گئے تو میں فی الحال منع کر دوں گی۔ کل چلی جاؤں گی واثق اور حمیدہ خالہ کو لے کر۔"

وہ سوچ رہی تھی کہ باہر گاڑی کا ہارن بجا۔

وہ وہیں ٹھٹک کر رک گئی۔ "اب کیا بہانہ کروں؟"

"بھابھی! آپ اریبہ کو لے چلیں ساتھ پلیز تھوڑی دیر کا کام ہے۔ آپ نے گھر ہی دیکھنا ہے۔ میں بھی دو تین ضروری کاموں میں پھنس گیا نکلتے نکلتے اتنا ٹائم ہوگیا۔ دیکھیں! اب پلیز اس کام کو اور ڈیلے نہیں کریں۔ میں آفس سے مزید چھٹی نہیں لے سکتا۔"

ساتھ والی ہمسائی کو بچوں کا خیال رکھنے کا کہہ کر وہ اریبہ کا ہاتھ پکڑ کر پچھلی سیٹ پر جاکر بیٹھ گئی۔ گاڑی روانہ ہوگئی۔

☼ ☼ ☼
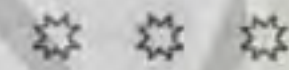
"امی! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟" بشریٰ کو دھچکا سا لگا۔

"جو میں تم سے کہہ رہی ہوں بس تم صرف وہ کرو۔" وہ اس کی حیرانی کی پروا کیے بغیر بولیں۔

"امی! آپ جانتی ہیں اس وقت میرے گھر میں کیا چل رہا ہے۔" وہ احساس دلانے کو بولی۔

"کون سی نئی بات ہے۔ کان پک گئے ہیں یہ سن سن کر اور تم سے میں نے کہا بھی تھا کہ مثال کو لے کر میری طرف آجاؤ۔ وہاں تم صرف ٹینشن کھاؤ گی۔ جو تمہارے لیے بھی نقصان دہ ہے اور تمہارے ہونے والے بچے کے لیے بھی۔ تمہیں یہ بات کیوں سمجھ میں نہیں آرہی۔"

"اچھا امی! آپ صرف مجھے یہ بتائیں' آپ مجھے رقم کا بندوبست کر کے دے رہی ہیں یا نہیں؟" وہ ماں کی تکرار سے زچ آکر بولی۔

"نہیں۔ کیونکہ میں تمہاری طرح بے وقوف نہیں ہوں۔" ذکیہ دو ٹوک لہجے میں بولیں تو بشریٰ کچھ دیر بول ہی نہ سکی۔

"میری گارنٹی پر بھی نہیں جبکہ میں جانتی ہوں آپ کے پاس۔" بشریٰ نرم لہجے میں ماں سے کہنے لگی۔

"تم جو بھی کہو۔ نہ میرے پاس اتنی رقم ہے نہ میں تمہیں دوں گی۔ بہتر ہے تم خود بھی جتنا بے وقوف بن چکی ہو اپنا سارا زیور لٹا کر اس کو کافی سمجھو اور ہاں! میری یہ بات لکھ لو' جس چکر میں یہ ماں بیٹا سب کچھ داؤ پر لگا رہے ہیں' وہ کام پھر بھی نہیں ہونا۔" ذکیہ باوثوق لہجے میں بولیں۔ بشریٰ نے اکتا کر فون بند کردیا۔

اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کیا کرے ماں کے مشورے پہ کان دھرے یا ساس کی التجاؤں پہ۔

اس نے کچھ سوچ کر عمران کو فون کیا۔ شاید ذکیہ اور عمران میں پہلے ہی اس سلسلے میں ساری بات چیت ہوگئی تھی۔ تب ہی اس نے صاف کہہ دیا کہ اس نے کسی دوست کو ادھار دیے تھے۔ وہ اب ملک سے باہر چلا گیا ہے۔

اس نے تھک کر پھر فون بند کردیا۔

"اگر امی کی بات درست نکلی۔۔۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد بھی وہ لوگ فوزیہ کو رخصت کرانے پر آمادہ نہ ہوئے تو؟" وہ بھی سوچ میں پڑ گئی۔

"یہ عدیل کہاں ہیں۔" اسے بہت دیر بعد خیال آیا تو فون کرنے لگی۔

"میں گھر ہی آرہا ہوں۔ آکر بات کرتا ہوں۔" عدیل نے کہہ کر فون بند کرلیا۔

"پتا نہیں اب یہ کیا بات کریں گے مجھ سے۔" وہ پریشان ہوگئی۔

☼ ☼ ☼
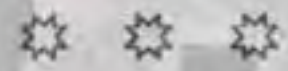
"نہیں امی! وہ لوگ نہیں مان رہے۔ ایک ہی رٹ لگا رکھی ہے ماں بیٹے نے کہ بیس لاکھ ملیں گے تو ہی ان کا کام ہوگا۔ میں نے جب زیادہ کہا تو کہنے لگے۔ پھر دو ماہ بعد کے لیے پانچ لاکھ کا چیک لکھ دوں۔ دو ماہ بعد وہ کیش ہو جائے گا تو وہ شادی کی تاریخ رکھ دیں گے۔ عجیب کاروباری سا انداز تھا ان کا۔ سچ امی! ہم فوزیہ کو بہت غلط جگہ بھیج رہے ہیں۔ یہ بات لکھ لیں آپ۔" وہ سخت اکتاہٹ کا شکار تھا۔ تھکن اس کے چہرے سے جھلک رہی تھی۔

"پھر کیا کہہ کر آئے ہو تم ان سے؟" نسیم بیگم بھی کچھ مایوس سی ہوگئی تھیں۔ بہت دیر بعد بولیں۔

"یہی کہ ہمارے پاس صرف یہ پندرہ لاکھ ہیں' اس سے اوپر ایک پائی نہیں۔ آگے ان سے جو ہوتا ہے کرلیں۔"

"عدیل!" نسیم تشویش سے بولیں۔

"امی! آپ فکر نہیں کریں' دیکھیے گا۔ یہی پندرہ لاکھ لینے کیسے آئیں گے کل صبح سے پہلے یہ لالچی لوگ۔ میں اب کچھ دیر آرام کروں گا۔ بہت تھک گیا ہوں۔" وہ اٹھ کر جانے لگا۔

"تم کہو تو میں بات کروں زاہدہ سے۔" نسیم بیگم آخری امید کے طور پر بولیں۔

"خبردار امی! آپ نے اب ادھر ذرا بھی فون کیا۔ ان کا دماغ تو پہلے ہی بہت خراب ہے اور سر پہ چڑھتے چلے جارہے ہیں۔ اب جو ہوگا دیکھا جائے گا۔" وہ جاتے ہوئے سخت لہجے میں ماں کو تاکید کر گیا۔

نسیم بیگم جواب میں کچھ بول ہی نہ سکیں۔ آج تو فوزیہ بھی بہت مایوس بہت مرجھائی ہوئی لگ رہی تھی۔ دونوں پاس بیٹھی تھیں اور چپ تھیں کوئی تیسرا دیکھتا تو یقین نہ کرتا مگر کیا کیا جائے کہ وقت سدا ایک سا نہیں رہتا۔ اس وقت نسیم بیگم پر بھی بڑا بھاری وقت پڑا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

بنتِ حوا

ادھی سوچ

گوری کے سر سج کے
سہرے کے پھول کھلیں گے
تم ملے پیار ملا رے

ڈیک پوری رفتار سے بج رہا تھا۔ گانے کی تیز آواز پورے محلے میں گونج رہی تھی۔ صحن میں جھاڑو لگاتے ہوئے نہ چاہتے بھی میں یہ آواز سننے پر مجبور تھی۔ یہ آواز ہمارے سامنے والے گھر سے آ رہی تھی۔ جہاں آج کل ان کی بیٹی صبا کی شادی کی تقریبات زور و شور سے جاری و ساری تھیں۔ آج شام میں مہندی تھی۔ مجھے بھی اس میں شرکت کرنا تھی۔ اگرچہ میں اس قسم کی تقریبات میں جانا پسند نہیں کرتی۔ مگر صبا کی شادی میں شرکت کرنا میری مجبوری ہی نہیں، بہت بڑی خوشی بھی تھی۔ صبا صرف میری محلے دار ہی نہیں۔ بلکہ بہت اچھی دوست بھی تھی۔ ہم بچپن سے ساتھ کھیلے کودے تھے۔ ساری تعلیم بھی ہم نے پہلے ایک ہی اسکول اور پھر ایک ہی کالج سے حاصل کی تھی۔

جھاڑو لگاتے ہوئے میرے ہاتھ نہایت تیزی سے چل رہے تھے۔ کیونکہ اس کے بعد مجھے کھانا بھی پکانا تھا اور شام کو مہندی کی تقریب میں شرکت کے لیے تیاری بھی کرنا تھی۔ اماں کی طبیعت آج ٹھیک نہیں تھی۔ اس لیے سارے کام مجھے ہی نمٹانے تھے۔

جھاڑو لگا کے میں نے صحن کے ایک کونے میں لگے واش بیسن سے ہاتھ دھوئے اور سیدھی کچن میں چلی آئی۔ ایک چولہے پر اماں کے لیے یخنی چڑھائی، اور دوسرے چولہے پر جلدی جلدی سالن تیار کرنے لگی۔ سالن چڑھانے کے بعد میں نے آٹا گوندھا اور روٹیاں بنانے لگی۔ اس سے فارغ ہو کر روٹیاں بنائیں۔ اتنی دیر میں میرے چھوٹے بہن بھائی، بلال اور ثوبیہ بھی اسکول سے آ گئے۔ دونوں کو میں نے کپڑے تبدیل کر کے اور منہ ہاتھ دھونے کے بعد جلدی سے دسترخوان پر آنے کی تاکید کی۔ اماں کو یخنی میں ایک پھلکا بھگو کر میں نے پہلے ہی دے دیا تھا۔ جب تک میں نے دسترخوان لگایا۔ تب تک ثوبیہ اور بلال بھی دسترخوان پر آ گئے تھے۔ ان دونوں سے اسکول کی آج کی رپورٹ لیتے ہوئے ہلکی پھلکی نوک جھونک کے ساتھ خوش گوار ماحول میں کھانا کھایا گیا۔

ثوبیہ کو برتن سمیٹنے کی تاکید کر کے میں اپنے کمرے میں آ گئی۔ اب میں تھوڑی دیر سونا چاہتی تھی۔ مگر گانوں کی تیز آواز مجھے سونے نہیں دے رہی تھی۔ گانے سنتے سنتے میں نہ جانے کب نیند کی وادیوں میں چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

مہندی رنگ کی انارکلی فراک، چوڑی دار پاجامہ کے ساتھ ہاتھوں میں ہم رنگ چوڑیاں اور کانوں میں چھوٹی چھوٹی جھمکیاں پہنے میں بالکل تیار تھی۔ میک اپ کے نام پر میں نے ہلکی سی لپ اسٹک اور کاجل ہی لگایا تھا۔ میں بچپن ہی سے ذرا سادہ مزاج واقع ہوئی ہوں۔ "شعر و شاعری کی دلدادہ، مٹی کی محبت میں گندھا خمیر اور اپنی تہذیب و ثقافت سے پیار کرنے والی" یہ وہ ٹائٹل تھے، جن سے میری سہیلیاں وقتاً فوقتاً مجھے نوازتی رہتی تھیں۔ یہ حقیقت بھی ہے کہ اپنی تہذیب و ثقافت سے محبت میری رگوں میں لہو بن کر دوڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میری گفتگو، نشست و برخاست اور لباس کے انتخاب میں اپنی تہذیب و ثقافت کی گہری چھاپ نمایاں ہے۔

میں نے آئینے میں اپنے سراپے کا تنقیدی نظروں سے جائزہ لیا اور پھر اماں سے اجازت لے کر صبا کے گھر پہنچ گئی۔

وہاں رنگ و بو کا ایک سیلاب امڈا ہوا تھا۔ چوڑیوں سے سجے حنائی ہاتھ، کھنکتے ہوئے نقرئی قہقہے اور چہل پہل شادی کے گھر کی مخصوص رونق ظاہر کر رہی تھی۔ چند لڑکیوں کی تیاریوں میں ابھی کچھ وقت تھا۔ میں صبا کے کمرے میں چلی آئی۔ وہ کمرے میں نہیں تھی۔ اس کا زرد دوپٹا بیڈ پر پڑا تھا، جو اس بات کا پتا دے رہا تھا

کہ صبا اس وقت واش روم میں ہے۔ اسی لمحے واش روم سے آتی ہوئی گرتے پانی کی آواز نے میرے اندازے کی تصدیق بھی کر دی۔ میں آرام سے اس کے بستر پر بیٹھ گئی اور وہاں رکھا ہوا میگزین اٹھا کر یوں ہی صفحات پلٹنے لگی۔ ابھی میں نے چند صفحات ہی دیکھے ہوں گے کہ کمرے کے باہر سے بچوں کے باتیں کرنے کی آواز آئی۔ وہ شاید کمرے کے دروازے کے باہر ہی کھڑے تھے۔ ایک بچہ بولا۔

"ناصر! تمہیں پتا ہے کہ خالد اناتھ ہو گیا ہے؟"

لفظ "اناتھ" پر میں چونک اٹھی اب میں پوری طرح ان کی گفتگو کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"سچی؟" دوسرے بچے کی آواز میں حیرت تھی۔

"ہاں! پرسوں اس کے پتا کا دیہانت ہو گیا ہے۔ کل میرے پتا جی، میری ماتا جی کو بتا رہے تھے..... تو میں نے بھی سن لیا۔" اس بچے نے تفصیل بتائی۔ دوسرے بچے نے پوچھا۔

"تمہارے پتا ان کے کریا کرم میں گئے تھے؟"

"ہاں!"

وہ بچے چلے گئے۔ مگر میرے ذہن میں ہلچل مچا گئے۔ میں دکھی دل کے ساتھ سوچوں میں غرق ہو گئی۔

یہ صرف ان بچوں کی گفتگو کا ہی انداز نہیں، بلکہ تقریباً" ہمارے پورے ملک میں آج کل یہ وبا عام ہے۔ اچھی خاصی سمجھ دار اور پڑھی لکھی خواتین بھی پڑوسی ملک کے ڈراموں اور فلموں کے سحر میں بری طرح جکڑی ہوئی ہیں۔ رنگ برنگ ملبوسات، خوب صورت جیولری اور میک اپ کی چکا چوند نے ان پر جیسے کوئی سحر طاری کر رکھا ہے۔ ان کی روز مرہ کی بات چیت میں آدھے سے زیادہ بات ان ہی ڈراموں کی ہوتی ہے۔ یہ نادان خواتین یہ تک نہیں سوچتی کہ ان کے ساتھ بیٹھ کر یہ ڈرامے دیکھنے والے ان کے چھوٹے معصوم بچوں کے ذہنوں پر ان ڈراموں کا کیا اثر پڑ رہا ہے۔ بلکہ اکثر مائیں تو اس بات پر فخر کرتی نظر آتی ہیں کہ میرا بیٹا فلاں ڈرامے کے ہیرو کی بہت اچھی نقل اتارتا ہے یا میری بیٹی تو فلاں ڈرامے کی ہیروئن جیسی دکھتی ہے۔ محفلوں میں بچوں سے کہا جاتا ہے کہ بیٹا فلاں کی نقل کرو بیٹا! فلاں کی طرح بول کر دکھاؤ۔ میرا بیٹا تو اس گانے پہ بہت اچھا ڈانس کرتا ہے۔ بیٹا اٹھو سب کو ڈانس کر کے دکھاؤ۔ اس سب باتوں کا اثر ان کچے ذہنوں پہ کس طرح پڑ رہا ہے، یہ ان بچوں کی باتوں سے ظاہر ہونے لگا ہے۔ ان ڈراموں کی کہانیاں ان کے مکالمے اور کرداروں نے بچوں سے ان کی معصومیت، ان کا بچپن چھین لیا ہے۔

بن بیاہی ماں، بدلے، انتقام کی کہانیوں سے ہمارے بچے کیا سیکھ رہے ہیں۔ ابھی میں یہ سب سوچ ہی رہی تھی کہ صبا آ گئی۔ میرے چہرے پر دکھ کی چھاپ دیکھی تو پریشان ہو گئی، میں نے اسے بتایا تو وہ بھی دکھ سے بولی۔

"ہاں! ہم یہ نہیں سمجھ رہے ہیں کہ یہ آگ ہمارے بچوں کو کہاں لے جائے گی۔ چودہ، چودہ، پندرہ پندرہ سال کے بچوں نے عشق، محبت کرنا جیسے اپنا فرض سمجھ لیا ہے۔ راتوں کو چھپ کر موبائل فون پر عشق و عاشقی کی باتیں کرتے ہیں۔ الگ مذہب، الگ قوم کے نام پر حاصل کیے جانے والے اس ملک میں ہماری روایات، ہماری ثقافت کچھ بھی تو اپنا نہیں رہا۔ سب کچھ ہم نے ادھر ادھر سے لے لیا ہے۔ بول چال، زبان، کلچر سب کچھ دوسروں کا ہے اور ہم بڑی آسانی سے یہ سب اپنی نئی نسل میں منتقل کر رہے ہیں۔ یہ جانے بنا کہ اس کا انجام کیا ہو گا۔ ہم اپنے مستقبل کے معماروں کو یہ کس راہ پر ڈال رہے ہیں۔" اس کی باتیں سن کر میں نے دکھ سے سر ہلایا۔

"ہاں! روشن خیالی اور نام نہاد دوستی کا راگ الاپتے الاپتے ہم یہ بھول گئے ہیں کہ ہم نے یہ ملک کتنی جدوجہد اور قربانیوں کے بعد حاصل کیا تھا تاکہ ہم اپنی شناخت قائم رکھ سکیں۔ راشد منہاس اور کیپٹن سرور شہید جیسے اپنے قومی ہیروز اور اپنے فوجی جوانوں کے قصے سنانے اور ان پر بنے ڈرامے دکھانے کے بجائے ہم اپنے بچوں کو وہ سب دکھا رہے ہیں، جو انہیں اللہ نہ کرے تباہی کے راستے پر لے جائے گا۔ ہمارے لیے دین اب کورس کی کتابوں تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ خواتین چاہے نماز کی پابندی کریں یا نہیں، پر ڈرامے بڑی پابندی سے دیکھتی ہیں۔ اگر کوئی قسط دیکھنے سے رہ جائے تو اس کا تو افسوس ہے۔ مگر خود نے یا بچوں نے نماز نہیں پڑھی، اس کا افسوس نہیں۔

ستم بالائے ستم کہ گانوں میں موجود کفریہ کلمات کے باوجود ہم اپنے بچوں کو ایسے بے ہودہ اور لچر گانے گانے سے نہیں روکتے۔ ان گانوں میں اللہ پاک کی شان میں کھلی کھلی گستاخیاں کی گئی ہیں۔ مگر ہم پتا نہیں کیسے مسلمان ہیں جن کی غیرت نہیں جاگتی۔ ہم خود اپنے بچوں کو جہنم کا راستہ دکھا رہے ہیں۔ ہمارے دشمن ہمیں تباہ و برباد کرنا چاہتے ہیں اور ہم ایسا کرنے میں ان کا بھرپور ساتھ دے رہے ہیں۔

ہم یہ نہیں سوچتے کہ ہماری ترقی کا دارومدار ہماری نوجوان نسل اور ہمارے بچوں پر ہے۔ جب بنیاد ہی مضبوط نہیں ہو گی تو عمارت کیسے مضبوط ہو گی۔ جو بچے خود کو نہیں سنبھال پائیں گے، وہ آگے چل کر ملک کو کیا سنبھالیں گے۔"

"ہاں! تم صحیح کہہ رہی ہو۔ ہم تو وہ نادان ہیں، جو خود اپنے ہی ملک میں اپنے ملک کے دشمن پیدا کر رہے ہیں۔ ہمارے بچوں کی زبان خراب ہوتی جا رہی ہے۔ بے ہودہ گالیاں دینا، لچر ڈائیلاگ بولنا، الٹی سیدھی حرکتیں کرنا ان کی عادت بنتا جا رہا ہے۔ بچے اپنی قومی زبان سے دور ہو رہے ہیں۔ خون کو کھون، خان کو کھان، غلط گلت بولتے ہیں۔ ہمارے معصوم بچے اس جگمگاتے جادو کا شکار ہو چکے ہیں۔ ہمارے بچے ذہنی طور پر ان کے غلام ہو رہے ہیں۔ ہمارے دین پر ان کا دھرم اثر انداز ہو رہا ہے۔" وہ بہت دکھی ہو رہی تھی۔ وہ کچھ مایوس سی نظر آئی تو میں نے کہا۔

"کیا ہم اپنے بچوں کو وہ تربیت نہیں دے سکتے جو ان کی زندگیوں کو سنوار دے؟ کیا ہم انہیں اللہ اور اس کے رسول کے احکامات پر نہیں چلا سکتے؟ کیا ہم اپنے بچوں کے اچھے مستقبل کی خاطر اپنی یہ بری لت نہیں چھوڑ سکتے؟ ہمیں چاہیے کہ ہم ٹی وی پر یہ فالتو ڈرامے دیکھنے کی بجائے اپنے بچوں کے ساتھ وقت گزاریں۔ انہیں اچھے برے میں فرق کرنا سکھائیں۔ اپنے دین، اپنے وطن اور اپنی ثقافت سے پیار کرنا سکھائیں۔ انہیں ملک کا کارآمد شہری بننے میں ان کی مدد کریں۔ ان کے اچھے مستقبل کے لیے ان کا آج سنواریں۔ اگر ہم ایسا نہیں کریں گے تو کل کو ہمیں پچھتانا نہ پڑ جائے۔ کیونکہ ہم آج اچھا بوئیں گے تو ہی کل کو اچھا کاٹیں گے نا!"

"ہاں! تم صحیح کہہ رہی ہو۔ میں ان شاء اللہ اپنے بچوں کی تربیت ان ہی خطوط پر کروں گی۔" صبا کے لہجے کا عزم دیکھ کر میں خوش اور مطمئن ہو گئی کہ ہمارا آج دھندلا ہی سہی۔ مگر آنے والا کل روشن ہے۔

☼

تیسری قسط

صائمہ اکرم چوہدری

دیمک زدہ محبت

سکینہ جمیلہ مائی اور اللہ دتا کمہار کی اکلوتی بیٹی ہے، جو شادی کے سترہ سال بعد پیدا ہوئی اور چودہ برس کی عمر میں کینسر [illegible] پن کی بیماری میں مبتلا ہو گئی۔ پانچ سال لگاتار علاج کے بعد بیت المال والوں نے اسے سرکاری اسپتال میں پرائیویٹ [illegible] دلوا دیا۔ جہاں ڈاکٹر خاور اس کا مفت علاج کر رہے ہیں۔ عام سی شکل و صورت والی سکینہ "ڈاکٹر خاور کو پسند کرتی" ہے۔ سکینہ کی آواز بہت خوب صورت ہے تاہم ڈاکٹر خاور اسے صرف اپنی پیشنٹ سمجھتے ہیں۔

ماہم منصور حسین ترین سائیکولوجسٹ ہے۔ اور اپنا ذاتی کلینک چلاتی ہے۔ رامس علی اس کا مریض ہے۔ ماہم [illegible] حسن پرست ہے۔ اس کی دوست عائشہ قدرے کم صورت ہے۔ عائشہ کا بھائی موحد رحیم ماہم کو پسند کرتا ہے مگر [illegible] آپریشن میں اس کی دونوں ٹانگیں ضائع ہو جانے کے سبب ماہم اس سے کھنچ جاتی ہے۔ ماہم کی بڑی بہن ثمن عائشہ کے کزن انصر کی بیوی ہے اور ڈومیننٹ ہے۔

رامس علی اپنے نفسیاتی عارضے کی وجہ سے خودکشی کی کوشش کرتا ہے۔

لیکن بچ جاتا ہے۔ اس حادثے کے بعد رامس اور ماہم ایک دوسرے کے قریب آجاتے ہیں۔

سکینہ کی خوب صورت آواز کی وجہ سے ڈاکٹر خاور اسے ایک نعت کمپٹیشن میں حصہ لینے کے لیے کہتے ہیں۔ ڈاکٹر خاور کی ساتھی ڈاکٹر زویا کو ان کا سکینہ پر مہربان ہونا ناگوار گزرتا ہے۔ سکینہ اور ڈاکٹر خاور کو ان کی ناپسندیدگی کا علم ہے۔ جمیلہ مائی وقتاً فوقتاً سکینہ کو سمجھاتی رہتی ہیں۔

ثائلہ زبیر ایک مشہور مصنفہ ہے۔ اس کے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ وہ اپنے فرضی کردار سکندر شاہ سے محبت میں مبتلا ہو گئی ہے۔ اسی سلسلے میں اس کی ملاقات ماہم سے ہوتی ہے۔

ناولٹ

"آپ میرا یقین کریں ماہم..." اس نے ناخنوں سے میز کی سطح کھرچتے ہوئے عجیب سا اصرار کیا۔

"میں نے سکندر شاہ کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ وہ سو فیصد وہی تھا..." ثنائلہ زبیر ایک گھنٹے کے بعد ہی ماہم کے کلینک میں تھی۔ اس کے چہرے پر جہاں کچھ پالینے کی چمک تھی' وہیں کچھ کھودینے کا دکھ بھی ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ کال کٹ جانے کے بعد اس نے دوبارہ فون پر بات کرنے کے بجائے دوبارہ کلینک آجانا زیادہ مناسب سمجھا تھا۔

"ہو سکتا ہے ثنائلہ' وہ آپ کا وہم ہو..." ماہم نے اس کی اضطراری حرکت کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ناممکن۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا..." اس نے سر جھٹک کر سختی سے ماہم کی بات رد کی۔ "وہ میرا وہم نہیں تھا۔ وہ ایک بھرپور یقین کی طرح میرے سامنے تھا۔ مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر وہ سیاہ کلر کی ہنڈا سوک میں تھا۔ گاڑی سگنل پر رکی تھی اور روڈ کراس کرتے ہوئے میں نے اسے دیکھا۔ وہ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر ٹیک لگائے تھکے ہارے سے انداز میں براجمان تھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی وحشت اور چہرے پر پھیکا پن تھا۔" اس نے ایک لمحے میں جیسے ساری جزئیات محفوظ کرلی تھیں۔

"پلیز ثنائلہ! ایک نظر میں تم اتنا کچھ کیسے دیکھ سکتی ہو۔" ماہم نے اصرار کیا۔

"کمال کرتی ہیں آپ..." وہ تھوڑا سا برا مان گئی۔ "میں نے اس کردار کو خود تخلیق کیا تھا۔ وہ پورے تین سال تک میرے قلم کی نوک کے نیچے رہا ہے۔ میں اس کے سب ہی چہرے پہچانتی ہوں..." اس کی بات پر ماہم کی آنکھوں کی حیرانی میں یک لخت کمی ہوئی تھی۔ وہ جیسے اس کی بات سمجھ گئی تھی۔

"ہوں..." ماہم نے سر اثبات میں ہلایا۔ "اگر وہ وہی تھا تو یقین رکھو' اس چھوٹے سے شہر میں وہ تمہیں پھر کہیں نہ کہیں نظر آجائے گا..." ماہم کی تسلی پر وہ بمشکل مسکرائی لیکن اس کے سارے وجود پر چھائی اداسی اور مایوسی میں کمی نہیں آئی تھی۔

"آپ سوچ بھی نہیں سکتیں کہ ایک بات نے میری ساری زندگی کو ڈسٹرب کر کے رکھ دیا ہے۔ میں کچھ بھی نہیں کرپارہی۔ میں نے ایک سلسلے وار ناول درمیان میں ادھورا ہی چھوڑ دیا ہے..." وہ بے بسی سے بولی۔

"ادھورے پن کا کرب وہ ہی شخص محسوس کرسکتا ہے' جس نے دنیا کے میلے میں اپنے کسی بہت پیارے کو کھودیا ہو۔ میرے زندگی کے کیلنڈر میں ہر تاریخ پر مایوسی کا سیاہ حاشیہ سا لگتا جارہا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے جدائی نے میری انگلی پکڑ کر مجھے تنہائیوں کے سمندر میں دھکیل دیا ہو۔"

"میں تمہارے احساسات و جذبات کو اچھی طرح سمجھ سکتی ہوں ثنائلہ..." ماہم کو اپنا دل بے نام سے تاسف میں مبتلا ہوتا محسوس ہوا تھا۔ "لیکن تم میری یہ بات آج کہیں لکھ لو' تمہارے حصے کی خوشیوں کے جگنو تمہیں ڈھونڈتے ہوئے خود تمہارے پاس آجائیں گے۔ زندگی میں کبھی بھی ایک جیسے موسم نہیں رہتے۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں..." اس کی بات پر ثنائلہ کی آنکھوں میں ایک الوہی سی روشنی بھر گئی۔

"لیکن ایک بات تو بتاؤ۔" ماہم کے چہرے پر ایک پُراسرار سی مسکراہٹ نے احاطہ کیا تو وہ بے اختیار چونک گئی۔

"دیکھو! سکندر شاہ تمہیں نہیں جانتا۔ اس لیے کہ وہ تمہاری کہانی کا ایک کردار ہے۔ تم اس کی زندگی میں کہیں نہیں ہو..." اس کی بات پر اس کے چہرے کی رنگت اچانک متغیر ہوئی۔

"آپ کہنا کیا چاہتی ہیں..."

"میں صرف یہ کہنا چاہتی ہوں کہ جب کبھی وہ تم سے ملے تو تم اسے کھوگی کیا..." اس نے گہری نظروں سے اپنے سامنے بیٹھی مشہور و معروف مصنفہ کو دیکھا جو اس سوال پر بالکل ہکابکا سی ہوگئی تھی۔

"یہ بات تو میں نے کبھی سوچی ہی نہیں..." اس کے جواب پر اب ہکابکا ہونے کی باری ماہم کی تھی۔ جو سخت تعجب سے اپنے سامنے بیٹھی اس سادہ سی لڑکی کو دیکھ رہی تھی جو اتنی بڑی مصنفہ تھی مگر اس کے چہرے پر حد درجہ معصومیت تھی۔ ایسی معصومیت جو آج کل زمانہ میں ناپید تھی۔

☼ ☼ ☼

"میری پتری دی طبیعت تے ٹھیک ہے ناں...؟" اللہ دتا کمہار نے انتہائی محبت سے اپنی لاڈلی بیٹی کا مضطرب انداز دیکھا۔ وہ ہاتھ کی پشت سے کنپٹی کو سہلا رہی تھی۔ اس نے اس دفعہ ابے کی آمد پر بے ساختہ خوشی کا اظہار بھی نہیں کیا تھا۔ جمیلہ مائی اعجاز کو لے کر قریبی میڈیکل اسٹور پر گئی تھیں۔

"ابا! طبیعت تو اب اللہ چاہے گا تو ہی ٹھیک ہوگی۔" اس نے بے بسی سے کہا۔ "ویسے مجھے تو کوئی امید نہیں۔" وہ اب بےزاری سے چھت پر لگے پنکھے کو چلتے دیکھ رہی تھی۔ آج فضا میں تپش کا احساس کافی تھا۔

"وہ کیوں پتر..." اس نے جانچتی نظروں سے اپنی لاڈو کا خفا خفا انداز دیکھا۔

"کبھی کبھی میں سوچتی ہوں ابا! یہ اللہ کا بس بھی ہم جیسے غریبوں پر ہی چلتا ہے..." اس کے شکوے پر اللہ دتا دہل سا گیا۔

"ناں پتری! ایسی باتیں نہیں کرتے۔" اس کے لہجے میں محسوس کی جانے والی بدگمانی تھی۔

"نہیں ابا! جو اللہ چاہتا ہے وہی ہوتا ہے۔؟ بھلے ہم کتنی ہی کوششیں کیوں نہ کریں۔" "جب بھوری مجھ (بھینس) بیمار ہوئی تھی' تو نے کتنی دعائیں کی تھیں اور وہ ٹھیک ہوگئی تھی۔ پھر جب سیلاب میں ہمارا پنڈ بہنے سے بچ گیا تھا' تب بھی تو نے کہا تھا کہ تیری دعا قبول ہوئی ہے۔ یہ کیا تھا؟" ابے کی بات پر وہ لاجواب ہوئی۔

"ہاں ابا! پر تجھے کیسے سمجھاؤں بعض دعائیں زندگی سے بڑی ہوتی ہیں۔ وہ قبول نہ ہوں تو کچھ باقی نہیں رہتا۔" وہ بے بسی سے بولی۔

"اس کی مصلحتیں وہی جانے۔ تو دعا مانگنا نہ چھوڑ بس۔"

"میں دعا مانگنا نہیں چھوڑتی ابا! پر کبھی کبھی تھکنے لگتی ہوں۔" اس کے لہجے میں دکھ اتر آیا۔

"اللہ خیر سکھ رکھے پتری' سوہنا رب ضرور اپنا کرم کرے گا..." ابے کے لہجے کا یقین بھی سکینہ کے چہرے پر مسکراہٹ لانے میں ناکام رہا تھا۔

"چل چھوڑ ساری باتوں کو۔ وہاں پنڈ میں سارے لوگ تیرا بڑا پوچھتے ہیں۔ شیدے حلوائی نے میری دھی کے لیے خالص دیسی گھی کے پیڑے بھیجے ہیں اور زینب مائی نے اپنے درخت کے بیر..." ابے نے اس کا دھیان بٹانے کو کہا مگر سکینہ تو اپنی سوچوں میں محو تھی۔ اس نے اللہ دتا کی بات دھیان سے نہیں سنی تھی۔

"ابا' اک گل تو بتا..." کچھ توقف کے بعد وہ ہاتھوں کی انگلیوں کو باہم پھنسائے ہوئے بولی۔ اس کے لہجے میں بلا کی سنجیدگی تھی۔

"تجھے اپنے کام سے عشق ہے' تو پوری محنت اور لگن سے پانڈے (برتن) بناتا ہے' فیر وی کسی نہ کسی میں کوئی خرابی تو رہ جاتی ہوگی۔ ابا! میں سوچتی ہوں کہ کیا ان نقص والے پانڈوں کا بھی کوئی خریدار ہوگا..." سکینہ کے متجسس انداز پر اللہ دتا مسکرایا۔ اسے علم تھا کہ وہ یہ سوال کس پس منظر میں کررہی ہے۔

"میری دھی وی ڈاڈی جھلی اے..." اللہ دتا نے انتہائی محبت سے سکینہ کو دیکھا۔

"پتری! اس سوہنے مالک کی ذات نے کوئی بھی چیز بغیر مقصد کے نہیں بنائی۔"

"فیر وی ابا! تو سوچ کے بتا۔ تیرا کوئی پانڈا تو ایسا ہوگا جو کسی کو بھی اچھا نہیں لگتا ہوگا..." سکینہ کے بے تحاشا اصرار پر وہ کچھ لمحوں کے لیے سوچ میں ڈوب گیا۔

"ہاں پتر! بس ایک چھوٹی سی گاگر ہے' جس کا منہ

تھوڑا سا ٹیڑھا ہو گیا تھا۔ اسے ابھی تک کسی نے نہیں خریدا لیکن کوئی بات نہیں۔ کوئی نہ کوئی اسے بھی خرید ہی لے گا۔" اللہ دتا کے لہجے میں امید و یقین کا ایک جہاں آباد تھا۔

"ابا! تو اس گاگر کو پھینک کیوں نہیں دیتا۔۔۔۔" سکینہ نے اپنے ہونٹوں کو پھیلا کر عجیب سے استہزائیہ انداز میں مشورہ دیا۔

"لے! میں اپنی بنائی چیز کو کیوں پھینکوں۔" وہ تعجب سے بولا۔

"میرے محنت کش ہاتھوں نے اسے پوری محبت، لگن اور محنت سے بنایا ہے۔ میں اپنی بنائی ہوئی چیز کو کسی اور کی نظر سے نہیں دیکھتا۔ وہ ہزار بدشکلی ہو لیکن مجھے تو اچھی لگتی ہے۔ مجھے کسی اور سے کیا لینا دینا۔" اللہ دتا، جمیلہ مائی کی طرح شکر اور قناعت کی نعمت سے مالا مال تھا۔

"ابا! فیر اس کا مطلب ہے کہ جب تجھے اپنے ہاتھ سے بنائی ایک چھوٹی سی گاگر سے اتنا پیار ہے تو میں تو ایک جیتی جاگتی انسان ہوں۔ اس لیے اس کی مخلوق کو میں کتنی ہی عجیب یا مضحکہ خیز کیوں نہ لگوں، لیکن اس رب کو تو سکینہ کبڑی سے پیار ہو گا ناں۔۔۔۔" اس کے لہجے میں دل کو دکھانے والی سادگی اور معصومیت تھی۔ نمی کی پتلی سی لکیر اس کی آنکھ کے کونے سے کان کی سمت رینگ رہی تھی۔

"سکینہ! ایسی باتیں نہ کیا کر۔" اللہ دتے کا دل دکھ کے گہرے احساس سے بھر گیا تھا "اللہ کو اپنی ساری مخلوق سے پیار ہے۔ وہ بندے کی شکل سے نہیں اس کے اعمال سے پیار کرتا ہے۔ بس اپنا ایمان پختہ رکھ اور اللہ کی ذات پر کبھی شک نہ کرنا۔"

"ابا! اس سوہنے رب کی محبت پر مجھے کوئی شبہ نہیں لیکن آج کل پتا نہیں کیوں دل میں اوکھے سے خیال سے آتے ہیں کہ آخر یہ سب میرے ساتھ ہی کیوں ہوا۔" سکینہ کو اماں سے زیادہ ابے سے بات کرنے میں مزا آتا تھا کیونکہ وہ اسے کبھی بھی جھڑکتا نہیں تھا۔

"پتر! بس یہ سوچ اپنے دل میں بٹھا لے کہ اللہ سوہنا کسی کے ساتھ برا نہیں کرتا، کبھی اس ذات سے بدگمان نہیں ہوتا۔ یہ بدگمانی دل کو کالا کر دیتی ہے اور بندے کو اللہ سے سچا پیار ہو تو پھر اس کے دل میں کوئی وہم یا بدگمانی کی گنجائش ہی کہاں بچتی ہے۔" اس نے کھوجتی نگاہوں سے اس کا اداس چہرہ پڑھا تھا۔

"پر ابا! لوگ دل بہت دکھاتے ہیں۔" سکینہ کی آنکھیں نمکین پانیوں سے بھر گئی تھیں۔ وہ مرتعش ہاتھوں سے اپنی گردن کو چھو رہی تھی۔

"پتا ہے ابا! یہ لوگ، جو اللہ کی زمین پر اکڑ کر چلتے ہیں جن کو اس نے صحت و تندرستی سے نوازا ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ یہ اللہ کا ان پر احسان نہیں بلکہ ان کا کمال ہے۔ ہم جیسوں کو اگر اس نے کسی بیماری میں مبتلا کیا ہے تو اس میں ہماری کوئی خامی یا گناہ ہے۔ تب ہی وہ ہمیں عجیب عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہیں، کانوں کو ہاتھ لگا کر توبہ توبہ کرتے ہیں۔" وہ آج پہلی دفعہ اپنے باپ کے سامنے اس طرح جذباتی ہوئی تھی۔

"پتر! لوگ جتنا بھی دل دکھائیں یہ یاد رکھا کر کہ جب اللہ کے بندے ہمیں توڑتے ہیں تو ان کا توڑنا ہی ہمیں اللہ سے جوڑتا ہے۔" اللہ دتا کمہار نے مسکراتے ہوئے اسے ایک اور مشکل سبق پڑھایا تھا۔

"ابا! تو بڑی اوکھی اوکھی باتیں کرتا ہے۔" اس کے منہ بنانے پر اللہ دتا بے ساختہ ہنس پڑا۔ اسی لمحے ڈاکٹر خاور نے کمرے میں قدم رکھا اور سکینہ کے دل کی دھڑکنوں میں ایک ارتعاش سا برپا ہو گیا۔ سبز رنگ کے بڑے بڑے خانوں والی تہبند باندھے سفید کرتے میں ملبوس یہ محنت کش بندہ ڈاکٹر خاور کو ہمیشہ اچھا لگا تھا۔ اس لیے وہ انتہائی محبت سے ملے۔

واہ! کمرے میں تو آموں کی مہک پھیلی ہوئی ہے۔" انہوں نے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے بڑی خوش گوار مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"ڈاکٹر صاحب! آپ کے لیے خاص طور پر لنگڑے آموں کی پیٹی ملتان سے لایا ہوں۔" اللہ دتا کمہار کو ڈاکٹر خاور کا بے غرض سا انداز اچھا لگتا تھا۔

"ارے کیوں ایسی زحمت کرتے ہیں یقین مانیں

مجھے بہت شرمندگی ہوتی ہے۔ پچھلی دفعہ آپ دیسی گھی شکر لے آئے تھے۔ میں نے تب منع کیا تھا۔" ڈاکٹر خاور واقعی شرمندہ ہوئے تھے۔

"ڈاکٹر صاحب! یہ تو تحفہ ہے اور محبت بھرے تحفوں سے کون شرمندہ ہوتا ہے۔" اللہ دتا کمہار کی آنکھوں میں خلوص کی فراوانی تھی۔

"کسی اور کا تو پتا نہیں لیکن مجھے شرمندگی ہوتی ہے ایک تو آپ اتنا لمبا سفر کر کے آتے ہیں اور ساتھ اتنا سامان بھی لے آتے ہیں۔" انہوں نے تازہ ایکسرے کی رپورٹ کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب! آپ بھی تو ہم غریبوں کا اتنا خیال رکھتے ہیں۔"

اللہ دتا کی بات پر وہ ہلکا سا ہنس پڑے۔ سکینہ کو دل کی دھڑکنوں کو سنبھالنا دشوار ہو گیا تھا۔

"بھئی وہ تو میری ڈیوٹی ہے اور ڈیوٹی کسی پر احسان تھوڑی ہوتی ہے۔" ڈاکٹر خاور کے انداز میں متانت نمایاں تھی۔

"احسان کر کے کسی پر احسان نہ جتانا بھی بڑا افضل کام ہے جی اور یہ احسان کرنے سے زیادہ اوکھا ہے۔" اللہ دتا کی بات پر ڈاکٹر خاور نے بے یقینی سے انہیں دیکھا۔

"ایک بات تو بتائیں، آپ نے کبھی اسکول، کالج کی شکل تک نہیں دیکھی، پھر آپ اور اماں جی اتنی گہری باتیں کر کیسے لیتے ہیں۔"

"پتر! پڑھائی صرف مدرسوں میں تھوڑی ہوتی ہے۔ ایک پڑھائی وہ ہوتی ہے جو آپ کو زمانہ سکھاتا ہے۔ ایک پڑھائی وہ ہوتی ہے جو اللہ خود بخود آپ کے دل میں اتار دیتا ہے۔ ہم ان پڑھ جاہل لوگ ہیں۔ لفظوں کی گھمن گھیریاں ہمیں نہیں آتیں۔ بس نیت صاف ہے اور یہ بھی مولا کریم کا احسان ہے ہمارا کوئی کمال نہیں۔" اللہ دتا نے ہاتھ جھاڑ کر سادگی سے کہا۔ جب کہ ڈاکٹر خاور کو اپنے سامنے کھڑے بندے پر سخت رشک آیا جس کے دل میں سب کے لیے خیر اور بھلائی تھی جو شکر گزاری کی نعمت سے مالا مال تھا۔

"آپ یہ بات سکینہ کو بھی سمجھایا کریں۔ یہ آج کل بڑی مایوسی والی باتیں کرتی ہے۔" ڈاکٹر خاور نے اس کی فائل کو میز پر رکھتے ہوئے ہلکے پھلکے لہجے میں اس کی شکایت کی تو سکینہ کا مجسم سماعت بنا دل باغی ہونے لگا۔

"ڈاکٹر صاحب سوچنے والی بات ہے نا کہ اگر بندے کے مزاج میں اتار چڑھاؤ نہ ہو تو وہ بندہ تھوڑی ہوا نا، فیر تے او لکڑی کا گڈا ہو گیا نا۔" اللہ دتا کی بات پر وہ چونکے۔ "اللہ سوہنا دل کو غم زدہ کرتا ہے تو بندہ اس کی طرف لپکتا ہے نا۔ میری سکینہ تو بہت بہادر ہے۔ بس اللہ نے اپنی محبت اور آزمائش کا ذرا اوکھا پرچا اس کے ہاتھ میں تھما دیا ہے اس لیے کملی دھی پریشان ہو جاتی ہے۔" اللہ دتا نے اپنی لاڈو رانی کی بھرپور حمایت کی تھی۔

"ویسے سکینہ! آپ کے ابا جی نے تو ہمیں پہلی ہی بال پر آؤٹ کر دیا۔ آپ کی اماں ٹھیک کہتی تھیں کہ سکینہ کے ابے کو اس سے بہت پیار ہے۔" ڈاکٹر خاور بے ساختہ ہنسے تھے۔ ان کی ہنسی نے سکینہ کے دل میں پھول ہی پھول کھلا دیے تھے۔

"واہ۔ اندر تو بڑی رونقیں لگی ہوئی ہیں۔" سفید کاٹن کی شلوار قمیص میں اندر داخل ہوتا اعجاز سکینہ کو آج سے پہلے کبھی اتنا برا نہیں لگا تھا۔ ڈاکٹر خاور کے ساتھ کھڑا درمیانے قد کا دبلا پتلا حاجی، جس نے میٹرک کا امتحان پاس کر کے اللہ دتا کمہار کی شاگردی اختیار کر رکھی تھی۔ وہ سکینہ کو ویسے ہی اچھا نہیں لگتا تھا اور ڈاکٹر خاور کے ساتھ کھڑا تو وہ اسے اور بھی عجیب لگ رہا تھا۔

"ابا اس لیچڑ کو ہر دفعہ پتا نہیں کیوں لے آتا ہے۔ جسے بات کرنے کی بھی تمیز نہیں۔" سکینہ نے ڈاکٹر خاور کے ساتھ اپنے آپریشن کی تفصیلات ڈسکس کرتے اعجاز کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اعجاز کا ہاتھ پکڑ کر کمرے سے باہر نکال دے۔

"ڈاکٹر صاحب! میری دھی کو فٹافٹ ٹھیک کر دیں۔

فیریہ جاجی آپ کو اپنی شادی کے میٹھے چاول کھلائے گا۔" جمیلہ مائی کی بات پر سکینہ نے سخت خوف زدہ نظروں سے اماں کو دیکھا' جن کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ تھی۔

"اچھا' کب ہے شادی؟" ڈاکٹر خاور کے چہرے پر خوشگوار سی حیرت پھیلی۔

"اللہ سائیں' جلدی وہ ویلا لائے۔ بس ذرا سکینہ اپنے پیروں پر کھڑی ہو جائے تو ہم نے فوراً" دیگیں کھڑکا دینی ہیں۔ اپنے جاجی کی منگ ہے نا سکینہ۔" جمیلہ مائی نے ہاتھ میں پکڑا دوائیوں کا شاپر میز پر رکھتے ہوئے ایک جتلاتی سی نظر سکینہ کے بے زار چہرے پر ڈالی۔ جہاں لاتعلقی اور خفگی نے اچانک ہی خیمہ لگالیا تھا۔

"اللہ کرے کہ میں کبھی اپنے پیروں پر کھڑی نہ ہو سکوں۔" جاجی کے چہرے پر پھیلی مسرت دیکھ کر سکینہ کے دل نے بڑی عجیب سی دعا کی تھی۔ وہ دل ہی دل میں اماں سے سخت خفا ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"لگتا ہے اللہ نے چن چن کر سارے نمونے میرے ہی گھر میں بھیج دیے ہیں۔"

عائشہ جیسے ہی گلاس وال کو دھکیل کے اندر داخل ہوئی تو ماما کی سرد اور غصے سے لبریز آواز نے اس کا استقبال کیا۔ اس کے قدم وہیں تھم گئے۔

"ناکوں چنے چبوا دیے ہیں ان بچوں نے مجھے سخت بے زار ہو گئی ہوں میں۔" ماما کے لہجے میں باہر کے تپتے موسم سے زیادہ حرارت تھی۔ اس کا اندازہ عائشہ کو ایک لمحے میں ہو گیا تھا۔ سامنے لاؤنج کے بڑے صوفے پر ماما اور ان کے مقابل ماہم کے ساتھ ساتھ ثمن آپی کو دیکھ کر اسے خوشگوار سی حیرت ہوئی۔ ٹی وی لاؤنج کے دوسرے حصے میں موحد ان کی طرف پشت کیے لاتعلق سے انداز میں بیٹھا تھا۔

"السلام علیکم۔" اس نے ہلکا سا اندر جھانکا تو وہ تینوں خواتین چونک گئیں۔ "یہاں کا ماحول تو باہر کی نسبتاً" زیادہ گرم ہے۔ اے سی تیز کر دوں کیا؟" اس کے شرارت بھرے انداز پر ماما کے ماتھے کی شکنوں میں بڑی سرعت سے اضافہ ہوا تھا۔

"وعلیکم السلام لڑکی! تم کہاں اتنی سخت گرمی میں دورے کرتی پھر رہی ہو؟" ثمن آپی نے فوراً" اسے محبت سے گلے لگایا "ذرا آئینے میں چہرہ دیکھو اپنا۔ ساری اسکن رف کر لی ہے تم نے۔" ثمن آپی کو ویسے ہی اس سے بے تحاشا محبت تھی لیکن اس وقت بالکل تازہ ماما کی دکھ بھری داستان کے زیر اثر انہوں نے اسے گھور کر دیکھا' جو لاپروائی سے ٹرالی سے جگ اٹھا کر لیمن اسکوائش گلاس میں انڈیل رہی تھی۔

"مجھے چھوڑیں۔ آپ تو اتنی گرمی میں بھی لشکارے مار رہی ہیں۔ آپ کا مارننگ شو دیکھا تھا میں نے' آفت لگ رہی تھیں۔" اس نے انکھیوں سے ماما کا بے زار چہرہ دیکھتے ہوئے ماہم کے ساتھ والی سیٹ سنبھالی۔

"عائشہ! میں تمہارے سارے مسکے سمجھتی ہوں۔" ثمن آپی کھلکھلا کر ہنسیں۔ ماہم کی طرح وہ اپنی تعریف اپنا حق سمجھ کر وصول کرتی تھی۔ دونوں بہنوں کی عادات میں کافی مماثلت تھی۔ دونوں ہی حسن کی دولت سے مالا مال تھیں۔

"واقعی ثمن آپی! یہ میرون کلر آپ پر بہت سوٹ کر رہا ہے اور آپ تو دن بہ دن نکھرتی جا رہی ہیں۔" عائشہ نے کھلے دل سے انہیں سراہا تھا۔

"ظاہر ہے اپنا خیال رکھتی ہے وہ۔ تمہاری طرح نہیں کہ سر جھاڑ منہ پہاڑ اپنی ماں کو ہر جگہ شرمندہ کرواتی پھرو۔" ماما کے سلگ کر بولنے پر ماہم اور ثمن آپی بے ساختہ ہنس پڑیں۔ جبکہ عائشہ نے آنکھ کے اشارے سے اپنی ماں کی مشیر خاص ماہم سے ان کی برہمی کا سبب پوچھا۔ اس کی بدقسمتی کہ اس کا اشارہ ماما کی زیرک نگاہوں سے چھپ نہیں سکا تھا۔

"مجھ سے براہ راست پوچھ لو۔" ماما کا لہجہ سخت اور ہنوز خفگی لیے ہوئے تھا۔

"میں تو آنکھوں ہی آنکھوں میں اس لیے پوچھ رہی تھی ناکہ آپ کو کانوں کان خبر نہ ہو۔" عائشہ کے انداز میں بے ساختہ سی شوخی چھلک رہی تھی۔

"بیٹا! اتنی بے وقوف نہیں ہوں میں۔ ساری زندگی تمہارے فوجی باپ کے ساتھ گزاری ہے' جو گھر میں بھی ہر وقت کرفیو لگائے رکھتے تھے۔" ماما نے ابرو چڑھا کر اسے دیکھا۔ ہلکے انگوری رنگ کے لان کے سوٹ کے ساتھ اتنی گرمی میں بھی وہ جوگرز پہنے ہوئے تھی۔ چہرہ میک اپ سے مبرا اور دھوپ کی زیادتی سے مرجھا سا گیا تھا۔ وہ ابھی تک سمجھنے سے قاصر تھی کہ یہ آج توپوں کا رخ اس کی جانب کس خوشی میں ہوا ہے۔

"توبہ کریں ماما! کیوں میرے اتنے سوئٹ بابا کو بدنام کرتی ہیں۔" عائشہ نے خالی گلاس میز پر رکھتے ہوئے ایک دفعہ پھر شوخی سے انہیں چھیڑا۔ "ویسے یہ سینٹ کا اجلاس خیر سے کیوں بلوایا آپ نے؟"

"یہ اجلاس آنٹی نے نہیں بلوایا' ہم لوگ خود سے انہیں ملنے آئے تھے۔ یہاں آکر معلوم ہوا کہ تم انہیں "لارا" لگا کر حسب عادت غائب ہو۔" ماہم کی بات پر اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ اسے ماما کی ناراضی کی وجہ اچانک ہی سمجھ میں آگئی تھی۔

"اوہ گاڈ۔" اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھاما۔ آج تو ماما کے ساتھ مسز ہمدانی کے ہاں لنچ پر جانا تھا۔

"سوسوری ماما! مصروفیت میں ذہن سے نکل گیا۔" اس کے شرمندہ انداز پر بھی ان کی برہمی کم نہیں ہوئی تھی۔

"تم بہت عجیب و غریب لڑکی ہو عائشہ!" اپنے جوگرز کے تسمے کھولتے ہوئے وہ ثمن آپی کی بات پر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"پہلے فیصلہ تو کر لیں کہ میں عجیب زیادہ ہوں یا غریب۔" عائشہ کے ہلکے پھلکے انداز پر ماہم نے اپنی ستواں ناک چڑھا کر اسے دیکھا۔

آپ پہلے مدر ٹریسا کے روپ میں صرف "عجیب" لگتی تھیں لیکن اب اپنے حلیے سے دن بہ دن "غریب" ہو رہی ہیں۔ بندہ پوچھے اتنی گرمی میں جوگرز پہننے کی تک کیا بنتی ہے۔" ماہم نے استہزائیہ انداز سے اسے اوپر سے لے کر نیچے تک دیکھا۔

"یار! ماما کو بتا کر گئی تھی کہ آج یونیورسٹی میں تھیلیسیمیا کے مرض میں مبتلا بچوں کے لیے کیمپ لگایا ہے اور یونیورسٹی میں پتا ہے ناکہ کتنا چلنا پڑتا ہے۔" اس کا لہجہ سادگی اور نرمی کا امتزاج لیے ہوا تھا۔

"خیر سے یہ تھیلیسیمیا کے بچوں کی خدمت خلق کا خیال میم عائشہ کو کیسے آگیا' روشنی ڈالنا پسند کریں گی؟" ماہم کے طنزیہ انداز پر وہ تھوڑا سا خجل ہوئی۔

"ایسے مشورے لینے کے لیے اسے باہر جانے کی کیا ضرورت ہے۔" ماما کے انداز میں بھی آج ضرورت سے زیادہ کڑواہٹ تھی۔ "خیر سے باپ اور بیٹی کو ایسے دورے وقتاً" فوقتاً" پڑتے ہیں رہتے ہیں۔ بندہ کم از کم اپنا اسٹیٹس تو دیکھتا ہے۔" ماما کو سخت غصہ تھا کہ اس نے ان کے کینیڈا جانے کے بعد چپ چپاتے ایک فلاحی تنظیم جوائن کر لی تھی۔

"کم آن ماما! ہمارے سوشل سرکل میں ساری خواتین کسی نہ کسی این جی او سے وابستہ ہیں اور اس بات کا تذکرہ بھی وہ بڑے فخر سے کرتی ہیں۔" عائشہ کے ہونٹوں پر لگتا تھا جیسے آج مسکراہٹ منجمد ہو گئی ہو۔

"وہ فضول کاموں کے لیے سخت گرمی میں صبح و شام سڑکوں پر مٹر گشت نہیں کرتیں۔ کلب کی میٹنگ میں ہی سارے کام نپٹا لیتی ہیں۔ اللہ جانے یہ ساری دنیا سے نرالی اولاد مجھے ہی کیوں ملی ہے۔" انہوں نے کھا جانے والی نظروں سے عائشہ کو دیکھا جو ریموٹ کنٹرول سے کھیل رہی تھی۔

"پہلے یونیورسٹی میں اس کے یہ ڈرامے ہوتے تھے۔ میں نے سوچا کہ دو چار دن کا بخار ہے' اتر جائے گا' لیکن یہاں تو لگتا ہے کہ بخار خاصا بگڑ چکا ہے۔" ماہم طنز کرنے میں ماہر تھی اور آج اس کا یہ فن عروج پر تھا۔

"پتا نہیں اسے گندے مندے بچوں کو پیار کرتے ہوئے الجھن کیوں نہیں ہوتی پچھلے ہفتے چوکیدار کی نواسی کو خسرہ نکلی اور عائشہ رحیم صاحبہ اسے گود میں

اٹھائے ڈاکٹر صاحب کے پاس لے جارہی تھیں۔ مجھے ٹینشن ہورہی تھی لیکن اسے کوئی پروا ہی نہیں تھی۔" مسز رحیم کو اچانک ہی کچھ دن پہلے کا منظر یاد آیا تو انہوں نے بیٹھے بیٹھے ناگواری سے پہلو بدلا۔

"آنٹی! یہ تو صرف خسرہ کی مریضہ بچی تھی۔ یہ محترمہ تو ایک دن میری گاڑی کے نیچے آنے والی ایک غلیظ سی بلی کو اٹھا کر جانوروں کے اسپتال لے گئی تھیں۔ یقین کریں کہ مجھے تو دیکھ کر ہی وومٹنگ ہورہی تھی اور گھر جاکر میں نے ساری گاڑی واش کروائی۔" ماہم کے لہجے کی تلخی سے عائشہ کو پہلی دفعہ احساس ہوا کہ آج واقعی اس کے ستارے گردش میں تھے۔

"مائی گاڈ۔۔ عائشہ! کیا چیز ہو تم۔" ثمن آپی نے ٹشو پیپر سے ہونٹوں کے کونوں کو نزاکت سے صاف کیا۔ وہ اب تعجب سے اسے مسلسل مسکراتے دیکھ رہی تھیں۔

"مائی گاڈ! ذرا سا لنچ بھول جانے پر آپ لوگ اس طرح سے پرانے کھاتے کھول کر بیٹھ جائیں گے، مجھے اس چیز کا اندازہ ہوتا تو یہ غلطی کبھی نہ کرتی۔" عائشہ کے لہجے میں اب ہلکی سی ناگواری در آئی تھی۔

"بری بات عائشہ! ایسی باتوں کا خیال رکھتے ہیں۔ لڑکیوں کو اتنی لاپروائی سوٹ نہیں کرتی۔" ثمن آپی نے بھی نصیحت کرنے کا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا تھا۔

"ثمن! کیوں بھینس کے آگے بین بجارہی ہو، میں اس سے سخت مایوس ہوچکی ہوں۔" ماما نے ایک سرد اور لاتعلق سی نگاہ عائشہ پر ڈالتے ہوئے زہرخند لہجے میں کہا تھا۔ وہ اب کچن میں جانے کے لیے کھڑی ہوگئیں۔

"ماما! کون سا ایسا گناہ کردیا ہے عائشہ نے، جو آپ اس طرح عدالت سجا کر بیٹھ گئی ہیں۔" بالکل خاموش بیٹھا موحد ایک دم ہی چیخا۔ اس کے ماتھے کی رگیں ابھر گئی تھیں۔ اس کے اس طرح اچانک چیخنے پر کمرے میں سناٹا سا چھا گیا تھا۔

"شکر ادا کیا کریں کہ آپ کی بیٹی میں انسانیت ہے، بے حس نہیں ہے وہ۔" موحد نے قدرے خشونت سے سب کو دیکھتے ہوئے تلخی سے کہا۔ وہ اب ان سب کے بالکل سامنے وہیل چیئر پر بیٹھا تھا۔

"بیٹا! میرا مطلب یہ نہیں تھا۔" ماما بوکھلا کر صوفے پر بیٹھ گئیں۔ مہمانوں کی موجودگی میں موحد کے مشتعل ہونے سے وہ سخت گھبرا گئیں۔

"میں بچہ نہیں ہوں، مجھے سب چیزوں کے مطلب سمجھ میں آتے ہیں۔" اس نے غصے سے ہاتھ میں پکڑا انگلش میگزین گھما کر دیوار پہ دے مارا تو سب ہی بخود رہ گئے۔

"فار گاڈ سیک ماما! اپنی اولاد کی جن چیزوں پر آپ کو فخر کرنا چاہیے، آپ ان پر شرمندہ ہوتی ہیں، کیسی ماں ہیں آپ۔" وہ پتھریلے لہجے میں بیگانگی سے بھرپور آنکھوں سے ان چاروں کو دیکھ رہا تھا جو شدید اعصابی تناؤ کا شکار نظر آرہی تھیں۔ انہوں نے اس سے پہلے موحد کا یہ روپ کب دیکھا تھا بھلا۔

"عائشہ کو اس کی زندگی جینے دیں۔ کیوں اسے مصنوعی باتیں سکھاتی ہیں۔ اسے بے حس ہونے کے سبق دیتی ہیں۔ چہرے پر لیپا پوتی کرنے سے انسانی روح صاف شفاف نہیں ہوجاتی۔ چہرے کی رنگت کو سنوارنے کے بجائے اسے لوگوں کی زندگیوں کو سنوارنے دیں۔ یہ خوب صورتی چار دن کی چاندنی ہے۔ یہ کاغذی پھول جیسے چہرے کسی کو زیادہ دیر تک اچھے نہیں لگتے۔" موحد سب ہی کے کانوں میں پگھلا سیسہ انڈیل رہا تھا۔

"اس دن وہ بیٹ مین کی بہن کی شادی پر گئی اور آپ نے ہنگامہ کھڑا کردیا۔ وہ یتیم خانے کے بچوں کو پڑھانے کے لیے جانے لگی تو آپ کو وہ بھی ناگوار گزرا۔ سارا سارا دن وہ کسی بیوٹی سیلون میں ہزاروں روپے برباد کردے، یہ آپ کو منظور ہے مگر وہ پیسے کسی غریب کے کام آجائیں یہ بات آپ کو پسند نہیں۔" موحد کے اس غیر معمولی انداز نے عائشہ کو بھی حیرت میں ڈال دیا۔ وہ نہ جانے کہاں کا غصہ کہاں نکال رہا تھا۔

"بیٹا لالی' چوکیدار اور ملازموں کی مدد کرنے سے میں نے کبھی نہیں روکا' لیکن اس طرح ان کے گھروں میں جاکر ان کے بچوں کو پڑھانا ہمارا اسٹیٹس نہیں۔" ماما نے بوکھلا کر وضاحت دینے کی کوشش کی' جو ان کے گلے ہی پڑ گئی۔

"یہ اسٹیٹس' وسٹیٹس کی بات کم از کم میرے سامنے نہ کیا کریں۔ کیا ہے آپ کا اسٹیٹس۔۔۔ ذرا آج بتا ہی دیں۔" اس نے ایک دم بھڑک کر انگلی کے اشارے سے پوچھا۔ "یہ روپے پیسے کی چمک دمک سے بنا اسٹیٹس جس کی ہر چیز سے مصنوعی پن ٹپکتا ہے۔ جہاں انسان کے وزن کا اندازہ اس کی مالی حیثیت اور پوزیشن سے لگایا جاتا ہے تو آپ بھی آج اپنی یہ غلط فہمی دور کرلیں۔ اگر آپ کے گلے میں لیفٹیننٹ جنرل عبدالرحیم کی مسز ہونے کا ٹیگ نہ ہو تو کوئی آپ پر بھی ایک نظر ڈالنا پسند نہ کرے۔" ماما کو اس کی بات پر دھچکا سا لگا تھا۔

"اس اسٹیٹس میں آپ کی اپنی ذاتی حیثیت کہاں ہے۔ کبھی سوچا ہے آپ نے؟" اس کی آنکھوں سے شرارے پھوٹ رہے تھے۔

"کم آن بھائی! کیا ہو گیا ہے۔ دفع کریں ان باتوں کو۔" عائشہ بوکھلا کر کھڑی ہوئی۔ "ماما ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ میری غلطی تھی مجھے بھول گیا تھا کہ لنچ پر جانا ہے' اس لیے ماما خفا ہو رہی تھیں۔" عائشہ نے فوراً" اٹھ کر اس کے کندھوں کو ہلکا سا دبا کر اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی تھی جو کچھ کامیاب رہی تھی۔ اس لیے وہ دوبارہ بولا تو لہجے میں قدرے نرمی تھی۔

"تمہیں تو ذرا سا لنچ بھولا ہے' جبکہ لوگ تو دوسروں کی زندگیوں کے ساتھ کھیل کر سب کچھ بھول جاتے ہیں۔" موحد کا چہرہ شدید نوعیت کی اعصابی شکست د یخت کا غماز نظر آرہا تھا۔ اس کی بات پر ماہم نے بے چینی سے پہلو بدلا تھا۔

"ماما کو خود خیال کرنا چاہیے' کیوں ہر تیسرے دن یوں عدالت کا کٹہرا سجا کر بیٹھ جاتی ہیں۔ لوگوں کے سامنے اپنے دکھڑے روتی ہیں۔ عائشہ ایسی کیوں ہے؟ موحد ویسا کیوں ہے؟ خدارا! معاف کردیں ہمیں یہ" اس نے باقاعدہ ہاتھ جوڑ کر تلخی سے کہا تھا۔ اس کے متنفر انداز پر ماما کی آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں۔

"کیا ہو گیا ہے موحد! کیوں اتنے تلخ ہو رہے ہو۔ آنٹی تو شروع ہی سے تم لوگوں کی ایسے ہی کیئر کرتی ہیں۔" ثمن آپی نے محتاط انداز میں کہتے ہوئے اس کی سرخ آنکھوں سے نظریں چرائی۔ ان کی بات پر ایک زہریلی سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر ٹھہر گئی' لیکن وہ خاموش رہا۔

"موحد پلیز! یہ آنٹی کو اذیت دینا بند کرو۔ وہ کوئی ایسی غلط بات بھی نہیں کررہی ہیں' تم خوامخواہ جذباتیت کا شکار ہو رہے ہو۔" ماہم نے ناگواری سے اسے ٹوکا جو اس کی بات پر دل جلانے والے انداز سے ہنس رہا تھا۔

"تمہیں تو ماما کی ساری باتیں ہی ٹھیک لگیں گی' کیونکہ وہ کچھ باتوں میں بالکل تمہاری طرح سنگ دل ہیں۔" موحد کی بات پر ماہم کا چہرہ سرخ ہوا۔ "جہاں تک جذباتی ہونے کی بات ہے تو دنیا ہم جیسے جذباتی لوگوں کی وجہ سے ہی چل رہی ہے' جنہوں نے انسانیت کے جذبے کو بچا رکھا ہے' ورنہ بے حسی کی ردا اوڑھ لینا کون سا مشکل کام ہے۔ ہر دکھ' ہر تکلیف سے آزاد ہو جاؤ۔" اپنی بات مکمل کرکے وہ جاچکا تھا لیکن اس کی باتوں کی تلخی کا دھواں اے سی کی ٹھنڈک کے ساتھ پورے کمرے میں پھیل چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

"ڈاکٹر خاور! آپ کو پتا ہے کہ زندگی سب سے زیادہ بری کب لگتی ہے۔" ڈاکٹر زویا نے اسپتال کی لمبی شاہراہ پر پیدل چلتے ہوئے ایک دم رک کر کہا۔

دونوں اطراف سے درختوں میں گھری یہ سڑک بہت خوب صورت تاثر چھوڑتی تھی اور آج تو موسم ویسے ہی غضب کا تھا۔ وہ دونوں فارغ تھے۔ اس لیے لمبی واک کرتے ہوئے رہائشی علاقے کی طرف نکل آئے تھے۔

"نہیں زویا! مجھے ایسا کوئی تجربہ نہیں۔" وہ بھی چلتے

چلتے رکے اور انہوں نے شرارت سے ایک درخت کی ٹہنی کو ہلکا سا ہلایا تو بہت سے سفید پھول ڈاکٹر زویا کے اوپر آن گرے۔ انہوں نے چونک کر اپنے سے کچھ فاصلے پر مردانہ وجاہت سے مالا مال شخص کو دیکھا جن کو دیکھتے ہی اس کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو جاتی تھیں۔

"ڈاکٹر خاور! زندگی سب سے زیادہ بری اس وقت لگتی ہے' جب آپ کا کوئی بہت پیارا دوست آپ سے روٹھ جائے۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے سامنے کھڑی دلکش سی زویا کو دیکھا' جو گلابی لان کے سوٹ میں بہار کا ہی کوئی خوب صورت رنگ لگ رہی تھی۔

"آپ میری اس دن والی بات کے پس منظر کی وجہ سے کہہ رہی ہیں تو میں وضاحت کردوں کہ میں آپ سے خفا نہیں تھا۔ بس ہلکا سا گلہ تھا۔" انہوں نے صاف گوئی سے کہا۔ وہ دونوں پھر چلنے لگے تھے۔

"آپ کی اور میری دوستی کوئی آج کی نہیں ہے۔" وہ چلتے چلتے رکیں۔ "ہم نے اپنی ساری میڈیکل لائف اکٹھے گزاری ہے۔ میری زندگی میں یہ پہلا موقع تھا جو آپ اس طرح مجھ سے ناراض ہوئے۔ یقین کریں میں پوری دو راتیں سلیپنگ پلز لینے کے باوجود نہیں سو سکی۔" ڈاکٹر زویا کی آنکھوں میں ایک خاموش سا شکوہ تھا۔

"آئی ایم سوری زویا! میرا مقصد آپ کو تکلیف دینا نہیں تھا۔" وہ دونوں بازو سینے پر باندھے اب اپنی سحر انگیز آنکھوں کو ان پر ٹکائے کھڑے تھے۔ ڈاکٹر زویا کے دماغ سے سارے لفظ بھک کرکے اڑ گئے۔

"آپ کو پتا ہے نا مجھے اپنے پروفیشن سے محبت نہیں' عشق ہے اور میں اس چیز پر کوئی سمجھوتا نہیں کرتا۔ مجھے لگا کہ آپ مجھے غلط سمجھ رہی ہیں' بس اسی وجہ سے میں تھوڑا تلخ ہو گیا تھا۔" ڈاکٹر خاور نے سیاہ تارکول کی سڑک پر پھیلے سفید پھولوں کو دلچسپی سے دیکھتے ہوئے وضاحت دی۔

"میں بھلا آپ کو کیوں غلط سمجھوں گی۔" وہ اپنی بڑی بڑی سنہری آنکھیں پھیلائے سخت حیرت سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔ "آپ کا اور میرا ساتھ کوئی آج کا نہیں' ساتھ آٹھ سالوں پر محیط ہے اور آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں نے آپ کی وجہ سے پاکستان آنے کا ارادہ کیا اور اس کی وجہ سے ماما' پاپا ابھی تک مجھ سے ناراض ہیں۔" ڈاکٹر زویا کے لہجے میں ہلکی سی افسردگی در آئی۔

"حالانکہ ان کو معلوم ہے کہ ایسے بے وقوفانہ فیصلے آپ ہمیشہ سے کرتی آئی ہیں۔" ڈاکٹر خاور کا شریر انداز انہیں اچھا لگا تھا۔

"ہاں' صرف آپ کے لیے۔" ڈاکٹر زویا کی گھنی پلکوں میں ایک ارتعاش سا برپا ہوا۔ ان کے چہرے پر اس لمحے اتنے رنگ تھے کہ ڈاکٹر خاور نے بمشکل اپنی نظریں ان پر سے ہٹائیں۔ وہ اب ایک درخت کی کھوہ میں دبکے گلہری کو دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے ڈاکٹر زویا کی اس بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

"آپ بہت ظالم انسان ہیں ڈاکٹر خاور! کیا آپ کی زندگی میں محبت نام کی کسی چیز کی کوئی گنجائش نہیں۔" ان کی خاموشی سے اکتا کر انہوں نے رنجیدگی سے کہا تو وہ متانت بھرے انداز سے مسکرا دیے۔

"میں ظالم انسان نہیں ہوں زویا! تھوڑا سا مختلف ہوں۔" وہ اب گہری نظروں سے اپنے سامنے کھڑی جھنجلائی سی زویا کو دیکھ رہے تھے۔ جن کے دل کے نہاں خانوں میں چھپے جذبوں نے ان کے رخساروں میں گلابیاں بھر دی تھیں۔

"میری زندگی میں محبت کے علاوہ کسی اور چیز کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ میں اس سے بھی آگے پر یقین رکھتا ہوں اور عشق بھی جو کسی ارفع مقصد سے ہو۔ جو انسان کی مردہ رگوں میں زندگی کا گرم لہو دوڑا دے۔" وہ گل لالہ کے پھولوں کی کیاری کے پاس رکے بڑی سنجیدگی سے کہہ رہے تھے' لیکن ان کا انداز ٹالنے والا تھا۔

"ہاں وہ ہی عشق جو آپ کو صرف اور صرف اپنے پروفیشن سے ہے۔" ڈاکٹر زویا کے جل کر بولنے پر وہ بے ساختہ ہنس پڑے۔

"ہاں کہہ سکتی ہیں آپ؟" وہ شرارتی نظروں سے زویا کا جھنجلایا ہوا سرخ چہرہ دیکھ رہے تھے۔

"ٹھیک کہا آپ نے۔

کیوں سنے عرض مضطرب مومن
صنم آخر خدا نہیں ہوتا۔"

وہ زویا کی برجستگی پر کافی محظوظ ہوئے۔ دونوں چلتے چلتے کافی دور نکل آئے تھے۔ ان دونوں کے درمیان خاموشی چپکے سے آکر ساتھ چلنے لگی تھی۔

"ایک بات تو بتائیں خاور۔۔۔" وہ کسی غیر مرئی نقطے کو گھورتے ہوئے بولیں۔ وہ چونک سے گئے۔ "آپ کو اپنی پیشنٹ سکینہ کیا بہت عزیز ہے۔" ان کے تھکے تھکے لہجے پر خاور نے بغور انہیں دیکھا۔

"مجھے سکینہ ہی نہیں، اپنا ہر مریض بہت عزیز ہے۔" انہوں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا تھا۔ "میں اللہ سے بس ایک ہی دعا مانگتا ہوں کہ جو بھی شخص میرے پاس آئے۔ اللہ اس پر کرم کرکے اسے میرے ہاتھوں شفا دے۔ میں اپنی مسیحائی انسانیت کے لیے وقف کرچکا ہوں۔" ڈاکٹر خاور کے لفظوں میں چھپی سچائی اور خلوص ڈاکٹر زویا کے لیے نیا نہیں تھا۔ لیکن آج وہ ان کی باتوں پر کوفت کا شکار ہو رہی تھیں

"سکینہ بہت پیاری لڑکی ہے۔ اللہ سے محبت نے اس لڑکی کی شخصیت میں خاص رنگ بھر دیے ہیں۔ اسے اللہ نے بہت خوب صورت آواز سے نوازا ہے۔ آپ کبھی اس سے حمد یا نعت سن کر دیکھیے گا۔"

"وہ کہاں سے پیاری ہے ڈاکٹر خاور!" نہ چاہتے ہوئے بھی زویا کے منہ سے پھسل گیا۔

"اگر آپ کے نزدیک حسن کا پیمانہ صرف ظاہری اور جسمانی خدوخال ہے تو پھر واقعی وہ خوب صورت نہیں، لیکن اگر آپ دل اور نیت کی سچائی کو دیکھیں اور اس کی مثبت اپروچ کے ساتھ زندگی کے بارے میں رویہ دیکھیں تو وہ اس لحاظ سے بہت خاص ہے۔" ڈاکٹر خاور نے بھی آج شاید ان کو جلانے کی قسم کھا رکھی تھی۔ "وہ ٹی وی کے ایک نعتیہ مقابلے میں شرکت کرے گی، آپ بھی چلیے گا۔" ڈاکٹر خاور کی آفر پر وہ تھوڑا سا چونکیں۔

"آپ اسے کن کاموں میں لگا رہے ہیں ڈاکٹر صاحب!" زویا کے چہرے پر ایک طنزیہ مسکراہٹ پھیلی۔

"اصل میں زویا! وہ جس مرض میں مبتلا ہے اس کا علاج بہت طویل اور صبر آزما ہے۔ ایسے مریض اکثر اپنی ساری زندگی ایسے ہی گزار دیتے ہیں۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ وہ خود کو کسی مثبت مشغلے میں مصروف رکھے۔" وہ حد درجہ سنجیدگی سے کہہ کر وارڈ کی طرف چلنا شروع ہوگئے۔

"خاور! جہاں تک میرا محدود علم ہے تو ایسے مریضوں میں ری کوری کے چانسز بہت کم ہوتے ہیں اور سو میں سے دو، تین مریض ہی صحت یاب ہوتے ہیں، پھر آپ کیوں ان کو خوانخواہ امید دلا رہے ہیں؟" ان کا عجیب سا انداز ان کو برا تو لگا تھا، لیکن وہ تحمل بھرے انداز سے گویا ہوئے۔

"کیا کوئی مسیحا اپنے مریض کو مایوسی اور ناامیدی کی بھٹی میں دھکیل سکتا ہے؟" انہوں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"انسان کو پریکٹیکل ہونا چاہیے۔" زویا کا یہ لاتعلق سا انداز انہوں نے پہلی دفعہ دیکھا تھا، اس لیے انہیں رنج سا ہوا۔

"مائی ڈیر زویا! کسی دوسرے کے لیے پریکٹیکل ہونے کا مشورہ دینا دنیا کا سب سے آسان کام ہے۔ آپ ایک ڈاکٹر ہیں۔ خدانخواستہ یہی مرض آپ کے کسی اپنے کو ہوتا تو کیا آپ اسے صاف صاف کہہ سکتی ہیں کہ اسی تکلیف کے ساتھ اس وقت تک زندگی گزارو جب تک عمر کے خیمے اکھڑ نہیں جاتے۔" ڈاکٹر خاور کے لہجے میں تلخی آگئی۔

"ہم انسان کون ہوتے ہیں کسی کو یہ فتویٰ دینے والے کہ اس کے مرض کا دنیا میں کوئی علاج نہیں، جبکہ ہمارا دین کہتا ہے کہ موت برحق ہے مگر دنیا میں ہر بیماری کا علاج موجود ہے۔" انہوں نے سنجیدگی سے ڈاکٹر زویا کا خفت زدہ چہرہ دیکھا۔

ڈاکٹر خاور کی باتوں سے انہیں بالکل چپ لگ گئی تھی۔ وہ اب خاموشی سے لمبی سڑک پر چلنے لگے جس کا اختتام دور دور تک نظر نہیں آرہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"واٹس امیزنگ۔۔۔ سو بیوٹی فل۔۔۔" کوئی اس کے بالکل پیچھے کھڑا توصیفی انداز میں بولا تو وہ چونک گئی۔ اپنی پینٹنگ کو آخری ٹچ دیتے ہوئے اس نے بے ساختہ مڑ کر اپنے بالکل پیچھے تھوڑے سے فاصلے پر سفید ٹریک سوٹ میں ملبوس شخص کو دیکھا۔ جس کی ستائشی نظریں اس کے کینوس پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ اپنے کام میں اتنی محو تھی کہ اسے احساس تک نہیں ہوسکا کہ وہ کسی کی گہری نظروں کے حصار میں ہے۔

"تھینکس۔۔۔" عائشہ نے اس اجنبی شخص کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنا برش صاف کیا۔ وہ اس وقت فاطمہ پارک میں صبح سویرے کی دلکشی اور خوب صورتی سے محظوظ ہوتے ہوئے اپنے کام میں مصروف تھی۔

"میں پچھلے دو دن سے آپ کی اس پینٹنگ کو فالو کر رہا تھا۔ مجھے بہت تجسس تھا کہ اسے مکمل ہوتا ہوا دیکھوں۔" وہ اب اپنے ٹراوزر کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے بڑی بے تکلفی سے کہہ رہا تھا۔ اس کی بات پر عائشہ کو جھٹکا سا لگا۔ کیونکہ پارک میں بے شمار جوگنگ کرنے والے افراد کی وجہ سے اسے بالکل اندازہ نہیں ہوسکا تھا۔

"آپ نے زمین پر گرے زخمی گھوڑے کو جس ہمت اور عزم سے دوبارہ اٹھتے ہوئے دکھایا ہے۔ قابل رشک ہے۔ گرنے کی تکلیف اپنی جگہ، لیکن اس کے اندر دوبارہ اٹھنے کا عزم جو اس کی آنکھوں سے جھلک رہا ہے، اس نے اس پینٹنگ کو آؤٹ اسٹینڈنگ کردیا ہے۔" وہ بڑے بے تکلف اور بے لاگ انداز سے اس تصویر کا بالکل ٹھیک تجزیہ کر رہا تھا۔ عائشہ سخت حیران ہوئی۔

"کیا اتنے برے طریقے سے زندگی کی دوڑ میں گرنے والا بندہ اسی توانائی کے ساتھ دوبارہ کھڑا ہوسکتا ہے؟" وہ انتہائی سنجیدگی کے ساتھ پوچھ رہا تھا۔

"کیا آپ کو انسانی عزم و ہمت پر کوئی شک و شبہ ہے، کیا آپ کو پتا نہیں کہ انسان اللہ کی انتہائی حیران کن تخلیق ہے؟" عائشہ نے اب تفصیل سے اپنے سامنے کھڑے دراز قد انسان کو دیکھا۔ وہ اپنی مقناطیسی کشش کی حامل بادامی آنکھیں سامنے کینوس پر ٹکائے کھڑا تھا۔ کھڑی مغرور ناک، کشادہ پیشانی اور بے نیازی نے اس کی شخصیت کو ایک متاثر کن وقار بخش دیا تھا۔

"مجھے انسانی عزم پر شبہ نہیں، لیکن انسان تقدیر اور تدبیر کی بھول بھلیوں میں الجھ گیا ہے۔ وہ ہر چیز کو قسمت کے کھاتے میں ڈال کر ہاتھ جھاڑ کر بڑی فرصت سے اللہ سے شکوے کرنے لگتا ہے۔" اس شخص نے پیپل کے درخت کے پاس گرے چڑیا کے گھونسلے کو دیکھا۔

"ہاں انسان اس معاملے میں بہت ناشکرا ہے۔ جو چیز اس کے اختیار میں ہو، بعض دفعہ اپنی ازلی سستی اور کاہلی کی وجہ سے وہ بھی نہیں کرتا۔" وہ اس کی بات سے متفق ہوتے ہوئے اسے تعجب سے دیکھ رہی تھی۔ جس نے باتیں کرتے کرتے گھونسلے کو اٹھا کر ایک مضبوط تنے پر رکھ دیا تھا۔

"کیا آپ یہ پینٹنگ مجھے فروخت کرسکتی ہیں؟" وہ ایک دم مڑا اور انتہائی پُراعتماد انداز سے عائشہ کو مخاطب کیا، جو اس کی بات پر اپنے بیگ سے سیل فون نکالنا بھول گئی تھی۔

"آئی ایم سوری! میں یہ سیل نہیں کرسکتی۔" عائشہ نے سامنے کھڑے شخص کی سحر انگیز نگاہوں میں ایک لمحے کو جھانکا اور گڑبڑا سی گئی۔ اس شخص کی وجاہت میں عجیب سی بے نیازی تھی۔

"اٹس اوکے۔" اس نے کندھے اچکائے۔ "لیکن کیا آپ ایسی ہی پینٹنگ مجھے بنا کردے سکتی ہیں؟" اس کی فرمائش پر عائشہ نے جھنجلا کر اسے دیکھا، جس کے ساتھ یہ پہلی ملاقات تھی اور وہ "مان نہ مان، میں تیرا مہمان" کی تصویر بنا جم کے کھڑا تھا۔

"سوری! ایسا بھی ممکن نہیں۔ اس سے ملتی جلتی پینٹنگ بن تو سکتی ہے، لیکن ضروری نہیں کہ اس کے اسٹروک بھی اتنے ہی جان دار ہوں۔" عائشہ نے صاف گوئی سے کہتے ہوئے ڈرائیور کا نمبر ملایا جو پارکنگ میں گاڑی لیے اس کا منتظر تھا۔

"ہوں۔۔۔" وہ تھوڑا سا مایوس ہوا۔ "تو کیا یہ آپ نے کسی ایگزیبیشن کے لیے بنائی ہے۔" اس نے کسی خیال کے زیر اثر پوچھا۔

"نہیں! یہ پینٹنگ مجھے اپنے بھائی کو تحفے میں دینی ہے۔" اس نے بغیر کسی لگی لپٹی کے صاف گوئی سے کہا تھا۔

"اوہ۔۔۔ اٹس آل رائٹ۔" اس نے کندھے اچکائے۔ "مجھے معلوم نہیں تھا، سوری۔" وہ اپنی بے اختیاری پر کچھ خفت زدہ ہوا۔

"ویسے اس مہینے کی اٹھائیس تاریخ کو آرٹ گیلری میں ایگزیبیشن ہے میری، آپ وہاں وزٹ کرلیں، ہو سکتا ہے کہ آپ کو کوئی اور اچھی چیز مل جائے۔" عائشہ نے اس کے چہرے پر پھیلی مایوسی دیکھی نہیں گئی تو اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی اسے دعوت دے دی۔

"ییس شیور، وائے ناٹ۔" وہ ابھی بھی ٹراؤزر کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے سامنے کینوس کو توصیفی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

"کیا آپ کسی کی فرمائش پر کسی آئیڈیا کو رنگوں کی زبان میں بیان کرسکتی ہیں۔" اس اجنبی نے بھی شاید آج عائشہ کو جی بھر کر حیران کرنے کا تہیہ کر رکھا تھا۔

"کسی کے خیال کو کینوس پر منتقل کرنا آسان کام نہیں، اس طرح ضروری نہیں کہ آپ کو ویسا ہی کام ملے جیسا آپ کے ذہن میں ہو۔" عائشہ کو اب اس سے گفتگو میں لطف آنے لگا تھا۔

"مجھے ایسی پینٹنگ چاہیے جس کے ہر اسٹروک سے عزم، ہمت اور حوصلے کے رنگ نمایاں ہوں، تصویر چاہے کوئی بھی ہو۔" اس کی بے ریا آنکھیں عائشہ کے چہرے پر ٹکی ہوئی تھیں۔

"ہوں۔۔۔ میں کوشش کروں گی۔" وہ فوراً ہی رضامند ہوگئی۔ یہ اس کے لیے مشکل ٹارگٹ نہ تھا۔ اور یہ بات ہے کہ اس کے بعد وہ کئی گھنٹوں تک اس بات پر پریشان ہوتی رہی کہ اس نے ہامی کیوں بھرلی۔

"جزاک اللہ!" اس نے گردن کو ہلکا سا خم دے کر اس کا شکریہ ادا کیا اور پھر اپنا نام پتا بتائے بغیر ٹریک کی طرف دوڑنے لگا۔

"یار! بہت عجیب شخص تھا وہ، مجھے تو حیران کرگیا۔" اسی شام کو وہ ماہم کو سارے دن کی روداد سناتے سناتے یہ قصہ بھی سنا بیٹھی۔

"پرسنالٹی کیسی تھی؟" ماہم نے اپنے مطلب کی بات سب سے پہلے پوچھی۔

"کیا لو کا مجسمہ۔" عائشہ کی زبان پھسلی تو ماہم کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"تھینک گاڈ! خوب صورت چیز کو سراہنے والی حس تم میں بھی موجود ہے۔"

"بائے گاڈ! میں نے اسے غور سے نہیں دیکھا، بس اس کو ذہن میں لاتے ہی جو پہلا نام ذہن میں ابھرا تمہیں بتا دیا۔" اسے ماہم کی معنی خیز نظروں سے الجھن ہو رہی تھی۔

"ہوں، تب ہی میں کہوں کہ محترمہ بھاگ بھاگ کر پارکوں میں ہی اپنا کام کرنے کیوں جاتی ہیں اور وہ بھی منہ اندھیرے۔" ماہم کو اس کا گھبرایا ہوا چہرہ لطف دے رہا تھا۔

"کچھ خدا کا خوف کرو ماہم! تمہیں پتا ہے میرا تو ہمیشہ سے یہ معمول رہا ہے کہ میں اکثر صبح سویرے ہی کسی پارک میں اپنے کام نپٹاتی ہوں۔" عائشہ نے جھنجلا کر اسے صفائی دی، جو شوخی سے آنکھیں گھما گھما کر اسے بغور دیکھ رہی تھی۔

"مگر مجھے تو آج پتا چلا ہے کہ صبح سویرے ایسے ہینڈسم لوگ بھی جوگنگ کے لیے آتے ہیں جن کو دیکھ کر سارا دن فریش گزرتا ہے۔" وہ شرارت سے مسکرائی۔

"تمہیں بھی فریش ہونے کا شوق ہو تو صبح تمہیں بھی پک کرلوں گی۔" عائشہ جل کر بولی، اسے علم تھا کہ صبح جلدی اٹھنے سے اس کی جان جاتی تھی۔

"توبہ کرو یار! کون صبح سویرے اٹھے، میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔" ماہم نے فوراً "کانوں کو ہاتھ لگائے۔

☼ ☼ ☼

"اماں! یہ تیرا جاجی یہاں سے کب جائے گا۔" سکینہ نے ہاتھ میں پکڑا ڈائجسٹ میز پر پٹختے ہوئے آج اماں سے صاف صاف بات کرنے کی ٹھانی۔

"کیوں تجھے کیا کہتا ہے وہ، جو اتنی اوکھی ہو رہی ہے۔" جمیلہ مائی نے کچھ دنوں سے اس سے عجیب سی بے رخی اختیار کرلی تھی۔ اس کی یہ لاتعلقی سکینہ کو اور زیادہ بدگمان کر رہی تھی۔

"جب وہ ابے کے ساتھ واپس جا رہا تھا تو کیا ضرورت تھی اس کو یہاں روکنے کی۔" سکینہ کے اماں سے گلے بڑھتے ہی جا رہے تھے۔

"تجھے ضرورت نہ ہو، لیکن مجھے تو تھی۔ پرائے دیس میں کسی مرد ذات کا ہونا بہت ضروری ہوتا ہے۔" اماں نے اپنا فریم اٹھاتے ہوئے دلیل دی۔ اس کی اس دلیل پر ایک استہزائیہ سی مسکراہٹ سکینہ کے چہرے پر ٹھہر گئی تھی۔

"واہ اماں! مرد ذات کی کمی کا تجھے بڑی جلدی احساس ہوگیا۔ پچھلے سات، آٹھ سالوں میں تو تجھے کبھی یہ خیال نہیں آیا تھا۔" سکینہ نے بدلحاظی سے کہا۔

"ہاں تو یہ کون سی انوکھی گل اے، اب خیال آگیا اے تو تجھے کیا مسئلہ ہے۔" جمیلہ مائی کی تیوری کے بل گہرے ہوئے۔

"مجھے مسئلہ ہے تو رولا ڈال رہی ہوں نا۔" اس کے ذہن و دل سخت کھولن کی زد میں تھے۔ "ایسے ہی آتے جاتے فری ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ کبھی رسالے، کتابیں اٹھا لاتا ہے۔ کبھی سیانا بن کے ڈاکٹروں سے میرے علاج کا پوچھنے لگتا ہے۔ سخت زہر لگتا ہے مجھے۔" جمیلہ مائی نے تاسف بھرے انداز سے سر ہلایا۔

"پتر بوہتا اوپر نہیں ویکھدے، کدی کدی آسماناں نوں بوہتا ویکھن نال بندے دی گردن اکڑ جاندی اے۔ لہٰذا کجھ وی نئیں، بندا مفت دی تکلیف وچ پے جاندا اے۔" جمیلہ مائی نے بمشکل خود کو مشتعل ہونے سے روکا تھا۔

"تجھے کیا ہے۔ میری گردن ٹوٹے گی نا، تو ٹوٹنے دے۔" وہ سخت بدظن تھی۔ جمیلہ مائی کے دل کو دھچکا لگا تھا۔ انہوں نے خاموشی سے اٹھ کر کھڑکی کا پردہ ہٹایا۔ سامنے ہی آسمان گہرے سیاہ بادلوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ اسلام آباد کا موسم بھی ان کی بیٹی کے مزاج کی طرح دھوپ چھاؤں جیسا تھا۔

انہوں نے اس کی بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ سکینہ نے کتاب اٹھالی۔ اس کی نظریں کتاب کے صفحات پر جب کہ ذہن میں مختلف سوچوں نے اودھم سا مچا رکھا تھا۔

باہر بادل ایک دم زور سے گرجے۔ سکینہ نے کتاب سے نظریں ہٹا کر باہر لان میں دیکھا۔ سامنے درخت کے نیچے رکھے بینچ پر بیٹھا اعجاز اپنے سیل فون پر اللہ جانے کس سے باتوں میں مگن تھا۔ وہ پچھلے تین دن سے ان دونوں کا سایہ بنا ہوا تھا۔ ہر گھنٹے دو گھنٹے بعد وہ کمرے میں جھانک کر جمیلہ مائی سے پوچھتا تھا کہ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔ اس کی آمد پر سکینہ کے چہرے پر پھیلنے والی بے زاری جمیلہ مائی کو بہت دکھی کرتی تھی۔ کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ سکینہ کے دل کی سلیٹ سے ڈاکٹر خاور کا نام ایک لمحے میں مٹا دیں۔

آسمان سے گرنے والی بوندیں بڑی قوت سے زمین کی گود میں گر رہی تھیں۔ بوندوں کے تسلسل میں روانی تھی۔ نم ہوا سکینہ کے چہرے سے ٹکرا کر اسے طمانیت کا احساس بخش رہی تھی۔ موسم کی خوشگواری نے اس کے مزاج پر اچھا اثر چھوڑا تھا۔ اس نے کن اکھیوں سے سوئی میں دھاگا ڈالتی اماں کو دیکھا جن کے چہرے کی نرمی میں ایک محسوس کی جانے والی سنجیدگی چھلک رہی تھی۔ اسے اماں سے کچھ دیر پہلے کی جانے والی بدتمیزی پر ندامت سی ہوئی۔

"ماں! ناراض ہے مجھ سے؟" اس کی خفت زدہ آواز پر جمیلہ مائی نے سر اٹھایا۔ کمرے میں اندھیرا بڑھنے سے سوئی میں دھاگا ڈالنے میں دقت ہو رہی تھی۔

"ناراض ہو کے مجھ نمانی نے کہاں جانا ہے۔ ہماری تو مجبوری ہے پتر' اکوں اک اولاد ہے۔ جب اللہ سے اتنی فرمائشیں کر کے لی ہے تو منتوں مرادوں والی اولاد کے نخرے بھی ہمیں ہی سہنے ہیں نا۔" جمیلہ مائی کا لہجہ افسردگی میں ڈوبا ہوا تھا۔

"اماں تو میری باتوں پر ناراض نہ ہوا کر۔ میں ٹھہری پاگل۔ تو تو میری سیانی اماں ہے نا۔" کہتے کہتے اس کے لہجے میں ایک دم دکھ اتر آیا۔

"پتر! اولاد بھی اللہ کی طرف سے ایک امتحان ہی ہوتی ہے۔ سارے سیانے پن کے سبق اس کی محبت میں دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ تجھے صرف اس لیے سمجھاتی ہوں کیونکہ تیری اداسی میرا دل چیرتی ہے اور میں سوہنے رب سے تیرے لیے پتا نہیں کیا کیا مانگنے لگتی ہوں۔ اللہ جانے وہ تیرے لیے بہتر بھی ہے کہ نہیں ہے۔" جمیلہ مائی نے ایک دفعہ پھر سوئی میں دھاگا ڈالنے کی کوشش کی۔

"ادھر لا اماں! میں ڈال دوں دھاگا۔ تو خوا مخواہ اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہی ہے۔" سکینہ نے اماں کو چھیڑا۔

"یہ ہی چیز میں بھی تجھے سمجھاتی ہوں کہ پرائے اندھیرے میں ہاتھ پیر مارنے سے کچھ نہیں ملتا۔ اپنی چھوٹی موٹی روشنی میں گزارا کرنا سیکھ لے۔" اماں کی گہری بات پر وہ ایک لمحے کو ساکت رہ گئی۔ اچانک اس کی نظر کھڑکی سے باہر لان کے پاس پارکنگ میں پڑی۔ ڈاکٹر خاور نے بارش کی تیز بوچھاڑ سے بچنے کے لیے چھاتا کھولا تھا۔ ان کے ساتھ ہنستی ہوئی ڈاکٹر زویا کو دیکھ کر سکینہ کو سخت دھچکا لگا تھا۔

ڈاکٹر خاور نے چلتے چلتے جھک کر ڈاکٹر زویا سے کچھ کہا تھا وہ کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ سرخ رنگ کے اسٹائلش سے سوٹ میں ان کا سراپا ایک خوب صورت سانچے میں ڈھلا لگ رہا تھا۔ وہ بالکل نازک سی گڑیا کی طرح تھیں۔ سکینہ نے [illegible] ہوئے بھی اس سخت ناپسندیدہ منظر پر آنکھیں [illegible] تھیں۔ اس کے دل پر آرے چل رہے تھے۔ [illegible] میں رقابت کا جذبہ انسان کو کتنا اذیت دیتا ہے [illegible] اذیت کے کڑے مرحلے سے آج کل بار بار گزر رہی تھی۔

باہر کے منظر کو دیکھتے ہوئے سکینہ کے چہرے [illegible] کرب کے سائے اتنے گہرے تھے کہ جمیلہ مائی وا[illegible] اعصاب پر کوئی ہتھوڑا سا گرتا ہوا محسوس ہوا تھا۔

"ماں! بارش کتنی بری ہوتی ہے نا؟" سکینہ [illegible] آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز اتنی [illegible] تھی کہ جمیلہ مائی بمشکل سن سکیں۔

"پتر! اکھیاں بند کرن نال سچائی دا سورج [illegible] نہیں۔ دل تے پیر رکھنا سیکھ لے دھی رانی! جندو[illegible] آسان ہو جاوے گی۔" جمیلہ مائی کا ناصحانہ انداز [illegible] اور مضطرب کر گیا تھا۔ انہوں نے اٹھ کر فوراً کھڑ[کی] بند کر دی۔ ان کے بس میں ہوتا تو بیٹی کے دل کا دروا[زہ] بھی ایسے ہی بند کر دیتیں۔

☼ ☼ ☼

بھوربن مری کے آسمانوں پر آج صبح سے کالے [illegible] بادل اٹکھیلیاں کرتے پھر رہے تھے۔ مئی کا مہینہ تھا۔ موسم کی حدت میں بہت تیزی سے اضافہ ہوا تھا۔ مسز رحیم پچھلے تین دن سے اپنی ساری فیملی کے ساتھ آرمی گیسٹ ہاؤس میں مقیم تھیں۔ چنار گولف کلب میں عائشہ اور عبدالرحیم آ کر ہمیشہ انجوائے کرتے تھے۔ اس وقت وہ سفید ٹراؤزر پر پنک شرٹ پہنے لائم جوس کے ہلکے ہلکے گھونٹ لیتی ماما کے ساتھ مینس کے برآمدے میں رکھے کین کے صوفے پر براجمان تھی۔ اس کی نظریں سامنے لش گرین لان پر جمی ہوئی تھیں جہاں بابا اپنے دوست کے ساتھ ایک دفعہ پھر گولف کھیلنے میں مگن تھے۔ سامنے گول گیند نما کرسیوں کے پاس موحد اپنی وہیل چیئر پر اپنی سوچوں میں گم تھا۔

"ماما! کیا ہوا۔ پچھلے تین دن سے آپ سخت رنجیدہ نظر آ رہی ہیں۔" عائشہ نے مسز رحیم کو مخاطب کیا جو خاصی افسردہ تھیں۔ بھوربن کے خوشگوار موسم نے بھی ان کے مزاج پر کوئی اثر نہیں ڈالا تھا۔

"عائشہ! میں موحد کی طرف سے سخت خوف زدہ ہو گئی ہوں۔ مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا کہ موحد ایسا بھی کر سکتا ہے۔ اتنا غصہ' اتنا اشتعال اور اتنی تخریب کاری۔ اس نے اس دن اپنے کمرے کی ہر چیز توڑ پھوڑ دی تھی۔ مائی گاڈ۔" مسز رحیم کو پانچ دن پہلے کا وہ منظر بھولتا ہی نہیں تھا جب موحد نے ایک طوفان برپا کرنے کے بعد خود کو اپنے کمرے میں مقید کر لیا تھا۔ تب عائشہ نے گھبرا کر بابا کو فون کیا' جو پہلی فلائٹ پر پشاور سے اسلام آباد پہنچے تھے۔ انہوں نے ہی آ کر پورے اڑتالیس گھنٹوں کے بعد موحد کے کمرے کا دروازہ کھلوایا تھا۔ پچھلے تین دن سے وہ لوگ اپنی ساری مصروفیات کو پس پشت ڈالے بھوربن میں تھے۔

"ماما! ہم نے بھی تو حد ہی کر دی تھی۔ ان کو گھر میں ڈال کر اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔" عائشہ آج کل ضرورت سے زیادہ بھائی کی طرف داری کرنے لگی تھی۔

"آپ اور بابا گھر میں نہیں تھے اور میں اپنی ہولا انگیز بیشن کی تیاریوں میں مگن۔ ایسے میں بھائی کو تو لگنا ہی تھا نا کہ کسی کے پاس ان کے لیے وقت نہیں۔" عائشہ نے ہاتھ میں پکڑا گلاس میز پر رکھا جب کہ مسز رحیم کے دل پر ایک بوجھ سا آن گرا۔

"بیٹا! ہم سب تو شروع سے ہی اپنی اپنی لائف میں مگن ہیں' لیکن موحد کا مزاج اتنا جارحانہ ہو گا' اس کا مجھے پہلی دفعہ اندازہ ہوا ہے۔" وہ ابھی تک سخت تشویش کا شکار تھیں۔

"ماما! پہلے کی بات اور تھی۔ اب بھائی کے ساتھ اتنا بڑا حادثہ ہوا ہے۔ آپ یہ بات کیوں بھول جاتی ہیں۔" عائشہ نے نرم لہجے میں انہیں یاد دلایا۔

"لیکن بیٹا! میرا نہیں خیال کہ آرمی کی تربیت کے بعد بھی کوئی شخص اپنی ذات کے بارے میں اتنی جذباتیت کا شکار ہو سکتا ہے۔" مسز رحیم کے انداز میں بے یقینی اور تعجب کی فراوانی تھی۔ انہیں اس دن کا صدمہ بھولتا ہی نہیں تھا۔

"ماما! مجھے ایک بات کی سمجھ نہیں آتی کہ آپ لوگ آرمی والوں کو پتھر کیوں سمجھتے ہیں۔ ان کے سینوں میں بھی ویسا ہی دل دھڑکتا ہے جیسا کہ عام انسانوں کے۔ ان کو بھی اتنی ہی تکلیف ہوتی ہے جتنی ہمیں۔" عائشہ کے لہجے میں ایک محسوس کی جانے والی برہمی تھی۔

"میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا بیٹا!" مسز رحیم نے گھبرا کر صفائی دی۔

"آپ خود سوچیں کہ کسی جیتے جاگتے انسان کے وجود کا ایک حصہ اس سے علیحدہ ہو جائے تو اس کے دل پر کیا بیت سکتی ہے۔ اس کے کرب اور تکلیف کا اندازہ وہی کر سکتا ہے جو اس سانحے سے گزرا ہو۔" عائشہ نے انتہائی دکھ اور تکلیف سے اپنے بھائی کو دیکھا جس کے قدموں کے نیچے کبھی زمین ہوا کرتی تھی اور اب وہ بالکل بے بس تھا۔

"یہ سب تو اللہ کے کام ہیں بیٹا! اس نے وطن کے لیے اپنے وجود کا قیمتی حصہ دیا ہے۔ اللہ اسے اس کا اجر ضرور دے گا۔" مسز رحیم نے ویٹر کو پائن ایپل جوس لانے کا اشارہ کیا۔ عائشہ اٹھ کر گولف کلب کے لان کی طرف چل پڑی۔

"موسم کتنا بدل گیا ہے نا۔" عائشہ نے بہت محبت سے پیچھے سے آ کر اپنے بھائی کے گلے میں بازو ڈال دیے۔ یہ اس کی محبت کے اظہار کا ایک مخصوص انداز تھا۔ جس پر کسی زمانے میں موحد بہت چڑا کرتا تھا۔

"ہوں۔۔۔" وہ جیسے گہری نیند سے جاگا تھا۔ اس نے سرعت سے گردن اٹھا کر دیکھا۔ "موسم بدلنے میں پھر بھی کچھ نہ کچھ وقت لیتے ہیں لیکن انسان تو موسموں سے بھی زیادہ سرعت سے تبدیل ہوتا ہے۔ بالکل گرگٹ کی طرح لمحوں میں کئی رنگ بدلتا ہے۔" عائشہ نے موحد کے چہرے پر پھیلا تلخی کا دھواں اپنے

دل میں اترتا محسوس کیا تھا۔ وہ اس کے سامنے اس کے جیسی سفید گیند نما کرسی پر بیٹھ گئی۔
"ایسے گرگٹ نما دوستوں کے بدلنے پر خود کو دکھی کرنا کہاں کی دانش مندی ہے بھائی۔۔۔" اس کے ناصحانہ انداز پر وہ زبردستی مسکرایا۔ وہ اس کی بات کے پیچھے چھپے معنی سمجھ چکا تھا۔
"دل کو ایسی باتیں آسانی سے سمجھ آجائیں تو اسے دل کون کہے۔۔۔؟" وہ کسی گہری سوچ کے زیر اثر تھا۔
"دل کو خود پر اتنا سوار نہیں کرتے ورنہ یہ زندگی کو تنگ کرنے کے سوا کچھ نہیں کرتا۔ اس کی باگیں اپنے کنٹرول میں رکھتے ہیں۔"
"دل کی باگیں کیسے کنٹرول میں رکھتے ہیں؟" وہ سخت رنجیدگی سے سامنے سے گزرتے ہوئے گھوڑوں کو دیکھ رہا تھا۔ ہارس رائیڈنگ اس کا جنون تھا۔
"جس طرح گولف کھیلتے ہوئے گولف اسٹک کو اور گھوڑے کی سواری کے دوران گھوڑے کو اپنے قابو میں رکھتے ہیں۔" عائشہ کی شرارت بھری مثالوں پر آخر کار وہ ہنس ہی پڑا تھا۔ عائشہ نے ایک پرسکون سی سانس فضا میں خارج کی لیکن یہ لمحات خاصے مختصر تھے۔
"اس گولف کلب میں آکر میرا دل کر رہا ہے کہ میں ایک دفعہ پھر زمین کی سختی کو اپنے پیروں پر محسوس کرسکوں۔ ایک وقت تھا جب بھی انتہائی فاتحانہ انداز سے زمین پر چلتے ہوئے کبھی میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ ایسا وقت بھی آئے گا' جب میں زمین کے سینے پر قدم رکھنے کو ترس جاؤں گا۔ انسان کتنا عجیب ہے ناں۔ زندگی میں ہمیشہ بہترین کے لیے سوچتا ہے لیکن خود کو کبھی بدترین کے لیے تیار نہیں کرتا پھر میری طرح قنوطیت کے جال میں پھنس کر کڑھتا رہتا ہے۔" اس کے سنجیدہ لہجے میں دکھ کی آنچ آرہی تھی۔
"جس دن آپ اس بات پر یقین کرلیں گے کہ آپ کی قسمت میں ان تمام چیزوں کو ایسے ہی شامل ہونا تھا' یقین کریں زندگی میں سکون آجائے گا۔" عائشہ کی نصیحت کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا کیونکہ ایک تمسخرانہ سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر بے ساختہ چھلکی تھی۔
"کاش! کبھی قسمت میرے ہاتھ لگ جائے تو میں اس سے پوچھوں' تمہیں زندگی سے بھرپور چہرے کے ساتھ کھیلتے ہوئے ذرا بھی رحم نہیں آتا؟" اس کے چہرے پر گہری رنجیدگی' افسردگی اور بے بسی کے سارے ہی رنگ تھے۔
"قسمت کو کوسنے سے کہیں بہتر ہے کہ بندہ اپنے لیے نئے راستے تلاش کرے۔ ستاروں سے آگے کئی اور جہان ہمیشہ انسان کے منتظر رہتے ہیں۔ بس ہمت پکڑنے کی دیر ہوتی ہے۔" عائشہ اب اٹھ کر اس کے بالکل قریب آگئی تھی۔ اس نے محبت سے موحد کے بکھرے بالوں کو اپنی انگلیوں سے سنوارا تھا۔
"تمہیں یاد ہے عائشہ! دو سال پہلے جب تم میں اور ماہم مقابلہ موسیقی میں شرکت کرنے کے لیے بھوربن آئے تھے۔" اس کے چہرے پر کسی خوب صورت سوچ کا عکس اتنا واضح تھا کہ عائشہ کو اپنے دل میں موجود دکھ کا حجم ایک دم ہی بڑھتا محسوس ہوا تھا۔
"بھائی! میں "ماضی" کی ان خوب صورت یادوں کو کبھی نہیں دہراتی جن کا اعادہ میرے حال کو برباد کردے۔۔۔"
موحد کو اس لمحے اپنی بہن بڑی بے رحم لگی تھی۔ اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ اس موضوع پر گفتگو کرنا نہیں چاہتی' جو موحد کے لیے خوشی کے ساتھ ساتھ تکلیف کا بھی باعث بنتا تھا۔ موحد نے شکوہ کناں نظروں سے اسے دیکھا جو لاپروائی سے کسی مشہور انگلش گانا گنگناتے ہوئے یہ بھول گئی تھی کہ کسی دور میں یہ گانا بھی وہ تینوں بلند آواز میں گایا کرتے تھے۔

☆ ☆ ☆

"مجھے ہر حال میں تم سے ملنا ہے بس۔۔۔" رامس کے لہجے میں بے چینی' بے تابی اور بے صبری وہ اتنی دور ہوتے ہوئے بھی محسوس کرسکتی تھی۔ تکیے کے ساتھ ٹیک لگاتے ہوئے اس نے فون پر دوسری طرف

موجود رامس کو تسلی دی۔
"تم یہاں پہنچو تو سہی' پھر دیکھتے ہیں۔۔۔" وہ نمکو کی پلیٹ گود میں رکھ کر ٹانگیں پھیلائے بڑی فرصت سے نیم دراز ہوگئی تھی۔
"میں اس شہر میں داخل ہونے کے بعد سب سے پہلے تمہارا چہرہ دیکھنا چاہتا ہوں' اس لیے تم فوراً ایئرپورٹ آجاؤ۔۔۔" مونگ پھلی کا دانہ منہ میں ڈالتے ہوئے وہ اس کی فرمائش پر ہنس پڑی تھی۔ وہ ابھی کراچی سے سوار بھی نہیں ہوا تھا اور اسے ایئرپورٹ پر پہنچنے کا کہہ رہا تھا۔
"تم سوچ نہیں سکتیں کہ میں نے تمہیں کتنا مس کیا۔" محبت سے بھرپور لہجہ اس کی سماعتوں سے ٹکرا کر اسے عجیب سی سرشاری بخش رہا تھا۔
"تم میرا لکی بانڈ بن گئی ہو ماہم!" دوسری طرف وہ بڑی ترنگ میں تھا۔ نمکو کی پلیٹ سے اس کی ساری دلچسپی ختم ہوگئی تھی۔ وہ اب صرف اور صرف رامس علی کی طرف متوجہ تھی۔ اس کا لہجہ محبت کی چاشنی سے لبریز تھا۔
"جب سے تم میری زندگی میں آئی ہو' کامیابیوں نے میرا ہاتھ پکڑ لیا ہے۔" اس کی بات پر ماہم نے جی جان سے قہقہہ لگایا تھا۔
"خیر ہے ناں یہ فون پر کون سے لطیفے سنے جارہے ہیں۔" عائشہ نے اس کے بیڈ روم میں بڑا کامیاب چھاپا مارا تھا۔ اسے دیکھتے ہی ماہم نے فوراً "اللہ حافظ" کہہ کر فون بند کردیا تھا۔
"کچھ نہیں یار! رامس کا فون تھا۔ اسے ایک فرم میں بہت شان دار جاب مل گئی ہے۔" ماہم کی اطلاع پر اس نے برا سا منہ بنایا اور اس کے ساتھ ہی بیڈ پر ڈھیر ہوگئی۔
"کتنی فضول لڑکی ہو تم۔ اکیلے اکیلے سیر سپاٹے کرکے میرا خیال آگیا تمہیں۔۔۔" ماہم کو بروقت یاد آیا کہ وہ بھوربن ٹرپ کے بعد پہلی دفعہ اس سے مل رہی ہے۔
"اکیلی کہاں تھی۔ بابا' ماما' اور بھائی بھی ساتھ تھے۔" اس نے فوراً تصحیح کی۔
"اس قدر ہنگامی دورے کی وجہ؟" ماہم نے حیرت سے پوچھا۔ وہ اس دن موحد کے بھڑک جانے کے بعد دانستہ عائشہ کی طرف نہیں گئی تھی۔
"بس یار! بھائی بہت اپ سیٹ تھے۔ اس لیے بابا نے ساری ایکٹیویٹیز کینسل کرکے پروگرام بنالیا لیکن کوئی خاص مزا نہیں آیا۔"
"کیوں؟" ماہم کو تعجب ہوا۔
"ماما بھائی کی وجہ سے اپ سیٹ تھیں۔" عائشہ نے بے زاری سے تکیہ گود میں رکھتے ہوئے بتایا۔
"بھائی صاحب اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنائے ہوئے تھے اور بابا کو وہاں اپنے کچھ فرینڈز مل گئے۔ ایسے ہی بے کار گئے تین دن۔" عائشہ کی صاف گوئی پر وہ کچھ سنبھل کر گویا ہوئی۔
"ہاں موحد نے خوامخواہ اپنے اوپر قنوطیت طاری کی ہوئی ہے۔ نہ وہ ایڈمنسٹریشن کو جوائن کرنا چاہتا ہے اور نہ ہی کوئی اور ایکٹیویٹی کرنے کو تیار۔" ماہم کو بھی اس سے کافی شکایتیں تھیں۔
"وہ کبھی بھی ایسا نہیں تھا ماہم۔۔۔" عائشہ نے فوراً اس کی بات رد کی۔ "اتنے بڑے سانحے کے بعد بھی وہ تین چار ماہ بالکل ٹھیک ٹھاک رہا تھا لیکن ہم لوگ بزی ہوئے تو اسے لگا کہ ہم اسے نظر انداز کررہے ہیں بس اسی سوچ نے انہیں سب سے بدول کردیا۔"
"خیر ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ ہم سب تو ویسے کے ویسے ہی ہیں' وہ ضرورت سے زیادہ حساس ہوگیا ہے۔" ماہم نے منہ بناتے ہوئے لوشن اٹھایا اور ہاتھوں کا مساج شروع کردیا۔
"ان کی حساسیت بھی ہمارے بدلتے رویوں کی مرہون منت ہے۔ ہم سمجھنے لگے ہیں کہ شاید وہ زندگی کی دوڑ میں اب ہمارا ساتھ نہیں دے پائیں گے۔" عائشہ کے لہجے میں اپنے بھائی کے لیے چھلکنے والا دکھ بڑا فطری سا تھا۔
"تو وہ جس طرح ہر وقت جلی کٹی سناتا ہے' کون اس

کے پاس جا کر بیٹھے گا۔ طنزیہ گفتگو اور شعلہ برساتی آنکھیں۔ وہ کسی طرح بھی پہلے والا موحد نہیں لگتا۔" ماہم نے سارا قصور اسی کے کھاتے میں ڈال دیا۔ عائشہ اسے بہت کچھ کہتے کہتے چپ کر گئی۔

"چھوڑو ان باتوں کو' یہ بتاؤ' کیا ہو رہا ہے آج کل۔۔۔"

"کچھ نہیں کلینک کی مصروفیات ہی سکون لینے نہیں دیتیں۔۔۔" ماہم نے سستی سے جمائی لی "انکل جواد نے کلینک کا سیٹ اپ بڑا کر لیا ہے۔ خود بھی پاکستان آرہے ہیں۔ ایک سائیکاٹرسٹ اور دو سائیکولوجسٹس کی بھی تقرری کی ہے۔ بس اسی سلسلے میں کچھ زیادہ مصروف ہوں۔ تم سناؤ۔۔۔" ماہم نے مساج کریم ڈریسنگ پر رکھتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"میرے ذہن پر ایگزیبیشن سوار ہے۔ بس دن رات وہ ہی کام نمٹا رہی ہوں۔" عائشہ نے کشن سر کے نیچے رکھتے ہوئے تفصیل سے بتایا۔ وہ آج کافی دن کے بعد ماہم کی طرف آئی تھی۔

"وہ ایگزیبیشن سے مجھے یاد آیا کہ ایک مشہور برانڈ کی لان کی بھی ایگزیبیشن چل رہی ہے۔۔۔ آج شام میں وزٹ نہ کر کے آئیں وہاں کا۔۔۔" ماہم بڑے جوش سے اٹھ بیٹھی تھی۔

"توبہ ہے ماہم! تم شاپنگ کے لیے کیسے ہر وقت تیار رہتی ہو۔" عائشہ نے بے زاری سے اس کا پرجوش چہرہ دیکھا۔

"اور تم کتنی پوستی اور آدم بے زار لڑکی ہو۔ دنیا سے نرالے تمہارے شوق ہیں۔ کچی بستیوں میں جانا ہو' کوئی سوشل ورک کرنا ہو تو ایک منٹ میں تیار ہو جاتی ہو۔" ماہم نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا' جس کے ماتھے پر پینٹ لگا ہوا تھا۔ وہ منہ ہاتھ دھوئے بغیر ادھر آ گئی تھی۔

"میری تیاری میں کون سا وقت لگتا ہے دو چار منہ پر چھینٹے مارے' سن گلاسز' بیگ اور سیل فون اٹھایا اور تیار۔۔۔"

"ہاں اور آج تو منہ پر دو چار چھینٹے مارنے کی بھی زحمت نہیں کی' بندہ گھر سے نکلتے ہوئے کم از کم منہ دھو لیتا ہے۔" ماہم کو اس کی لاپروائی پر بعض اوقات بہت غصہ آتا تھا۔

"یار! مجھے کس نے دیکھنا ہے پھر کسی شاعر نے میرے لیے ہی کہا ہے۔ نئے کپڑے بدل کے جاؤں کہاں اور بال بناؤں کس کے لیے۔۔۔؟" عائشہ ابھی بھی غیر سنجیدہ تھی۔

"نئے کپڑے پہن کر بھی تم جس انداز سے گھومتی ہو' لگتا ہی نہیں ہے کہ نئے ہیں۔ پتا نہیں کون سی بوڑھی روح گھسی ہوئی ہے تمہارے اندر۔" ماہم سخت چڑی تھی۔

"بھئی ہم مست ملنگ فقیر لوگ قلندرانہ مزاج رکھتے ہیں' ظاہری حلیوں کے بجائے دلوں میں جھانکتے ہیں اور انسانیت سے پیار کرتے ہیں۔ ہم درویشوں سے خفا نہ ہوا کرو۔" اس کی بے نیازی میں شرارت کا عنصر نمایاں تھا۔ ماہم نے اس کی بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

"مجھے چھوڑو یہ بتاؤ کہ تمہارے اس سفید کبوتر کا کیا حال ہے۔۔۔" عائشہ نے اس کا موڈ سیٹ کرنے کے لیے اسے چھیڑا۔

"کون سفید کبوتر۔۔۔" ماہم نے سخت تحیر بھرے انداز سے اس کی آنکھوں میں مچلتی شرارت کو دیکھا۔

"بھئی وہ ہی جس کو آج کل تم خوب "دانہ" ڈال رہی ہو' حالانکہ وہ جال میں پہلے سے ہی پھنسا ہوا ہے۔۔۔" عائشہ کے ذو معنی انداز کو اب اس نے فوراً" بوجھا تھا۔

"رامس علی" ماہم کھلکھلا کر ہنسی۔ اس کی آنکھوں میں خیرہ کر دینے والی روشنی آج کل اسی ایک نام سے آتی تھی۔

"اف کتنی بدتمیز لڑکی ہو تم۔" ماہم نے مصنوعی صدمے سے اسے دیکھا جو سستی اور کاہلی کا پہاڑ بنی لیٹی ہوئی تھی۔

"بھئی ہم بندے کی شخصیت کے مطابق ہی اسے ٹائٹل دیتے ہیں' تم اپنے ایمان سے کہو کہ سفید کبوتر نہیں لگتا وہ۔۔۔" اس نے بڑے اشتیاق بھرے انداز سے دریافت کیا۔

"اچھے خاصے ہینڈسم اور ڈیشنگ بندے کے لیے سفید کبوتر کا خطاب ہی ملا تھا۔۔۔" ماہم کو نہ چاہتے ہوئے بھی ہنسی آ گئی تھی۔

"ویسے اس نے تو مجھے حیران کر دیا ہے۔ بہت جلدی بہتری آئی ہے اس میں۔ تم سوچ نہیں سکتی ہو کہ مجھے اس کی حالت دیکھ کر کتنی خوشی ہوتی ہے۔" ماہم نے کھلے دل سے اسے سراہا تھا۔

"ظاہر ہے تم سے زیادہ کون خوش ہو سکتا ہے۔۔۔" عائشہ نے غور سے اس کے چہرے پر پھیلی دھنک کو دیکھا۔ کبھی یہ رنگ صرف موحد کو دیکھ کر بے اختیار سے چھلکتے تھے۔

"بھئی میرا مریض ہے وہ۔۔۔" ماہم نے کھسیا کر اسے یاد دلایا۔ "اور مریض کو صحت مند ہوتے دیکھنا کسی بھی مسیحا کے لیے خوشی کی بات ہی ہوتی ہے۔" ماہم کی وضاحت پر ایک طنزیہ مسکراہٹ بڑی سرعت سے عائشہ کے چہرے پر پھیلی تھی۔

"ایک تو ان میں مریض محبت ٹائپ لوگوں سے بہت تنگ ہوں' جو دیکھتے دیکھتے محبت کے تاج محل قائم کر لیتے ہیں اور پھر اس تاج محل پر جب ان کی محبت کا مقبرہ بنتا ہے تو دھاڑیں مار مار کر روتے ہیں۔" عائشہ کے لہجے کی تلخی پر وہ ایک لمحے میں سمجھ گئی تھی کہ اس کا اشارہ موحد کی طرف ہے لیکن وہ دانستہ چپ رہی۔

☼ ☼ ☼

"اماں! دعا کر کہ میں نعت کا مقابلہ جیت کر آؤں۔" اماں نے فریم سے نظریں ہٹا کر بیٹی کا پرجوش چہرہ دیکھا۔

"پتر! اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں جیتنا ہے تو اس کی بتائی ہوئی باتوں پر عمل کر' اس کے نقش قدم پر چل' یہ راہ بہت اوکھی اے' تیرے میرے دے بس دا روگ نئیں۔" اماں نے ایک اور نیا سبق پڑھایا جو سکینہ کی سمجھ میں بالکل نہیں آیا تھا۔

"اماں! جن لوگوں کو اللہ کے رسولؐ سے محبت ہوتی ہے وہ ہی تو نعت پڑھتے ہیں۔۔۔"

"لے اے نئی گل ہوئی۔۔۔" جمیلہ مائی نے ناک پر انگلی رکھ کر تعجب کا اظہار کیا۔ "ہنٹر مجھ نمانی دی آواز تے پھاٹا ڈھول اے' تے مینوں نعت پڑھن دا سلیقہ وی نئیں' تے تہاڈا کی مطلب اے کہ مینوں محبت نئیں۔۔۔" جمیلہ مائی نے تولیے سے منہ صاف کرتے ہوئے صاف اس کا مذاق اڑایا۔

"اماں! میرا مطلب یہ تھوڑی تھا۔ اب دنیا میں لاکھوں لوگوں کی آوازیں اچھی ہیں لیکن ہر کسی کو تو اللہ یہ سعادت نہیں دیتا ناں۔۔۔" سکینہ نے جمیلہ مائی کو سمجھانے کی ناکام کوشش کی۔

"پتر! اللہ سمجھ بوجھ تے ہر بندے نوں ہی دیندا اے ناں۔" اماں نے مسکرا کر اس کا جھنجلایا ہوا چہرہ دیکھا۔ "ہنٹر تینوں اگر اللہ دے رسول ناں محبت اے تے توں نعت پڑھنی اے ناں' تے فیر دفع کر دنیا دی پوزیشناں نوں۔"

"اماں تو بس میرے لیے دعا کر۔۔۔" سکینہ نے ضد کی۔ سفید ململ کے دوپٹے میں جمیلہ مائی کا سانولا چہرہ بڑا روشن اور پرنور لگ رہا تھا۔

جمیلہ مائی نے قرآن پاک کھول لیا تھا اور سکینہ کو معلوم تھا کہ اماں اب اس کی کسی بات کا جواب نہیں دیں گی۔

اس نے کن اکھیوں سے اماں کا مصروف انداز دیکھا۔ وہ قرآن پاک پڑھتے ہوئے دنیا مافیہا سے بے گانہ ہو جاتی تھی۔ سکینہ نے اپنے دائیں جانب رکھے لوہے کا چھوٹا سا ڈرم کھولا جو ابا نے اس کی فرمائش پر پنڈ سے لا کر دیا تھا۔ لوہے کے اس چھوٹے سے ڈرم میں اس کی کافی خفیہ چیزیں تھیں۔ یہ واحد جگہ تھی' جہاں وہ اماں کو بھی ہاتھ ڈالنے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔

اماں کو مصروف دیکھ کر اس نے ڈرم سے کریم نکال کر چہرے پر رگڑ رگڑ کر لگائی۔ سیاہ رنگ کے سرمے دانی سے سرمے کی سلائیاں نکال کر آنکھوں پر پھیریں۔ اماں لپ اسٹک لگانے نہیں دیتی تھیں' اس

لیے سرخ رنگ کی سپاری کے چند دانے نکال کر منہ میں ڈالے اور پھر زبان سے ہونٹوں کو رنگا۔ اب وہ چوری چوری لوشن نکال کر ہاتھوں پر لگا رہی تھی وہ تو شکر تھا کہ جمیلہ مائی کا چہرہ دوسری طرف تھا ورنہ وہ اس بار سنگھار پر اس کی طبیعت درست کر دیتیں۔ اس نے وال کلاک پر نظر ڈالی صبح کے نو بجنے والے تھے۔ ڈاکٹر خاور کا راؤنڈ شروع ہو چکا تھا اور وہ اس کے کمرے میں آنے ہی والے تھے۔ اس کے دل کی دھڑکنوں نے الگ اسے بوکھلا رکھا تھا۔

اپنے کام سے فراغت پا کر اس نے تکیے کے ساتھ ٹیک لگائی اور وہ کتاب اٹھائی جو ڈاکٹر خاور ہی اس کے لیے لائے تھے۔ اسے جب سے پتا چلا تھا کہ ڈاکٹر خاور کو بھی کتابیں پڑھنا پسند ہے' وہ ہر وقت کوئی نہ کوئی کتاب اپنی گود میں رکھے بیٹھی رہتی۔

"واہ سکینہ خوب مطالعہ ہو رہا ہے۔" وہ ایک دم ہی اندر آئے تھے۔ ان کے ساتھ ڈاکٹر زویا کو دیکھ کر سکینہ کے دل پر بڑی زور سے ضرب لگی تھی۔ اماں نے بھی انہیں دیکھ کر فوراً" قرآن پاک بند کر دیا تھا۔

"ماشاء اللہ! آج تو بہت فریش لگ رہی ہیں۔" ڈاکٹر خاور نے اس کی فائل دیکھتے ہوئے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا۔ سکینہ کا رنگ ایک دم سرخ ہو کر مزید سیاہ لگنے لگا تھا۔ اس کی پلکوں پر ارتعاش کی کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے ڈاکٹر زویا نے بے اختیار ناگواری سے پہلو بدلا تھا۔

"یہ سکینہ نے ہونٹوں پر کیا لگایا ہے؟" جمیلہ مائی کی جانچتی نظروں نے ایک لمحے میں بیٹی کی تیاریوں کو محسوس کر کے سوچا تھا۔

"بھئی سکینہ! ایکسرسائز تو باقاعدگی سے ہو رہی ہے ناں...؟" ڈاکٹر خاور نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا اور سکینہ کی دل کی دنیا میں زلزلہ سا آ گیا۔ بے ترتیب دھڑکنوں کو سنبھالنا اتنا مشکل نہیں تھا' جتنا ڈاکٹر خاور کے ساتھ نگاہیں ملا کر بات کرنا۔ پلکوں پر منوں بوجھ آن گرا تھا۔ اس لیے اس نے سر جھکا کر اثبات میں سر ہلایا۔

"اپنی نعت کی بھی تیاری اچھی رکھیں سالگرہ کو مقابلہ ہے' یاد ہے ناں...؟" ڈاکٹر خاور بھی آج بار بار مخاطب کر کے اس کا امتحان لینے پر تلے ہوئے تھے۔ سکینہ نے ایک دفعہ پھر سر ہلا کر ہاں میں جواب دیا۔

"بھئی خیر ہے ناں! یہ آج اشاروں کی زبان سے کیوں کام چلایا جا رہا ہے۔" ڈاکٹر خاور نے ہاتھ میں پکڑے بال پوائنٹ کو حسب عادت ہلکا سا اس کے سر پر شرارت سے مارا۔ یہ ان کا مخصوص انداز تھا' جو ان کے خوشگوار موڈ کی عکاسی کرتا تھا۔

"ایسی تو کوئی بات نہیں۔" وہ بمشکل تھوک نگل کر بولی تھی۔ وہ تو شکر تھا کہ ڈاکٹر خاور جمیلہ مائی سے حال احوال پوچھ کر فوراً" کمرے سے نکل گئے جب کہ سکینہ سوچ رہی تھی۔ کہ ایک ایسا شخص جس کی محبت خون کے ساتھ آپ کی شریانوں میں گھوم رہی ہو۔ جس کو دیکھ کر دل باغ باغ ہو جائے۔ دھڑکنیں شرارت سے گنگنانے لگیں۔ سماعتیں اس شخص کی آہٹوں کو بھی محسوس کرنے لگیں تو ایسے شخص کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کیسے بات کی جائے۔

"تائی! یہ اپنی سکینہ آج ماشاء اللہ کتنی ٹھیک ٹھاک لگ رہی ہے ناں؟" جاجی جو گرم گرم جلیبیاں لے کر ابھی ابھی پہنچا تھا سکینہ کو دیکھ کر چونک گیا۔ سکینہ ایک دم ہی حقیقت کی بے رحم دنیا میں واپس آئی تو سامنے سرخ خانوں والا رومال کندھوں پر رکھے جاجی کو دیکھ کر اس کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔

"جا کر اپنی آنکھوں کا علاج کروا...." اسے ایک دم ہی غصہ آیا۔

"کیوں جی...؟" جاجی شوخی سے بولا۔ وہ ابھی ابھی حمام سے نہا کر لٹھے کا سفید کرتا پہن کر آیا تھا۔

"میرے پاس تیری فضول باتوں کا کوئی جواب نہیں۔" سکینہ کو جاجی کی شوخ نگاہوں سے سخت الجھن ہو رہی تھی' جب کہ جاجی کو اس کی جھنجلاہٹ بہت لطف دے رہی تھی۔ اس لیے وہ کرسی گھسیٹ کر اماں کے پاس بیٹھ گیا۔ اسے اس طرح جمے دیکھ کر سکینہ

نے بے زاری سے رخ موڑ لیا۔ جبکہ جاجی کی محویت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ سکینہ کو اپنی پشت پر دو شرارے سے بھری آنکھوں کی تپش سخت جھنجلاہٹ میں مبتلا کر رہی تھی۔

☼ ☼ ☼
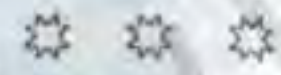
گوال منڈی کے مین بازار میں بنا یہ پانچ مرلے کا گھر تنگی اور بوسیدگی کا جیتا جاگتا اشتہار تھا۔ اس گھر کے سامنے والے حصے میں تین دکانیں بھی تھیں۔ جس کی وجہ سے پیچھے بنا گھر خاصا تنگ و تاریک سا نظر آتا تھا۔ دو کمرے چھوٹے سے باورچی خانے' برآمدے اور صحن پر مشتمل اس گھر میں صرف دو ہی مکین رہتے تھے۔ ایک کمرے میں ساٹھ سالہ بیمار خاتون تھیں۔ جن کی نگاہوں میں کسی کا انتظار جم سا گیا تھا۔ جبکہ اس کے ساتھ اس کی جوان بیٹی' جس کی شادی کی فکر نے بھی اس بیمار وجود کی نیندیں اڑا رکھی تھیں۔

سامنے والے کمرے میں دو پلنگ تھے' جن پر کاٹن کی پرانی اور بدرنگ چادریں بچھی ہوئی تھیں۔ کمرے میں موجود واحد میز پر کتابیں' قلم دان' روشنائی کی دوات اور ایک پرانا سا لیمپ تھا۔ اس میز کے پاس رکھی کرسی کا رنگ اڑا ہوا اور اس کی پشت ادھڑی ہوئی تھی۔

صبح سے ہونے والی بارش نے ثنائلہ کو سخت بے زار کر رکھا تھا۔ برآمدے کی چھت کئی جگہوں سے ٹپکتی تھی۔ جن کے نیچے اس نے کہیں جگ تو کہیں بالٹی وغیرہ رکھ کر احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس وقت بھی وہ چھت سے دھلے ہوئے کپڑوں کا ڈھیر سنبھالنے میں بے حال تھی جب کہ ٹپ ٹپ گرتے پانی کی آواز اس کے اعصاب پر ہتھوڑے کی طرح برس رہی تھی۔

"شمیر کا فون آئے گا تو اسے کہوں گی کہ کہیں سے پیسوں کا بندوبست کرے' کم از کم ان بوسیدہ چھتوں کا تو کوئی علاج کرے۔" اس نے ہزار بار کی سوچی ہوئی بات دل میں دوہرائی تھی لیکن اسے یہ بھی پتا تھا کہ تین سال سے کویت گئے بھائی سے یہ بات کرنا بھی بذات

خود ایک دشوار کن مرحلہ تھا۔ اس کے پاس اپنی مجبوریوں کی ایک لمبی داستان تھی جس میں سرفہرست اس کی عمر میں اس سے تیرہ سال بڑی در زن بیوی کے میکے کے مسائل تھے۔ اچھے خاصے جاذب نظر بھائی کی عقل کو نہ جانے کیا ہوا تھا جو اس نے کویت جاتے ہی اپنے پڑوس میں رہنے والی ایک ڈھلتی عمر کی خاتون سے دھواں دھار عشق کے بعد شادی کر لی تھی۔

"یار میں کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ اتنے غیر رومانوی ماحول میں رہتے ہوئے بھی تم کس طرح اتنی رومانوی کہانیاں تخلیق کر لیتی ہو۔" پڑوس میں رہنے والی تابیہ دروازہ کھلا دیکھ کر سیدھی وہیں آ گئی۔ اسے سیلن زدہ باورچی خانے کے فرش پر بیٹھے پیاز چھیلتے دیکھ کر اس نے "شرارتاً" کہا۔

"وہ کام بھی آج کل کھٹائی میں پڑا ہوا ہے۔ عجیب سی بے زاری ہے۔ ایک لفظ بھی نہیں لکھا جاتا......" ثنائلہ نے سڑے ہوئے پیاز ایک شاپر میں ڈالتے ہوئے برا سا منہ بنایا۔

"دفع کرو ان سب چیزوں کو۔ یہ گرم گرم کڑھی اور پکوڑے کھاؤ' خالہ کدھر ہیں؟" تابیہ بھی لکڑی کی پیڑھی سنبھال کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔

"امی دوائی کھا کر سو رہی ہیں۔ ایک تو شوگر اور اوپر سے ان کا بی پی بھی ہائی رہنے لگا ہے۔ بیماری کی وجہ سے سخت چڑچڑی ہو گئی ہیں۔" ثنائلہ نے فریج سے گوندھا ہوا آٹا نکالا۔ کڑھی دیکھ کر اسے بھوک کا احساس جاگ اٹھا تھا۔

"خیریت...! پھر کوئی ٹینشن لے لی ہو گی انہوں نے۔" وہ اس گھر کے تمام حالات سے آگاہ تھی۔ اس کی بات پر ایک تلخ سی مسکراہٹ ثنائلہ کے چہرے پر ٹھہری گئی۔

"ابا کے انتقال کے بعد سے تو خیریت نام کا لفظ ہماری ڈکشنری سے نکل گیا ہے۔ ددھیال والوں نے ویسے ہی آنکھیں ماتھے پر رکھ لیں اور ننھیال میں صرف ایک ماموں تھے جو سات سمندر پار جو گئے تو دوبارہ مڑ کر نہیں دیکھا۔" اس کی رنجیدگی پر تابیہ کچھ

بے چین ہوئی۔

"آج کل مارکیٹ میں ایسے ہی رشتے دار آرہے ہیں۔ اس لیے ان سے تو کوئی توقع ہی نہ رکھو۔" نابیہ نے اسے تسلی دی۔ ابا کے انتقال کے بعد ان دونوں خواتین کو پڑوس میں رہنے والی اس فیملی کا ہی آسرا تھا۔ دونوں خاندان پچیس سال سے وہیں آباد تھے۔

"ٹینشن ان کی نہیں، شہیر کی ہے۔ ہم دو ہی تو بہن بھائی ہیں۔ اس نے بھی کویت جاکر آنکھیں ماتھے پر رکھ لی ہیں۔" اس کی افسردگی پر نابیہ نے اس کے ہاتھ سے پیڑا لے کر روٹی بیلنی شروع کردی۔

"شہیر تو شروع ہی سے انتہائی خودپسند اور خودغرض بندہ تھا اس سے تو بھلائی کی توقع رکھنا ہی فضول تھا۔" نابیہ نے بڑی مہارت سے گرم توے پر روٹی ڈالی۔ اسے اپنی بہترین دوست کے اکلوتے بھائی کی خودغرض فطرت اور بے حسی آزردہ تو کرتی تھی لیکن وہ اس معاملے میں کچھ بھی کرنے سے قاصر تھی۔

"کچھ بھی سہی، لیکن بھائی تو ہے ناں میرا۔۔۔" ثنائلہ کی مسکراہٹ میں عجیب سی بے بسی تھی۔ جب کہ اس کی بات پر نابیہ تڑخ کر بولی۔

"محترمہ! آپ نے خود ہی اپنی ایک کہانی میں لکھا تھا کہ دنیا میں بعض رشتے ایسے ہوتے ہیں جن کے ہونے یا نہ ہونے سے کسی دوسرے کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔۔۔"

"زندگی میں بعض چیزوں کو صفحات پر لکھنا جتنا آسان ہوتا ہے، حقیقی زندگی میں ان پر عمل کرنا اتنا ہی مشکل۔ بعض الفاظ جب حقیقت کا لباس اوڑھ کر مجسم سامنے آجائیں تو ان کو دیکھنے سے ہی آنکھیں جلنے لگتی ہیں۔ ان کو چھو کر محسوس کرنا تو بہت دور کی بات ہے۔" وہ کسی گہری سوچ کے تانے بانے میں الجھی ہوئی تھی۔

"بعض چیزوں کی حقیقت کو جتنی جلدی سمجھ لیا جائے۔ زندگی اتنی ہی آسان ہوجاتی ہے۔ ورنہ خود کو دھوکا دے کر بندہ کتنی دیر خوش رہ سکتا ہے۔" نابیہ نے گرم گرم روٹی رومال میں لپیٹتے ہوئے ثنائلہ کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"مسئلہ میرے سمجھنے کا نہیں، امی کی سمجھ کا ہے۔" اس کی آواز میں نمی کی آمیزش تھی۔ نابیہ نے ... نظروں سے اسے دیکھا۔

"نہیں یہ غلط فہمی ہے کہ ان کے صاحبزادے نے ادھیڑ عمر درزن صاحبہ سے شادی کسی مجبوری میں کی ہوگی۔" اس کے انداز میں مایوسی اور جھنجھلاہٹ تھی۔

"شادی تو اس نے واقعی مجبوری میں ہی کی ہے لیکن ایسی مجبوری جس میں شہیر صاحب کی اپنی کوئی بڑی آسانی چھپی ہوئی ہوگی۔ برا مت ماننا، بڑا کتابی ہے تمہارا بھائی۔۔۔" نابیہ کی بات پر وہ پھیکے سے انداز میں مسکرائی۔

"مجھے دکھ اس کی شادی کا نہیں، اس کی بے مروتی اور بے حسی کا ہے۔ اول تو کبھی فون کرنے کی توفیق ہی نہیں ہوئی اور اگر کبھی ہمارا فون اٹھالے تو مجبوریوں کی نہ ختم ہونے والی ایک لمبی فہرست ہوتی ہے اس کے پاس۔" ثنائلہ کے چہرے پر ایک تاریک سا سایہ دوڑا تھا۔

"امی نے کل اسے فون پر کہا کہ پیسے بھیجو گھر کی مرمت کروانی ہے۔ اس نے بے مروتی سے کہا کہ گھر میں آپ اور آپی ہی تو ہیں کیا ضرورت ہے بنوانے کی۔" اگر زیادہ ہی مسئلہ ہے تو پھر تینوں دکانوں کا جو کرایہ آتا ہے، اسے اس مد میں خرچ کرلیں۔"

"اس احمق کو یہ نہیں پتا کہ اس گھر میں رہنے والے دو مکینوں کے سارے اخراجات ان دکانوں کے کرائے سے ہی پورے ہوتے ہیں۔ ابھی تو وہ قرضہ بھی اتارنا باقی ہے جسے لے کر موصوف کویت گئے تھے بلند و بالا دعوے کرکے۔" نابیہ نے غصے سے ہاتھ میں پکڑا پیڑا باقاعدہ پرات پر پٹخا تھا۔

"کویت جاکر اس کی یادداشت خاصی کمزور ہوگئی ہے۔ اسے سب کچھ بھول گیا ہے، یہ بھی کہ ان دکانوں کا کرایہ ہے ہی کتنا۔ اسے یہ بھی یاد نہیں کہ پہلے بھی ان تین دکانوں کے کرائے سے گھر بمشکل چلتا تھا۔

اب تو امی کی بیماری اور وہ قرضہ بھی شامل ہو گیا ہے، جو وہ خود لے کر گیا تھا۔" اس کی آنکھوں میں نہ جانے کیوں پانی آئے جا رہا تھا۔

"سب پتا ہے اسے۔ اویں ڈرامے کرتا ہے۔" نابیہ کے لہجے میں طنز کی کاٹ تھی۔ "ابھی اس پر اس عورت کا عشق سوار ہے۔ اس لیے مت ماری گئی ہے اس کی۔ ویسے بھی بڑی عمر کی عورت کا عشق جوان بندے کو خوار ہی کرتا ہے۔" ثنائلہ کے لہجے میں گہرا دکھ پوشیدہ تھا۔ اس کے بہنوئی نے بھی کچھ عرصہ پہلے چوری چوری دس سال بڑی مطلقہ خاتون سے شادی رچالی تھی گھر والوں کو چار سال بعد پتا چلا۔

"ایک بات بتاؤں۔۔۔؟" ثنائلہ کے چہرے پر نمودار ہونے والی پُراسرار سی مسکراہٹ پر نابیہ نے فوراً" چونک کر دیکھا۔

"جب کوئی ادھیڑ عمر مرد کسی الہڑیا بالی عمر کی لڑکی سے محبت کرتا ہے تو اس کے پیچھے پاگل ضرور ہوتا ہے، لیکن اپنے حواس برقرار رکھتا ہے لیکن جب کوئی جوان مرد اپنے سے دگنی عمر کی عورت کے عشق میں گرفتار ہوتا ہے تو وہ اندھا گونگا اور بہرا ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے دماغ کی چابی کسی اندھے کنویں پھینک دیتا ہے۔" ثنائلہ کے لہجے میں کوئی گہرا مشاہدہ چھپا ہوا تھا۔

"چھوڑو، یہ بتاؤ کہ تم ماہم منصور کے پاس گئی تھیں؟" نابیہ اس کے پیچھے ہی صحن میں تھی۔ بارش کے بعد دھلا دھلایا آسمان بہت روشن اور چمکیلا لگ رہا تھا۔ دونوں انار کے پیڑے کے نیچے چارپائی پر بیٹھ گئیں۔

"ہاں گئی تھی۔ بہت مہنگی سائیکالوجسٹ ہے لیکن میری تحریروں کی قدر دان تھی، اس لیے اس نے آئندہ سیشن میں سختی سے کوئی بھی فیس ادا کرنے سے منع کیا ہے۔" ثنائلہ نے خفیف سا ہنس کر بتایا، وہ ماہم کے پاس نابیہ کی کسی دوست کے توسط سے گئی تھی۔

"میں نے سنا ہے، بہت خوبصورت ہے وہ۔۔۔"

"واقعی وہ اس قدر خوبصورت ہے کہ لڑکی ہو کر میرے لیے اس پر نظر ہٹانا دشوار ہو رہا تھا۔ چاندی جیسا اجلا جسم اور رنگت جیسے کسی نے دودھ میں گلابیاں گھول دی ہوں۔

"واقعی۔۔۔" نابیہ کے تجسس کو مزید ہوا ملی "کبھی اپنے اس نامعقول ہیرو کو دوبارہ کہیں دیکھا؟" اس نے سلاد کھاتے ہوئے عجلت میں پوچھا تھا۔

"نہیں یار! تین دفعہ جناح سپر جا چکی ہوں کہ شاید دوبارہ نظر آجائے لیکن ایسے اتفاقات کہاں ہوتے ہیں۔" ثنائلہ کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ ابھری۔

"مجھے تو وہ تمہاری نظر کا دھوکا لگتا ہے۔۔۔ مان لو ثنا کہ زبیر کہ تمہارا مضبوط تخیل تمہیں بے وقوف بنا رہا ہے اور کچھ نہیں۔۔۔" نابیہ نے اسے سمجھانے کی ایک اور ناکام کوشش کی۔

"اگر وہ تخیل اتنا طاقتور اور خوبصورت ہے تو مجھے نام نہاد تلخ حقیقتوں کی کوئی ضرورت نہیں۔" وہ سر جھکائے ایسے بولی جیسے اپنے کسی گناہ کا اعتراف کر رہی ہو۔ نابیہ نے سخت حیرت سے اپنے سامنے چارپائی پر بیٹھی اس مصنفہ کو دیکھا جو اتنی ذہین ہونے کے باوجود اپنے ہی لفظوں کے سحر میں گرفتار ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼
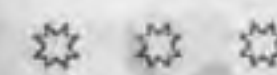
"اماں! یہ محبت کیا ہوتی ہے۔۔۔"

ایک اداس سی شام سکینہ نے اچانک ہی بڑے عجیب لہجے میں جمیلہ مائی سے سوال کیا تھا۔ آسمان پر روئی کے گالوں کی طرح اڑتے بادلوں کو دیکھ کر سکینہ ضد کر کے لان میں آگئی تھی۔ اس کی وہیل چیئر پھولوں کی کیاری کے پاس تھی۔ جب کہ جمیلہ مائی خود سنگ مرمر کی بینچ پر اپنی تسبیح لے کر بڑی فرصت سے بیٹھ گئی تھیں۔ اس وقت ہوا درختوں کے پتوں کے ساتھ اٹکھیلیاں کر رہی تھی اور نم آلود جھونکے طبیعت کو خوشگوار احساس بخش رہے تھے۔

"پتر! محبت وہ چیز ہے، جو اپنے رب سے ہو تو بندے کو سکون دیتی ہے اور اگر سوہنے رب کے بندوں سے ہو جائے تو نرا خوار کرتی ہے۔" جمیلہ مائی نے سمندر کو کوزے میں بند کیا۔ اس کے جواب پر سکینہ الجھ کر آسمان پر موجود پرندوں کی ڈار کو دیکھنے لگی جو ایک ہی لائن میں محو سفر تھے۔

"اچھا اماں! فیر یہ بتا کہ یہ عشق کیا ہوتا ہے؟" سکینہ نے روئی کے گالوں جیسے بادلوں میں سورج تلاش کر رہی تھی۔

"پتر تو نے کبھی بکریوں کا ریوڑ دیکھا ہے؟" جمیلہ مائی کے پُراسرار انداز پر سکینہ کو سخت تعجب ہوا۔ "بس یوں سمجھ کہ عشق اپنے اندر کی بکری کو مارنے کا نام ہے۔" جمیلہ مائی کی انتہائی عجیب بات پر وہ ایک لمحے کو ہکا بکا رہ گئی۔

"لے اماں! یہ کیا بات ہوئی بھلا۔" سکینہ اس سخت بے تکی بات پر برا مان گئی۔

"میں سو آنے درست گل کیتی اے سکینہ۔۔۔" جمیلہ مائی نے انتہائی محبت سے اس کا خفا خفا چہرہ دیکھا۔

"دیکھ! جس طرح بکری ہر ویلے "میں، میں" کردی اے، اسی طرح عشق وچ اپنی اسی "میں" نوں مارنا پیندا اے میری دھی۔ بس اے نکا جیا نکتہ سمجھ وچ آجاوے نے عشق دے سارے گنجل۔ کھل جاندے نے۔" سکینہ کی نظروں میں سخت حیرانی در آئی۔

اپنی وہیل چیئر پھولوں کی کیاری کے پاس لے آئی جہاں رنگ برنگی تتلیوں کو دیکھ کر وہ پلکیں جھپکنا بھول گئی۔

"محبت کی تتلی ہر کسی کے ہاتھ نہیں آتی۔ اسے پکڑنے کی خواہش کرنا فضول ہے۔" کیاری پھلانگ کر اچانک ہی ڈاکٹر زویا سامنے آئیں۔ ان کا لہجہ تلخ اور چہرے پر ایک زہریلی سی مسکراہٹ دیکھ کر سکینہ کی رنگت فق ہو گئی۔ وہ جو تھوڑا سا جھک کر اڑان بھرتی تتلی کو پکڑنے ہی والی تھی ان کی اچانک آمد سے ہکا بکا رہ گئی۔

"اور اس وقت تو بالکل بھی ہاتھ نہیں آتی جب آپ کے پیروں کے نیچے زمین بھی اپنی نہ ہو۔۔۔" ڈاکٹر زویا کے چہرے پر ایک تمسخرانہ سا تبسم تھا۔ جمیلہ مائی بوکھلا کر کھڑی ہو گئیں۔

"آپ لوگ لان میں کیا کر رہی ہیں؟" انہوں نے طنزیہ پوچھا۔ جمیلہ مائی خجل سی ہو کر وضاحت دینے لگیں۔

"بس پتر! یہ پاگل، نادان اویں ضد کر کے اس ویلے باہر نکل آئی۔۔۔" جمیلہ مائی نے خفت زدہ انداز سے وضاحت کی۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ سامنے کھڑی ڈاکٹر صاحب کا مزاج کس بات پر برہم ہے۔

"بچے تو ہر اچھی چیز کو دیکھ کر مچل ہی جاتے ہیں۔ آپ ماشاء اللہ اچھی خاصی سیانی ہیں، دھیان رکھا کریں۔" ڈاکٹر زویا کا انداز اگرچہ ہلکا پھلکا تھا لیکن ان کی آنکھوں سے نکلنے والی تپش سکینہ کو اپنا دامن جلاتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

جمیلہ مائی کو ڈاکٹر زویا کا "پیغام" جیسے ہی سمجھ آیا ایک فطری سی پریشانی نے دل و دماغ کا احاطہ کر لیا تھا۔ جب کہ سکینہ ہراساں نظروں سے انہیں دیکھے گئی۔

"ڈاکٹر خاور! کہاں ہیں آپ بھول گئے آج ڈنر کرنا تھا ہم نے۔۔۔" سیل فون کان کے ساتھ لگاتے ہوئے ڈاکٹر زویا کے لہجے میں عجیب سا استحقاق تھا۔ انہوں نے دانستہ وہاں کھڑے کھڑے کال ملائی تھی۔

"چل سکینہ پتر! اندھیرا پھیل گیا اے، اندر چلیں۔۔۔" جمیلہ مائی نے انتہائی افسردگی و سنجیدگی سے سکینہ کی وہیل چیئر دھکیلی، جب کہ سکینہ کے چہرے پر صدمے کی انتہائی کیفیت تھی۔ آنسوؤں کی لکیریں اس کی کنپٹی سے دائیں بائیں بہہ رہی تھیں۔

باقی آئندہ شمارے میں

نمرہ احمد

جنت کے پتے

مکمل ناول

آنے سلائیوں سے سوئیٹر بُن رہی تھیں۔ سلائیوں سے لٹکتا دھاگا زمین تک پہنچ کر اون کے گولے میں بدل جاتا تھا۔ عائشے گل بڑے صوفے کے ایک کونے پہ ٹکی ' اون کے اس گولے کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی نگاہیں دھاگے پہ جمی تھیں مگر ذہن کہیں دور بھٹک رہا تھا۔

زندگی بھی اب اون کے گولے کی سی لگتی تھی۔ کوئی اسے کب بُن دے ' کب ادھیڑ دے۔ سلائیاں تو اس کے ہاتھ میں تھیں ہی نہیں۔

"عائشے! تمہارا فون بج رہا ہے۔" آنے کے پکارنے پہ وہ چونکی۔ گود میں رکھا موبائل جانے کب سے بج رہا تھا۔

اس نے نمبر دیکھا اور پھر ایک معصوم سی مسکان نے اس کے لبوں کو چھولیا۔

"بہارے!" نمبر پہ لکھا نام بہت محبت سے لے کر اس نے آنے کو بتایا اور سبز بٹن دبا کر فون کان سے لگایا

پندرھویں اور آخری قسط

"السلام علیکم!" اس نے مسکرا کر سلام کیا۔
"میں ٹھیک ہوں تم سناؤ ترکی والے کیسے ہیں؟" اس کی مسکراہٹ اور بھی خوب صورت ہو گئی۔ آنکھوں میں طمانیت کے سارے رنگ اتر آئے۔
"ہاں بتاؤ کیا ہوا؟" اس کے الفاظ سن کر آنے نے بے اختیار سلائیاں چلاتے ہاتھ روک کر اسے دیکھا۔
اسی پل عائشے سیدھی ہو کر بیٹھی۔ اس کی مسکراہٹ ایک دم سمٹی تھی۔
"کون سا بارڈر؟ ترکی اور شام کا؟" اس نے آہستہ سے دہرایا۔ آنے فاصلے پہ بیٹھی تھیں۔ ان کو سنائی نہیں دیا تھا مگر انہوں نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا ضرور تھا۔ وہ ان کو یوں دیکھتے پا کر زبردستی ذرا سی مسکرائی، پھر معذرت خواہانہ نگاہوں سے گویا اجازت طلب کرتی اٹھ کر کچن میں آگئی۔
آنے نے ذرا حیرت سے اسے گردن موڑ کر دیکھا۔ وہ کچن کے کھلے دروازے سے کاؤنٹر کے پیچھے کھڑی فون پہ بات کرتی نظر آ رہی تھی۔ آنے واپس سلائیوں کی طرف متوجہ ہو گئیں۔
"ہاں، کہو پھر، میں سن رہی ہوں۔" کاؤنٹر پہ کہنی رکھ کر جھکے کھڑی عائشے نے ایک محتاط نظر باہر لاؤنج میں کھڑکی کے پاس بیٹھی آنے پہ ڈالی۔ وہ اب اس کی جانب متوجہ نہیں تھیں۔
"ذرا اونچا بولو، اتنا آہستہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔ کیا کوئی آس پاس ہے؟" اس نے رک کر سنا، پھر اثبات میں سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے، مجھے ساری بات سمجھاؤ اب۔"
اس نے پھر ادھ کھلے دروازے سے جھانکا۔ آنے اپنی بنائی میں مصروف تھیں۔
"کیا؟ ایک منٹ۔ کیلس کی کس طرف ہے وہ بارڈر؟"
وہ تیزی سے فریج کی جانب بڑھی اور اس کے دروازے پہ نصب ہولڈر سے پین نکالا اور ساتھ ہی آویزاں نوٹ پیڈ کے اوپری صفحے پہ تیزی سے لکھنے لگی۔ "منگل کی رات، یعنی پیر اور منگل کی درمیانی رات دو سے تین بجے، وہ ان لیگل (غیر قانونی) طور پر کراس کرے گا اچھا اور...؟" وہ روانی سے چند لفظ گھسیٹے گئی۔
"ہاں ٹھیک، میں سمجھ گئی۔ اچھا... اوکے۔" اس نے پین واپس ہولڈر میں رکھا اور نوٹ پیڈ کا صفحہ پھاڑا، پھر تہہ کر کے مٹھی میں دبا لیا۔
"اچھا... میں دیکھتی ہوں۔ کیا ہوا؟ کوئی آ گیا ہے؟ اچھا تم فون رکھو، بعد میں بات کریں گے، مرحبا!" اس کا مرحبا ادا ہونے سے قبل ہی فون بند ہو چکا تھا۔ اس نے ایک نظر موبائل کو دیکھا اور پھر چند گہرے گہرے سانس لے کر اپنے حواس بحال کیے۔ دل ابھی تک یونہی دھڑک رہا تھا۔
راز بھی ایک بوجھ ہوتے ہیں، جنہیں سہارنے کے لیے بہت مضبوط اعصاب چاہیے ہوتے ہیں۔ اس نے ہاتھ میں تہہ شدہ کاغذ پہ نگاہ دوڑائی۔ اس معلومات کے ساتھ اسے کیا کرنا چاہیے؟
"ترکی کا تم پہ قرض ہے عائشے! اپنے دل سے پوچھو کہ اگر تمہیں معلوم ہو جائے کہ ایک مجرم ترکی کا ایک قومی مجرم، غیر قانونی طریقے سے سرحد پار کر رہا ہے تو تمہیں کیا کرنا چاہیے؟"
اس نے اپنے دل سے پوچھنا چاہا۔ عجیب سا ہیجان اور تذبذب دل پر غالب تھا۔
"تمہیں بارڈر سیکورٹی فورس کے کمانڈر کو فون کرنا چاہیے۔ تمہیں ان کو بتانا چاہیے سب کچھ، تاکہ وہ اسے گرفتار کر سکیں۔ مگر نہیں... عائشے گل یہ سب کیسے کرے گی؟ عائشے گل تو کبھی کچھ نہیں کر سکتی!"
وہ ذرا سی چونکی۔
"عائشے گل کبھی کچھ نہیں کر سکتی!" عبدالرحمٰن ہمیشہ اسے کہا کرتا تھا۔ یہ تو اس کا پسندیدہ فقرہ تھا۔ مگر اس وقت یہ فقرہ کسی تیر کی طرح اسے لگا تھا۔ وہ شکستہ قدموں سے چلتی واپس لاؤنج کے بڑے صوفے کے کنارے آ ٹکی۔

آنے نے سلائیوں سے نظر ہٹا کر اسے دیکھا۔
"کیا کہہ رہی تھی بہارے؟"
عائشے نے بات ٹھیک سنی نہیں تھی، بس نفی میں گردن ہلائی۔ وہ کہیں اور گم تھی۔
کیا اسے عبدالرحمٰن کو دکھا دینا چاہیے کہ عائشے گل بہت کچھ کر سکتی ہے؟ کیا واقعی؟

☼ ☼ ☼

وہ چلتے چلتے اس جنگل نما علاقے تک آ پہنچے تھے۔ اونچے سرسبز درخت، اور ان کے درمیان سے دریا کسی تنگ جھرنے کی مانند بہہ رہا تھا۔ پانی کے اوپر پل کی صورت لکڑی کے پھٹے لگے تھے اور درمیان میں لکڑی کا ایک بڑا سا تخت تھا۔ تخت پہ سرخ قالین بچھا تھا اور تین طرف منڈیر بنا کر گاؤ تکیے لگے تھے۔ چوتھی طرف منڈیر نہ تھی، تاکہ وہاں ٹانگیں لٹکا کر بیٹھو تو پیر پانی کو چھوئیں۔
سبزہ، سبز درخت، اور اوپر جھلکتا نیلا آسمان۔ پل کے اس پار جھونپڑے سے بنے تھے، جن میں سے ایک سے وہ ابھی ابھی نماز پڑھ کر نکلی تھی۔ ظہر سے عصر تک وہ بس چلتے ہی رہے تھے، پھر اس مقام پہ جہاں انہیں چھوڑ کر اپنے کسی کام کی غرض سے چلا گیا تھا۔ اس کو گھنٹے تک آنا تھا۔
وہ کھانے کے بعد جب نماز پڑھنے لگی تھی تو بہارے باہر آ گئی تھی۔
"کیا تم اس لیے اداس ہو کہ اس نے تمہیں ڈانٹا ہے؟"
"وہ ہر وقت ہی ڈانٹتا ہے مگر میں نے کچھ غلط نہیں کیا۔"
سامنے سے ایک پرندہ اڑتا ہوا آیا، پانی کی سطح سے اپنے پنجے ٹکراتے ہوئے ذرا سے قطرے چونچ میں بھرے اور بغیر رکے، پر پھڑپھڑاتا اڑ گیا۔
"کیا تم نے واقعی ہماری باتیں سنی تھیں؟" استفسار کرتے ہوئے بھی وہ جانتی تھی کہ اگر اس نے سنا ہو تب بھی وہ سمجھ نہیں پائی ہو گی۔
"نہیں سنا میں نے کچھ۔ سب مجھے کیوں الزام دیتے ہیں؟" وہ خفگی سے کہتی سر اٹھا کر دور جاتے پرندے کو دیکھنے لگی جو اوپر آسمان پہ اڑتا جا رہا تھا۔ شاید اس کے لیے چونچ بھر پانی ہی کافی تھا۔ اس کی وسعت بس اتنی ہی تھی۔
"اچھا، پھر اداس کیوں ہو؟"
"حیا! کیا جب میں پندرہ سال کی ہو جاؤں گی تو شادی کر سکوں گی؟" اور حیا کا منہ حیرت سے کھل گیا۔
"تمہیں ایسی بات کیوں سوجھی بہارے؟"
"غنچہ کی شادی بھی پندرہ سال کی عمر میں ہوئی تھی نا۔"
"غنچہ کون؟"
"ہماری جد سی میں رہتی تھی، ہم سب گئے تھے اس کی شادی پہ، عبدالرحمٰن بھی گیا تھا۔ تصویر بھی ہے میرے پاس۔ دکھاؤں؟"
حیا نے میکانکی انداز میں سر ہلایا۔ بہارے نے اپنا پرس کھولا، اندرونی خانے کی زپ کھولی اور ایک لفافہ نکالا۔ اسے اس کے موبائل کی جھلک نظر آئی تھی۔
"تمہارا فون تمہارے پاس تھا؟" اس کو اچنبھا ہوا۔ "میں سمجھی تم نہیں لائیں۔"
"میں لے آئی تھی، چارجنگ ہو گئی تھی۔"
"کیا میں اسے دیکھ سکتی ہوں؟" اس نے موبائل لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو بہارے نے جھٹ سے زپ بند کر کے بیگ پرے کر لیا۔
"میں نے کچھ غلط نہیں کیا۔ تم میرا یقین کیوں نہیں کرتیں؟ میں اچھی لڑکی ہوں۔" حیا نے گہری سانس بھری۔
"اچھا ٹھیک ہے، میں تمہارا یقین کرتی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ بہارے گل اچھی لڑکی ہے اور اچھی

لڑکیاں کبوتر نہیں بنتیں۔ وہ باتیں اِدھر سے اُدھر نہیں کرتیں۔" اس نے ہاتھ واپس کھینچ لیا تھا "جہان تمہیں جو بات آگے بتانے سے منع کر رہا تھا' وہ تم عائشہ کو نہیں بتاؤ گی' پرامس؟"

"مگر دانشیہ کو تو پہلے ہی ..." اس نے جیسے زبان دانت تلے دبائی۔

"کیا اسے پہلے ہی پتا ہے؟" حیا نے بغور اسے دیکھا۔ بہارے نے جھٹ گردن نفی میں ہلائی۔ "میں کسی کو نہیں بتاؤں گی۔ پرامس!"

اس نے تصویر احتیاطاً خط کے لفافے میں ڈالی اور اسے بیگ میں رکھ دیا' کچھ تھا جو حیا کو ڈسٹرب کر رہا تھا۔ کچھ غلط تھا کہیں۔ مگر خیر...

"اور تم یہ شادی کی باتیں مت سوچا کرو۔ اچھا؟" اسے تنبیہہ کرنا یاد آیا۔

بہارے نے سر اٹھا کر اسے دیکھا' پھر نفی میں گردن ہلائی۔

"میں تمہیں نہیں بتاؤں گی کہ میں کس سے شادی کروں گی۔"

"وہ کیوں؟"

سامنے دریا کنارے درخت کا ایک پتا ہوا سے پھڑپھڑا رہا تھا۔ جب ہوا کا بوجھ بڑھا تو وہ ایک دم شاخ سے ٹوٹ کر نیچے گرا۔

"تم برا مانو گی۔ سمجھو میں نے ایسا کہا ہی نہیں۔"

ہوا نے پتے کو اپنے پروں پہ سہارا دیے آہستہ آہستہ نیچے اتارا' یہاں تک کہ پانی نے اسے نرمی سے ہوا کے ہاتھوں سے لیا اور اپنے اوپر لٹا لیا۔

"تمہیں پتا ہے' عبدالرحمن نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ اگر وہ مر جائے تو میں اسے کندھا ضرور دوں گی۔"

"کیا؟" وہ ششدر رہ گئی۔ سانس رکا اور دل بھی دھڑکنا بھول گیا۔ اہلارا کے دریا کی سطح پہ درختوں اور آسمان کا عکس جھلملا رہا تھا۔ اس عکس پہ تیرتا پتا ان کی سمت آ رہا تھا۔

"ہاں' اس نے بہت دفعہ ایسا کہا۔"

"چھوڑو ان باتوں کو۔" اس نے خفیف سا سر جھٹکا۔ پتا نہیں کیوں وہ ہمیشہ آگے کی ساری پلاننگ سیٹ رکھتا تھا' چاہے وہ مرنے کی ہی کیوں نہ ہو۔

اس نے گردن اٹھا کر سامنے دریا کو دیکھا۔ وہاں سے چٹانیں اور غار دکھائی نہیں دیتے تھے' مگر جب بیلون میں اوپر اڑ رہے تھے' تب وہ نظر آتے تھے بالکل ویسے جیسے ڈاکٹر ابراہیم کی دی گئی کینڈی کے ریپر پہ بنے تھے۔

"بہارے!" اسے ایک دم یاد آیا۔ "یاد ہے عائشے کہا کرتی تھی کہ قرآن میں نشانیاں ہوتی ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں اور تم نے کہا تھا کہ تم جانتی ہو وہ اس روز ہمیں کیا بتانا بھول گئی تھی؟"

"ہاں!" بہارے نے اثبات میں سر ہلایا۔

پتا بہتا ہوا ان کے قدموں کے قریب آ رہا تھا۔ جیسے ہی وہ مزید آگے آیا' بہارے نے اپنے پاؤں سے اس کا راستہ روکنا چاہا۔ حیا کو احساس ہوا کہ وہ دونوں پتے کو دیکھ رہی تھیں' بہارے نے اسے روکنے کی کوشش کی تھی' مگر اس نے نہیں کی۔

"عائشے نے بتایا ہی نہیں تھا کہ آخر میں جنگ کون جیتا۔"

بہارے نے اپنے پیر سے پتے کو واپس دھکیلا۔ وہ ذرا پیچھے ہوا' پھر اسی رفتار سے واپس آیا۔ اب کے بہارے نے اسے نہیں روکا۔ وہ ان دونوں کے پیروں کے درمیان سے گزرتا تختے کے نیچے بہتا چلا گیا۔

"مسلمان جیتے تھے۔"

"یہ تو مجھے پتا ہے۔" حیا کو حیرت ہوئی۔ یہ تھی بات جس کو جاننے کے لیے اسے بہت تجسس تھا؟

"مگر مجھے نہیں پتا تھا' سو میں نے اسٹوری بک سے پڑھ لیا تھا بعد میں۔" ساتھ ہی بہارے نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔ بچھڑا ہوا پتا' اپنے درخت سے بہت دور' پیچھے کو بہتا چلا جا رہا تھا۔

"بس؟ یہی بات تھی؟"

"ہاں!" بہارے نے اثبات میں سر ہلایا۔

حیا کو مایوسی ہوئی تھی۔ یہ تو سامنے کی بات تھی کہ مسلمان ہی جیتے تھے' تو پھر؟ بہارے نے سمجھا' عائشے بتانا بھول گئی ہے جبکہ عائشے نے اس لیے اس بات کا ذکر نہیں کیا کہ سب جانتے ہیں' احزاب کی جنگ مسلمانوں نے جیتی تھی۔ یہ کوئی اہم بات تو نہیں تھی۔

شاید ڈاکٹر ابراہیم اسے یہی بتانا چاہ رہے تھے کہ آخر میں یہ جنگ وہ جیت جائے گی۔ پھر بھی' کہیں کچھ مسنگ تھا۔ کچھ تھا جو وہ پھر مس کر گئی تھی۔ اس نے خفیف سا سر جھٹکا۔ پتا نہیں۔

بہارے ابھی تک گردن موڑے دور جاتے پتے کو دیکھ رہی تھی۔ وہ پتا جسے اب کبھی اپنے درخت کے پاس واپس نہیں آنا تھا۔

☼ ☼ ☼

جہان آیا تو وہ لوگ اہلارا گاؤں آ گئے۔ اب شام ہو رہی تھی' سو وہ وہیں سے واپس ہو لیا جبکہ انہوں نے کیب لے لی اور واپس آشیانہ آ گئیں۔

جہان نے کہا تھا' کل یہاں سے روانہ ہونا ہے۔ اسی حساب سے وہ آج پیکنگ کر رہی تھی۔ پنار رات میں چائے دینے آئی تو ان کو سامان سمیٹتا دیکھ کر افسردہ ہو گئی۔

"میری منگنی ہو گی سرما میں' کیا تم لوگ آؤ گے؟ میں تمہیں ضرور انوائیٹ کروں گی۔"

"میں ضرور آؤں گی!" بہارے نے چہک کر کہا' پھر حیا کو دیکھ کر مسکراہٹ ذرا سمٹی۔ "میرا مطلب ہے' شاید آؤں!"

"ہوں!" پنار مسکرا کر اس کا گال تھپتھپاتی باہر نکل گئی۔

"عائشے کہتی ہے' جب میں اس کے پاس آجاؤں گی تو ہم دونوں دور کسی دوسرے ملک چلے جائیں گے'

جہاں پاشا بے نہ ہو اور جہاں ہم عائشے اور بہارے بن کر رہیں' منی اور حنہ نہیں اور پھر وہاں ہم بہت سا پڑھیں گے بھی سہی۔"

"میں کیا کہہ سکتی ہوں؟" اس نے شانے اچکاتے ہوئے اپنے سفری بیگ کی اندرونی زپ کھولی۔ ایک خانہ ذرا پھولا ہوا تھا۔ اوہ' اسے یاد آیا۔ اس نے اس خانے سے وہ سیاہ مخملیں ڈبی نکالی۔

اپنا فراک تہہ کرتی بہارے وہ ڈبی دیکھ کر ٹھٹکی' پھر اس کے پاس چلی آئی۔ حیا نے ڈبی کھولی۔ اندر سیاہ مخمل پہ وہ نازک سا نیکلس جگمگا رہا تھا۔ حیا نے نگاہیں اٹھا کر بہارے کو دیکھا۔

پہلے اس کی آنکھوں میں حیرت اتری' پھر الجھن' اور پھر سمجھ کر اس نے نفی میں سر جھٹکا۔

"یہ وہ نہیں ہے۔ یہ وہ نہیں ہو سکتا۔ کیا تم نے اسے خریدا ہے؟"

"میں نے اور عبدالرحمن نے مل کر اسے خریدا ہے ادالار کی شہزادی کے لیے۔"

بہارے نے اپنے فراک کو آخری تہہ دی اور پلٹ کر اسے بیگ میں ڈالا۔ جیسے وہ افسردہ ہو گئی تھی۔

"یہ میرے پاس نہیں رہے گا حیا! میں نے اپنا موتی عبدالرحمن کو دیا' اس نے مجھے دے دیا مگر وہ باسفورس میں گر گیا۔ عائشے نے بھی اپنے موتی عبدالرحمن کو دیے' اس نے وہ تمہیں دے دیے۔ اب یہ بھی مجھ سے گم ہو جائے گا۔ میں یہ نہیں لوں گی۔"

"مگر یہ میں نے تمہارے لیے لیا ہے بہارے!"

بہارے بیگ چھوڑ کر اس تک آئی۔ مخمل پر سے اٹھایا' اس کے ہک کو الٹ پلٹ کر دیکھا' پھر اسے حیا کی کلائی کے گرد لپیٹ کر اس کا ہک آخری کنڈے کے بجائے' کلائی کے گھیر کے برابر ایک کنڈے میں ڈال دیا' یوں کہ نیکلس کلائی کے گرد پورا آ گیا اور ایک لڑی سی ساتھ لٹکنے لگی' جیسے

بریسلٹ کی لٹکتی ہے۔

"یہ اب تمہارا ہو گیا!" وہ پہلی دفعہ مسکرائی تھی۔

حیا نے کلائی کو گھما کر دیکھا۔ زنجیر سے لٹکتے ہیرے بہت بھلے لگ رہے تھے۔ کلائی کے عین سائیڈ پہ ایک لمبا سا کنڈا خالی تھا۔

"شکریہ بہارے!" وہ ذرا سا مسکرائی۔ "تحفہ تو پھر تحفہ ہوتا ہے نا۔"

"کیا میں پھر کبھی عبدالرحمٰن سے نہیں مل سکوں گی؟"

بہارے اب سرخ صوفے کے کنارے جا ٹکی تھی اور ہتھیلیوں پہ چہرہ گرائے اداسی سے پوچھ رہی تھی۔

"نہیں، کبھی بھی نہیں۔ تمہیں اب اس بارے میں سوچنا چھوڑنا ہو گا۔" وہ اپنی باقی چیزیں سمیٹنے لگی۔ مسلسل حرکت سے کلائی سے لٹکتی زنجیر ادھر ادھر جھول رہی تھی۔

"میں کل انقرہ سے ایران چلی جاؤں گی اپنی بہن کے پاس۔ تم لوگ پھر کدھر جاؤ گے؟"

"دیکھو، پتا نہیں۔" اس نے مصروف سے انداز میں ٹالنا چاہا۔

"کیا تم لوگ کیلیس جاؤ گے؟"

اس کے متحرک ہاتھ ٹھہر گئے۔ اس نے سر اٹھا کر بہارے کو دیکھا۔

"تم نے اس وقت کچھ سنا تھا نا، بہارے کیا سنا تھا؟"

"بس اتنا سا!" اس نے انگلی اور انگوٹھے کو ایک انچ کے فاصلے پہ رکھ کر بتایا۔ "مگر جان بوجھ کر نہیں، خود بخود۔"

"اور تم نے کیا سنا؟"

"عبدالرحمٰن کیلیس کا نام لے رہا تھا۔ کیا کوئی کیلیس جا رہا ہے؟ واللہ مجھے نہیں پتا، وہ کس کی بات کر رہا تھا۔" اس نے قسمیہ انداز میں ہاتھ سے کان کی لو کو چھوتے ہوئے "چچ" کی آواز نکالی۔

"اور تم نے عائشے کو بتائی یہ بات؟"

"نا۔۔۔ نہیں!" بہارے ذرا سی اٹکی تھی۔ جہان نے کہا تھا اس نے اگر سنا ہو تب بھی وہ کچھ نہیں بتائے گی۔ اس نے اپنی عقل کے بجائے جہان کی عقل پہ بھروسا کرنا زیادہ مناسب سمجھا اور واپس پیکنگ کرنے لگی۔ بہارے سے انہیں کوئی خطرہ نہ تھا۔

بیگ کی ایک زپ میں ڈی جے کی ٹوٹی عینک رکھی تھی۔ اس نے احتیاطاً اسے وہاں سے نکال کر اپنے ہینڈ بیگ کے اندرونی خانے میں رکھ دیا۔ جہاں سفید رومال میں کچھ لپٹا ہوا رکھا تھا اور پھر بیگ کی زپ زوردار کی آواز کے ساتھ زور سے بند کی۔

کل انہیں انقرہ جانا تھا۔

☼ ☼ ☼

آشیانہ کی فیملی اور فاتح ان کو سی آف کرنے آشیانہ کے صحن میں کھڑے تھے۔ اتنے دن یوں لگ رہا تھا کہ وہ ہوٹل میں نہیں، بلکہ کسی کے گھر میں ٹھہرے ہوئے ہوں۔ اب ایک ایک کو خدا حافظ کہنا، مسز سونا اور بہارے کے گلے لگ کر دوبارہ آنے کا بے یقین سا وعدہ کرنا، سب بہت اداس کر دینے والا تھا۔ اس کی آنکھیں بار بار بھر آ رہی تھیں۔ ترکی میں اگر اس نے بہت کچھ کھویا تھا تو بہت کچھ پایا بھی تھا۔ کبھی جب وہ سود و زیاں کا حساب کرنے بیٹھے گی تو پانے والا پلڑا شاید بھاری نکلے۔

☼ ☼ ☼

جہان نے بہارے کے سارے کاغذات اسے پہنچا دیے تھے، البتہ انقرہ میں وہ خود انہیں نہیں ملا تھا۔ حیا نے اسے ایئرپورٹ پہ سی آف کرنا تھا اور تہران میں اس کی بہن نے اسے ریسیو کر لینا تھا۔

بہارے ایئرپورٹ پہ آخری وقت تک داخلی احاطے کو دیکھتی رہی تھی، شاید کہ وہ آ جائے!

"وہ نہیں آئے گا بہارے! اس نے کہا تھا کہ وہ نہیں آ سکے گا۔"

بہارے کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ پس منظر میں

اعلان ہونے لگا تھا۔ اب ان دونوں کو الگ ہونا تھا۔

"کیا ہم پھر کبھی نہیں ملیں گے حیا؟"

اس کی بات پہ حیا نے گہری سانس بھری اور بہارے کے سامنے پنجوں کے بل بیٹھی، پھر اس کے دونوں ہاتھ تھام کر کہنے لگی۔

"بہارے گل! زندگی میں انسان کو ہر چیز ویسے نہیں ملتی جیسی اس نے سوچی ہوئی ہے۔ سب ہماری مرضی کے مطابق نہیں ہو سکتا اور جو ہم کہتے اور سوچتے ہیں وہ تو کبھی نہیں ہوتا۔ پہلے ہم نے سوچا تھا کہ ہم ہمیشہ ایک دوسرے سے رابطے میں رہیں گے، مگر یہ نہیں ہو سکا۔ اور اب ہم سوچ رہے ہیں کہ ہم کبھی دوبارہ مل نہیں پائیں گے تو ہو سکتا ہے کہ یہ بھی نہ ہو۔"

اس کے ہاتھوں میں اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھ لیے کھڑی بہارے اس بات پہ چونکی، پھر ایک انوکھی سی چمک اس کے چہرے پر اُمڈ آئی۔

"ہاں بہارے! ہو سکتا ہے، زندگی کے کسی موڑ پہ، کسی شاپنگ مال میں، کسی ریسٹورنٹ میں، کسی فلائٹ کے دوران، ہم کئی سال بعد اچانک سے ایک دوسرے سے ٹکرا جائیں۔ زندگی میں سب کچھ ممکن ہوتا ہے۔"

اور پھر۔۔۔ بہارے گل چلی گئی۔

زندگی کا ایک باب ٹھک سے بند ہوا۔

جہان کی جاب کا اصول تھا کہ ایک اسائنمنٹ ختم ہو جانے کے بعد اس سے متعلقہ تمام کانٹیکٹس سے تعلقات قطع کر دیتے تھے، ہاں اگر جاب کے دوران دوبارہ کسی دوسرے اسائنمنٹ کے لیے ان تعلقات کی ضرورت پڑے تو ان کو پھر سے بحال کیا جا سکتا تھا۔

بس ایک موہوم سی امید تھی ۔۔۔ کہ شاید پھر کبھی وہ چاروں اکٹھے ہو سکیں مگر بہت موہوم جیسے تیز آندھی میں ٹمٹماتی موم بتی کا شعلہ۔

☼ ☼ ☼

کھڑکی سے چھن کر آتی روشنی کتاب کے صفحوں پہ پڑ رہی تھی جو اس نے اپنے سامنے پھیلا رکھی تھی۔ وہ الفاظ پہ نگاہیں مرکوز کیے ہوئے بھی ان کو نہیں پڑھ رہی تھی۔ ذہن کہیں اور تھا۔ دل پر بھی عجب اداسی سی چھائی تھی۔ جب تک بہارے واپس نہ آ جاتی، وہ یونہی افسردہ رہتی۔ یہ وہ وجہ تھی جس سے وہ خود کو بہلا لیتی کہ ہاں یہ اداسی صرف بہارے کی وجہ سے ہے۔

مگر وہ جانتی تھی کہ جب وہ آ جائے گی تو بھی یہ افسردگی رہے گی۔ بس تب ــــــــــ بہانہ ختم ہو جائے گا۔

کھڑکی کی جالی سے ہوا کا تیز جھونکا آیا تو کتاب کے صفحے اس کے ہاتھ میں پھڑپھڑا کر رہ گئے۔ اس کی زندگی کا ایک باب بھی کتاب کے اس صفحے کی مانند تھا جسے کسی نے بے دردی سے پھاڑ دیا ہو، یوں کہ کوئی نشان، جلد سے لگا کاغذ کا کوئی ٹکڑا باقی نہ رہا ہو۔

عائشے گل نے کتاب بند کر کے تپائی پہ ڈال دی۔ اس کا دل کسی شے کے لیے نہیں چاہ رہا تھا۔

زندگی کا وہ باب ۔۔۔ عبدالرحمٰن پاشا ایک اجنبی جوان کی زندگیوں میں آیا اور پھر ان کی پوری زندگی بن گیا۔ وہ کتنا اچھا، کتنا سلجھا ہوا، ویل مینرڈ اور نفاست پسند آدمی تھا۔ اس کی ہر چیز پرفیکٹ ہوتی تھی۔ وہ اس کے ساتھ بھی بہت اچھا تھا۔ اس کی رائے کو اہمیت دیتا اس کی سمجھ داری، ذہانت کی قدر کرتا۔ جب عثمان بے نے اپنے بیٹے کا رشتہ پاکستان میں طے کر دیا اور سفیر ان سے ناراض ہو گیا تھا تب عبدالرحمٰن کے کہنے پہ ہی اس نے سفیر سے بار بار اس موضوع پہ بات کی تھی۔ عبدالرحمٰن کو جب بھی کوئی خاص کام ہوتا، وہ اس کے پاس آیا کرتا تھا۔ جیسے اس رات وہ حیا کو لے کر آیا تھا۔

اس رات تو وہ اسے عبدالرحمٰن لگا ہی نہیں تھا۔ اتنا رف حلیہ، بے چین، مضطرب، بکھرا بکھرا سا۔ مگر جب اس رات کی صبح ہوئی، تو وہ وہی پرانا والا عبدالرحمٰن بن گیا، بلکہ وہ بن گیا جو وہ اس تھپڑ کے بعد بنا تھا۔

اچھی لڑکیاں جلد بازی نہیں کرتیں، مگر اس سے ہو گئی تھی۔ وہ تھپڑ اس کے اور عبدالرحمٰن کے درمیان ایک ایسی سرد دیوار بن گیا جسے وہ کبھی پاٹ نہ سکی۔ اس

نے عائشے کو اس تھپڑ کے لیے کبھی معاف نہیں کیا تھا اور اب تو وہ ان سے بہت دور جا چکا تھا۔

بہارے' آنے اور وہ خود' وہ سب اس کو بھلا دیں گے کیا؟ پاشا بے تو اپنے کاموں میں مصروف سطحی سا آدمی تھا مگر آنے؟ اس نے نگاہ اٹھا کر دیکھا۔

کمرے کے دوسرے کونے پہ آنے بیٹھی سوئیٹر بن رہی تھیں۔ پچھلے اور اس سے پچھلے دونوں سرما میں انہوں نے عبدالرحمٰن کے لیے سوئیٹر بنے تھے' اس دفعہ بھی وہ اپنی روٹین دہرا رہی تھیں۔ وہ دیکھتی تھی کہ کس طرح آنے فون کی بیل' دروازے کی دستک' اور

ہر آہٹ پہ چونکتیں پھر عبدالرحمٰن کی خیر خبر نہ پا کر مایوسی سے اپنا کام کرنے لگتیں۔ کیا وہ سب ایک نارمل زندگی گزار پائیں گے؟

شاید ہاں۔ شاید نہیں۔

مگر ابھی اسے کیا کرنا ہے؟

اس نے بلاؤز کی جیب سے وہ تہہ کیا ہوا کاغذ نکالا اور اسے کھولا۔ یہ ترکی کی امانت تھا۔ کیا اسے یہ امانت لوٹا دینی چاہیے؟

اس نے گردن پھیر کر کیلنڈر کو دیکھا۔ آج ہفتہ تھا اور یہ معلومات پرسوں' یعنی پیر اور منگل کی درمیانی شب کے بارے میں تھیں۔ اب صحیح وقت آن پہنچا تھا۔

وہ ایک فیصلے پر پہنچ کر اٹھی اور اپنا پرس اٹھا لیا۔

تقریباً" آدھے گھنٹے بعد وہ اپنے گھر سے بہت دور ایک پے فون پہ کھڑی' کارڈ ڈال کر ایک نمبر ملا رہی تھی۔

"دیکھ لو عبدالرحمٰن' عائشے گل کیا کر سکتی ہے!"

ریسیور کان سے لگائے' اس نے وہ تہہ کیا ہوا کاغذ سامنے کھول کر رکھ لیا۔ ساتھ ہی کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھی۔ ان کو اس کی کال ٹریس کرنے میں نوے سیکنڈ لگنے تھے۔ وہ اسی سیکنڈ بعد کال کاٹ دے گی۔

کال ملنے کے دسویں سیکنڈ میں اس کا رابطہ موجود کمانڈر سے ہو گیا۔

"میرے پاس آپ کے لیے ایک بڑی ٹپ (مخبری) ہے۔"

"آپ کون ہیں اور کہاں سے بول رہی ہیں؟" بھاری آواز والے مرد نے کال لمبی کرنے کی کوشش کی تھی۔

"جھوٹ بولنا نہیں چاہتی اور ظاہر ہے سچ بتاؤں گی نہیں۔ میرا وقت ضائع مت کریں۔ وہ ٹپ (مخبری) سنیں جو میرے پاس ہے۔" وہ تیزی سے بولی۔

پچیس سیکنڈ۔ اُف! دل تھا کہ زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

"جی' جی کہیے۔" دوسری جانب کال ریکارڈ کی جانے لگی تھی۔ ریڈ الرٹ۔

"منگل اور پیر کی درمیانی شب دو بجے کے قریب کیلیس سے تین کلومیٹر دور' ترکی اور شام کی سرحد کو کوئی کراس کرے گا۔ اس کے بہت سے نام ہیں' مگر میں آپ کو وہ نام بتاؤں گی جو آپ جانتے ہیں۔"

چالیس سیکنڈ۔۔۔۔

"کون سی چوکی کے قریب سے؟" وہ نوٹ کر رہے تھے۔

عائشے جلدی جلدی وہ تمام چیزیں دہرانے لگی' جو اس نے کاغذ پہ لکھ رکھی تھیں۔ چھوٹی چھوٹی باتیں' جو اہم تھیں۔

"اطلاع دینے کا شکریہ' کیا آپ کو یقین ہے کہ وہ اپنا پروگرام نہیں بدلے گا؟"

اسی سیکنڈ۔

"نہیں۔ مرحبا!" اس نے کھٹ سے ریسور رکھا' اور پھر دل پہ ہاتھ رکھ کر چند گہری سانسیں اندر اتاریں۔

"اللہ' اللہ! اس نے کر ہی لیا۔ یہ تو ذرا بھی مشکل نہ تھا۔"

اب وہ آہستہ آہستہ سانس لیتی اپنے پھولے تنفس کو بحال کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ دل تھا کہ بری طرح دھڑک رہا تھا۔

"عبدالرحمٰن۔۔۔ دیکھو' عائشے گل کیا کچھ کر سکتی ہے!"

وہ پلٹی اور سر جھکائے' تیز تیز چلتی کیب اسٹینڈ کی جانب بڑھ گئی۔ اسے جلد سے جلد گھر پہنچنا تھا تاکہ آنے کو شک نہ پڑے۔

☼ ☼ ☼

چھت سے کھلی' گرے اسپورٹس کار کشادہ ہائی وے پہ دوڑتی جا رہی تھی۔ وہ کہنی دائیں طرف کھلی کھڑکی پہ ٹکائے' بند مٹھی سے گال کو سہارا دیے' آنکھیں موندے کچی پکی نیند میں تھی۔ گرم ہوا سے سیاہ اسکارف پھڑپھڑا رہا تھا۔ دفعتاً" کار کو ذرا سا جھٹکا لگا تو اس کا چہرہ آگے کو لڑھکا مگر اگلے ہی پل وہ آنکھیں کھول کر' سنبھل کر پیچھے ہوئی۔

سامنے لمبی ہائی وے کے افق پہ سورج طلوع ہو رہا تھا۔ ہوا میں گرمی کی شدت بڑھ گئی تھی۔ سڑک کے دونوں اطراف خشک و ویرانہ تھا۔ دور پہاڑ تھے۔

"میں سو گئی تھی؟" اس نے آنکھیں ملتے جیسے خود سے پوچھا۔

"نہیں مادام! آپ کل رات سے ڈرائیو کر رہی ہیں۔ سو تو میں رہا تھا۔"

حیا نے بائیں جانب دیکھا۔ جہان اسٹیرنگ وہیل پہ دونوں ہاتھ رکھے ڈرائیو کر رہا تھا۔ نیلی جینز پہ نیلی ڈریس شرٹ کے آستین کہنیوں تک موڑے' آنکھوں پہ سیاہ گلاسز لگائے' جن کے سائیڈ سے آنکھ کے قریب زخم کا نشان صاف نظر آ رہا تھا۔

"کیا ہم کیلیس پہنچ گئے؟" اس نے گردن ادھر ادھر گھمائی۔ موٹروے کے اطراف کا مخصوص ویران علاقہ۔

"نہیں' سو جاؤ۔ جب پہنچیں گے تو تمہیں اٹھا دوں گا۔"

"ہوں!" حیا نے اثبات میں سر ہلایا اور گردن سیٹ کی پشت سے ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ جہان نے نگاہ پھیر کر اسے دیکھا اور پھر افسوس سے سر جھٹکا۔

"حیا خانم! فرنٹ سیٹ پہ بیٹھنے کی جو ایتھکس (اخلاقیات) ہوتی ہیں ان میں دوسرا نمبر کس چیز کا ہوتا ہے؟"

"میں نے سیٹ بیلٹ پہن رکھی ہے۔" بند آنکھوں سے کہتے اس نے ہاتھ سے اپنی سیٹ بیلٹ کو چھو کر یقین دہانی کی۔

"وہ پہلا اصول ہے۔ دوسرا فرنٹ سیٹ پہ سونے کی ممانعت کے حوالے سے ہے۔"

نیند ویسے ہی ٹوٹ گئی تھی' اوپر سے اس کے طنز۔ وہ آنکھیں کھول کر پوری طرح جاگ کر سیدھی ہوئی۔

"تمہارے منہ سے ایتھیکس کا ذکر کتنا خوب صورت لگتا ہے نا جہان!"

"کیوں؟ چند ایک باتوں کے علاوہ میں ایک بہت ڈیسنٹ آدمی ہوں!" وہ برا مان گیا۔ حیا نے بہت حیرانی سے اسے دیکھا۔

"تھینک یو ویری مچ جہان سکندر! ورنہ میں انقرہ سے یہاں تک یہی سوچتی آ رہی ہوں کہ یہ کار تمہاری اپنی ہے یا چوری کی؟"

جہان نے ایک خفا نگاہ اس پہ ڈالی اور "رینٹ کی ہے۔" کہہ کر سامنے دیکھنے لگا۔

"ہم کیلیس کب پہنچیں گے؟" اس نے ذرا کسلمندی سے پوچھا۔

"ڈرائیو میں کر رہا ہوں' تم تو سوتی آئی ہو پھر؟"

"ایک تو پتا نہیں ہر ڈرائیو کرنے والا یہ کیوں سمجھتا ہے کہ اس کے علاوہ باقی تمام مسافر تھک نہیں سکتے۔"

"اوہ' تمہارا پاؤں تو نہیں دکھ رہا؟"

"نہیں' ٹھیک ہے اور تمہارا سر درد؟" اس نے پھر سے جارحیت کے پردے میں دفاع کیا۔

"میں ٹھیک ہوں!" حیا نے اس بات پہ گردن موڑ کر بغور اس کا چہرہ دیکھا۔

"آخری دفعہ سچ کب بولا تھا؟"

"ابھی دس سیکنڈ پہلے جب میں نے کہا کہ میں ٹھیک ہوں۔"

وہ جانتی تھی کہ اگر اس کے سر میں درد تھا' تب بھی وہ نہیں بتائے گا۔

چند لمحے خاموشی سے گزرے۔ باہر چلتی گرم ہوا کے تھپیڑوں کے سوا کوئی آواز نہ سنائی دیتی تھی۔

"ہم کیلیس کب پہنچیں گے؟" اس نے اب کے ذرا اکتا کر کوئی تیسری دفعہ پوچھا۔

"دو گھنٹے مزید لگیں گے۔ میں نے نہیں کہا تھا کہ آؤ تم خود مصر تھیں۔"

"شکایت تو نہیں کر رہی۔ ٹائم ہی پوچھ رہی ہوں۔"

"کوئی سترویں دفعہ پوچھ رہی ہو۔" وہ باقاعدہ برا مان گیا تھا۔ "اور تم تو کیپاڈوکیہ دیکھنے آئی تھیں۔ پھر کیلیس آنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"میری مرضی!" اس نے بے نیازی سے شانے اچکائے۔ یہ کہہ نہیں سکتی تھی کہ وہ اس کو اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ وہ اسے کھو نہ دے۔

گاڑی اسی طرح سنسان سڑک پہ دوڑ رہی تھی۔ شاذونادر آس پاس سے اکادکا گاڑی گزر جاتی' ورنہ ہر سو سنہری سی خاموشی تھی۔

"ہم کیلیس میں کہاں رہیں گے؟" کبھی کبھی بھارے گل بننے میں حرج نہیں ہوتا' سو اس نے پھر سے سوال کیا۔

"ایک سیف ہاؤس ہے۔ رات وہیں رہیں گے۔ آج اتوار ہے۔ کل پیر کا دن بھی وہیں گزاریں گے۔ پھر میں کل رات بارڈر پہ چلا جاؤں گا' اور تم پرسوں صبح استنبول چلی جاؤ گی۔ پھر پرسوں رات تم پاکستان کی فلائٹ لے لو گی۔ اب اگر کہتی ہو تو اکہترویں دفعہ سارا پلان دہرا دیتا ہوں۔"

"اتنی بری لگ رہی ہوں تو نہ لاتے مجھے۔ تم نے ایک دفعہ بھی منع نہیں کیا اور فوراً" راضی ہو گئے۔ تم اندر سے خود یہی چاہتے تھے کہ میں تمہارے ساتھ آؤں!"

"واہ ..... یہ سن کر میری آنکھیں بھر آئیں۔" جہان نے مسکراہٹ دبائے سر جھٹکا۔ وہ یقیناً گاڑی کے سونے سے بور ہو رہا تھا اور چاہتا تھا کہ وہ جاگ جائے اور جلی کٹی ہی سنائے' مگر بولتی رہے' مگر مجال ہے جو یہ آدمی اعتراف کر لے۔

وہ خفگی سے رخ موڑے بائیں طرف باہر دیکھتی رہی۔ پاکستان میں ڈرائیونگ سیٹ دائیں طرف ہوتی تھی' مگر ترکی میں بائیں جانب تھی' سو وہ جہان کے دائیں جانب بیٹھی تھی۔

سورج اب پوری طرح سے نکل آیا تھا۔ کل رات جب انقرہ میں ہوٹل سے جہان نے اسے پک کیا تھا' تب سے اب تک وہ حالت سفر میں تھے۔

"ویسے اب بتاؤ' دنیا کا سب سے خوب صورت شہر کون سا ہے؟" وہ اسے چھیڑ رہا تھا۔

"اسلام آباد!" وہ بے نیازی سے بولی۔

"اچھا!" اسٹیرنگ وہیل گھماتے ہوئے جہان نے اثبات میں سر ہلایا۔ "اور ہیلن آف ٹرائے کے ٹرائے" کا تو سنا ہو گا تم نے؟"

"ہاں' اس کا یہاں کیا ذکر؟" وہ دور نظر آتے پہاڑوں کو دیکھ کر بولی۔

"ٹرائے کا تاریخی شہر ترکی میں ہی واقع ہے۔ اور ہیلن آف ٹرائے کی کہانی ترکی کی ہی ہے۔"

"اچھا!" جہان نے اپنے تئیں اسے متاثر کرنے کی کوشش کی مگر حیا نے ذرا اثر نہیں لیا۔ وہ ابھی ڈی جے کی دوست ہونے کا حق ادا کرنا چاہتی تھی۔

جہان کچھ دیر دانت سے لب دبائے کچھ سوچتا رہا' پھر ایک دم اس نے گردن موڑ کر حیا کے اس طرف دور سے دکھائی دیتے پہاڑوں کو دیکھا اور ایک مسکراہٹ اس کے لبوں پہ آ گئی۔

"اس پہاڑ کا نام معلوم ہے تمہیں؟"

حیا اسی طرف دیکھ رہی تھی' بس ذرا سے شانے اچکائے۔ "نہیں۔"

"وہ ماؤنٹ نمروت ہے۔" کہہ کر جہان نے اس کے تاثرات دیکھے۔

"اچھا!" وہی بے نیازی۔

"نہیں' تم نہیں سمجھیں۔ یہ ماؤنٹ نمروت ہے۔ نمروت کو تو جانتی ہو گی تم؟"

"کون؟" اس کے لبوں سے پھسلا پھر یاد آیا' ترکوں کے جو نام "ت" پہ ختم ہوتے تھے' وہ ہمارے ہاں "د" پہ ختم ہوتے تھے۔ احمت سے بنا احمد' مولوت سے بنا مولود اور نمروت سے بنا.....

"نمرود؟ بادشاہ نمرود؟" وہ چونکی۔

"ہاں' وہی نمرود اور یہ وہی پہاڑ ہے جہاں نمرود نے ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں اتارا تھا۔"

"اللہ' اللہ' یہ وہ پہاڑ ہے؟ وہ پہاڑ ترکی میں ہے؟" اس کو حیرت کا جھٹکا سا لگا تھا۔ وہ فوراً" سیدھی ہو بیٹھی۔ وہ بھورا سا پہاڑ' جو ان سے بہت دور تھا' کافی دیر سے ان کے ساتھ چلا آ رہا تھا۔ یہ تھا وہ پہاڑ؟ وہ پانچ ماہ سے ترکی میں تھی اور اسے کبھی یہ نہیں پتا چلا کہ وہ سارا قصہ' وہ سب آج کے ترکی میں ہوا تھا؟

جہان اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر آسودہ سا مسکراتے ہوئے ڈرائیو کر رہا تھا اور وہ اپنا اسلام آباد بھلائے بنا پلک جھپکے اس پہاڑ کو دیکھ رہی تھی۔

وہ چار ہزار سال پرانا قصہ' وہ جس کا ذکر قدیم مقدس کتابوں میں ملتا ہے' وہ اس پہاڑ پہ پیش آیا تھا۔ بالکل اسی پہاڑ پہ جب ابراہیم علیہ السلام کو' ان ابراہیم علیہ السلام کو جنہیں یہود' عیسائی اور مسلمان' سب اپنا پیغمبر مانتے ہیں' ان کو آگ میں ڈالا گیا تھا۔ اس آگ میں جو جلا دیتی ہے۔ جو راکھ کر دیتی ہے۔ مگر وہ آگ ان کے لیے گلزار بن گئی تھی۔ نرم گلابوں کی طرح۔

لیکن پھر ہر کسی کے پاس قلب سلیم تو نہیں ہوتا نا۔ اور جانے اس سلیم دل کو حاصل کرنے کے لیے پہلے انسان کو کتنا جلنا پڑے' یہاں تک کہ آگ اس پہ اثر کرنا چھوڑ دے۔ ہاں' تپش اثر کرنا چھوڑ دیا کرتی ہے جب جل جل کر انسان کندن بن جاتا ہے اور پھر لوگ پوچھتے ہیں کہ آپ کو عبایا میں گرمی نہیں لگتی اور حجابی لڑکی حیران ہوتی ہے کہ گرمی؟ کون سی گرمی؟

اس نے بے اختیار اپنے بازو کے اوپری حصے کو چھوا جہاں داغے گئے تین حروف آج بھی ویسے ہی تھے۔

WHO وہ کون تھی؟

ہاں' بہت گناہگار' بہت غلطیاں کرنے والی ہی سہی۔ بہت نافرمان قسم کی مسلمان ہی سہی' مگر سامنے اس پہاڑ پہ نقش تاریخ سے "ایک امت" ہونے کا رشتہ تو تھا ہی اور زندگی میں بعض لمحے ایسے ہوتے ہیں جب کسی مسلمان کو خون کے ابلتے جوش' بازو پہ کھڑے ہوتے رونگٹوں اور فرط جذبات سے بھیگتی آنکھوں کے ساتھ اپنے مسلمان ہونے پہ بہت فخر محسوس ہوتا ہے۔

اس کے لیے بھی وہ ایک ایسا ہی لمحہ تھا۔

☼ ☼ ☼
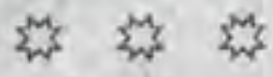
کیلیس قریب آیا تو نمروت داغ (کوہ نمرود) دور ہو تا گیا' مگر اس کا سحر ابھی تک قائم تھا۔ جہان بتا رہا تھا کہ نمروت داغ پر نمرود کے بڑے بڑے مجسمے بنے ہیں جن کے سر کاٹ دیے گئے ہیں۔ اب وہ کٹے ہوئے سر پہاڑ کے قدموں میں جا بجا پڑے ہیں اور سیاح ان پہ اسٹول کی طرح بیٹھ کر تصاویر بنواتے ہیں۔ جو سر جھکتے نہیں' وہ اسی طرح کاٹ دیے جاتے ہیں۔ چلو' وقت انسان سے جو بھی چھینے' کم از کم اس بات کا فیصلہ تو کر ہی دیا کرتا ہے کہ کون تاریخ کے درست طرف تھا اور کون غلط طرف۔

کیلیس سے ذرا دور' وہ ایک گیس اسٹیشن پہ رکے تو جہان نے کہا کہ وہ ادھر موجود اسٹور سے گفٹ لینا چاہتا ہے۔ کس کے لیے؟ اس نے نہیں بتایا۔ یقیناً" اپنے میزبانوں کے لیے۔ وہ بھی گاڑی سے نیچے اتر آئی۔

اسٹور میں آکر وہ پرفیوم والے ریک کی طرف چلا گیا۔ خالص زنانہ پرفیومز۔ اسے شبہ ہوا کہ وہ کسی لڑکی کے لیے شاپنگ کر رہا ہے۔ عجیب سا لگا۔

کیلیس چھوٹا سا قصبہ تھا۔ تنگ مگر صاف گلیاں۔ خوانچہ فروش، پھلوں سبزیوں کی ریڑھیاں۔ پاکستان کے کسی چھوٹے شہر جیسا، مگر زیادہ صاف ستھرا۔ قریباً" آدھے گھنٹے بعد وہ ایک ایسی ہی گلی میں ایک گھر کے دروازے پہ کھڑے تھے۔ دستک دینے کے چند لمحوں میں ہی دروازہ کھل گیا۔

"مرحبا!" معمر خاتون نے مسکراتے ہوئے سلام کیا۔ مسکراہٹ کا پتا آنکھوں سے چلا، ورنہ انہوں نے کھلے اسکرٹ اور لمبے بلاؤز کے اوپر اسکارف سے نقاب لے رکھا تھا۔

"مرحبا!" ساتھ ہی جہان نے حیا کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ خاتون راستہ چھوڑ کر کھڑی تھیں۔ حیا نے ذرا جھجک کر جہان کو دیکھا، پھر ان خاتون کو سر کے اثبات سے سلام کا جواب دیتی اندر داخل ہوئی۔

چھوٹا سا صحن، آگے کمرے کا دروازہ تھا۔ برآمدہ وغیرہ نہیں تھا۔ وہ تینوں دروازے تک ساتھ آئے۔ چوکھٹ پہ جہان جھک کر بوٹ کے تسمے کھولنے لگا، پھر جھکے جھکے گردن اٹھا کر آنکھوں سے حیا کو ذرا خفگی سے اشارہ کیا۔

"اوہ!" وہ جلدی سے آگے بڑھی اور نقاب اتارتے ہوئے، "تعظیماً" ان خاتون کا ہاتھ لے کر چوما اور آنکھوں سے لگایا۔

"یہ میری بیوی ہے، حیا!" وہ اب جوتے پیروں سے نکال رہا تھا۔ خاتون نے مسکراتے ہوئے اسے دعا دی۔ عمر میں برکت اور نعمتوں کی بقا کی دعا۔

وہ مسکراتے ہوئے دوبارہ نقاب کرنے لگی تو وہ سیدھا ہوتے ہوئے بولا۔ "یہاں اور کوئی نہیں ہے۔ اتار دو۔" پھر ان خاتون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ "یہ مریم خانم ہیں۔ میرے دوست علی کرامت کی والدہ۔"

اللہ اللہ! یہ تھیں وہ؟ حد ہے، جہان نے بتایا ہی نہیں۔

"بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔" وہ واقعی خوشی سے بولی تھی۔ وہ خاتون مسکراتے ہوئے سر ہلا کر انہیں اندر لے گئیں۔

"خانم! ہم کھانا کھائیں گے، مگر کوئی تکلف مت کیجیے گا۔ جو بنا ہے، لے آئیں۔" وہ ذرا اونچی آواز سے بولا۔ حیا خاموش ہو گئی۔ پھر کچھ غلط پوچھ لیا تھا شاید۔

"ہاں۔ تم بیٹھو، میں کھانا لاتی ہوں۔" اس کی اپنائیت پہ ان کی پھیکی پڑتی مسکراہٹ دوبارہ زندہ ہوئی اور وہ باہر چلی گئیں۔

"تم مریم خانم کے لیے لائے ہو پرفیوم؟" اس نے پھر سوال کیا۔ حالانکہ ابھی اس کے سامنے ہی تو جہان نے ان کو وہ گفٹ بیگ تھمایا تھا۔

"ہاں! ان کو خوشبو پسند ہے۔ جب میں چلا جاؤں گا تو وہ اسے ضرور استعمال کریں گی اور انہیں اچھی بھی لگے گی۔" وہ ان کا ذکر بہت محبت اور ادب سے کر رہا تھا۔ اس کی اپنی مرہ جیلہ۔

پھر کھانے کے وقت مریم خانم نے ڈش اس کے آگے کرتے ہوئے کہا۔

"جہان کو بورک بہت پسند ہے اور ایران بھی۔ تمہاری پسند کا ایک میٹھا۔ کیا تم یہ کھا لو گی؟"

"جی بالکل۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پہلی دفعہ اسے احساس ہوا تھا کہ اسے جہان کی پسند ناپسند کا علم نہیں۔ کھانے کے بارے میں ہی سہی۔

ایران ترک لسی تھی اور بورک سموسے یا کچوری کی ہی ایک جدید شکل تھی)۔ جہان بہت شوق سے کھا رہا تھا۔ گو بہت زیادہ نہیں۔ مگر خلوص اور محبت کا بھی اپنا ذائقہ ہوتا ہے۔

"تمہارا کمرا اوپر تیار ہے تم آرام کر لو۔" کھانے کے بعد وہ ہاتھ دھو کر آیا تو مریم خانم نے کہا۔

"جی۔" وہ اثبات میں سر ہلاتا، رومال سے ہاتھ صاف کرتا اور حیا کو ایک نظر (جیسے کہہ رہا ہو، میں ذرا آرام کر لوں) دیکھ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ حیا نے گردن موڑ کر دیکھا۔ ادھ کھلے دروازے سے سیڑھیاں نظر آ رہی تھیں۔ وہ ان پہ چڑھتا اوپر جا رہا تھا۔ اس سے جیسے وہ بہت مانوس تھا۔

"لائیں! میں آپ کی مدد کر دیتی ہوں۔" وہ ان کے ساتھ برتن اٹھانے لگی۔ کچن میں آکر اس نے دیکھا کہ مریم خانم نے اپنا نقاب اتار دیا تھا۔ وہ واقعی سیاہ فام تھیں۔ لیکن پھر بھی خوب صورت تھیں اور محبت پسندیدگی کو تو نہیں کہتے۔ عربی لغت میں تو محبت کہتے ہی کسی شخص کا کسی دوسرے کی نظر میں خوب صورت لگنے کو ہیں۔ اتنا خوب صورت کہ وہ دل میں کھب جائے اور واقعی اتنی خوب صورت تو پھر وہ تھیں ہی!

ان کا گھر چھوٹا تھا، مگر سلیقے سے سجا ہوا۔ بڑے گھر تو سب سجا لیتے ہیں۔ اصل آرٹ تو چھوٹا گھر سجانا ہوتا ہے۔ بیٹھک سے نکلو تو ایک طرف سیڑھیاں اور دوسری جانب کچن تھا۔

"تم بھی آرام کر لو۔ کافی تھک گئی ہو گی۔" جب وہ کچن میں موجود پھیلاوا سمیٹنے لگی تو مریم خانم نے بہت اپنائیت سے کہا۔ حیا نے ایک نظر کھلے دروازے سے نظر آتی سیڑھیوں کو دیکھا۔ اوپر ایک ہی کمرا ہو گا ظاہر ہے اور کتنا برا لگے گا اگر ابھی ادھر چلی گئی۔

"نہیں! اصل میں میں تو سوتی آئی تھی۔ ویسے بھی تھک گئی ہوں بیٹھ بیٹھ کے۔ اب لیٹنے کا دل نہیں کر رہا وہ آرام کرے گا ابھی۔ میں آپ کے ساتھ بیٹھوں گی۔"

"چلو! جیسے تمہاری مرضی۔" وہ مسکرا کر بولیں۔

جب کچن سمیٹ لیا تو وہ دونوں پھر اس فرشی نشست والے کمرے میں آ بیٹھیں۔ چند لمحے خاموشی سے گزر گئے۔ حیا کی سمجھ میں نہیں آیا، وہ کیا کہے۔ نئی جگہ تھی۔ وہ بے تکلف ہونا نہیں چاہ رہی تھی۔ مگر اس گھر میں کچھ انوکھی سی اپنائیت تھی۔

"کیا وہ اکثر یہاں آتا رہتا ہے؟"

"کبھی کبھی آتا ہے۔ وہ بھی پچھلے تین سال سے۔ جب سے اس کا کاروبار اس جگہ پہ ہو گیا ہے۔"

اس بات پہ حیا نے غور سے ان کا چہرہ دیکھا۔ مگر یوں لگتا تھا جیسے وہ نہیں جانتیں، وہ کون سا کاروبار کر رہا ہے۔

"تمہاری شادی کب ہوئی تھی؟" انہوں نے مسکرا کر محبت سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔ وہ ذرا گڑبڑا گئی۔ پتا نہیں، جہان نے کیا کہہ رکھا تھا۔ پھر زبردستی ذرا سا مسکرائی۔

"زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔" (بیس بائیس سال ہونے والے ہیں)

"اچھا! اللہ تعالیٰ تمہیں خوش رکھے۔" وہ مسکرا کر سر ہلاتی دعا دے رہی تھیں۔ عربوں کی مخصوص عادت۔

☼ ☼ ☼

رات میں اس نے مریم خانم کے ساتھ مل کر کھانا تیار کروایا تھا۔ انہوں نے آج مانتی بنائے تھے۔ عجیب و غریب سی ڈش تھی۔ مگر مزے دار تھی۔ مریم خانم کے بقول جہان کو بہت پسند تھی۔ جب وہ دسترخوان پہ برتن لگا رہے تھے۔ تب وہ سیڑھیوں سے اترتا ہوا دکھائی دیا۔

"جہان! مجھے مریم آنٹی نے وہ کارڈ بھی دکھایا ہے، جو تم نے ان کے لیے لکھا تھا۔ آنٹی! آپ تو جہان کو اس سے بھی پہلے سے جانتی ہیں نا؟" جب وہ اندر قالین پر آکر بیٹھا تو اس کے سامنے پلیٹ رکھتے ہوئے حیا نے مسکراہٹ دبائے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ مریم آنٹی اس کے پیچھے ٹرے لے کر کمرے میں داخل ہو رہی تھیں۔ اس کی بات پر مسکرا کر سر اثبات میں ہلایا۔

"ہاں بیٹا! عرصہ ہو گیا ہے ان کے ساتھ تو۔" انہوں نے مانتی کی ڈش دسترخوان کے وسط میں رکھتے

ہوئے کہا۔ پھر خود بھی وہیں بیٹھ گئیں۔

تمام برتن رکھے جاچکے تھے اور ان کے گرد وہ تینوں تکون کے تین خانوں کی طرح آمنے سامنے بیٹھے تھے۔

"تو پھر بتائیں نا آنٹی! جہان بچپن میں کیسا تھا؟" وہ اسی طرح مسکراہٹ دبائے گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کے بیٹھی مزے سے پوچھنے لگی۔

کھلے بال سمیٹ کر کندھے پہ ایک طرف ڈالے لمبی جامنی قمیص پہ شانوں پہ ٹھیک سے زیتونی دوپٹا پھیلائے وہ اس گھر کے ساتھ بہت مانوس لگ رہی تھی۔

"جہان کیسا تھا؟ ایسا ہی تھا جیسے اب ہے۔" آنٹی ڈش اس کے سامنے کرتے ہوئے مسکرا کر کہنے لگیں۔ وہ اس دوران سر جھکائے خاموشی سے پلیٹ میں کھانا ڈال رہا تھا۔

"تو بتائیں نا اب اور تب وہ کیسا تھا؟"

اس نے ابرو اٹھا کر سنجیدگی سے حیا کو دیکھا پھر سر جھٹک کے اپنی پلیٹ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"بھئی! ایسا ہی تھا۔ بہت سمجھ دار، بہت تمیز دار لڑکا۔ ہماری جدکی کے لڑکے جب کھیلتے تھے تو گیند اکثر ہمارے گھروں کی چھت پر آجاتی تھی۔ لڑکے بغیر پوچھے گھروں میں پھلانگ لیتے تھے۔ مگر یہ تو بہت اچھا بچہ تھا۔ کبھی بغیر پوچھے کسی کے گھر میں نہ داخل ہوتا نہ بغیر پوچھے کسی کی چیز اٹھائی۔ کبھی کسی کی باتیں نہیں سنیں۔ کسی کی بات اِدھر سے اُدھر نہیں کی۔ بہت ہی سعادت مند لڑکا تھا۔" آنٹی بڑی محبت اور اپنائیت سے بتا رہی تھیں اور وہ منہ آدھا کھولے ہکا بکا سی سن رہی تھی۔ جبکہ سعادت مند لڑکے نے اسی سعادت مندی سے اثبات میں سر ہلایا۔

"بس! اللہ کا کرم ہے خانم! میری ممی کی تربیت بہت اچھی تھی۔" ساتھ ہی اس نے مسکراہٹ دبائے حیا کو دیکھا جس کے چہرے کی خفگی بتا رہی تھی کہ اسے یہ ساری باتیں بالکل بھی اچھی نہیں لگ رہی تھیں۔ وہ خاموشی سے اپنی پلیٹ میں کھانا نکالنے لگی۔ اگر وہ سمجھتی تھی کہ جہان نے صرف اس کو بے وقوف بنایا ہے تو وہ غلط تھی۔ اس فہرست میں تو بہت سارے لوگ تھے۔ اللہ سمجھے اس کو۔

رات میں آنٹی کے اپنے کمرے میں چلے جانے کے بعد وہ اوپر آ گئی۔ گیسٹ روم اچھا تھا۔ ڈبل بیڈ، نفیس بیڈ شیٹ۔ چھوٹے سے گھر کا چھوٹا سا کمرا۔ بالکنی میں کھلتا دروازہ (ترکوں کے بالائی منزل کے کمروں میں بالکنی میں کھلتے دروازے ضرور ہوا کرتے تھے)

جہان کمرے میں نہیں تھا۔ وہ بیڈ کی پائنتی پہ آ بیٹھ گئی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کرے۔ بالکنی کے دروازے پہ آہٹ ہوئی تو وہ فوراً اٹھنے لگی۔

"بیٹھو، بیٹھو!" وہ ہاتھ اٹھا کر روکتا عجلت میں آگے آیا۔ کرسی کے سائیڈ سے اپنا بیگ اٹھایا اور اسے کھولنے لگا۔ حیا اٹھتے اٹھتے واپس بیٹھ گئی۔

"تم سو جاؤ۔ مجھے ذرا کام ہے۔" اپنے بیگ سے اپنا لیپ ٹاپ نکالتے ہوئے اس نے حیا سے کہا۔ لیپ ٹاپ کو اپنے سامنے کھول کر وہ اب کچھ سی ڈیز نکال کر الٹ پلٹ کرنے لگا تھا۔ وہ خاموشی سے اس کو دیکھے گئی۔ ایک سی ڈی نکال کر جہان نے لیپ ٹاپ میں ڈالی۔ چند لمحے کے لیے کچھ دیکھا۔ پھر سی ڈی واپس نکالی۔ کور میں ڈالی۔ لیپ ٹاپ کو اٹھا کے بیگ میں رکھا اور پھر ذرا چونک کر اسے دیکھا۔ وہ ابھی تک جہان کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے دیکھنے پر ذرا گڑبڑا کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔

"تم سو جاؤ۔ میں جا رہا ہوں۔ لیکن ان کو مت بتانا۔" بیگ اٹھا کے زپ بند کرتے ہوئے وہ کھڑا ہوا۔ اسے کندھے پہ ڈالا اور پھر بالکنی کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

وہ متفکر سی کھڑی ہوئی۔ "کب آؤ گے؟"

"صبح! اندر سے دروازہ بند کر لو۔ میرے پاس

دوسری چابی ہے۔" اس نے مڑے بغیر کہا اور باہر نکل گیا۔

"کاش! اس وقت مریم خانم سن لیتیں کہ ان کے گھر کی کتنی چابیاں ان کے سعادت مند بیٹے کے پاس ہیں۔"

حیا نے دروازہ بند کرتے ہوئے ذرا سی جھری سے باہر دیکھا۔ باہر ایک خستہ حال زینہ تھا جو گھر کی پشت پہ اترتا تھا۔ بیک ڈورز کی عادت تو اسے ہمیشہ سے تھی۔ اس نے دروازہ بند کر دیا اور اس کی پشت سے ٹیک لگائے چند گہری سانسیں اندر اتاریں۔

"چوبیس گھنٹے ۔۔۔ پورے چوبیس گھنٹے بعد وہ کیلس کے بارڈر پہ ہوں گے۔ کل کی رات بلاشبہ ایک یادگار رات ہوگی۔" اس نے سوچا۔

وہ اس کی سوچ سے بھی زیادہ یادگار ہوگی، یہ وہ نہیں جانتی تھی۔

☆ ☆ ☆

صبح کا سنہری دودھیا پن کیلس کے کھیتوں اور زیتون کے درختوں کے جھنڈ پہ قطرہ قطرہ اتر رہا تھا۔ وہ کمرے میں رکھی اس واحد کرسی پر ٹیک لگا کر بیٹھی منتظر سی بالکنی کے دروازے کو دیکھ رہی تھی۔ سامنے میز پہ ناشتے کے برتن خالی پڑے تھے۔ وہ کافی دیر سے اسی پوزیشن میں بیٹھی تھی۔ اجرک کے لمبے کرتے میں ملبوس بالوں کا ڈھیلا جوڑا بنائے۔ منتظر، مضطرب مگر پرسکون۔

دفعتاً" دروازے کی کی ہول سے کلک کی آواز آئی۔ آہستہ سے دروازہ کھلا۔ پٹ دونوں ہاتھوں سے پکڑے جہان نے دبے پاؤں اسے یوں دھکیلا کہ اس کی چرچراہٹ کم سے کم سنائی دے۔ ابھی آدھا کھلا تھا کہ اس کی نگاہ سامنے بیٹھی حیا پہ پڑی۔ وہ شاید اس کے آرام کے خیال سے آہستہ کھول رہا تھا۔ اسے جاگتا ہوا دیکھ کر سیدھا ہوا اور اندر آ کے دروازہ بند کیا۔

"صبح بخیر! اٹھ گئیں؟"

"ہاں! کب کی۔"

جہان نے اپنا بیگ بیڈ پہ رکھا۔ وہ تھکا ہوا نہیں لگ رہا تھا۔ ٹھیک ہی تھا۔ شاید رات کہیں اور سویا تھا یا شاید نہیں۔ پتا نہیں کیا کرتا رہا تھا۔

"کیا خانم آئی تھیں؟" وہ الماری کی طرف بڑھا۔ جہاں اس کے کپڑے رکھے تھے۔

"ہاں! ناشتا دے گئی تھیں۔ میں نے تمہارا نہیں بتایا۔"

"اچھا! کیا بنایا ناشتے میں؟" شاید ان کے ہاتھ کا ذائقہ اسے بہت پسند تھا، سو ذرا دلچسپی سے پوچھا۔ ساتھ ہی الماری میں رکھے کپڑوں کو الٹ پلٹ کر کے دیکھ رہا تھا۔

"بورک لائی تھیں۔ ایک میرا اور ایک تمہارا۔"

"تم نے اپنا کھا لیا؟"

"ہاں!"

"اور میرا؟" اس نے ایک شرٹ اور تولیہ نکال کر کندھے پہ ڈالتے ہوئے باتھ روم کی طرف جاتے جاتے مڑ کر پوچھا۔

"تم تھے نہیں۔ اب واپس کیا کرتی۔ تو میں نے وہ بھی کھا لیا۔"

وہ جو کسی اور جواب کی توقع میں باتھ روم کی طرف جانے ہی لگا تھا، رک کر بے حد تحیر سے اسے دیکھا۔

"تم نے میرا ناشتا بھی کھا لیا؟"

"ہوں!" اس نے آرام سے سر ہلایا۔ ٹانگ پہ ٹانگ چڑھائے، ٹیک لگائے وہ مزے سے بیٹھی تھی۔

جہان نے تاسف سے اسے دیکھا۔

"دادا کہتے تھے کہ ان کے زمانے میں بیویاں شوہر کے آنے سے پہلے کھانا نہیں کھایا کرتی تھیں۔"

"یہ تمہارے دادا کیا فرعون کے زمانے کے تھے؟" وہ منہ بنا کے بولی۔ "ابھی تو گزرا ہے ان کا زمانہ۔ اب بھی وہی راج ہیں۔ پتا نہیں بڑوں کو کیا نوسٹیلجیا ہوتا ہے کہ شاید ان کا زمانہ زیادہ اچھا تھا۔"

"اس کی بات پہ جہان نے افسوس سے ذرا سا سر

جھٹکا۔

"اچھا سنو! مریم خانم کے کچن کی اوپر والے کیبنٹس میں سے دائیں ہاتھ کی تیسری کیبنٹ کھولو گی تو وہاں کھانے پینے کی بہت سی چیزیں پڑی ہوں گی۔ کچھ نکال لاؤ میرے لیے۔"

"اللہ اللہ، جہان! کل وہ کس کے بارے میں کہہ رہی تھیں کہ وہ سعادت مند لڑکا تھا۔ کبھی بغیر پوچھے چیز نہیں لیتا تھا۔"

"میں نے کب کہا ہے کہ بغیر پوچھے لو۔"

"تم نے یہ بھی نہیں کہا کہ پوچھ کے لو۔"

"بورک سے جی نہیں بھرا جو صبح صبح میرا دماغ کھا رہی ہو؟" وہ خفگی سے کہتا باتھ روم میں چلا گیا اور دروازہ زور سے بند کیا۔

اس کے جانے کے بعد حیا کے لبوں پہ مسکراہٹ اُمڈ آئی۔ وہ شرارت سے نچلا لب دانتوں سے دبائے اٹھی۔ سائڈ ٹیبل کے پردے کے پیچھے سے ایک ڈھکی ہوئی پلیٹ نکالی اور پھر اوپر والی پلیٹ اٹھا کے جہان کا بورک دیکھا۔ اسے دوبارہ ڈھکا اور پھر سامنے میز پر رکھا۔ چند لمحے کے لیے کھڑی سوچتی رہی۔ پھر اپنا پرس اٹھایا۔ اندر سے پین اور پوسٹ اٹ نوٹ کا چھوٹا پیڈ نکالا۔ اوپری صفحے پر لکھا۔

"تمہارے دماغ سے بورک کا ذائقہ بہت اچھا ہے۔" اور اس نوٹ کو پیڈ سے پھاڑا اور پھر اوپری پلیٹ پہ چپکا دیا۔ چند لمحوں بعد وہ کمرے سے باہر تھی۔

کچھ دیر بعد جہان نیچے آیا تو وہ دونوں فرشی نشست والے کمرے میں بیٹھی تھیں۔ اسے دیکھ کر وہ ذرا سا مسکرایا۔ وہی اپنائیت بھری مسکراہٹ۔ غالباً "بورک" اسے مل گیا تھا۔ وہ بھی جواباً" مسکرائی۔ دونوں نے کہا کچھ بھی نہیں۔ پھر وہ تھوڑی دیر بیٹھ کر کسی کام کا کہہ کر باہر نکل گیا۔

دوپہر میں مریم خانم جب کپڑے دھونے کے لیے صحن میں آئیں تو وہ بھی اپنا عبایا اور اسکارف لے کر ادھر ہی آ گئی۔

"آنٹی! ایک بات تو بتائیں۔"

"پوچھو۔" انہوں نے دوران مصروفیت پوچھا۔

"جہان کہتا ہے کہ قرآن میں پہیلیاں ہوتی ہیں۔ کیا واقعی ایسا ہوتا ہے؟"

"دیکھو بیٹا! قرآن بذات خود پہیلی نہیں ہے۔ لیکن اس کے اندر بہت ساری نشانیاں ہیں۔ ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں اور یہ تو قرآن خود بھی بار بار کہتا ہے۔ ہاں! تم کہہ سکتی ہو کہ قرآن میں بہت ساری پہیلیاں ہیں۔"

"مگر آنٹی! قرآن تو آسان بنا کر اتارا گیا ہے نا تو پھر کیا ضروری ہے کہ ہر پہیلی ڈھونڈیں؟"

"نہیں! قرآن آسان بنا کر نہیں اتارا گیا۔ اس میں غور و فکر کرنا پڑتا ہے۔" وہ اب مشین کا ٹائمر لگا رہی تھیں۔

"لیکن آنٹی! اللہ تعالیٰ نے کہا کہ اس نے قرآن کو آسان بنا کر اتارا ہے؟"

"اللہ تعالیٰ نے یہ کہا ہے کہ قرآن کو یسر بنا کر اتارا ہے۔ لیکن آسان نہیں۔ یسر کا مطلب آسان نہیں ہوتا۔ یہ تو انگریزی اور دوسری زبانوں میں اس کا ترجمہ آسان کر دیا جاتا ہے۔ ورنہ اس کا مطلب آسان نہیں ہوتا۔ یسر کہتے ہیں، کسی چیز کو تمام ضروری لوازمات سے آراستہ کر کے اسے ready to use بنا دینے کو۔"

"مگر آنٹی! آسان بھی تو اسی چیز کو کہتے ہیں۔" وہ الجھی۔

"نہیں بیٹا! آسان کہتے ہیں پیس آف کیک کو۔ یعنی کسی کو کھانے کے لیے کیک کا ایک ٹکڑا دے دینا۔ اور یسر کا مطلب ہے کہ کسی کو انڈے، میدہ، گھی، چینی وغیرہ اور کیک کی ریسپی دے کر کچن میں بھیج دینا۔ سب اس کے ہاتھ میں ہو گا مگر کیک اسے خود بنانا ہو گا۔ اب یہ اس پہ منحصر ہے کہ وہ کیک بناتا ہے یا ان اشیا سے آملیٹ اور میدے کی روٹی بنا کر اصل مقصد سے ہٹ جاتا ہے۔ انسان کے لیے وہ ہی ہوتا ہے بیٹا جس

کی وہ کوشش کرتا ہے۔"

مشین زوردار آواز کے ساتھ چل رہی تھی۔ اس کے عبایا کو بھگوئے بھی کافی دیر ہونے کو آئی تھی، سو اس نے بالٹی سے اپنا گیلا عبایا اور اسکارف نکالا اور صحن کے کونے میں لگے سنک پہ لے آئی۔

"آنٹی! کیا سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں؟" نل کھول کر دونوں مٹھیوں سے سیاہ حریر کو بھینچتی، وہ اس سے جھاگ نکال رہی تھی۔ پانی غٹاغٹ کی آواز کے ساتھ سنک کے پائپ سے نیچے جا رہا تھا۔

"ہاں! کیوں نہیں۔"

"تو پھر وہ پیچھے کیوں آتے ہیں؟" سنک پہ جھکے کھڑی کپڑا بھینچ بھینچ کر اس کے ہاتھ دکھنے لگے تھے۔ جھاگ اب ذرا کم ہوئی تھی۔

"یعنی ...؟" اس کی آنٹی کی طرف پشت تھی۔ وہ ان کی صرف آواز سن سکتی تھی۔

"یعنی کہ وہ ہمیں بار بار دکھائی کیوں دیتے ہیں؟" اس نے گیلے عبایا کو گٹھڑی کی صورت بنا کر دونوں ہاتھوں سے نچوڑا۔ پانی کی دھاریں بہتی گئیں۔

"تو اچھا ہے نا! ایسے انسان بار بار معافی مانگتا رہتا ہے، پھر ایک وقت آتا ہے کہ جب اس کے وہ گناہ بدل کر نیکی لکھ دیے جاتے ہیں۔"

"لیکن وہ ہمارا تعاقب ختم کیوں نہیں کر دیتے؟" اس کے ہاتھ میں اب ٹھنڈا سا عبایا رہ گیا تھا۔ حریر بھی خوب کپڑا تھا۔ اس کو گھڑے میں بھی ڈال دو تو ایک شکن نہ پڑتی۔ اس نے کبھی بھی اس کو استری نہیں کیا تھا۔ گول مول کر کے رکھ دو۔ مجال ہے جو چمک ماند پڑے۔

"سچے دل سے توبہ کرو تو گناہ نہیں آتے پیچھے۔"

اس نے تار پہ عبایا پھیلایا اور پھر ان کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ وہ اب مشین سے گیلے کپڑے نکال رہی تھیں۔ کن اکھیوں سے اسے اپنا عبایا ہوا سے پھڑپھڑاتا دکھائی دے رہا تھا۔

"مگر وہ کوفت تو دیتے ہیں نا! جیسے یہ عبایا مجھے کوفت دے رہا ہے۔ لگتا ہے ابھی ہوا کا تیز جھونکا آئے گا اور یہ اڑ کر میرے سارے منظر پہ چھا کر اس کو تاریک کر دے گا۔"

اس بات پہ مریم خانم ذرا سا مسکرائیں اور ٹوکری میں سے ایک کلپ اٹھا کر عبایا کے اوپر لگا دیا۔ حیا پل بھر کو بالکل ٹھہر گئی۔

"اب نہیں اڑے گا۔ بھلے کتنا ہی پھڑپھڑا لے۔ دعا بھی ایک کلپ کی طرح ہوتی ہے اور یہ گناہ اس لیے یوں پھڑپھڑاتے ہیں۔ تاکہ تم یہ یاد رکھو کہ اگر تم دوبارہ اس راستے کی طرف گئیں تو یہ کلپ ٹوٹ جائے گا اور کپڑا اڑ کر سب پہ چھا جائے گا۔ زمانہ اسلام میں آنے کے بعد جاہلیت کے سب گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔ لیکن ایک دفعہ پھر غلط راستے کی طرف جانے کی صورت میں وہ پچھلے گناہ زندہ ہو جاتے ہیں اور انسان کو اس پرانے زمانہ جاہلیت کا بھی حساب دینا پڑتا ہے!"

"تو ... تو گناہ اس لیے ہمیں دکھائے جاتے ہیں تاکہ ہم ڈرتے رہیں اور برائی کی طرف دوبارہ نہ جائیں؟"

"ہاں! اور تاکہ ہم خوف اور امید کے درمیان اللہ تعالیٰ کو پکارتے رہیں۔ اسی کو کہتے ہیں ایمان۔"

مشین کا ڈرائیر بزر بجانے لگا تھا۔ آنٹی اس کی طرف پلٹ گئیں۔ وہ بس ان کی پشت کو دیکھے گئی۔ ترکی کے خوب صورت لوگوں کی خوب صورت باتیں۔

☼ ☼ ☼

کیلیس کا آسمان سیاہ بادلوں سے ڈھکا تھا۔ آج رات اس پہ چاند نہیں اترا تھا۔ مکئی کے کھیت سنسان پڑے تھے۔ ہر سو زیتون کی رسیلی مہک اور بارش سے پہلے کی مٹی کی خوشبو پھیلی تھی۔

خاموش، تاریک رات۔

جہان نے بریک پہ زور سے پاؤں رکھا۔ گاڑی جھٹکے

سے رکی۔ حیا نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ سبز شرٹ نیلی جینز' اور ماتھے پہ بکھرے بال۔ وہ کچھ سوچتے ہوئے ونڈ اسکرین کے پار دیکھ رہا تھا۔

"کیا ہمیں اس سے آگے پیدل چلنا ہے؟" اس کے سوال پہ جہان کا ارتکاز ٹوٹا۔ اس نے چونک کر حیا کو دیکھا اور پھر سر ہلایا۔

"ہاں' زیادہ دور نہیں جانا۔ گاڑی یہیں چھوڑ دیتے ہیں۔ تم واپس اسی پہ آنا اور اسے خانم کے گھر چھوڑ دینا۔ اس کا مالک اسے وہیں سے لے لے گا۔" اپنی طرف کا لاک کھولتے ہوئے وہ کہتے کہتے رکا۔ "آر یو شیور! تم میرے ساتھ وہاں تک آنا چاہتی ہو؟"

"تمہیں کیا لگتا ہے' میری حس مزاح اتنی بری ہے کہ میں ایسی بات مذاق میں کہوں گی؟" وہ خفگی سے کہتی باہر نکل آئی۔

اس نے جہان کی ہدایت کے مطابق عبایا نہیں لیا تھا' تاکہ شامی عورتوں جیسی نہ لگے اور کیلس کی مقامی عورتوں کی طرح گھٹنوں سے نیچے گرتا ترک فراک' ٹراؤزر اور سر پہ مریم خانم کا پھول دار سیاہ سفید اسکارف یوں لے رکھا تھا کہ اسکارف ماتھے پہ لپیٹ کر اس کی دونوں تکونوں کی گرہ گردن کے پیچھے لگائی اور پھر ان کو کندھے پہ سامنے ڈال دیا' بالکل کشمیری عورتوں کی طرح۔ رات کے اندھیرے میں بھی اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔

"میں پہلے چلوں گا' جب اس جھاڑی تک پہنچ جاؤں۔" اس نے جھاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "تب تم چلنا' تاکہ ہمارے درمیان فاصلہ رہے۔"

حیا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ خاموشی سے آگے چلا گیا۔

حیا نے پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ وہاں دور دور کچھ بتیاں دکھائی دیتی تھیں۔ اس نے واپس آگے دیکھا جہاں وہ جا رہا تھا۔ وہاں ہر طرف اندھیرا تھا۔ پیچھے روشنی' آگے اندھیرا' علامتی امتزاج۔

جب وہ نشان زدہ مقام تک پہنچ گیا تو وہ چلنے لگی۔ اس نے پھر وہی' ہاں وہی سرخ ہیل پہن لی تھی' جس کی وجہ سے ... تھی کہ جہان اس سے چڑتا ہے' اسی لیے پہنی تھی۔ پاؤں کا درد ویسا ہی تھا' مگر اپنا سیاہ پرس پکڑے وہ کچی پکی زمین پہ بہرحال ہیل سے ٹھیک چل رہی تھی۔

آسمان پہ بادل وقفے وقفے سے گرجتے تھے۔ کل وہاں چاند نہیں تھا۔ آج وہاں ان کا چاند نہیں تھا۔

چند منٹ وہ یونہی چلتے رہے۔ پیر کا درد پھر سے ہونے لگا۔ اسے پچھتاوا ہوا۔ لیکن جہان کو چڑانا بھی تھا۔

وہ کھیت سے نکل کر اب ایک کھلے میدان میں چل رہے تھے۔ گرمی زوروں کی تھی۔ دور دور زیتون کے چند درخت نظر آتے تھے۔ جہان ایک بڑے سے درخت کے پاس جا کر رکا' اور مڑ کر اسے دیکھا۔ اندھیرے میں اس کا چہرہ صاف نظر نہیں آتا تھا۔ وہ سبک رفتاری سے چلتی اس تک آئی۔ سانس ذرا سا پھول گیا تھا۔

"وہ دیکھو!" جہان نے درخت کے اس پار اشارہ کیا۔ وہ تنے کی اوٹ سے بدقت دیکھنے لگی۔

بہت دور' کئی سو میٹر دور' سرحدی باڑ تھی۔ خاردار اونچے تار۔ اس کے اندر اضطراب بڑھتا گیا۔ دل کی دھڑکن سوا ہو گئی۔

"دو بجے تک ادھر ہی بیٹھتے ہیں۔" وہ سرگوشی کرتے ہوئے تنے سے ٹیک لگا کر زمین پہ بیٹھا (لگتا تھا میجر احمد بول رہا ہے) حیا بھی اسی کے انداز میں تنے سے پشت ٹکا کر اکڑوں بیٹھ گئی۔ دونوں نے اپنے بیگ ایک دوسرے سے مخالف سمت میں رکھ دیے تھے۔

اوپر سے بجلی زور سے چمکی۔ چاندنی لمحے بھر کو پھیلی اور پھر سارے میں سیاہی اتر آئی۔ حیا نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔

"کیا آج اسلام آباد میں بھی بادل ہوں گے؟" اس

نے وقت کا حساب کرنا چاہا۔ یہاں ساڑھے بارہ ہو رہے تھے تو ادھر ساڑھے دس ہوں گے۔ کبھی کبھی ڈنر اسی ٹائم کیا جاتا تھا۔ شاید اب بھی سب کھانا کھا رہے ہوں۔ ڈائننگ ٹیبل پہ سب ہوں۔ تایا ابا کی فیملی بھی' پھپھو بھی۔ وہ پلاسٹک کی بنی نتاشا بھی اور اگر کوئی ابھی ان کو بتائے کہ جہان اور حیا عین اسی وقت' ترکی اور شام کی سرحدی باڑ سے ذرا دور درخت تلے بیٹھے ہیں تو؟ اللہ' اللہ حیا۔ یہ وہ آخری موقع ہے جب ایسی بات تمہیں سوچنی چاہیے۔ اس نے خود کو سرزنش کی۔

جہان تنے سے سر ٹکائے' کلائی چہرے کے سامنے کیے گھڑی دیکھ رہا تھا' اس کا ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔

"کچھ وقت ادھر بیٹھنا ہو گا' پھر میں چلا جاؤں گا اور تم واپس!"

"جہان .... کیا یہ آخری طریقہ ہے شام جانے کا؟" وہ اس کو دیکھتے ہوئے فکر مندی سے بولی۔

"میرے لیے؟ ہاں!"

"مگر پہلے تو تم میرے ساتھ بھی کتنے آرام سے سفر کر لیتے تھے۔ تو اب؟"

"میں نے بتایا تھا نا' میرے ان سے تعلقات خراب ہیں۔ اس دفعہ میں یہی بارڈر کراس کر کے آیا تھا سو اب اسی طرح جا سکتا ہوں۔" وہ بہت دھیمی آواز میں سمجھا رہا تھا۔ آج دونوں کا لڑنے کا موڈ نہیں تھا۔

"مگر کیا تم جعلی پیپر ورک کر کے نہیں جا سکتے؟"

"میں اپنی شکل نہیں بدل سکتا حیا! میں ایئرپورٹ پہ گرفتار ہو جاؤں گا۔"

"بدل تو سکتے ہو!"

"وہ حیا سلیمان نہیں ہیں جن سے رات کے اندھیرے میں کوئی ڈراؤنی شکل بنا کر ملو تو وہ دن کی روشنی میں نہیں پہچانیں گے۔ وہ پورے ہجوم میں بھی اپنا بندہ ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ میں اس شکل پہ کوئی نارمل انسان والی دوسری شکل تو نہیں چڑھا سکتا نا۔"

"ہاں بس' جب کسی کو بے وقوف کہنا ہو تو میری مثال کافی ہے۔" وہ بغیر خفگی کے ہنس کر بولی تھی۔ پہلی دفعہ ایسی بات نے اسے خفا نہیں کیا تھا۔ وہ ذرا مسکرا کر سامنے دیکھنے لگا۔

چند لمحے بیتے۔ خاموشی کے بوجھ نے زیتون کی شاخوں کو مزید بوجھل کر دیا تو وہ بولی۔

"جہان! تمہاری زندگی کی سب سے بڑی خواہش کیا ہے؟"

"یہ کہ میں زندہ رہوں اور اس لمبی سی عمر میں اپنا کام کرتا رہوں۔"

اندھیرے میں بھی وہ اس کے چہرے پہ وہ چمک دیکھ سکتی تھی جو اب اس کے لیے' بہت مانوس تھی۔

"بہت محبت ہے نا تمہیں اپنی جاب سے؟"

"بہت زیادہ!" اس نے بس دو لفظ کہے۔ جذبات سے بوجھل لفظ۔ مزید کہنا بے کار تھا۔

"اور تمہاری زندگی کی سب سے بڑی خواہش؟" اس نے حیا سے پوچھا۔

"یہ کہ میں ایک کتاب لکھوں' جس میں قرآن کی آیات کے رموز پہ غور کروں۔ لفظوں میں چھپی پہیلیوں کو سلجھاؤں۔ ان کے نئے نئے مطلب آشکار کروں۔ کہتا ہے نا قرآن کہ اس میں نشانیاں ہیں' مگر ان لوگوں کے لیے' جو غور و فکر کرتے ہیں۔ میں بھی ان میں سے بننا چاہتی ہوں۔"

وہ محویت سے' ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے سن رہا تھا۔

"پھر کب لکھو گی یہ کتاب؟"

"کبھی نہ کبھی ضرور لکھوں گی' مگر پتا ہے' میں ایک بات جانتی ہوں کہ اگر دنیا کے سارے درخت قلمیں بن جائیں اور تمام سمندر روشنائی بن جائیں اور میں لکھنے بیٹھوں' اور مجھے اس سے دوگنا قلم اور روشنائی بھی دے دی جائے' تب بھی سارے قلم گھس جائیں گے' ساری روشنائی ختم ہو جائے گی' مگر اللہ تعالیٰ کی باتیں ختم نہیں ہوں گی۔"

پھر اس نے سر اٹھا کر درخت کی شاخوں کو دیکھا۔
"یہ زیتون کا درخت ہے نا' مبارک درخت!"
ایک مسکراہٹ اس کے لبوں پہ بکھر گئی تھی۔ اوپر گردن اٹھانے سے اسکارف سے نکل کر ماتھے پہ جھولتی لٹ کان تک جا گری تھی۔
"یعنی کہ تم واقعی قرآن پڑھتی ہو!" وہ اس کے شجرۂ مبارکہ کا حوالہ دینے پہ سمجھ کر بولا تھا۔
"ابھی تو نہیں۔" آواز میں ذرا شرمندگی در آئی۔
"بہت پہلے پورا پڑھا تھا۔"
"تم پہلے پڑھتی تھیں قرآن؟"
"میں شریعہ اینڈ لاء کی اسٹوڈنٹ ہوں۔ قرآن' حدیث' فقہ' شرعی احکام' پانچ برسوں سے یہی تو پڑھ رہے ہیں۔ مگر پہلے کورس کی طرح پڑھا۔ عمل میں اب لائی ہوں۔ وہ وقت گئے جب شریعہ اینڈ لاء میں صرف مذہبی رجحان والی لڑکیاں داخلہ لیا کرتی تھیں۔ اب تو شریعہ کی آدھی لڑکیاں ویسی ہی ہوتی ہیں جیسی پہلے میں تھی۔"
"اور اب؟" اس نے اسی روانی سے پوچھا تھا۔
"اب تو میں ... میں بس کل پاکستان جا کر ہی اپنا ٹائم ٹیبل سیٹ کرتی ہوں قرآن پڑھنے کا۔" وہ جیسے خود سے وعدہ کر رہی تھی۔
جہان نے اسے دیکھتے ہوئے دھیرے سے نفی میں سر ہلایا۔
"حیا! قرآن کبھی بھی کل نہیں پڑھا جاتا۔ قرآن آج پڑھا جاتا ہے۔ اسی دن۔ اسی وقت کیونکہ کل کبھی نہیں آیا کرتا۔"
"اوکے! پھر میں آج سے پڑھوں گی!" اس نے فوراً" بات مان لی۔ "اور اگر کوئی اور ہوم ورک ہے تو وہ بھی دے دو۔"
"جیسے تم میری بہت مانتی ہو؟"
"کیا نہیں مانا؟"
"میں نے کہا تھا' واپسی چلی جاؤ' مگر تم نہیں گئیں۔"
"ہاں تو میں اب بھی کیبلیس دیکھنے ہی آئی ہوں۔ تمہارے لیے تھوڑی ہی آئی ہوں۔" اس نے ناک چڑھائی۔
زیتون کی خوشبو' کچی پکی' رسیلی سی خوشبو ہر سو پھیل رہی تھی۔ جیسے اس نے کپادوکیہ میں غبارے سے خوبانی نہیں کھائی تھی' ایسے ہی اس کا دل اب زیتون کھانے کو بھی نہیں چاہا تھا۔ جہان ساتھ ہو تو بات سننے کے علاوہ کہاں کسی دوسرے کام کے لیے جی چاہتا تھا؟
کافی دیر بعد جب وہ ایک ہی پوزیشن میں بیٹھی بیٹھی تھک گئی تو ذرا سا پہلو بدلا اور ایسا کرتے ہوئے پاؤں کی سمت بدلی تو جوتے کی آواز آئی۔ جہان نے چونک کر دیکھا۔
"تم پھر یہی جوتے پہن آئی ہو؟" اس نے اب نوٹ کیا تھا یا پہلے سے جانتا تھا' وہ فیصلہ نہ کر سکی۔
"ہاں' کیونکہ مجھے پتا ہے' تمہیں یہ کتنے پسند ہیں۔"
"بالکل۔ ذرا ایک منٹ اتارنا۔"
"کیوں؟"
"بس ایک منٹ نا!"
حیا نے ذرا تذبذب سے جھک کر جوتوں کے اسٹریپس کھولے اور پاؤں ان سے نکالے۔ جہان نے ایک جوتا اٹھا کر الٹ پلٹ کیا۔
"اچھا ہے' مگر اتنا نہیں کہ ساتھ نبھا سکے۔" ساتھ ہی اس نے جوتے کے دونوں کناروں کو پکڑ کر جھٹکا دیا۔ چٹاخ کی آواز کے ساتھ جوتا درمیان سے ٹوٹا۔
"جہان' نہیں!" وہ بمشکل اپنی حواس باختہ چیخ روک پائی۔ جہان نے پروا کیے بغیر دوسرے کو بھی فوراً" ہی اٹھا کر اسی طرح توڑا۔ جوتے کی لکڑی ٹوٹ چکی تھی مگر چمڑے کے باعث دونوں ٹوٹے حصے ایک دوسرے سے منسلک تھے۔
جہان نے ایک ایک کر کے دونوں کو دور اچھال دیا۔ وہ اندھیرے میں گم ہو گئے۔ حیا شاکڈ سی اسے دیکھ رہی تھی۔
"کیوں کیا تم نے ایسا؟"
اس نے جواباً" بے نیازی سے شانے اچکائے۔
"دل چاہ رہا تھا۔"
"اب میں گھر کیسے جاؤں گی؟ کیا تم مجھے اپنے جوتے دو گے؟"
"میں بالکل بھی اپنے جوتے نہیں دوں گا۔"
"اور جو یہ یہاں اتنے پتھر' اتنے کانٹے اور جھاڑیاں ہیں' میں ان پہ کیسے ننگے پاؤں چل کر جاؤں گی؟" وہ خفگی سے بولی۔
"یہ جو تم نے اپنے پرس میں نیلے پلاسٹک بیگ میں گلابی رنگ کے کینوس شوز رکھے ہیں نا' تم یہ پہن کر واپس چلی جانا۔"
اور حیا ایک دم جھینپ کر ہنس دی۔
وہ ایک دفعہ پھر پکڑی گئی تھی' سوچا تھا۔ اس کو خوب چڑا کر واپسی پہ کینوس شوز پہن لے گی' مگر وہ جہان ہی کیا جو بلا اجازت کسی کا بیگ نہ چیک کرے۔
"میں دیکھنا چاہتی تھی کہ اگر میرا جوتا ٹوٹا تو تم مجھے جوتا دیتے ہو یا نہیں؟"
"اور تمہیں یقین تھا کہ میں نہیں دوں گا' اسی لیے تم دوسرا جوڑا اٹھا لائیں۔"
"ہاں' تمہارا کیا بھروسا۔ اسی لیے پلان بی میں نے تیار رکھا تھا۔ مگر یہ طے ہے کہ میں تمہیں نہیں آزما سکتی' اور تم بھلے مجھے کتنا ہی کیوں نہ آزماؤ۔" وہ محظوظ انداز میں بولی۔ "اور تم نے میرا بیگ چیک کیا' مطلب تمہیں مجھ پہ بھروسا نہیں ہے۔"
"اونہوں۔ بات بھروسے کی نہیں پروفیشنلزم کی ہے۔ اصول' اصول ہوتے ہیں۔ اپنے escort کو بغیر چیک کیے میں یہاں تک نہیں لا سکتا۔"
"اور کیا نکلا میرے پرس سے؟" وہ لطف اندوز ہوتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔
"ایک ٹوٹی ہوئی عینک اور اس رومال میں کیا تھا؟"
وہ ذرا چونکی' مسکراہٹ سمٹی۔ "تم نے اسے کھولا؟" آنکھوں میں بے چینی امڈ آئی۔
"نہیں۔"
"آخری دفعہ سچ کب بولا تھا؟"
"ابھی پانچ سیکنڈ پہلے جب میں نے کہا کہ میں نے اس کو نہیں کھولا۔"
حیا خاموشی سے سامنے اندھیرے کو دیکھنے لگی۔ مبارک درخت کا سایہ اس پل مزید سیاہ ہو گیا تھا۔
"میں نے بس آخری دفعہ سیپ چنا۔ سوچا تھا کہ عائشے کی طرح کا سفید موتی نکلے گا' یا پھر مرے ہوئے جانور کے سوا کچھ نہ ہو گا۔ مگر ان دونوں میں سے کچھ نہیں ہوا؟"
"پھر کیا نکلا؟"
حیا نے ذرا مضطرب انداز سے نفی میں سر ہلایا۔
"وہ کچھ اچھا نہیں ہے۔ قابل فخر نہیں۔"
"دکھاؤ۔"
حیا نے بنا احتجاج کیے پرس کھولا اندر سے وہ تہہ شدہ رومال اور ٹوٹی ہوئی عینک ایک ساتھ نکالی' ایک ہاتھ میں عینک دوسرے کی ہتھیلی میں وہ رومال تھاما۔ پھر ہتھیلی جہان کے سامنے کر کے کھولی تو رومال کی پوٹلی کھل کر آبشار کی طرح ہاتھ کے اردگرد گر گئی۔ اب ہتھیلی پہ کاغذ کی طرح رکھے سفید رومال کے وسط میں کچھ رکھا نظر آ رہا تھا۔
جہان نے گردن ذرا آگے کر کے دیکھا اور مسکرایا۔
"اور تم کہہ رہی تھیں کہ یہ اچھا نہیں ہے؟"
حیا نے رومال کی سمت دیکھا' جس کے عین وسط میں ایک موتی چمک رہا تھا۔
سیاہ رنگ کا موتی۔
"عائشے کے موتی سفید نکلتے ہیں۔ سفید رنگ ہوتا ہے پاکیزگی' معصومیت' نیکی کی علامت مگر میرا موتی سیاہ رنگ کا نکلا۔ بہت سے سفید موتیوں میں کسی

ugly duckling کی طرح۔'' وہ اداسی سے موتی کو دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ جہان نے سمجھ کر اثبات میں سر ہلایا۔

''واقعی' سیاہ تو برائی کا رنگ ہوتا ہے۔ جادو کی سب سے بری قسم سیاہ جادو کہلاتی ہے' گناہوں سے بھرا دل سیاہ دل ہوتا ہے' گناہ گاروں کے چہرے سیاہ ہوں گے روز قیامت۔''

اس کی بات پہ حیا کا چہرہ مزید بجھ گیا۔ مگر ''میجر احمد'' کی بات ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔

''اور تم نے اس سے یہ اخذ کیا کہ سیاہ ایک برا رنگ ہے؟ اونہوں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''سیاہ وہ رنگ ہے جو دھنک کے سارے رنگ اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ یہ ایک ڈارک رنگ ہے' اور ڈارک' برے کو نہیں' ڈیپ (گہرے) کو کہتے ہیں۔ سارے رنگ اس میں مدفن ہیں اور وہ ان کو کسی راز کی طرح چھپائے رکھتا ہے۔ وہ جو گہرا ہوتا ہے' ہاں وہ سیاہ ہوتا ہے۔ ٹھیک ہے' سیاہ رات میں گناہ کیے جاتے ہیں مگر بے ریا عبادت بھی رات کی سیاہی میں کی جاتی ہے۔ کالا جادو کو کالا اسی لیے کہلاتا ہے کہ یہ سفید جادو سے گہرا ہوتا ہے۔ یہ گہرائی کا رنگ ہے۔ دیرپا ہونے کا رنگ۔ شاید اسی لیے کعبہ کا غلاف سیاہ ہوتا ہے' آسمان کا رنگ بھی تو سیاہ ہے' بارش کے قطرے اپنے اندر سموئے بادل بھی تو کالے ہوتے ہیں' قرآن کے لفظ بھی تو عموماً'' سیاہ روشنائی میں لکھے جاتے ہیں' اور۔'' وہ سانس لینے کو رکا۔ ''اور تمہارا برقع بھی تو سیاہ ہے نا!''

اس کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ چہرے پہ ایک سکون سا آ ٹھہرا۔ اسے جیسے میجر احمد پھر سے مل گیا تھا۔ اس نے مٹھی بند کر لی' رومال ہاتھ کے کناروں سے جھلکنے لگا تھا۔

''اور کیا سیاہ رات میں کی گئی نیکیاں' سیاہ برائیوں کو دھو ڈالتی ہیں؟''

''تمہیں کیوں لگتا ہے کہ ایسا نہیں ہوتا؟''

''ہوتا ہوگا' مگر وہ ویڈیو' اگر وہ کسی کے پاس ہوئی تو؟'' اس کی آواز میں کرب در آیا۔ جہان نے [illegible] سے اس کا چہرہ دیکھا۔

''کیا وہ کسی کے پاس ہے حیا؟''

''نہیں۔ میں تو یونہی کہہ رہی تھی۔'' وہ کہہ کر پچھتائی۔

''اگر وہ کسی کے پاس ہے تو تم مجھے بتا سکتی ہو' میں...''

''تمہیں مجھ سے محبت کب ہوئی تھی جہان؟ جب میں نے ریسٹورنٹ میں گل دان توڑ کر پھینکا تھا یا جب میں نے تمہارے اوپر جنجر بریڈ کا ٹکڑا پھینکا تھا؟'' اس نے جلدی سے بات بدلی۔

تیزی سے بات پلٹنے کی کوشش میں وہ بنا سوچے سمجھے بولی تھی۔ وہ جو روانی سے کچھ کہہ رہا تھا' اس کے لب ٹھہرے' آنکھوں میں ذرا سی بے یقینی اتری' مگر وہ اسی روانی سے بولا۔

''جب تم نے میرے اوپر ٹھنڈا سلش پھینکا تھا۔''

وہ سانس روکے ان ہی ٹھہری ہوئی پتلیوں سے اسے دیکھے گئی۔ چند لمحے سرحدی لکیر کے گرد سب کچھ رک گیا۔ اور پھر وہ دونوں ہنس دیے۔

''دیکھ لو' مجھے بھی آتا ہے لوگوں سے جواب نکلوانا۔''

''اللہ ان لوگوں پہ رحم کرے!''

وہ گردن پیچھے پھینکے ہنستی جا رہی تھی۔ سخت گرمی میں جیسے کیلیس پہ بہار اتر آئی تھی۔ جب ہنسی رکی تو اس نے مسکراہٹ بمشکل دبائے جہان کو دیکھا۔

''کیا تمہیں یاد ہے کہ پہلی دفعہ زندگی میں تم نے کیک کب کھایا تھا؟ یا پہلی دفعہ تم کب روئے تھے؟ نہیں نا؟ کسی کو بھی ایسی باتیں یاد نہیں ہوتیں۔ مجھے بھی نہیں یاد کہ کب پہلی دفعہ میں نے اپنے نام کے ساتھ تمہارا نام سنا تھا۔'' وہ دور پھیلے مکئی کے تاریک کھیتوں کو دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ''یاد ہے تو بس

یہ کہ تمہارا ذکر میرے ساتھ ہمیشہ سے تھا' جیسے میرا سایہ میرے ساتھ ہے' یا جیسے میری روح۔''

''اور تمہیں مجھ سے محبت کب ہوئی تھی؟''

حیا نے محظوظ نگاہوں سے اسے دیکھا۔ ''میں نے نہیں کہا کہ مجھے تم سے محبت ہے!''

''اوکے۔ میں نے یقین کر لیا!'' وہ بھی جہان تھا' مگر اتنی آسانی سے تو وہ اعتراف نہیں کرنے والی تھی۔

''وہ جو ونڈ چائم میں نے تمہیں گفٹ کیا تھا' ابھی گھر رکھا ہے' تم پاکستان آؤ گے تو تمہیں دوں گی' مگر تم نے لکھا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول پڑھا؟ اس شخص جو صرف اس لیے اپنی بیوی کو چھوڑنا چاہتا تھا کہ وہ اس سے محبت نہیں کرتا تھا' مگر گھر بنانے کے لیے محبت ضروری نہیں ہوتی جہان! محبت تو بعد میں بھی ہو جاتی ہے۔ وفا اور قدر دانی زیادہ اہم ہوتی ہیں۔''

پھر وہ رکی' اور بے ساختہ امڈ کر آتی مسکراہٹ روک کر بظاہر سنجیدگی سے بولی۔

''تم نے قدر دانی نبھائی وہ ایسے کہ تم میری قدر کرتے ہو اور جانتے ہو کہ سرچ لائٹ لے کر بھی ڈھونڈو گے تو میرے جیسی بیوی نہیں ملے گی اور میں نے وفا نبھائی' سو تمہیں نہیں چھوڑا۔ کیا ہوا جو تم میرے جتنے گڈ لکنگ نہیں ہو' کیا ہوا جو تم ایک بے مروت' بدلحاظ اور بدتمیز انسان ہو' مگر ہو تو میرے شوہر نا!''

ساتھ ہی اس نے شانے اچکائے۔

جہان نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

''بہت شکریہ حیا!''

چند ساعتیں کیلیس کی سرزمین خاموش رہی۔ درخت اور ان کے پتے ہولے ہولے سانس لیتے رہے۔ پھر وہ بولا۔

''میرا مسئلہ یہ تھا حیا! کہ میں ہمیشہ سوچتا تھا کہ اس رشتے کو اپناؤں یا نہیں' مگر بہت دیر بعد میں نے یہ جانا ہے کہ یہ رشتہ تو ہم بہت پہلے اپنا چکے۔ بات ''کرنے'' یا ''نہ کرنے'' کی حد سے آگے نکل چکی ہے۔ اب نبھانے کا فیز ہے۔ بس سمجھنے میں دیر ہوئی' مگر میں سمجھ گیا ہوں۔''

حیا کے ننگے پیروں پہ کچھ رینگا تھا۔ اس نے جلدی سے پاؤں جھاڑا۔ کوئی کیڑا تھا شاید' مگر ماحول کا طلسم ٹوٹ گیا۔ جہان نے گھڑی دیکھی۔ پونے دو ہونے کو تھے۔

''اب مجھے جانا ہے۔''

اور حیا کو لگا' اس کا دل زور سے سمندر میں دھکیل دیا گیا ہے۔ یہ درد اتنا شدید تھا کہ اسے جسمانی لحاظ سے بھی محسوس ہوا تھا۔ وہ درخت کی ٹیک چھوڑ کر اس کی طرف مڑی۔

''جہان پلیز... مت جاؤ!'' آنکھوں میں اضطراب لیے وہ التجا کرنے لگی تھی۔

''نہیں حیا! ایسے مت کرو!''

''پلیز' میرے دل کو کچھ ہو رہا ہے۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے' تم مت جاؤ۔''

''حیا! یہ اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ یہ اوپر ستارہ جو ہے نا۔'' اس نے آسمان کی طرف اشارہ کیا' مگر حیا نے اوپر نہیں دیکھا۔ وہ اسی مضطرب انداز میں جہان کو دیکھ رہی تھی۔ ''یہ ستارہ اپنے دائیں جانب رکھ کر میں چلتا رہوں گا اور ایلیسو پہنچ جاؤں گا۔ یہ بہت سمپل ہے حیا۔''

''جہان! پلیز' نہ جاؤ۔ دیکھو' سیکیورٹی فورسز۔ کیا پتا وہ جانتے ہوں' وہ پہلے سے تیار بیٹھے ہوں' پھر؟''

''وہ کیسے جان سکتے ہیں' جب میں نے یا تم نے ان کو نہیں بتایا تو؟''

''مگر یہاں بارودی سرنگیں ہیں۔''

''وہ مسئلہ نہیں ہیں۔ مسئلہ صرف کمانڈر ہوتا ہے اور کمانڈر شیعہ ہے' یعنی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔''

''شیعہ؟'' اس نے حیرت سے جہان کو دیکھا۔ یہ فرقہ واریت کہاں سے آ گئی۔

''دیکھو' شام کے صدر بشار الاسد شیعہ ہیں اور پاپا سنی ہیں۔''

"دس کے پیا؟ اچھا طیب اردگان!"

"اللہ ایسی عقل مند بیوی ہر ایک کو دے۔ دیکھو، طیب اردگان سنی ہیں۔ سو جب بارڈر کا کمانڈر سنی ہوتا ہے تو آپ شام سے ترکی میں داخل ہو سکتے ہیں، سیکیورٹی نرم ہوتی ہے مگر ترکی سے شام جانے میں مسئلہ ہوگا، لیکن جب کمانڈر شیعہ ہوتا ہے تو وہ آپ کو شام جانے دے گا۔"

"میری سمجھ میں نہیں آئی یہ بات۔"

"مطلب یہ کہ اگر شام سے ترکی جانا ہے تو تب جاؤ جب سنی کمانڈر ہو اور جب ترکی سے شام جانا ہو تو شیعہ کمانڈر کے وقت جاؤ۔ میں اسی لیے اتنے دن ٹھہرا رہا کیونکہ کمانڈر بدلنا تھا۔ چار روز پہلے نیا کمانڈر آیا ہے۔ دنیا کے ہر بارڈر پہ کمانڈر کی تبدیلی کے گھنٹے بھر میں ہی اس کا نام وغیرہ اسمگلرز اور جاسوسوں میں پھیل جاتا ہے، یہ واحد بارڈر ہے جہاں پہلی بات یہی پھیلتی ہے کہ وہ سنی ہے یا شیعہ۔ یہ فرقہ واریت نہیں ہے، یہ تو بس اسٹرٹیجک strategic سیاست ہے!"

وہ اسی طرح فکر مند اور پریشان سی اسے دیکھتی رہی۔

"میں اگلے ہفتے، منگل کے دن پاکستان آجاؤں گا، میرا یقین کرو!"

حیا نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ اس کو روکنا چاہتی تھی مگر اب یہ اس کے بس سے باہر تھا۔

"اب یاد کرو، آشیانہ میں میرا وعدہ کہ ہر پلان میں ڈیسائیڈ کروں گا۔ یاد ہے؟"

"ہوں!" اس نے گردن ہلائی۔ آنسو گلے میں پھندا ڈال رہے تھے۔

"اب مجھ سے کچھ وعدے کرنے ہوں گے تمہیں۔" وہ بہت غور سے اسے دیکھتا قطعیت سے کہہ رہا تھا۔ "میرے جانے کے بعد تم پیچھے مڑ کر نہیں دیکھو گی۔

جو پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں، وہ پتھر کے ہو جاتے ہیں۔"

حیا نے پھر اثبات میں گردن کو جنبش دی۔ اس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔

"اور میرے جانے کے پورے پانچ منٹ بعد تم یہاں سے اٹھو گی اور مڑے بغیر واپس گاڑی تک جاؤ گی۔ کلیئر؟"

"ہاں۔۔۔ ٹھیک!" اس کی آواز رندھی ہوئی سی نکلی۔

"اور تیسری بات، اس درخت کے اس پار یعنی سرحد کی طرف تم نہیں جاؤ گی بلکہ واپس گاڑی کی جانب جاؤ گی۔ حیا۔ کچھ بھی ہو جائے۔ بھلے کچھ بھی ہو جائے۔ تم اس جگہ سے آگے نہیں جاؤ گی۔"

"جہان۔۔۔" اس نے کہنا چاہا مگر جہان نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش کرا دیا۔

"میں کچھ نہیں سنوں گا۔ میں نے کیا دو کیسے؟ یہاں تک تمہاری سب باتیں مانیں۔ اب میری یہ تین باتیں تم مانو گی۔ تم یہاں سے آگے نہیں جاؤ گی۔ بھلے تم کچھ بھی دیکھو یا سنو۔ مجھے کچھ بھی ہو جائے۔ میں مر بھی جاؤں، گرفتار ہو جاؤں، جو بھی ہو، تم واپس گاڑی تک جاؤ گی بس۔"

اس کی آنکھیں جھلملانے لگی تھیں۔ بمشکل وہ کہہ پائی۔

"ٹھیک۔۔۔ مگر ایک بات مانو میری۔"

"کیا؟"

"وہ جو تمہارا۔۔۔ نقلی دانت۔۔۔ سائینائیڈ۔۔۔ وہ مجھے دے دو۔ میں اسے یہیں پھینک دوں گی، مگر میں اس خیال کے ساتھ نہیں رہ سکتی کہ تم اپنے منہ میں زہر۔۔۔ پلیز جہان!"

ساتھ ہی اس نے بند مٹھی کھولی۔ رومال بھی کھلا چلا گیا۔

"میں تمہارا دل نہیں توڑنا چاہتا۔" جہان نے چہرہ ذرا دوسری سمت کیا اور انگلی سے دانت سے کچھ نکالا۔ حیا نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس نے کوئی نوک دار چیز رومال پہ رکھی اور رومال بند کیا۔ حیا نے آنکھیں کھولیں اور پھر مٹھی بھینچ لی۔ گول موتی۔۔۔ نوک دار

چیز۔ وہ محسوس کر سکتی تھی۔

چند لمحے وہ یوں ہی اسے دیکھتا رہا۔ رات گزرتی رہی۔

"تمہیں پتا ہے حیا! تم ان جنت کے پتوں میں بہت اچھی لگتی ہو۔"

وہ بھیگی آنکھوں سے مسکرائی۔

"اور تم بھی، میجر احمد!"

"میں؟" اس کے چہرے پہ الجھن ابھری۔

"تم نے کہا تھا کہ جنت کے پتے ہر وہ چیز ہوتے ہیں جو انسان رسوا ہونے کے بعد خود کو ڈھکنے اور دوبارہ عزت حاصل کرنے کے لیے اوڑھتا ہے۔ تو پھر اپنی فیملی پہ لگا داغ دھونے کے لیے، جو یونیفارم تم نے پہنا، جو کیپ تم نے لی۔ وہ سب بھی تو جنت کے پتوں میں ہی آتا ہے نا۔"

وہ ہلکے سے مسکرایا، پھر گھڑی دیکھی اور کھڑا ہو گیا۔ حیا نے اس کے جوتوں کو دیکھا۔ اس کے جوتوں کا رخ۔ ان کا رخ۔۔۔

"منگل کو آؤں گا میں۔ ضرور۔ انسان کو کوئی چیز نہیں ہرا سکتی، جب تک کہ وہ خود ہار نہ مان لے۔ میں نے کہا تھا قسمت ہرا سکتی ہے، مگر میں غلط تھا، قسمت انسان کو مار تو سکتی ہے مگر ہرا نہیں سکتی۔"

اور پھر وہ درخت کے پیچھے چلا گیا۔ وہ مڑ کر بھی نہ دیکھ سکی۔ اس نے وعدہ کیا تھا۔ سو وہیں چپکی بیٹھی رہی۔ اپنے دل کی دھڑکن، اپنے ہاتھوں کی لرزش، سب محسوس ہو رہا تھا اسے۔ ایک ہاتھ میں پوٹلی کے اندر موتی کی گولائی اور نقلی دانت کی چبھن اور دوسرے میں۔۔۔

وہ چونکی۔ اس کا دوسرا ہاتھ خالی تھا۔

"اللہ۔۔۔ اللہ!" اس کے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ ڈی جے کی ٹوٹی عینک۔۔۔ وہ ابھی اس کے ہاتھ میں تھی۔ پھر وہ پیر سے کیڑا جھاڑنے لگی۔ تب۔۔۔ وہ کہاں گئی۔

اس نے بدحواسی سے ہاتھ اندھیرے میں زمین پہ ادھر ادھر مارا۔ نوکیلے چھوٹے پتھر، گھاس کے سوکھے تنکے، مٹی۔ عینک کہیں نہ تھی۔

"نہیں! پلیز نہیں۔" وہ ڈی جے کی عینک نہیں کھونا چاہتی تھی۔ وہ ایک دفعہ پھر سے ڈی جے کو نہیں کھونا چاہتی تھی۔ اس نے اندھوں کی طرح رومال والی بند مٹھی اور دوسرے کھلے ہاتھ سے مٹی کو ٹٹولا۔ کچھ بھی نہیں تھا۔

رومال پرس میں رکھنے کی غرض سے اس نے پرس کھولا اور پھر بس ایک نظر دیکھنے کے لیے پوٹلی کھولی۔ اندر سیاہ موتی کے ساتھ ایک ننھی سی چیز پڑی تھی۔

ایک سرمئی رنگ کا چھوٹا سا کنکر۔

"جہان!" بے یقینی سے اس کے لب کھل گئے۔

پروفیشنلزم۔۔۔ اصول۔۔۔ اسے ان پہ کوئی سمجھوتا نہ تھا۔ اس کا دل رکھنے کے لیے اس نے حیا کو تاثر دیا کہ وہ دانت نکال رہا ہے۔ مگر اپنے فرار کا واحد راستہ اس نے اپنے پاس ہی رکھا تھا۔ اس نے نیچے پڑے اس جیسے ہزاروں کنکروں میں سے ایک اٹھا کر رومال پہ رکھ دیا تھا۔

"جہان!" بہت تکلیف سے اس نے درخت کی اوٹ سے اس پار دیکھا۔

پہلا وعدہ چبھن سے ٹوٹا۔

دور، سرحدی باڑ تاریکی میں ڈوبی تھی۔ اتنی تاریکی کہ کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اسی پل بجلی زور کی چمکی، پل بھر کو سب روشن ہوا اور تب اسے دکھائی دیا۔ ایک ہیولا جو ٹیڑھی چال چلتا سرحد کی طرف بڑھ رہا تھا۔

پانچ منٹ کب کے گزر چکے تھے۔ دوسرا وعدہ بادلوں کی گرج میں تحلیل ہو گیا تھا۔ وہ دم سادھے بجلی چمکنے کا انتظار کرتی اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر دیکھ رہی تھی مگر اب اس نے وہ ہیولا کھو دیا تھا۔

گزرتے وقت کا احساس کر کے وہ اٹھی اور واپس جانے کے لیے قدم بڑھائے۔ اٹھنے سے قبل وہ جھکتے ہوئے زمین پہ ہاتھ مار کر عینک ڈھونڈ رہی تھی۔ دفعتاً قریب ہی اس کا ہاتھ کسی سخت شے سے ٹکرایا۔

اسٹریپ لکڑی۔ اس نے وہ چیز اٹھائی۔ ٹوٹی سرخ جوتی۔

اب عینک اور دوسرا جوتا ڈھونڈنا بے کار تھا۔ وہ سیدھی کھڑی ہوئی تاکہ واپس جا سکے۔ اب اسے پیچھے نہیں دیکھنا تھا۔ اپنے پرس کو پکڑا ہی تھا۔ دوسرے جوتے نکالنے کو۔۔۔ ایک دم کہیں سے سورج نکل آیا۔
آنکھیں چندھیاتی روشنی۔

وہ تیزی سے واپس پلٹی۔ کالی رات روشن ہو گئی تھی۔ جلتی بجھتی روشنی۔ اس نے ہراساں نگاہوں سے پلٹ کر دیکھا۔

سرحد پہ روشنی کے راؤنڈز فائر کیے جا رہے تھے۔ اندھیرے میں ہر طرف روشنی بکھرتی، مدھم ہوتی، پھر بکھرتی، سرحدی باڑ پہ ہیولے سے بھاگتے دکھائی دے رہے تھے۔

اس نے زمین پہ پڑے ایک بڑے پتھر کو خالی ہاتھ سے سختی سے تھام لیا۔ دل دھک دھک کر رہا تھا۔
روشنی۔۔۔ فائرنگ۔۔۔ گولیاں۔۔۔ اسپیکر پہ آوازیں۔
وہ بنا آواز کے چلائی۔

"جہان۔۔۔ واپس آجاؤ!" آنکھوں سے آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگے تھے۔ جسم کپکپا رہا تھا۔

روشنی فواروں کی صورت بار بار پھوٹ رہی تھی۔ اس کا دل چاہا وہ بھاگتی ہوئی سرحد پہ چلی جائے۔
مگر وہ تیرا وعدہ۔۔۔ وہ پیر کی زنجیر بن گیا۔ وہ ہر دفعہ اسے چھوڑ کر چلی جاتی تھی۔ پہلی دفعہ وہ اسے چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی تھی۔ مگر جہان کے وہ الفاظ اسے واپس بھیج رہے تھے۔ "حیا۔۔۔ کچھ بھی ہو جائے، کچھ بھی!"
اور پھر۔۔۔ ایک دم زور سے دھماکا ہوا۔

پتھر کو پکڑے، گٹھڑی کی صورت بیٹھی حیا کے بہتے آنسو رک گئے۔ اس نے ساکت نگاہوں سے سرحد کی جانب سے آتے دھوئیں کو دیکھا۔ روشنی۔۔۔ چیخ و پکار۔۔۔ سائرن۔۔۔ بارود کی بو۔۔۔ اور پھر دھوئیں کے بادل ہر طرف چھاتے گئے۔ سرحد چھپ گئی اور دھندلی دیوار ایک دفعہ پھر ان دونوں کے درمیان چھا گئی۔
کیا ہوا تھا۔۔۔ کیا پھٹا تھا۔۔۔ اسے نہیں معلوم تھا۔ وہ مردہ قدموں سے کھڑی ہوئی۔ ایک ہاتھ سے ٹوٹا جوتا لٹک رہا تھا۔ دوسرا ہاتھ پہلو میں خالی [illegible] خالی ہاتھ، خالی دامن۔۔۔ اسے دو وعدے تو [illegible] نبھانا تھا۔ اسے واپس جانا تھا۔

بادل گرج دار آواز کے ساتھ ایک دم [illegible] موٹی موٹی بوندیں ٹپ ٹپ گرنے لگیں۔ ترکی کی [illegible] بارش میں۔۔۔ بھی وہ ننگے پیر ٹوٹے جوتے کے [illegible] چل رہی تھی۔ آخری بارش بھی وہ ننگے پیر تھی۔

"ممی جواہر تک گئی ہیں۔ میں ان کا بیٹا بول رہا ہوں جہان۔"

وہ ننگے پاؤں کھردری زمین پہ چل رہی تھی۔ [illegible] چبھ کر تلوؤں کو زخمی کر رہے تھے مگر وہ سامنے دیکھ رہی تھی۔ بلکہ شاید کچھ بھی نہیں دیکھ رہی تھی۔
"جوتے کو کیا ہوا ہے؟ اتنی سردی میں ننگے پاؤں بیٹھی ہو، لاؤ دکھاؤ جوتا۔"

تڑتڑ گرتے قطرے اسے بھگو رہے تھے۔ بادلوں نے سارا بوجھ اتار کر زمین اور زمین والوں کو بوجل کر دیا تھا۔

"میں بکواس کر کے گیا تھا نا، مگر میری کون سنتا ہے اس گھر میں۔ دو دن نہ ہوں تو سارا نظام الٹ جاتا ہے۔"

اس کے پیروں سے خون نکل رہا تھا۔ جسم میں جان نہ رہی تھی۔ لگتا تھا ابھی لڑکھڑا کر گر پڑے گی اور اگر گری تو اٹھ نہ سکے گی۔
"انسان وہی چیز مانگتا ہے جس کی اس کو کمی لگتی ہے، سو میں ہمیشہ زندگی مانگتا ہوں۔"
اس کے ہاتھ میں صرف اپنا ایک جوتا تھا۔ دوسرا وہیں زیتون کے درخت کے آس پاس رہ گیا تھا۔ جب آدھی رات کے بعد حقیقت اپنا نقاب اتار کر پھینکتی ہے تو ہر سنڈریلا کو ایک جوتا اسی مقام پہ چھوڑ کر واپس ہونا ہوتا ہے، اسے بھی جانا تھا۔
"ہینڈسم گائیڈ ابھی مصروف ہے۔ کسی غیر ہینڈسم گائیڈ سے رابطہ کرو۔"
وہ بارش کے قطرے تھے یا آنسو، جو اس کے چہرے [illegible] چکے تھے۔ دفعتاً اس کا پیر رپٹا۔ وہ اوندھے منہ [illegible] گری۔ ہتھیلیاں چھل گئیں۔ چہرے پہ مٹی لگ گئی۔ برستی بارش، سیاہ رات۔
"بعض دفعہ قسمت ہرا دیا کرتی ہے حیا! ڈی جے کی [illegible] ہو گئی ہے۔"
وہ اٹھنا چاہتی تھی، اٹھ نہ سکی۔ وہیں جھکی بیٹھی سسکیوں کے ساتھ روئے گئی۔ کیچڑ، بارش، آنسو۔۔۔ سب گڈمڈ ہو رہا تھا۔
"فرقان ماموں کی فیملی سے ڈر لگتا ہے، کیونکہ وہ سرخ مرچ کا استعمال کچھ زیادہ ہی کرتے ہیں۔"
بمشکل ہتھیلی کے بل زور لگا کر وہ اٹھ پائی۔ پیر لہولہان ہو چکے تھے۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی موسلا دھار بارش میں پھر سے چلنے لگی۔
"میں نے کہا تھا نا، زندگی میں کوئی جنت کے پتے گرا دے تو انہیں تھام لیجیے گا۔ وہ آپ کو رسوا نہیں ہونے دیں گے۔"
گرتے پڑتے وہ کار کے قریب آئی۔ دروازہ کھولا اور پھر اس کا سہارا لے کر خود کو سنبھالنا چاہا۔
"جب اپنا چہرہ چھپانے کے لیے میگزین سامنے کرتے ہیں تو اسے الٹا نہیں پکڑتے۔"
اسٹیئرنگ وہیل تھامے اس نے دھندلی آنکھوں سے شیشے کے پار دیکھا۔ ہر سو دھند تھی۔ دھند جو ان کی زندگیوں سے چھٹتی ہی نہیں تھی۔
"اگر جادوگر اپنی ٹرک کے فوراً بعد ہی راز بتا دے تو کیا فائدہ؟"
ہر شے سلو موشن میں ہو رہی تھی۔ ساری آوازیں بند تھیں۔ بس حرکت دکھائی دے رہی تھیں۔ اس نے خود کو مریم خانم کے دروازے پہ دیکھا۔ بارش اسی طرح برس رہی تھی، مگر اس کی سماعت بند ہو چکی تھی۔
"اچھا تم نے پاشا بے کے اوپر کافی الٹ دی تھی؟ گڈ! ویری گڈ!"
خانم اس کو سہارا دیے بستر پہ لٹا رہی تھیں۔ اس کے گرد ساری دنیا گول گول گھوم رہی تھی۔
"اپنی جگہ کبھی نہیں چھوڑتے۔ ہوٹل گرینڈ کی مثال یاد رکھو۔"
وہ بستر پہ لیٹی تھی، آنکھوں سے بے آواز آنسو بہہ رہے تھے۔ پائنتی کی طرف بیٹھی مریم خانم اس کے پیروں پہ دوا لگا رہی تھیں۔ اسے درد نہیں ہو رہا تھا۔ ساری حسیات ختم ہو گئی تھیں۔
"بالکل بھی مدد نہیں کروں گا۔ جو کرنا ہے اکیلے کرو اور خود کرو، کیونکہ تم کر سکتی ہو۔" وہ اپنا ٹرالی بیگ گھسیٹتی ریلوے اسٹیشن پہ چل رہی تھی۔ دونوں پیر پٹیوں میں بندھے تھے۔ قدم اٹھاتی کہیں اور تھی، پڑتا کہیں اور تھا۔
"لگتا ہے مجھ سے تنگ آ گئے ہیں۔ دل کرتا ہے ماہ سن کی طرح کبوتر بن کر کسی غار میں چھپ جاؤں۔"
ٹرین تیز رفتاری سے دوڑ رہی تھی۔ وہ کھڑکی کی طرف بیٹھی بھیگی سرخ آنکھوں سے باہر بھاگتے مناظر دیکھ رہی تھی۔ زیتون کے درخت پیچھے رہ گئے تھے۔ شیشے دھندلا گئے تھے یا اس کی آنکھوں میں دھند تھی۔ اب تو سارے فرق ختم ہو گئے تھے۔
"میرا نام جہان سکندر ہے، میجر جہان سکندر احمد۔"
سبانجی کا سبزہ زار بھی اسی کہر میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہر سو دھند تھی۔ کوئی آواز، کوئی شور نہیں، اس نے خود کو ایک فیکلٹی اپارٹمنٹ کا دروازہ بجاتے دیکھا تھا۔
"شش چیخنا نہیں، ورنہ آواز باہر جائے گی اور یہ ساری فیملی بھاگتی ہوئی آجائے گی۔"
اندر سے نکلتی فربہی مائل لڑکی اسے دیکھ کر پریشانی سے اس کی جانب بڑھی تھی۔ وہ کیا کہہ رہی تھی۔ حیا سن نہیں پا رہی تھی۔ بس اپنی آواز کسی گہری کھائی سے آتی سنائی دی۔ "میرا سامان پیک کروا دیں انجم باجی!"
"اچھا تمہیں نہیں پتا تھا میں کپادوکیہ میں ہوں؟"
ہالے اس کے بیگ کی زپ بند کرتے ہوئے کچھ کہہ رہی تھی۔ انجم باجی اس کے جوتے رکھ رہی تھیں۔ وہ بس ساکت سی صوفے پہ بیٹھی سر جھکائے بے آواز رو رہی تھی۔
"تھوڑی سی کاٹن لا دو فارمیسی سے، کان میں ڈالنی ہے۔"

اپنے ٹرالی بیگ کو ہینڈل سے گھسیٹتی وہ اتاترک ہوالانی (ایرپورٹ) کے دروازے سے اندر داخل ہو رہی تھی۔ بے جان قدم، بے سوچ نگاہیں۔

"پتا ہے حیا! تم کب اچھی لگتی ہو؟ جب تم خاموش رہتی ہو۔"

وہ شناسا سا لڑکا تیزی سے اس کی طرف آیا تھا۔ وہ اس کو پہچانتی تھی مگر اس کو سمجھ نہ پا رہی تھی۔ وہ بول رہا تھا کچھ۔

"عبدالرحمٰن بھائی نے کہا تھا کہ آپ سے مل لوں، کہیں آپ کو کچھ مدد کی ضرورت نہ ہو۔ آپ ہمارے گل کو لے کر چلی گئیں، میں بہت پریشان تھا۔ یہ ممی نے بھجوائے ہیں آپ کے لیے۔" وہ کوئی پیکٹ اس کی طرف بڑھا رہا تھا۔

"میری لغت میں دو بجے کا مطلب ہوتا ہے، ایک بج کر پچپن منٹ۔"

آفیسر اس کو لیپ ٹاپ ہینڈ کیری میں اٹھانے کا کہہ رہی تھی۔ اس نے خالی خالی نگاہوں سے اسے دیکھتے لیپ ٹاپ بیگ اٹھا لیا۔ اب کسی چیز سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

"مجھے کچھ بھی ہو جائے، مر جاؤں، گرفتار ہو جاؤں، جو بھی ہو، تم واپس گاڑی تک جاؤ گی، بس!"

جہاز کی کھڑکی سے نیچے بہت دور باسفورس کا سمندر نظر آ رہا تھا۔ نیلی چادر، سفید جھاگ اور ان سب پہ چھائی دھند، پھر بھی اس نے آنسو نہیں پونچھے۔ وہ ترکی سے ہمیشہ روتے ہوئے جاتی تھی۔ اسے اس دفعہ بھی روتے ہوئے جانا تھا۔

مگر کون جانے۔۔۔

کہ اس دفعہ کا غم۔۔۔

سب سے بڑا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ آنکھوں پہ بازو رکھے لیٹی تھی۔ دفعتاً دروازے پہ دستک ہوئی۔ اس نے آنکھوں سے بازو نہیں ہٹایا۔ اسی طرح لیٹی رہی۔ دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور پھر چلتے قدم۔ آنے والے نے آگے بڑھ کر کھڑکی کے پردے ہٹائے۔ اسے بند آنکھوں سے بھی سورج کی روشنی چھن کر خود پہ پڑتی محسوس ہوئی تھی۔

"حیا اٹھ جاؤ بیٹا! طبیعت کیسی ہے؟" اس نے سبین پھپھو کی آواز سنی اور پھر بیڈ کی پائینتی کے پاس بوجھ محسوس ہوا جیسے وہ ادھر بیٹھ گئی تھیں۔

"بخار اترا تمہارا؟" انہوں نے جھک کر اس کے ماتھے کو چھوا۔ حیا نے بازو آنکھوں سے ہٹایا اور خالی خالی نگاہوں سے ان کو دیکھا۔

شانوں پہ دوپٹا لیے، بال کیچر میں باندھے وہ ویسی ہی تھیں۔ پرسکون، صابر، ٹھنڈی۔

"میں ٹھیک ہوں۔" وہ کہنی کے بل ذرا سی اٹھی۔ نقاہت، پژمردگی، جیسے جسم میں جان ہی نہ رہی تھی۔

"اور یہ تمہارے پاؤں کو کیا ہوا ہے۔ نتاشا کہہ رہی تھی کہ نئی بینڈیج لا رہی ہے۔ یہ بینڈیج تو بالکل خراب ہو گئی ہے۔" انہوں نے ہولے سے اس کے پیر کے انگوٹھے کو چھو کر کہا، جس پہ لگی پٹی اب پرانی اور خستہ ہو چکی تھی۔ حیا تکیے کے سہارے بیٹھی اسی طرح انہیں دیکھتی رہی۔

"جہان تمہارے ساتھ تھا؟" انہوں نے نرمی سے پوچھا۔ جب سے وہ آئی تھی اتنی بیمار ہو گئی تھی کہ پھپھو سے باقاعدہ بات اب ہو پا رہی تھی۔

اس نے گردن کو اثبات میں جنبش دی۔ گلے میں آنسوؤں کا پھندا سا پڑنے لگا تھا۔

"پھر؟"

اور اس پھر کے آگے سارے جواب ختم ہو جاتے تھے۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

"میں نہیں جانتی پھپھو! ہم ساتھ تھے۔" وہ کہنے لگی تو آواز بہت بوجھل تھی۔ "اس رات آسمان پہ بادل تھے اور چاند نہیں تھا، تارے بھی نہیں تھے۔ وہ آگے جا رہا تھا۔ میں نے اسے روکنا چاہا۔ منع بھی کیا مگر اس نے۔۔۔ اس نے میری نہیں مانی۔ وہ چلا گیا۔ اور پھر۔۔۔" وہ رکی اور پلک جھپکی تو آنسو رخسار پہ لڑھکنے لگے۔

"پھر پتا نہیں کیا ہوا۔ مگر۔۔۔ مگر وہ واپس نہیں آیا۔"

کمرے میں چند لمحوں کے لیے بوجھل سی خاموشی رہی۔ پھپھو کے چہرے پہ وہی سکون، وہی ٹھہراؤ تھا۔

"کیا اسے اسی وقت واپس آنا تھا؟"

"نہیں، اس نے کہا تھا کہ آنے والے منگل کو وہ آجائے گا۔"

"تو ابھی منگل میں کچھ دن ہیں نا، وہ آجائے گا، تم فکر کیوں کر رہی ہو؟"

حیا نے نفی میں سر ہلایا۔

"وہ نہیں آئے گا۔ وہ مشکل میں ہے۔ میں نہیں جانتی کہ وہ ٹھیک بھی ہے یا نہیں، مگر وہ مشکل میں ہے۔ شاید زخمی ہو، شاید گرفتار ہو اور شاید۔۔۔" اس سے آگے فقرہ ٹوٹ گیا۔ دل بھی ساتھ ہی ٹوٹ گیا۔

"مگر اس نے کہا تھا آئے گا تو وہ ضرور آئے گا۔ مجھے پورا یقین ہے۔" انہوں نے جیسے دلاسا دیتے ہوئے اس کے ہاتھ کی پشت کو تھپکا۔ وہ ان ہی بھیگی نگاہوں سے ان کا پرسکون چہرہ دیکھتی رہی۔

"میں سمجھتی تھی کہ آپ میں اور مجھ میں بہت فرق ہے پھپھو! آپ صبر سے انتظار کرنے والی عورت ہیں، مگر میں چیزیں اپنے ہاتھ میں لے کر جہان کے ساتھ چلنے والی عورت ہوں۔ لیکن اب مجھے لگتا ہے کہ تکلیف ہم دونوں کے حصے میں برابر آئے گی۔ آپ ظاہر نہیں کرتیں اور میں چھپا نہیں سکتی۔ بس یہی فرق ہے۔"

"بے یقین نہ ہو بیٹا! اللہ سے اچھا گمان رکھو، اچھا ہی ہوگا۔" انہوں نے نرمی سے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔ وہ سر بھی نہ ہلا سکی۔ عجیب بے یقینی سی بے یقینی تھی۔

☼ ☼ ☼
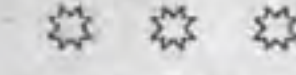
لاؤنج سے باتوں کا شور کمرے تک سنائی دے رہا تھا۔ ثنا اور سحرش اپنی امی کے ساتھ آئی تھیں اور حسب معمول ان کی آمد پہ ارم اور سونیا بھی چلی آئی تھیں۔ وہ ابھی تک کمرے میں ہی تھی، ان سے نہیں ملی تھی۔ اماں دروازے پہ دو دفعہ آکر باہر آنے کا کہہ چکی تھیں۔

"حیا باجی! آپ کا فون ہے۔" وہ اپنے کمرے میں لیپ ٹاپ کھولے عائشے کو میل لکھ رہی تھی، جب نور بانو نے دروازے سے جھانک کر صدا لگائی۔ وہ اچھا کہہ کر سینڈ کا بٹن دبا کر اٹھی اور باہر آئی۔ زندگی میں ناامیدی اتنی بڑھ گئی تھی کہ فون کی گھنٹی پہ بھی چونکنا چھوڑ دیا تھا۔ میجر احمد اسے لینڈ لائن پہ کبھی بھی کال نہیں کیا کرتا تھا، سو اسے دلچسپی نہ تھی کہ کس کا فون ہے۔

"ہیلو؟" اس نے کریڈل کے پاس رکھا الٹا ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا۔

"بہت شکریہ میری بات سننے اور سمجھنے کا۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ نے عقل مندی کا ثبوت دیا۔" ولید کی مسکراتی آواز۔ اسے لگتا تھا کہ سارے احساس مر گئے ہیں مگر ایک ابال سا اندر سے اٹھا تھا۔ ہاں ابھی دل میں کچھ زندہ تھا۔

"جو بھی کہنا ہے، صاف کہو۔" وہ دبے لہجے میں غرائی۔

"میرے خلاف وہ کیس واپس لے کر آپ نے ثابت کر دیا ہے کہ آپ ایک "عقل مند" خاتون ہیں۔" لمحے بھر کو اس کے اعصاب مفلوج سے ہو گئے۔ "کیس واپس؟ اس نے تو نہیں۔۔۔ پھر کس نے؟"

"میں نے تمہارے خلاف کوئی کیس واپس نہیں لیا۔"

"میں جانتا ہوں کہ آپ کے دباؤ پہ ہی یہ ہوا ہے اور میں جانتا ہوں کہ آپ نے یہ کیوں کیا ہے۔ یہ کال آپ کا شکریہ ادا کرنے کے لیے کی تھی اور یہ پوچھنے کے لیے کہ ہم پھر کب مل رہے ہیں؟" وہ جیسے بہت مسرور اور مطمئن تھا۔

اس کے اندر جوار بھاٹا اٹھنے لگا۔ بمشکل اس نے

ضبط کیا۔ "میں فون رکھ رہی ہوں۔"

"کل دوپہر ایک بجے میں جناح سپر والے پراہٹ پہ آپ کا انتظار کروں گا۔ ضرور آئیے گا، مجھے کچھ اہم باتیں کرنی ہیں، کیونکہ ابھی وہ آرکیٹیکٹ والا مسئلہ حل نہیں ہوا!"

"اچھا۔ اور تمہیں لگتا ہے میں آجاؤں گی۔ وہ اور ہوتی ہیں کمزور لڑکیاں، جو تم جیسوں سے ڈر جاتی ہیں۔ مائی فٹ۔" اتنا غصہ آیا تھا کہ دل چاہا یہ فون دیوار پہ دے مارے۔

"آپ کو آنا ہوگا۔ یاد رکھیں، وہ ویڈیو میرے پاس ہے۔ اگر آپ نہیں آئیں تو میں آپ کے گھر آکر وہ ویڈیو آپ کے ہی ٹی وی پہ چلا کر دکھاؤں گا اور یہ میرا وعدہ ہے۔" اس کے لہجے کی سفاکی..... حیا کا دل لرز کر رہ گیا مگر جب بولی تو آواز مضبوط تھی۔

"تو پھر تم کر گزرو جو تم کرنا چاہتے ہو۔ ایسا سوچنا بھی مت کہ میں تم سے یوں ملنے چلی آؤں گی۔ جہنم میں جاؤ تم۔"

اس نے فون زور سے کریڈل پر پٹخا۔ پھر تیزی سے مڑ کر ابا کے کمرے کی طرف گئی۔ وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ٹائی کی ناٹ صحیح کر رہے تھے۔ آفس جانے کے لیے بالکل تیار۔

"ابا! کیا آپ نے ولید کے خلاف کیس واپس لے لیا؟" وہ پریشانی سے کہتی بنا اجازت اندر آئی تھی۔ سلیمان صاحب نے چونک کر اسے دیکھا اور پھر واپس شیشے کے سامنے ہو کر ٹائی کی ناٹ ٹھیک کرنے لگے۔

"ہاں، واپس لے لیا۔"

"مگر کیوں؟" وہ صدمے سے بولی۔

"پہلی بات یہ کہ وہ بہت ہی کمزور کیس تھا۔ دوسری بات یہ کہ ہمارے پاس کوئی خاص گواہ نہیں ہے اور تیسری بات، اس کی گاڑی سے کسی کو نقصان نہیں پہنچا۔ فرقان بھائی کو چوٹ گرنے سے آئی تھی، اس لیے اس کیس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔" وہ اب پرفیوم اٹھا کر خود پہ اسپرے کر رہے تھے۔

"مگر ابا! آپ جانتے ہیں کہ اس نے مجھے ٹکر مارنے کی کوشش کی۔"

"حیا! میں اسے اس طرح نہیں چھوڑوں گا۔ آرکیٹیکٹ کے ساتھ مل کر اس نے جو بے ایمانی کی ہے، اس پہ میں اسے آڑے ہاتھوں لوں گا۔ تم ذرا انتظار تو کرو۔" لیکن ابا کی بات کے برعکس ان کا لہجہ غیر سنجیدہ تھا۔ وہ مزید سنے بغیر بھاگتی ہوئی باہر آئی۔ چند لمحوں بعد وہ تایا فرقان کے گھر تھی۔

تایا ابا اور صائمہ تائی ڈائننگ روم میں اکیلے ناشتا کر رہے تھے۔ لڑکے کام پر تھے۔ سونیا اور ارم بھی یہاں نہ تھیں۔

"تایا ابا۔" وہ پریشانی سے ان کے پاس آئی۔

"آؤ حیا! طبیعت کیسی ہے؟" وہ ہموار لہجے میں بولے، ساتھ ہی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ پہلے جیسی محبتیں نہ سہی مگر پچھلے کچھ عرصے والی رکھائی بھی نہیں، درمیانہ سا انداز۔

"تایا ابا! آپ لوگوں نے ولید کے خلاف کیس کیوں واپس لے لیا؟" وہ بے چینی سے وہیں کھڑے کھڑے بولی۔ صائمہ تائی اس کے لہجے پہ بے اختیار پلٹ کر اسے دیکھنے لگیں۔

"میں نے نہیں لیا، تمہارے ابا نے لیا ہے۔ اور وہ اتنے غلط بھی نہیں ہیں۔ کیس کمزور ہے۔ وقت اور پیسے ضائع کرنے کا فائدہ؟"

"مگر اس طرح تو وہ اور شیر ہو جائے گا۔ وہ سمجھے گا کہ ہم۔"

"حیا! ہم سب ٹھیک ہیں۔ چوٹ مجھے لگی تھی۔ جب میں سمجھوتا کرنے پہ تیار ہوں تو پھر؟" تایا ابا بھی شاید ولید کے خلاف کسی سخت کارروائی کے حق میں نہ تھے۔ کاروباری سیاستیں۔ اف۔

"اور آرکیٹیکٹ والا کیس؟"

"دیکھو ہم اس کو کھلم کھلا تو ڈیل نہیں کر سکتے۔ کمپنی کی ساکھ کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ مگر تمہارے ابا اس سے ضرور نبٹیں گے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم

فکر نہ کرو۔“

وہ جانتی تھی کہ اب اس سے کوئی نہیں نبٹے گا۔ وہ صرف اس کو آرکیٹیکٹ والے کیس کا ڈراوا دے رہے تھے تاکہ اس کو سیدھا کر کے رکھ سکیں۔ شطرنج، بساط، سیاست۔

”آپ نہیں سمجھیں گے۔“ اس نے تاسف سے نفی میں سر جھٹکا۔

”حیا! جہان نہیں آیا؟“ صائمہ تائی جو بڑی دیر سے منتظر تھیں نے ان کی گفتگو کو اختتام پذیر ہوتے دیکھا تو جلدی سے سوال کیا۔

اللہ اللہ۔ پھر وہی سوال؟ اس کے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔

”وہ نہیں آسکا تائی!“

”تو کب آئے گا۔ تمہارے ابا اور اماں تو چاہ رہے تھے کہ تمہارا نکاح بھی روحیل کے ولیمہ کے ساتھ اناؤنس کریں۔ مگر ـــــ“ تائی نے ہنکارہ بھر کر بات ادھوری چھوڑ دی۔ تایا ابا اس وقت اخبار کی طرف متوجہ ہو چکے تھے۔

ہر کوئی پوچھتا تھا کہ وہ نہیں آیا، کوئی یہ کیوں نہیں پوچھتا تھا کہ وہ کیوں نہیں آیا۔ سب اپنے مفاد کی بات پوچھتے تھے۔ جہان کی تو کسی کو فکر نہ تھی۔

☼ ☼ ☼

”اب تو بخار بھی اتر گیا ہے، باہر آجاؤ۔ وہ کب سے آئی ہوئی ہیں، اچھا نہیں لگتا۔“

وہ پھر بھی کچھ کہے بنا بیٹھی رہی۔ دل ہی نہیں چاہ رہا تھا کسی سے ملنے کو۔ پھر کافی دیر بعد اٹھی اور اپنا بیگ کھولا تاکہ کوئی جوڑا نکالے۔ ابھی پہنا لباس ملگجا سا ہو رہا تھا۔ گرے شلوار قمیص اور ساتھ میں پتا نہیں کس جوڑے کا گلابی دوپٹا پہنے، بہت بکھرے بکھرے سے حلیے میں وہ بیمار سی لگ رہی تھی۔ بیگ کھول کے ڈھکن اٹھایا تو سامنے کپڑوں پر گفٹ پیک میں ملفوف ایک پیکٹ رکھا تھا۔

اس نے پیکٹ اٹھایا۔ کچھ مدھم مدھم سا یاد تھا کہ سفیر نے جاتے ہوئے یہ اس کے حوالے کیا تھا، کہ یہ حلیمہ آنٹی نے دیا تھا۔ اس نے ریپر پھاڑا، اندر بہت خوب صورت سفید ان سلی سلک کا کپڑا تھا۔ ساتھ میں ایک چھوٹا سا کارڈ بھی لگا ہوا تھا۔ اس نے کارڈ اٹھایا۔

”حیا کے لیے، بہت دعاؤں کے ساتھ۔

تم ہمیشہ پوچھنا چاہتی تھیں کہ تمہارے ساتھ فلائیٹ میں عثمان نے سامنے بیٹھی ترک عورت سے کیا کہا تھا تاکہ وہ تم سے زیادہ فرینک نہ ہو سکے۔ تو میں تمہیں بتائے دیتی ہوں۔ انہوں نے اس سے کہا تھا کہ ہم نے ایسی ڈش کا آرڈر دیا ہے جس میں انڈین اسٹائل کی تلی ہوئی پیاز بھی شامل ہے۔ اور بات یہ ہے حیا کہ ترک عورتوں کو تلی ہوئی پیاز کی خوشبو سے سخت الرجی ہے لیکن آف کورس وہ صرف اس لیے ایسا کرنا چاہ رہے تھے کہ کہیں کسی اجنبی سے بے تکلفی سے تمہیں نقصان نہ ہو۔ ہم اپنے دوستوں کا بہت خیال رکھتے ہیں!

فقط حلیمہ اور عثمان۔

اس کے چہرے پہ افسردہ سی مسکراہٹ امڈ آئی

اس نے بیگ سے کپڑے ادھر ادھر کیے۔ آگے پیچھے ہر جگہ دیکھا۔ پھر دوسرا بیگ کھولا۔ اس کا وینڈ چائم کہیں نہیں تھا۔ پتا نہیں وہ اسے کہاں بھول آئی تھی۔ دل اتنا خراب ہوا اس بات سے کہ وہ لباس بدلے بغیر، بال کیچر میں باندھے ہی باہر آگئی۔

”مطلب حد ہو گئی۔ ایک دم سے ہمیں اتنی سنا دیں رضا بھائی نے۔ ہمارا کیا قصور؟ اور وہ فائزہ وغیرہ ان کو بھی تو دھیان رکھنا چاہیے تھا نا۔“

ثنا لاؤنج کے صوفے پہ بیٹھی زور و شور اور خفگی سے کہہ رہی تھی۔ حیا کو آتے دیکھا تو بات روک کر جلدی سے اٹھی۔

”حیا آپا کدھر ہیں آپ، سب کہہ رہے تھے کہ آپ آتے کے ساتھ ہی بیمار پڑ گئی ہیں۔“

وہ بڑے تپاک سے اس کے گلے لگی۔ حیا زبردستی ذرا سا مسکرائی۔ سونیا بھی اچھی طرح سے ملی۔ باقی سحرش اور ارم تو اپنے اپنے موڈ میں تھیں مگر اسے کہاں پروا تھی۔ ثنا شا اپنے مصروف انداز میں بے نیاز سی صوفے پہ بیٹھی میگزین کے ورق پلٹ رہی تھی۔

”تو پھر کیا تم نے فائزہ سے شکایت کی؟“ وہ سب بیٹھ گئیں تو سونیا بھابھی نے ثنا کو تفکر سے دیکھتے ہوئے سلسلہ کلام وہیں سے جوڑا۔ لاؤنج کی وسطی میز پہ شیشے کے پیالے میں اسٹرابریز بھری پڑی تھیں۔ درمیان سے کٹی ہوئی سرخ رسیلی اسٹرابریز۔ سحرش بات سنتے ہوئے ایک ایک اسٹرابری اٹھا کر کھاتی جا رہی تھی۔

”ہاں۔ آج جا کر فون کرتی ہوں فائزہ باجی کو۔ حد ہے۔“ پھر حیا کو دیکھ کر ثنا وضاحت کرنے لگی۔ ”فائزہ باجی نے پتا ہے کیا کیا؟“

”کیا۔“ حیا نے اسی کے انداز میں دوہرایا۔ اسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ فائزہ ارسل کی بہن تھی اور ارسل وہ تھا جس کے ولیمے کی رات تایا ابا نے اس کی بے عزتی کی تھی۔

”فائزہ باجی نے ارسل بھائی کے ولیمے کی تصویریں فیس بک پہ لگا دیں۔ چلو اپنی لگاتیں، خیر تھی۔ مگر ہماری نبیل کی بھی تین تصویریں البم میں لگا دیں اور پرائیویسی پبلک کے سامنے رکھ دی۔ رضا بھائی نے دیکھا اور پھر ہمیں ہی سنانے لگے۔ اب فائزہ باجی سے پوچھو، کہاں کے ایتھیکس ہیں یہ کہ کسی اور کی تصویر کو یوں لگا دو؟“

وہ بس خاموشی سے ثنا کو دیکھتی رہی۔ اس کا ذہن کیلیس کی سرحد سے آگے نہیں بڑھا تھا۔

”آپ کی تصویر بھی تھی۔“ ثنا نے یاد کر کے بتایا۔ اس پہ وہ ذرا سی چونکی۔

”مگر آپ کی تو خیر ہے، آپ نے تو لپیٹ کر دوپٹا لیا ہوا تھا نا۔ پتا ہی نہیں چل رہا تھا کہ کون ہے مگر میری تو اچھی خاصی کلاس لے لی بھائی نے۔“ وہ سخت رنجیدہ تھی، غالباً ان کے گھر آتے ہوئے ہی رضا سے ان کا ٹاکرا ہوا تھا۔

”ہاں۔ حیا کا دوپٹا نہ ہوا، سلیمانی چغہ ہوا۔“ ارم ذرا سی ہنسی۔ حیا نے نگاہ پھیر کر اسے دیکھا۔ وہ ہاتھ میں پکڑی شیشے کی پلیٹ پہ رکھی سٹرابری کو کانٹے میں پھنسا رہی تھی۔ پھر کانٹا منہ میں لے جاتے ہوئے اس نے حیا کو دیکھا۔ حیا کی نگاہوں میں کچھ ایسا تھا۔ ارم بے اختیار دوسری طرف دیکھنے لگی۔

”جہان نہیں آیا تمہارے ساتھ حیا؟“ سحرش نے بات کا رخ پھیرا تو حیا نے نگاہیں اس کی طرف پھیریں پھر ہلکا سا نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں۔“ اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔

”اچھا تم تو کہہ رہی تھیں کہ وہ تمہارے ساتھ آئے گا۔“ معصوم سا سوال تھا مگر اسے بہت زور سے چبھا۔ سونیا نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ اسے یقیناً سحرش کا لہجہ اچھا نہیں لگا تھا۔

”کہا تھا مگر ایسا ہو نہیں سکا۔“ اس نے فقط یہی کہا۔ اس کا دل بھر آیا تھا۔ وہ ایک دم اٹھی اور تیزی سے کمرے کی طرف آگئی۔

سب نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔ ثنا شا اسی طرح بے نیازی سی میگزین کے صفحے پلٹ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

اس کے سیل پہ عائشے کا جواب آگیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ شام میں آن لائن ہو گی، تب وہ دونوں بات کریں گی۔ وہ عائشے سے کیا بات کرنا چاہتی تھی، وہ نہیں جانتی تھی۔ بس وہ اپنا دکھ اور اضطراب کسی سے بانٹنا چاہتی تھی۔ کسی سپاہی کی بیوی ہو کر دنوں، ہفتوں، مہینوں اس کا صبر سے انتظار کرنا کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے وہ اب جان پائی تھی۔

”کیسی ہو؟“ اسکرین پہ عائشے کا شفاف، خوب صورت چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ وہ کمپیوٹر کے سامنے

ریوالونگ چیئر پر بیٹھی تھی اور بات کرتے ہوئے وہ شیشے کی ننھی پیالی سے ترک چائے کے گھونٹ بھر رہی تھی۔

"مجھے نہیں پتا میں کیسی ہوں؟" وہ اداسی سے بولی تھی۔ ملگجے لباس اور کف سے بندھے بالوں میں حیا بہت کمزور اور افسردہ دکھائی دیتی تھی۔

"کیا ہمارا اناطولیہ اچھا نہیں لگا؟" عائشے نے حیرت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ پیالی سائیڈ پہ رکھی۔ کپادوکیہ، وسطی اناطولیہ میں واقع تھا۔

"نہیں بہت اچھا لگا۔" وہ پھیکا سا مسکرائی۔

"بہارے بتا رہی تم لوگ انقرہ بھی گئے تھے۔ کیا اس کے جانے کے بعد تم نے انقرہ دیکھا یا واپس آ گئیں؟"

"میں کیلیس چلی گئی تھی۔" اس کے لبوں سے پھسلا۔

چائے کی پیالی اٹھاتی عائشے ذرا چونکی تھی۔

"اچھا؟ کس دن گئیں تم کیلیس؟"

"اتوار کو گئی تھی۔ منگل کی دوپہر واپس آ گئی۔" اب چھپانے کا کیا فائدہ تھا۔ عائشے چند لمحے کچھ سوچتی رہی تھی۔ پیالی اس کے ہاتھ میں تھی مگر وہ اسے لبوں تک لے جانا جیسے بھول گئی تھی۔

"کیا بارڈر وہاں سے بہت قریب پڑتا ہے؟"

"ہاں! بہت قریب!" اس کی نگاہوں کے سامنے پھر سے وہی رات گھوم گئی۔ وہ خوفناک، برستی بارش والی رات۔

"تو کیا بارڈر کی ساری خبریں کیلیس میں لوگوں کو مل جایا کرتی ہیں؟"

"کس قسم کی خبریں عائشے؟" اس نے اچنبھے سے اسکرین کو دیکھا۔

"مطلب جو لوگ ان لیگل بارڈر کراس کرتے ہیں ان کی گرفتاری کی خبریں۔ کیا منگل کی صبح تم نے کوئی ایسی خبر سنی تھی؟" وہ بہت سوچ سوچ کر بول رہی تھی۔ اور لمحے بھر کے لیے حیا کو لگا، اس کا سانس رک گیا ہے۔

"وہ اپنی بہن کی جاسوس ہے، ساری باتیں اس کو بتاتی ہو گی۔"

"تمہارا موبائل تمہارے پاس تھا بہارے؟"

"کیا تم لوگ کیلیس جاؤ گے؟ عبدالرحمٰن کیلیس کا نام لے رہا تھا۔"

"حیا؟" عائشے نے اسے پکارا وہ چونکی۔ کڑیاں سے کڑیاں ملائیں تو ایک عجیب سا خیال ذہن میں ابھرا۔ نہیں، یہ نہیں ہو سکتا تھا۔ عائشے پولیس کو کیوں بتائے گی؟ مگر پھر وہ بارڈر پہ گرفتاری کے بارے میں سننے میں اتنی دلچسپی کیوں رکھتی تھی؟

"پیر اور منگل کی درمیانی رات وہ بارڈر کراس کر رہا تھا عائشے! مگر سیکیورٹی اہلکار اس کے انتظار میں تھے۔ وہ گرفتار ہوا یا مارا گیا، میں نہیں جانتی۔ مگر میں اتنا جانتی ہوں کہ... وہ اس کے انتظار میں تھے کیونکہ تم نے ان کو بتایا تھا۔ ہے نا؟" پتا نہیں کیسے یہ سب اس کے منہ سے نکلا تھا۔ لاشعور میں جڑتی کڑیاں مل کر ایک ایسی زنجیر بنا گئی تھیں جس نے اس کے گلے میں پھندا ڈال دیا تھا۔

عائشے لمحے بھر کو خاموش ہو گئی۔ حیا کو لگا، وہ انکار کر دے گی مگر وہ جھوٹ نہیں بول سکتی تھی۔

"ہاں! میں نے ان کو کال کی تھی۔ میرا فرض تھا۔ اگر مجھے یہ معلوم ہو کہ ایک قومی مجرم قانون توڑنے جا رہا ہے تو مجھے سیکیورٹی فورسز کو بتانا چاہیے تھا۔"

وہ بے یقینی سے عائشے کو دیکھ رہی تھی۔ وہ کتنے آرام سے یہ سب کہہ رہی تھی۔ کیا اسے نہیں معلوم تھا وہ کیا کہہ رہی تھی؟

"مرحبا حیا!" بہارے کہیں پیچھے سے آئی اور بہن کے کندھے پہ جھول کر جھک کر اسکرین میں دیکھا۔ حیا نے جواب نہیں دیا۔ وہ ابھی تک عائشے کو دیکھ رہی تھی۔

"عبدالرحمٰن مجرم نہیں تھا عائشے! وہ مجرم نہیں تھا۔"

چائے کا گھونٹ بھرتے بھرتے عائشے گل ٹھہری۔ اس کی آنکھوں میں اچنبھا ابھرا۔ "عبدالرحمٰن کا کیا ذکر؟"

"تم۔" حیا نے لب کھولے مگر رک گئی۔ اس کے اندر ابلتا غصہ، بے یقینی سب کچھ رک گیا۔ کہیں کچھ غلط تھا۔

"تم۔ تم نے عائشے! ہم عبدالرحمٰن کی بات کر رہے ہیں، جسے میں نے کیلیس میں کھو دیا ہے۔" بے بسی سے اس نے کہنا چاہا۔ بہارے کبھی عائشے کو دیکھتی اور کبھی اسکرین کو۔

چائے کی پیالی بے اختیار ایک طرف رکھتے ہوئے وہ سیدھی ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں ابھری حیرت اب بے یقینی میں بدل گئی تھی۔

"عبدالرحمٰن کیلیس میں کیا کر رہا تھا؟"

"تم جانتی ہو، وہ کیا کر رہا تھا۔ تم نے سیکیورٹی کو بتایا اس کے بارڈر کراسنگ کا....."

"حیا! وہ کیلیس میں نہیں تھا۔ اسے انقرہ سے جرمنی جانا تھا۔ وہ کیلیس کیوں گیا؟"

"تم جانتی ہو وہ کیلیس میں تھا عائشے! تمہیں..... بہارے نے بتایا تھا مجھے معلوم ہے۔" جذبات کی شدت سے اس کی آواز بلند ہو گئی تھی۔

"بہارے گل! تم جانتی تھیں؟" عائشے نے بے یقینی سے اپنی بہن کو دیکھا۔ وہ بے ساختہ سہم کر پیچھے ہوئی۔

"میں نے کچھ نہیں کیا۔ سب مجھے ایسے کیوں دیکھتے ہیں؟" اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

"وہ منگل کی رات بارڈر کراس کرنے جا رہا تھا، کیا یہ تمہیں بہارے نے نہیں بتایا؟"

وہ بارڈر کراس کرنے جا رہا تھا؟ نہیں حیا۔۔۔ یہ نہیں ہو سکتا۔" عائشے ابھی تک دم بخود تھی۔ میں نے اس کے بارے میں تو کسی کو کچھ نہیں کہا۔ میں نے تو نصوح فخری کے بارے میں بتایا تھا سیکیورٹی کو۔ اس نے بارڈر کراس کرنا تھا منگل اور پیر کی درمیانی شب!"

"وہ جہان تھا عائشے! تم نے کال ہی کیوں کی سیکیورٹی کو؟" وہ دبی دبی چلائی تھی۔ اس رات کے زخم، بارود کی بو، روشنی کے گولے، سب پھر سے تازہ ہو گیا تھا۔

"کیونکہ مجھے عبدالرحمٰن نے ایسا کرنے کو کہا تھا۔" وہ بے بسی سے بولی تھی۔ بہارے نے تائید میں سر ہلایا۔

"میری بہن سچ کہہ رہی ہے۔ میں نے ان کی باتیں سنی تھیں چرچ میں۔"

اور حیا کو لگا وہ اگلا سانس نہیں لے سکے گی۔

☼ ☼ ☼

"عائشے! تمہارا فون بج رہا ہے۔" آنے کے پکارنے پہ وہ چونکی۔ گود میں رکھا موبائل جانے کب سے بج رہا تھا۔

"بہارے!" نمبر پہ لکھا نام بہت محبت سے لے کر اس نے آنے کو بتایا اور سبز بٹن دبا کر فون کان سے لگایا۔

"السلام علیکم!" اس نے مسکرا کر سلام کیا۔

"وعلیکم السلام کیسی ہو؟" ایران سے ہزاروں کلو میٹر دور، وہ اہلارا وادی کے چرچ میں کھڑا بہارے کے فون کو کان سے لگائے کہہ رہا تھا۔ ساتھ ہی اس نے پلٹ کر دیکھا۔ چرچ کے کھلے دروازے سے بیرونی سیڑھیاں نظر آ رہی تھیں، جو پہاڑ کے نیچے تک جاتی تھیں۔ حیا ابھی نماز پڑھ کر نہیں آئی تھی اور بہارے کے پرس سے فون نکال کر اس نے اسے تصویریں کھینچنے چرچ کی اوپری منزل پہ بھیجا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں، تم سناؤ، ترکی والے کیسے ہیں؟"

اس کی مسکراہٹ اور بھی خوب صورت ہو گئی۔ طمانیت کے سارے رنگ آنکھوں میں اتر آئے تھے بہت دن بعد اس نے عبدالرحمٰن کی آواز سنی تھی۔

"عائشے! یاد ہے تم نے کہا تھا تم مجھے ایک فیور دو گی۔" وہ چرچ کی چوکھٹ میں کھڑا سیڑھیوں کو ہی دیکھ رہا تھا۔ حیا کے آنے سے پہلے پہلے اسے بات ختم کرنی تھی۔

"ہاں، بتاؤ، کیا ہوا؟"

"تم ترکی کے اس بارڈر کے بارے میں کیا جانتی ہو؟"

"کون سا بارڈر؟ ترکی اور شام کا؟"

"ہاں، اس بارڈر کو ایک قومی مجرم اس منگل کی رات ــ کراس کرے گا، غیر قانونی طور پہ۔ ایسے میں تمہیں کچھ کرنا ہے۔"

چند لمحے کی خاموشی کے بعد (غالباً "وہ کسی اور جگہ آ گئی تھی) وہ بولی۔ "ہاں، کہو پھر، میں سن رہی ہوں۔"

"ترکی کا تم پہ قرض ہے عائشے! اپنے دل سے پوچھو کہ اگر تمہیں معلوم ہو جائے کہ ایک مجرم، ترکی کا ایک قومی مجرم غیر قانونی طریقے سے سرحد پار کر رہا ہے تو تمہیں کیا کرنا چاہیے؟"

عائشے خاموش رہی تھی۔ وہ آواز مزید دھیمی کرتے ہوئے بولا۔

"تمہیں بارڈر سیکیورٹی فورس کے کمانڈر کو فون کرنا چاہیے۔ تمہیں ان کو بتانا چاہیے سب کچھ تاکہ وہ اسے گرفتار کر سکیں، مگر نہیں، عائشے گل یہ کیسے کر سکتی ہے۔ عائشے گل تو کچھ نہیں کر سکتی۔"

"ذرا اونچا بولو، اتنا آہستہ مجھے سمجھ نہیں آ رہا۔ کیا کوئی آس پاس ہے؟" وہ برا مان کر ذرا خفگی سے بولی، جیسے آخری فقرے کو نظر انداز کرنا چاہ رہی ہے۔

"میں نہیں چاہتا کہ کوئی سنے۔ تم یہ سب لکھ لو اور کمانڈر کا نمبر بھی۔"

پھر وہ اسے تمام ضروری باتیں بتاتا گیا اور وہ لکھتی گئی۔

"انہیں تمہاری کال ٹریس کرنے میں نوے سیکنڈ لگیں گے۔ تم نے اسّی ویں سیکنڈ میں کال کاٹنی ہے۔

تم یہ کرو گی نا؟ تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔ اور تب اس کو اپنی پشت پہ آہٹ کا احساس ہوا وہ تیزی سے پلٹا۔ اندر چرچ کی سیڑھیوں پہ حرکت سی ہوئی تھی۔

"کوئی آ گیا ہے، بعد میں کال کروں گا۔" اور اس کے مڑ جانے سے قبل ہی وہ سبک رفتاری سے آگے آیا اور سیڑھیوں کی اوٹ میں کھڑی بہارے گل کو کلائی سے پکڑ کر باہر نکالا۔

"میں ابھی آئی تھی۔ واللہ! میں نے کچھ نہیں سنا۔" چھوٹی بلی بوکھلا گئی تھی، مگر وہ لب بھینچے۔ بہارے کو اسے چرچ سے باہر لایا تھا۔

"تو تم میری باتیں سن رہی تھیں۔ تمہیں تمہاری بہن نے سکھایا نہیں ہے کہ کسی کی باتیں چھپ کر نہیں سنتے؟"

"میری بہن کو کچھ مت کہو۔"

"جو تم نے سنا ہے اگر وہ تم نے حیا کو بتایا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا بہارے!"

وہ دبے دبے غصے سے کہہ رہا تھا۔ "اور اگر تم نے اپنی بہن کو بتایا کہ میں نے یہ بات حیا کو بتانے سے منع کیا ہے تو میں واقعی بہت برا پیش آؤں گا۔"

سیڑھیوں پہ ٹک ٹک کی آواز گونجنے لگی۔ وہ اوپر آ رہی تھی۔ جہان نے بہارے کو موبائل واپس کیا، جسے اس نے جلدی سے اپنے پرس میں ڈال دیا۔

"اگر تم نے میری بات نہ مانی بہارے......"

"میں نے کچھ نہیں سنا......" وہ روہانسی ہو گئی تھی۔ حیا تب تک اوپر پہنچ چکی تھی۔

"اس نے یہ سب کہا؟" وہ بے یقینی سے اسکرین پہ نظر آتی عائشے اور بہارے کو دیکھ رہی تھی۔

"ہاں، میری بہن سچ کہہ رہی ہے۔ میں نے خود سنا تھا۔"

"تم نے یہ سب سنا تھا؟" اور وہ سمجھتی رہی کہ شاید اس نے اس کی اور جہان کی باتیں سنی تھیں مگر وہ تو اردو میں بات کر رہے تھے۔ وہ سن بھی لیتی تو اسے کیا سمجھ میں آتا؟ اس نے ان کی باتیں سنی ہی نہیں تھیں۔ وہ ایک دفعہ پھر ایک طرف کی کہانی سے نتیجہ اخذ کر گئی تھی۔

اس نے اپنی مخبری خود کروائی؟ اس نے اپنے آپ کو خود گرفتار کروایا؟ مگر کیوں؟ اس سارے قصے کا کوئی تک نہ بنتا تھا۔ وہ حیران تھی، پریشان تھی۔

"تمہیں کیسے پتا کہ وہ گرفتار ہو گیا ہے؟" عائشے نے بے چینی سے پوچھا۔

"میں نے خود دیکھا تھا وہ......" حیا کے الفاظ لبوں پہ ٹوٹ گئے۔ اس نے کیا دیکھا تھا؟ ہیولے؟ دھواں؟ روشنی کے گولے ایک طرف کی کہانی؟

"مجھے نہیں پتا میں نے کیا دیکھا تھا۔ مجھے نہیں پتا۔" وہ بے بسی سے نفی میں سر ہلانے لگی۔ پھر ایک دم جھماکے سے اسے یاد آیا۔

جہان کے جوتوں کا رخ جب وہ اٹھا تھا تو اس کے جوتوں کا رخ بائیں جانب تھا، حالانکہ وہ سرحد کی طرف منہ کیے کھڑا تھا۔ کیا وہ سرحد کی طرف نہیں جا رہا تھا؟ وہ بائیں جانب جا رہا تھا؟ مگر بائیں طرف کیا تھا؟

"پلیز تمہیں جب بھی کچھ پتا لگے، مجھے ضرور بتانا۔ اگر اسے میری وجہ سے کچھ ہوا تو میں ساری زندگی خود کو معاف نہیں کروں گی۔"

عائشے بہت فکر مند اور بے چین ہو گئی تھی۔ حیا نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلایا۔ عائشے کو تسلی دینے کے لیے ایک لفظ بھی اس کے پاس نہ تھا۔

سرحد کی وہ رات اور ہراقلیطس کی دائمی آگ سے اٹھتے دھوئیں کے مرغولے...... سب پھر سے ذہن میں تازہ ہو گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس نے دیوار پہ لگے کیلنڈر کی تاریخوں کو ایک دفعہ پھر دیکھا۔ ابھی ابھی اس نے سرخ پین سے آج کی تاریخ یعنی ہفتے کا دن کاٹا تھا۔ ابھی مزید دو روز باقی تھے۔ پھر منگل تھا۔ پین رکھ کر وہ ڈریسنگ ٹیبل تک آئی اور آئینے میں خود کو دیکھا۔ ڈوبتی امید کے درمیان اس کا دل بننے سنورنے، تیار ہونے، کسی بھی چیز کو نہیں چاہ رہا تھا۔ سادہ سفید شلوار قمیص اور شانوں پہ پھیلا سفید دوپٹا اور ڈھیلے جوڑے کے بندھے بال، ویران آنکھیں۔ دل تو وہیں زیتون کے درختوں میں کھو گیا تھا۔

وہ باہر آئی تو روحیل کچن کی ادھ کھلی دیوار کے پیچھے سے نظر آ رہا تھا۔ اسے آتے دیکھ کر ذرا سا مسکرایا۔

"پیو گی؟" وہ کپ میں کانٹے سے کافی پھینٹ رہا تھا۔

"اونہوں!" وہ ہلکا سا نفی میں سر ہلاتے آگے آئی اور کچن کی سینٹر ٹیبل کی کرسی کھینچ کر بیٹھی۔

"اور کیا ہو رہا ہے۔ جہان نے کب آنا ہے؟" گھوم پھر کر وہی سوال۔

"اچھا ہے نا وہ نہیں آیا۔ سب خوش ہو گئے۔ اسے اور مجھے ساتھ دیکھ کر خوش تھا ہی کون بھلا۔" وہ تلخی سے بولی۔

"ارے میں تو خوش تھا بلکہ وہ آتا تو اور بھی خوش ہوتا۔ خیر پھپھو کہہ رہی تھیں کہ وہ منگل کو آ جائے گا؟" روحیل پوچھ رہا تھا یا بتا رہا تھا، وہ سمجھ نہیں سکی۔ پھپھو کو تو اس نے خود ہی بتایا تھا مگر جب اسے خود ہی یقین نہیں تھا تو روحیل کو کیا دلاتی۔

"نتاشا کہاں ہے؟" اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے موضوع بدلا۔

"اندر ہو گی۔ ولیمے کے لیے اپنے ڈریس کی ڈیزائننگ کرتی پھر رہی ہے۔"

"اچھا، خوش ہے وہ پاکستان آ کر؟"

"ہوں۔" روحیل نے کافی پھینٹتے ہوئے ذرا سے شانے اچکائے۔ یہ ہاں تھا یا ناں، وہ سمجھ نہیں پائی۔ اور اب تو ابا بھی جہان سے خوش تھے۔

"تو پہلے کون سا وہ......" وہ کہتے کہتے رکی۔ ایک دم

سے کچھ یاد آیا تھا۔ بیوک ادا میں جب روحیل سے اس کی بات ہوئی تھی تب اس نے کچھ بتایا تھا۔ "تم نے بتایا تھا روحیل! یاد ہے کہ ابا کسی وجہ سے جہان سے خفا تھے۔"

"چھوڑو حیا! رہنے دو' وہ تو بس ایسے ہی۔"

"نہیں مجھے بتاؤ۔ تم نے کہا تھا بعد میں بتاؤ گے۔"

"کوئی خاص بات نہیں تھی۔ لیکن جب ابا ڈیڑھ سال پہلے استنبول میں سبین پھپھو سے ملے تھے تو انہوں نے کسی لڑکی کو جہان کو ڈراپ کرتے دیکھا تھا۔ بس اسی بات سے ان کے دل میں گرہ لگ گئی تھی مگر خیر چھوڑو! اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

اور حیا کو تو یہ بات اچھی طرح یاد تھی۔ اس نے ابا اور تایا کی باتیں سنی تھیں۔ ہاں وہ یہی بات کر رہے تھے۔ لیکن جہان نے اسے یہ بات کبھی نہیں بتائی کیونکہ اس نے پوچھی نہیں تھی۔ تو کیا ابھی بھی کچھ ایسی باتیں تھیں جو وہ اسے نہیں بتاتا تھا۔ جیسے عائشے کو وہ سب کہنا۔ اف!

☼ ☼ ☼

منگل آیا' صبح ہوئی' دوپہر چڑھی' شام اتری اور رات چھا گئی۔ وہ نہیں آیا۔ بدھ بھی گزر گیا اور جمعرات کو زاہد چچا کی بیٹی مہوش پاکستان آ گئی مگر وہ شدید کرائسز میں تھی۔ زاہد چچا اور عابدہ چچی نے کسی کو نہیں بتایا مگر صائمہ تائی کو اپنے کسی ذریعہ سے پتا لگ ہی گیا۔ مہوش کا شوہر اس سے اگلی فلائٹ میں آ رہا تھا مگر امیگریشن کے کسی چکر میں پھنس گیا اور عین وقت پہ گرفتار کر لیا گیا۔ مہوش کی فلائٹ چونکہ ایک روز قبل کی تھی' سو وہ اس وقت تک پاکستان آ چکی تھی اور پھر خبر ملتے ہی تایا فرقان اور ان کی فیملی سمیت سب ہی عابدہ چچی کی طرف اکٹھے ہو گئے تھے۔

ڈائننگ ہال اور ڈرائنگ روم کے درمیان جالی دار پردہ آدھا گرا تھا اس کے پار صوفوں پہ سب بڑے بیٹھے تھے۔ لڑکے وغیرہ بھی اکٹھے ہو گئے تھے' سو وہ باہر لان میں تھے۔

"آج کل کے لڑکے بھی پتا نہیں کن چکروں میں ہوتے ہیں۔" صائمہ تائی نے ہمدردی سے کہا تھا۔

"بس اللہ تعالیٰ خیر سے اسے واپس پہنچا دے۔" پھپھو نے دھیرے سے کہا تھا۔ انہیں بھی صائمہ تائی کا یوں اصرار سے سب کو "افسوس" کے لیے ادھر لے جانا اچھا نہیں لگا تھا۔

"جہان کی کیا خبر ہے سبین! منگل تو گزر گئی' اس کا کوئی اتا پتا ہی نہیں؟" صائمہ تائی کو پھپھو کا ٹوکنا برا لگا تو توپوں کا رخ عفان سے جہان کی طرف کر دیا۔ حیا چونک کر آدھے ہٹے پردے کو دیکھنے لگی۔

"آ جائے گا بھابھی! کسی مسئلے میں ہو گا تب ہی دیر ہوئی ہے۔" پھپھو کی آواز مزید دھیمی ہو گئی۔

"تم بھی اپنے بیٹے پہ نظر رکھا کرو سبین۔" تایا ابا نے اسی انداز میں کہا' جس میں وہ عفان کی بات کر رہے تھے۔ "پتا نہیں' وہ بھی کسی ٹھیک کام میں ہے! اپنے باپ کے جنازے پہ بھی تو نہیں آیا تھا"

"جہان کا یہاں کیا ذکر بھائی؟" پھوپھو کے لہجے میں دبا دبا شکوہ تھا۔

حیا نے میز کا کونہ سختی سے پکڑا۔ پیشانی کی رگیں بھنچ گئی تھیں۔ اندر ایک ابال سا اٹھا تھا۔

"عفان کا بھی تو ہمیں معلوم نہیں تھا۔ یہاں شاید کسی کا بھروسا نہیں ہوتا۔" تایا ابا نے پھوپھو کی بات سنے بغیر تبصرہ کیا۔ حیا کے اندر کا ابال بس کسی لاوے کی طرح پھٹ پڑنے کو تیار تھا۔ بمشکل وہ ضبط کر کے لب بھینچے بیٹھی رہی۔

"ایسا کچھ نہیں ہے بھائی! میں اپنے بیٹے کو اچھی طرح جانتی ہوں۔" حیا نے مڑ کر دیکھا۔ جالی دار پردے کے پاس پھوپھو ذرا خفگی سے کہتی نظر آ رہی تھیں۔ اس نے صائمہ تائی اور عابدہ چچی کے چہروں کے معنی خیز تاثرات دیکھے اور پھر ابا کو دیکھا' جو خاموشی سے پھوپھو کو دیکھ رہے تھے۔

"سچ کہوں تو سبین! مجھے تمہارے بیٹے کا کام

مشکوک سا لگتا ہے۔ کبھی کہتا ہے ریسٹورنٹ ہے' کبھی کہتا ہے جاب سے چھٹی نہیں ملی۔ بہتر ہو گا تم اس پر چیک رکھا کرو تاکہ کل کو کوئی بڑا نقصان نہ اٹھانا پڑے۔ میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ کام کیا کرتا ہے۔"

اور تایا کی اس بات پر اسے لگا کہ اس کی برداشت ختم ہو گئی ہے۔ یہ ٹھیک تھا کہ اسے راز رکھنے آتے تھے مگر اب مزید نہیں۔ وہ تیزی سے اٹھی اور جالی دار پردہ اٹھا کر ڈرائنگ روم کے دروازے پہ آئی۔ اس کے یوں آنے پہ سب نے اسے مڑ کر دیکھا تھا۔

"کیا آپ جانتے ہیں تایا ابا! کہ وہ کیا کام کرتا ہے۔ اگر نہیں جانتے تو میں آپ کو بتاتی ہوں؟" اپنے لہجے میں پنہاں غصے کو ضبط کیے وہ جب بولی تو اس کی آواز کافی بلند تھی۔ تایا ابا نے اسے حیرانی اور قدرے برہمی سے دیکھا اور پھر سلیمان صاحب اور فاطمہ کو۔

"جہان ابھی اسی لیے نہیں آ سکا کیوں کہ وہ اپنی آفیشل اسائنمنٹ میں پھنسا ہوا ہے۔ آپ تو یہ بھی نہیں جانتے ہوں گے کہ وہ ہماری ایجنسی کا ایک ایجنٹ ہے' ایک بہت قابل آرمی آفیسر!" اس نے دھماکا کیا تھا۔

تایا ابا' صائمہ تائی' زاہد چچا' عابدہ چچی۔ سب حیران سی نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے جیسے ان کی سمجھ میں نہیں آیا ہو کہ اس نے کیا کہا ہے۔

"آرمی آفیسر ایجنٹ۔" تایا فرقان نے کچھ حیران نگاہوں سے پہلے اسے دیکھا جو اپنی بات کہہ چکنے کے بعد ذرا پر سکون سی چوکھٹ پہ کھڑی تھی۔ پھر سبین پھوپھو کو دیکھا جو خاموشی سے صوفے پہ بیٹھی تھیں مگر ان کی آنکھوں کا سکون اس بات کا غماز تھا کہ انہیں حیا کی اس بات سے خوشی ہوئی ہے۔ انہیں شاید جہان نے منع کر رکھا تھا۔ بیٹے کا مان رکھتے ہوئے وہ خاموش رہی تھیں۔ حیا کے اس عمل سے جیسے ان کو ڈھیروں سکون مل گیا تھا۔

"وہ ہماری ایجنسی کے لیے کام کرتا ہے؟" صائمہ تائی شاکڈ سی بولیں۔ "کیا وہ آرمی آفیسر ہے' کیا واقعی؟"

"جی تائی امی! یہ سچ ہے۔" وہ سینے پہ بازو لپیٹے بہت اعتماد سے کہہ رہی تھی۔ "اس نے بہت عرصہ یہ بات آپ لوگوں کو نہیں بتائی ہاں ٹھیک ہے اس کی جاب کی نوعیت ایسی تھی کہ اسے اپنی اصل شناخت چھپا کے رکھنا تھی۔ لیکن وہ چاہتا تو بتا سکتا تھا۔ لیکن اس نے آپ لوگوں کو نہیں بتایا شاید اس لیے کہ وہ آپ کا مان نہیں توڑنا چاہتا تھا۔ وہ مان جس سے بہت سال پہلے آپ لوگوں نے۔" اس نے 'لوگوں' کہتے ہوئے تایا فرقان کو دیکھا "بہت فخر سے کہا تھا کہ کسی غدار کے بیٹے کو فوج میں کمیشن نہیں مل سکتا۔ ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا تایا ابا۔ کتنے ہی غداروں کے بیٹے' بھتیجے آج بھی فوج میں کام کر رہے ہیں اور بہت دیانت داری اور حب الوطنی سے کر رہے ہیں۔" وہ جانتی تھی کہ 'بڑوں کے سامنے اتنا نہیں بولنا چاہیے' مگر بات کرتے ہوئے وہ بھی تمیز اور تہذیب کے دائرے سے آگے نہیں نکل رہی تھی۔ البتہ اس کی آواز ذرا اونچی تھی۔

ڈرائنگ روم میں اتنا سناٹا تھا کہ سوئی بھی گرتی تو گونج پیدا ہوتی۔ تایا فرقان کے چہرے پہ ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک جا رہا تھا۔ وہ جیسے سمجھ ہی نہیں پا رہے تھے کہ یہ سب ہوا کیا ہے۔

نتاشا' روحیل سے دھیمی آواز میں کچھ پوچھ رہی تھی اور وہ آہستہ سے جواب میں کچھ بتا رہا تھا۔ نتاشا اس کی بات سن کر ذرا سا مسکرائی اور فاتحانہ نگاہوں سے اسے دیکھا اور کہا "I guessed so" ڈرائنگ روم میں موجود نفوس میں وہ واحد تھی جسے اس خبر نے بہت محظوظ کیا تھا۔

"کیا کرتا ہے وہ' آرمی میں رینک کیا ہے اس کا؟" زاہد چچا وہ پہلے تھے جنہوں نے سوال کیا۔ شاید ان کے ذہن نے اس بات کو قبول کر لیا تھا۔

"میجر ہے۔" اس سے پہلے کہ وہ جواب دیتی' جواب کسی اور نے دیا۔ حیا بے اختیار چونکی۔

سلیمان صاحب!

اب حیران ہونے کی باری اس کی تھی۔ اس کے لب ذرا سے کھل گئے اور آنکھوں کی پتلیاں پھیل

گئیں۔ ابا کو پتا تھا؟ ابا کو کب سے پتا تھا؟ اس نے پھوپھو کی طرف دیکھا' وہ بھی حیران ہوئی تھی۔

"کیا تمہیں معلوم تھا؟" تایا فرقان کو جھٹکا لگا۔

"جی کافی عرصے سے پتا تھا۔" انہوں نے کہتے ہوئے حیا کو دیکھا "میں اس شہر میں رہتا ہوں اور میرے اپنے بھی سورسز ہیں۔ مجھے کافی عرصے سے پتا تھا اور مجھے اس پہ اسی بات کا غصہ تھا کہ کیا تھا اگر وہ ہمیں بتا دیتا۔ ہم اس کے اپنے تھے' دشمن تو نہیں تھے۔"

حیا نے بے اختیار روحیل کی طرف دیکھا۔ روحیل نے اثبات میں سر ہلایا تو یہ بات تھی جس کے سبب ابا اس سے برگشتہ رہتے تھے۔ وہ لڑکی والا معاملہ نہیں تھا۔ روحیل کو بھی پتا تھا' ابا کو بھی پتا تھا نتاشا کو شک تھا' بس ایک وہی بے وقوف تھی جو تین مہینے اس کے پزل باکس کی پہیلیاں ڈھونڈتی رہ گئی۔ کاش وہ ان سب سے پہلے پوچھ لیتی۔

"حیرت ہے۔" تایا فرقان بمشکل کہہ پائے۔ وہ ابھی تک بے یقین تھے۔

"تمہیں کس نے بتایا؟" فاطمہ ابھی تک حیران تھیں۔ کبھی اسے دیکھتیں' کبھی سلیمان صاحب کو۔ جیسے سمجھ نہ پا رہی ہوں کہ انہیں اس بات پہ خوش ہونا چاہیے یا نہیں۔

"جہان نے! اسے مجھے ہی بتانا چاہیے تھا نا۔" اس نے شانے اچکاتے ہوئے جواب دیا۔ بس وہ ایک جواب ہر جواب پہ بھاری ہو گیا۔ صائمہ تائی' عابدہ چچی کی معنی خیز نگاہوں' طنز و طعنے کے نشتروں' ہر شے کو اپنا جواب مل گیا۔

وہ واپس پلٹی تو دیکھا ڈائننگ روم میں موجود لڑکیاں اسے ان ہی ششدر و حیران نگاہوں سی دیکھ رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

وہ اپنے کمرے میں لیپ ٹاپ کے آگے بیٹھی ترکی کی تصویریں دیکھ رہی تھی جب اس کا موبائل بجا۔

اسکرین کو دیکھتے ہوئے اس نے فون اٹھایا اور نمبر دیکھ کر جیسے اندر تک کڑواہٹ گھل گئی۔ ولید جانے یہ کب اس کی جان چھوڑے گا۔

چند لمحے وہ جلتی بجھتی اسکرین دیکھتی رہی' اٹھائے یا نہیں۔ مگر اس آدمی سے کچھ بعید نہیں تھا۔ اٹھانا ہی پڑے گا۔ اس نے سبز بٹن دبا کے فون کان سے لگایا۔

"ہیلو۔"

"میں تمہارے گھر کے باہر ہوں۔ کیا تم پانچ منٹ میں باہر آسکتی ہو؟"

ان کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے کے دبا دیا۔

"کیا؟ تم یہاں کیا کرنے آئے ہو؟" وہ حیران پریشان سی کھڑی ہوئی۔ پھر کمرے سے باہر نکلی۔ وہ بیرونی دروازے کی طرف نہیں بلکہ سیڑھیوں کی طرف جا رہی تھی۔

"میں نے تم سے کہا تھا کہ مجھے تم سے بات کرنی ہے۔ وہ آرکیٹکٹ والا مسئلہ ابھی حل نہیں ہوا اور میں جانتا ہوں تم اسے حل کرواؤ گی۔ میں اس دن پزاہٹ میں ویٹ کرتا رہا مگر تم نہیں آئیں! اور اب میرا خیال ہے کہ وہ وقت آگیا ہے جب تمہیں میری بات کو سنجیدگی سے سننا چاہیے۔"

"اور میں نے تم سے کہا تھا کہ میں نہیں آؤں گی۔ تم مجھے کیا سمجھتے ہو۔ تمہارا خیال ہے کہ میں تمہاری ان گیدڑ بھبکیوں سے ڈر جاؤں گی؟ grow up ولید۔" لہجے میں سختی رکھتے ہوئے وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ اس نے ٹیرس کا دروازہ کھولا اور تیزی سے باہر آئی۔

"میں نے فون تمہاری یہ سب باتیں سننے کے لیے نہیں کیا۔ تم باہر آؤ' مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔ بس پانچ دس منٹ لگیں گے۔ اوکے!" کال کاٹ دی گئی۔

اس نے شاک زدہ انداز میں بند فون کو دیکھا اور پھر تیزی سے آگے آئی۔ چھت پہ کونے میں پڑے جھولے کے پیچھے ہو کر اس نے منڈیر پر سے جھانکا۔ باہر رات سیاہ تھی۔ کہیں کہیں سٹریٹ پول جل رہے

تھے۔ گھر کے گیٹ سے ذرا دور ولید کی سیاہ اکارڈ کھڑی تھی۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھا اسٹیرنگ ویل پہ ہاتھ رکھے منتظر سا ان کے گیٹ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ مڑی اور ٹیرس پہ رکھے ان مصنوعی پودوں کی طرف آئی جو بڑے بڑے گملوں میں رکھے تھے۔ گملے بڑے تھے اس لیے ٹہنیوں کو کھڑا رکھنے کے لیے انہیں مٹی کے بجائے چھوٹے بڑے پتھروں سے بھرا گیا تھا۔ اس نے ایک گملے سے ایک وزنی سا پتھر اٹھایا اور واپس منڈیر تک آئی۔ ولید ابھی تک منتظر نگاہوں سے گیٹ کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے اس کا خیال تھا کہ اس کی بلیک میلنگ میں آکر وہ ابھی گیٹ سے آتی دکھائی دے گی اور ایک دفعہ پھر اس کی گاڑی میں بیٹھ جائے گی۔ مومن ایک سوراخ سے کبھی دوبار نہیں ڈسا جاتا۔ وہ اتنی کمزور تو نہیں تھی کہ اس کی بلیک میلنگ کی وجہ سے اس کے ساتھ بیٹھ جاتی۔ وہ اور ہوتی ہوں گی کمزور لڑکیاں جو بلیک میلنگ سے گھبرا جاتی ہوں گی۔ نہیں۔ اگر اس نے جنت کے پتے تھامے تھے تو اللہ اسے رسوا نہیں کرے گا۔

اس نے ایک نظر ہاتھ میں پکڑے پتھر کو دیکھا اور پھر نیچے کھڑی گاڑی کو۔ لمحے بھر کے لیے ساری باتیں سیلاب کی طرح امڈ کر اس کے ذہن پہ چھاتی گئیں۔ ولید کی بلیک میلنگ' اس کی بدتمیزیاں' اس کی ہر وہ حرکت جس نے اسے ذہنی کوفت میں مبتلا رکھا تھا اور پھر اس نے کھینچ کر وہ پتھر اس کی گاڑی پہ دے مارا۔

اندازہ اس نے ونڈ اسکرین کا کیا تھا مگر وہ بونٹ پہ لگ کر نیچے گرا۔ ولید نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا اور اس سے پہلے کہ وہ اوپر گردن کرتا' حیا پیچھے ہو گئی۔ یہ نہیں تھا کہ وہ اس کے سامنے آنے سے ڈرتی تھی' بس اس نے اسکارف نہیں لے رکھا تھا۔

گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی اور ٹائروں کی رگڑ۔ حیا نے حیرت سے منڈیر کے سوراخ سے نیچے دیکھا۔ ولید کی گاڑی دور جاتی دکھائی دے رہی تھی۔ اتنا بزدل نکلا وہ؟ بس ایک پتھر سے ڈر گیا۔ اس کو واقعی حیرت ہوئی تھی۔ یا شاید ہر بلیک میلر اتنا ہی بزدل' اتنا ہی کمزور اور اتنا ہی گھٹیا ہوتا ہے۔ ہونہہ۔

لیکن اگر کسی دن اگر وہ واقعی ان کے گھر پہنچ گیا اور وہ سی ڈی ابا یا کسی کو دکھا دی تو پھر نتائج کیا نکلیں گے۔ وہ اپنی عزت کھودے گی' مقام کھودے گی۔ ولید کے ہاتھ سے ملنے والی سی ڈی سب خراب کر دے گی۔

ارم اور ولید۔ ان دونوں کو اللہ کا کوئی خوف نہیں تھا۔ وہ بے دلی سے بیڈ پہ آکے بیٹھ گئی۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کیا کرے۔

جب دل زیادہ اداس ہوا تو وہ وضو کر کے آئی اور قرآن کھول کر بیڈ پہ بیٹھ گئی۔ ہاں اس نے جہان سے وعدہ کیا تھا کہ وہ روز قرآن پڑھے گی مگر ابھی تک نہیں پڑھ سکی تھی۔ اب وہ پڑھا کرے گی۔ مگر کہاں سے شروع کرے۔ سورۃ بقرہ سے شروع کرے؟

اس نے سورۃ نور نکالی۔ یہ وہ سورت تھی جس نے ہر چیز شروع کی تھی۔ جس نے اسے ایک اور دنیا میں پہنچایا تھا۔ اب اسے ایک دفعہ پھر پڑھنا تھا۔ ہاں علشے کہتی تھی قرآن میں ہر چیز کا جواب ہوتا ہے۔ ہر دکھ کا مداوا' ہر پریشانی کی تسلی۔ ہر فکر کا حل۔ وہ سورۃ نور پڑھنے لگی۔ آہستہ آہستہ دل پہ تنگی قرآن پہ لکھے سیاہ حروف سے کم ہونے لگی۔ سیاہ حروف' اس کا سیاہ موتی جو رومال میں رکھا تھا اور ساتھ کنکر اس کے دل میں دوسرے خیال آنے لگے۔ اس نے سر جھٹکا اور آیات پر توجہ دی۔

"وہ لوگ جو تم میں سے ایمان والے ہیں' اور انہوں نے اچھے کام کیے ہیں' اللہ نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ ان کو وہ ضرور زمین میں جانشین مقرر کرے گا' جیسا کہ ان سے پہلوں کو مقرر کیا اور ان کے لیے جس دین کو پسند کیا ہے' اسے ضرور مستحکم کرے گا اور ان کے خوف ضرور امن میں بدلے گا' بس شرط یہ ہے کہ وہ میری عبادت کرتے رہیں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں!" (النور ۵۵)

لمحے بھر کو کمرے میں روشنی ہو گئی۔ سونے کے پتنگے سے ہر سو گرنے لگے تھے۔ نور تھا اوپر نور کے۔ وہ الفاظ بہت ہی خوب صورت' بہت ہی پر امید تھے۔ کیا

واقعی ایسا ہو سکے گا۔ کیا واقعی اسے اپنے دین کی ثباتی نصیب ہو سکے گی۔

کبھی کبھی قرآن کی باتیں اتنی پر امید دکھائی دیتی تھیں کہ اپنی ناامید زندگی سے اسے منسلک کرنا مشکل لگتا تھا۔ مگر مریم خانم نے کہا تھا کہ یقین سے مانگیں تو ضرور ملتا ہے۔ ایک دفعہ ان آیات پہ یقین کر کے تو دیکھے۔ کیا معلوم۔۔۔

اس نے قرآن بند کر کے احتیاط سے بک شیلف پہ رکھا اور۔۔۔ آنکھوں پہ بازو رکھے لیٹ گئی۔ ابھی وہ صرف سونا چاہتی تھی۔ تھکن بہت زیادہ ہو گئی تھی، بہت زیادہ۔

☼ ☼ ☼

صبح وہ اٹھی تو پہلا خیال ان آیات کا آیا تھا۔ ہاں کمرے میں اب صرف سورج کی روشنی تھی اور صبح کی ٹھنڈی ہوا۔ رات والی روشنی اب ادھر نہیں تھی۔

انسان اسی خیال کے ساتھ اٹھتا ہے جس کے ساتھ وہ سویا تھا۔ شاید اسی لیے انسان جس ایمان کے ساتھ مرے گا، اسی کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔ درمیان کا دورانیہ بے معنی تھا۔ وہ بال لپیٹتی باہر آئی۔ سارا گھر ابھی سو رہا تھا۔ لاؤنج اور کچن کے بیچ آدھی کھلی دیوار سے نوربانو کام کرتی نظر آ رہی تھی۔ پس منظر میں کوئی مانوس، غیر مانوس سی آواز آ رہی تھی۔

"نوربانو، ناشتہ!"

"میں نے نتاشا باجی کے لیے مینگو سلش بنایا تھا۔ آپ پئیں گی؟"

وہ سر ہلاتے ہوئے آگے آئی، کاؤنٹر سے گلاس اٹھایا اور سلش والے جگ کو اس میں انڈیلا۔ کوٹی ہوئی برف اور جوس کی دھار اس میں گرنے لگی۔ پھر وہ پاس رکھی کرسی پہ بیٹھی اور گلاس لبوں تک لے جاتے ہوئے یونہی سر اٹھایا۔

ایک لمحے کے لیے ساری دنیا ساکت ہو گئی۔

ہر شے ٹھہر گئی۔ بس ایک چیز تھی جو حرکت کر رہی تھی۔ گول گول دائرے میں گھومتی ہوئی، کانچ اور لکڑی کے ٹکرانے کی مدھم آواز۔ کانچ کی گلاب کی پنکھڑیاں۔ سلور راڈز۔

لبوں تک جاتا گلاس والا ہاتھ تیزی سے نیچے آیا تھا۔ آنکھوں کی پتلیاں بے یقینی سے پھیلیں۔

لاؤنج اور کچن کی درمیانی دیوار کے عین اوپر اس کا ونڈ چائم ہوا سے جھول رہا تھا۔

"یہ۔۔۔ یہ یہاں کیسے آیا؟ یہ کس نے لگایا؟" اس نے حیرت و شاک سے نوربانو کی طرف دیکھا۔ کام کرتی نوربانو نے مڑ کر ونڈ چائم کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اچنبھا ابھرا۔ پھر اس نے ناسمجھی سے نفی میں سر ہلایا۔

"مجھے نہیں پتا باجی۔ میں نے تو ابھی دیکھا ہے۔"

"یہ تو میرا ہے۔ یہ تو ترکی میں مجھ سے گم گیا تھا۔ یہ یہاں کیسے آیا۔ یہ یہاں کس نے لگایا۔" وہ نوربانو سے کم اور خود سے زیادہ بات کر رہی تھی۔

نوربانو ہراساں سی ہو گئی۔ "میں تو پہلے ہی کہتی تھی باجی کہ ہمارے گھر میں جن ہیں۔"

مگر وہ سنے بغیر تیزی سے کچن سے باہر آئی۔ سیڑھیوں کے اوپر والے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ وہ سلش کا گلاس ہاتھ میں پکڑے ننگے پیر تیز تیز سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ ایک، دو، تین، چار۔۔۔ قدم جیسے زینوں پہ نہیں، اس کے دل پہ پڑ رہے تھے۔ سانس تیز تیز چل رہا تھا۔ وہ چند سیڑھیاں، چند صدیاں کیوں بن گئی تھیں۔ جیسے یہ فاصلہ کبھی ختم ہی نہیں ہو گا۔

وہ پھولے تنفس کے ساتھ اوپر آئی۔ اور دھڑکتے دل سے اس آخری کمرے کا دروازہ دھکیلا۔ گیسٹ روم کے بیڈ پہ ایک کھلا ہوا بیگ رکھا تھا جس میں سے شرٹ نکالتے ہوئے وہ بیڈ کے ساتھ ذرا جھکا ہوا کھڑا تھا۔ آہٹ پہ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔

حیا چوکھٹ پہ سلش کا گلاس اٹھا کر کھڑی پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ جہان اسے دیکھ کر چند لمحے کچھ کہہ نہیں پایا پھر دھیرے سے مسکرایا۔ شرٹ بیگ پر رکھی اور قدم قدم چلتا اس تک آیا۔ نیلی جینز اور سبز شرٹ میں وہ بہت فریش لگ رہا تھا۔

"مرحبا!" حیا سے چند قدم دور رک کر اس نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ سر کو خم دیتے ہوئے سلام کیا۔ حیا چند لمحے ویسی ہی ساکت نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی اور پھر۔۔۔ پھر اس کے ادھ کھلے لب بھینچ گئے، پیشانی کی رگ تن گئی اور حیرت زدہ آنکھوں میں یکایک غصہ در آیا۔ ایک دم سے اس نے سلش سے بھرا گلاس جہان پہ پھینکا۔

"تم وہاں مرنے کے لیے مجھے چھوڑ گئے تھے۔ میں وہاں کتنی دفعہ مری ہوں، تمہیں پتا ہی نہیں اور اب تم آ کر کہتے ہو مرحبا!" وہ ایک دم پھٹ پڑی تھی۔

سلش جہان کی شرٹ پہ گرا تھا۔ وہ ایک دم پیچھے ہوا۔ پہلے اس نے اپنی شرٹ کو دیکھا اور پھر حیا کو جیسے اسے یقین نہ آیا ہو کہ حیا نے یہ کیا ہے۔ جیسے اسے یقین نہ آیا ہو کہ ایک دفعہ پھر حیا نے یہ کیا ہے۔

"حیا!" وہ لمحے بھر کے لیے کچھ بول ہی نہیں پایا۔

"کچھ مت کہو تم۔ تمہیں کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ تم کیا سمجھتے ہو مجھے۔ بے وقوف ہوں جو میں نہیں سمجھتی کہ تم نے عائشے کو فون کر کے خود اپنی مخبری کروائی، تم نے اپنے آپ کو خود پکڑوانا چاہا۔ یا شاید پتا نہیں تم وہاں گئے بھی تھے یا نہیں۔ میں نہیں جانتی وہاں کون تھا۔ مگر میں نے وہاں بارودی سرنگیں پھٹتے دیکھیں۔ میں نے وہاں پر گولیاں چلتے سنیں۔ میں نے وہاں پر دھواں دیکھا۔ میں نہیں جانتی وہاں پر کیا ہوا۔ مگر جو بھی ہوا اس کے پیچھے تمہارا ذہن تھا۔ میں جانتی ہوں جہان تم ہمیشہ چیزیں پلان کرتے ہو مگر تم نے کہا تھا کہ اس دفعہ تم کچھ پلان نہیں کرو گے لیکن تم نے کیا! کیا تھا اگر تم مجھے بتا دیتے۔ میں کتنا پریشان رہی، میں کتنی تڑپی۔ میں کتنی بے سکون رہی ہوں ان چند دنوں میں، اندازہ ہی نہیں تمہیں!" وہ وہیں بیڈ کے کنارے پہ بیٹھی اور پھر ایک دم ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ جہان نے ایک دفعہ پھر گردن جھکا کر اپنی گیلی شرٹ کو دیکھا اور پھر فرش پہ گرے گلاس کو۔ شکر ہے وہ پلاسٹک کا تھا سو ٹوٹا نہیں۔

"تم نے کیا کیا اس وقت میں نہیں جانتی۔ مگر جو بھی کیا وہ بہت برا تھا۔ اگر وہاں میرے دل کو کچھ ہو جاتا، میں شاک سے ہی مر جاتی تو کیا کرتے۔ مگر تمہیں تو کوئی فرق ہی نہیں پڑتا!" وہ روتے روتے کہہ رہی تھی۔

"اگر تمہاری یادداشت ٹھیک سے کام کر رہی ہے تو تمہیں یاد ہو گا کہ میں نے کہا تھا، فوراً" وہاں سے چلی جانا۔ اگر تم نے سب کچھ دیکھا ہے تو اس کا مطلب ہے تم وہیں پر تھیں۔ تم نے میری بات نہیں مانی۔"

حیا نے ایک دم سے گیلا چہرہ اٹھایا۔

"میں چلی بھی جاتی تو کتنا دور جاتی۔ چند میٹر دور ہی تو کھڑی تھی ہماری جیپ۔ کیا مجھے وہاں تک سرنگیں پھٹنے، دھماکے اور گولیوں کی آواز نہ آتی۔ وہ ایک تاریک خاموش رات تھی اور تم جانتے تھے کہ مجھے آواز آئے گی۔ اسی لیے تم نے مجھے کہا تھا کہ میں سرحد تک نہ جاؤں۔ کیا تم واقعی سرحد کے پار گئے تھے۔ کیا پتا تم گئے ہی نہ ہو۔ مجھے اب تمہاری کسی بات کا یقین نہیں رہا جہان۔"

کتنے دن وہ مضطرب، بے چین اور دل گیر رہی تھی اور اب کتنے مزے سے آ کر کہہ رہا تھا "مرحبا!"

"یعنی کہ تم نے میری بات نہیں مانی۔ یعنی کہ تم ہمیشہ اپنی مرضی کرتی ہو۔ اور اگر میں اپنی مرضی کروں تو تم غصہ کرتی ہو اور۔۔۔" جہان نے سر جھکا کر اپنی گیلی شرٹ کو دیکھا۔ "کیا کچھ رہ گیا ہے جو تم نے میرے اوپر نہیں توڑا تو ایک ہی دفعہ توڑ لو تاکہ یہ سلسلہ ختم ہو جائے۔" وہ خفگی سے بولا۔ حیا نے اس کی بھیگی شرٹ کو دیکھا۔ اسے ذرا بھی افسوس یا پچھتاوا نہیں تھا۔ فی الحال وہ اسی قابل تھا۔

"میں نے تم سے کہا تھا کہ ترکی اور شام کا بارڈر سب سے آسان بارڈر ہے۔ میں نے تم سے یہ بھی کہا تھا کہ وہ ہمیں نہیں پکڑ سکتے جب تک ہم خود نہ چاہیں۔ آسان بارڈر ہونے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ آپ منہ اٹھا کر سرحدی باڑ سے چلے جائیں گے۔ آسان بارڈر کا مطلب یہ تھا کہ ایسے بارڈر پہ سرحدی فوج کو ڈاج دینا آسان ہوتا ہے۔"

وہ کہتا ہوا باتھ روم کی طرف گیا، چند ہی لمحوں بعد

شرٹ کا گریبان تولیے سے صاف کرتے ہوئے واپس آیا تھا۔ "ہم ترکی اور شام کا بارڈر اسی طرح کراس کرتے ہیں۔ کمانڈر شیعہ تھا اس لیے مجھے یہ چاہیے تھا کہ میں اسے ایران سے کال کرواتا اور ایران میں میرے پاس بہترین آپشن عائشے تھی۔ عائشے نے انہیں فون کرکے ایک ایسے کرمنل کا بتایا جسے وہ پکڑنا چاہ رہے تھے۔ حالانکہ وہ آدمی اس سے ہفتہ پہلے ہی ترکی سے شام جاچکا تھا لیکن ان سیکیورٹی فورسز والے گدھوں کو نہیں معلوم تھا۔" شرٹ صاف کرکے اس نے گردن کے اوپر جوس کے قطرے بھی تولیے سے پونچھے پھر سر اٹھا کا گلہ آمیز نگاہوں سے حیا کو دیکھا۔

"اور اگر تم کسی پر کچھ گرانے سے پہلے اس کی بات سن لیا کرو تو زیادہ بہتر ہوگا۔ میں نے جس کرمنل کے بارے میں انہیں بتایا تھا' وہ وہاں پر جا ہی نہیں رہا تھا۔ جو بندہ میری جگہ بارڈر سے اس پوسٹ تک گیا تھا اس کو پیسوں کی ضرورت تھی۔ جب وہ اسے پکڑلیں گے تو چھ ماہ اسے جیل میں رکھیں گے اور پھر چھوڑ دیں گے اور ان چھ ماہ تک اس کے گھر والوں کا بہت اچھا گزارا ہوجائے گا۔ یہ صرف ایک تبادل تھا جو اپنی طرف سے ہم سیکیورٹی فورسز کو دیتے ہیں تاکہ وہ مخبری کی گئی چوکی کی طرف اپنا فوکس رکھیں اور ایسے میں ان کی توجہ کسی قریبی چوکی سے ہٹ جایا کرتی ہے اور ہم ان کی اسی بے دھیانی کا فائدہ اٹھا کر بارڈر کے پار چلے جایا کرتے ہیں۔ ترکی اور شام کا بارڈر سب اسی طرح کراس کرتے ہیں۔ ایک بندہ پکڑواتے ہیں اور پوری کی پوری فیملی قریب ہی کہیں دوسری جگہ سے بارڈر کراس کرلیا کرتی ہے اور جو بارودی سرنگ پھٹی وہ ان لوگوں سے بہت دور تھی۔ صرف افراتفری پھیلانے کے لیے کیا تھا میں نے یہ۔"

تو اسی لیے اس کے جوتوں کا رخ بائیں طرف تھا۔ وہ بارڈر کی طرف جا ہی نہیں رہا تھا۔ اس نے جانا ہی بائیں طرف تھا۔ کچھ نہ کچھ تو تھا جو جہان نے اسے سکھایا تھا۔ مگر اس سیکھی ہوئی بات کو وہ پہلے اپلائی کرلیتی تو اتنی پریشانی نہ ہوتی۔

"اگر میں تمہیں بتا دیتا کہ وہاں پر سیکیورٹی فورسز والے تیار ہیں۔ بارودی سرنگ پھٹنے کی جگہ گولیاں چلیں گی' تو کیا تم مجھے وہاں جانے دیتیں؟ تم پریشان ہوجاتیں۔ اسی لیے میں نے تمہیں نہیں بتایا۔ مگر نہیں' وہ حیا سلیمان ہی کیا جو میری بات مان لے جو اپنی عقل سے بے عقلی والے کام نہ کرے۔" گیلے تولیے کو صوفے کی پشت پہ ڈالتے ہوئے وہ برہمی سے کہہ رہا تھا۔

حیا نے بھیگے رخسار ہتھیلی کی پشت سے صاف کیے۔

"میں وہاں تمہارے لیے گئی تھی جہان! میں ترکی تمہارے لیے گئی تھی۔"

جہان کے خفا چہرے کے تنے ہوئے نقوش ذرا ڈھیلے پڑے اور پھر ایک مسکراہٹ اس کے لبوں پہ آگئی۔

"ویری گڈ! میں یہی سننا چاہتا تھا!" وہ بہت محظوظ ہوا تھا۔ "میں ہمیشہ سے جانتا تھا کہ تم وہاں کپادوکیہ دیکھنے کے لیے نہیں آئیں۔"

"کپادوکیہ کی بات کون کررہا ہے جہان!" اس نے اکتا کر ٹوکا۔ "تمہیں اچھی طرح پتا ہے کہ تم نے مجھے کپادوکیہ خود بلایا تھا' ورنہ تم کبھی مجھ سے ماہ سن والی بات نہ کہتے۔ تم چاہتے تھے کہ میں وہاں آؤں۔ لیکن میں کپادوکیہ کی بات کرہی نہیں رہی۔" وہ اس کے سامنے آکر کھڑی ہوئی اور جب بولی تو اس کی آواز پہلے سے دھیمی تھی۔

"میں ترکی تمہارے لیے گئی تھی جہان! میں نے سبانجی کا اسکالرشپ تمہارے لیے لیا تھا۔ میں تم سے ملنا چاہتی تھی۔ میں تم سے ان سارے گزرے ماہ و سال کا حساب لینا چاہتی تھی' جن میں میں نے تمہارا انتظار کیا۔ میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ میں نے تمہارا نام کب سنا میں نہیں جانتی لیکن میں اتنا جانتی ہوں کہ تمہارا نام ہمیشہ میرے نام کے ساتھ رہا تھا۔ اب تم اس کو محبت کہو یا جو بھی کہو مجھے نہیں پتا۔ میں بس اتنا جانتی ہوں کہ نہ میں تمہارے بغیر رہ سکتی ہوں نہ تم

میرے بغیر رہ سکتے ہو میجر احمد!" آخر میں وہ بھیگی آنکھوں سے مسکرائی۔ جہان نے ایک دم دروازے کو دیکھا۔

"آہستہ بولو' کوئی سن لے گا۔" حیا کی مسکراہٹ ذرا سی سمٹی۔

"سن بھی لے گا تو کیا ہوگا۔" اس نے شانے جھٹکے۔

"میں نہیں چاہتا ابھی کسی کو پتا چلے' سمجھا کرو نا۔" وہ ذرا سا جھنجلایا۔

"اس روز جب تایا فرقان وغیرہ تمہارے بارے میں پوچھ رہے تھے اور تمہیں الزام دے رہے تھے تو میں نے۔۔۔" وہ ذرا سی کھنکاری۔ "میں نے ہر چیز بتادی ان کو۔" بات کے اختتام پہ اس نے جہان کا چہرہ دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں پہلے اچنبھا اترا اور پھر۔

"تم نے سب کو کیا بتادیا؟" وہ بری طرح سے چونکا۔

"وہی جو سچ تھا۔ وہی جو تمہیں بہت پہلے ان کو بتانا چاہیے تھا' مگر تم میں ہمت ہی نہیں تھی سو میں نے سوچا' تھوڑی سی ہمت میں کرلوں اور میں نے بتادیا' بس!" وہ جتنی لاپروائی سے کہہ رہی تھی' اس کے دل کی تیز ہوتی دھڑکن اس کے برعکس تھی۔ جہان کس طرح ری ایکٹ کرے گا۔ اس پہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔ تب یقین جو نہیں تھا کہ وہ آجائے گا۔

"مگر تم نے ایسا۔۔۔ اف حیا۔۔۔ اف۔۔۔" اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کہے۔ وہ متفکر سا نظر آنے لگا تھا۔

"پتا نہیں اب سب کیسے ری ایکٹ کریں گے۔ ایک دفعہ پھر نیا ایشو۔ میں مزید ایشو افورڈ نہیں کرسکتا۔" وہ جھنجلایا۔

"تم سے کس نے کہا ہے کہ وہ ایشو بنائیں گے۔ وہ کوئی ایشو نہیں بنائیں گے جہان! تمہیں شاید ایک بات نہیں پتا۔" اس کے دل کی دھڑکن نارمل ہوئی اور جھک کر فرش سے پلاسٹک کا گلاس اٹھایا۔ پھر سیدھی ہو کر مسکراتے ہوئے بولی۔ "تمہیں دنیا کی ہر تہذیب' ہر ملک' ہر علاقے کا پتا ہوگا۔ تمہیں بہت سی زبانیں آتی ہوں گی۔ مگر ایک جگہ تم غلطی کرگئے ہو۔ تم پاکستان میں کم رہتے ہو نا' تمہیں پتا نہیں ہے کہ ہم پاکستانی بھلے مارشل لاء کے جتنے بھی خلاف ہوجائیں۔ ہمیں اپنے جرنیلوں ڈکٹیٹرز سے کتنے ہی شکوے کیوں نہ ہوں' ہم ان کی پالیسیز سے کتنا ہی اختلاف کیوں نہ کریں مگر ایک بات ہمیشہ سے طے ہے کہ ہم اپنی فوج سے واقعی محبت کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے۔"

جہان نے سر اٹھا کر اسے دیکھا پھر اس کے متفکر چہرے پہ ذرا سی مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہوئی۔

"اور کیا اس "ہم" میں تم بھی شامل ہو؟"

"یہ ایک پہیلی ہے اور اس کا جواب تمہیں خود ڈھونڈنا ہوگا۔ اب تم کام کرو اور میں ذرا عائشے کو بتادوں کہ تم واپس آگئے ہو۔"

"کون عائشے؟" وہ جیسے بہت الجھ کر بولا۔ وہ ٹھہر گئی۔ ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی خیز لہر دوڑ گئی۔

"میرا مطلب تھا' پھپھو کو بتادوں۔ آف کورس تمہاری طرح میں بھی کسی عائشے کو نہیں جانتی!"

جہان نے اثبات میں سر ہلایا۔ یعنی اب اسے ہمیشہ یہ بات یاد رکھنی ہوگی۔ عائشے تمہارے کا باب بند ہوگیا تھا۔

"کیا اب تمہیں کہیں جانا ہوگا یا تم گھر پہ رہو گے؟"

"کیوں نہیں جانا ہوگا۔ آج تو ویسے بھی میرا یوم قیامت ہے۔ یوم حساب۔ ایک ایک پائی کا حساب دینا ہوگا۔ ان تیس سال کا حساب دیتے ہوئے بھی ایک عمر نکل جائے گی۔" وہ واپس بیگ کی طرف مڑنے لگا پھر رک کر بولا۔

"اور۔۔۔ یہ آخری دفعہ ہوا ہے۔ ٹھیک!" اس نے حیا کے ہاتھ میں پکڑے گلاس اور اپنی گیلی شرٹ کو دیکھتے ہوئے تنبیہہ کی۔ حیا نے بڑی مشکل سے مسکراہٹ اپنے لبوں پہ روکی۔

"ایم سوری۔ بس میں غصے میں آگئی تھی۔"

پھر اپنی مسکراہٹ چھپاتی وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔ جو پہلی چیز اس نے جہان پہ گرائی تھی' وہ بھی

سلش ہی تھا مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ آج کا گرایا ہوا سلش وہ آخری چیز ہو گی جو اس نے جہان پہ گرائی ہے یا نہیں، البتہ یہ طے تھا کہ اتنی آسانی سے تو وہ اپنی عادت نہیں چھوڑنے والی۔

☼ ☼ ☼

سارے گھر میں خوشیاں اتر آئی تھیں۔ وہ خوشیاں جن کا اس نے بہت انتظار کیا تھا۔ پچھلے سال دسمبر میں سبانجی کی میل کے بعد ان چھ سات ماہ میں پہلی دفعہ وہ دل سے خوش ہوئی تھی۔ بہت مشکل سے یہ خوشی اس کو ملی اور وہ اس کو پورا پورا جینا چاہتی تھی۔

ابا اور پھپھو نے فیصلہ کیا تھا کہ جہان اور اس کی منگنی کا فنکشن بھی روحیل اور نتاشا کے ولیمے کے ساتھ رکھا جائے یعنی اسے بھی دلہن بننا تھا۔ ہاں رخصتی اس کی ڈگری ـــــ کے بعد ہی کی جائے گی ۔ سارے گھر میں افراتفری اور رونق سی لگ گئی تھی۔ جہان زیادہ تر گھر سے باہر رہتا لیکن جب بھی آتا اس کا استقبال ہمیشہ احترام اور عزت سے کیا جاتا۔

وقت بھی کیسے بدل جاتا ہے!

ہاں البتہ وہ اس سے اس کی جاب کے بارے میں، اس کے کیریر کے بارے میں اور اس کے آنے والے کاموں کے بارے میں ضرور پوچھا کرتے تھے اور وہ ان کے سامنے بیٹھا دھیمے لہجے میں مختصر سے جواب دے رہا ہوتا تھا۔ ایک لحاظ سا تھا جو سب نے اپنے اور اس کی درمیان کھڑا کر دیا تھا۔ پتا نہیں وہ اس سب سے خوش بھی تھا یا نہیں۔ مگر وہ بہت خوش تھی۔

اس وقت بھی کچن میں بیٹھے مہمانوں کی لسٹ بناتے ہوئے وہ مسلسل آپ ہی آپ مسکرا رہی تھی۔ اس کے مقابل پنیر کیک کے آمیزے میں چمچہ ہلاتی ارم نے دزدیدہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"تم نے فنکشن کا جوڑا لے لیا؟" جب ارم سے اس کی مسکراہٹ سہی نہ گئی تو اس نے پوچھ ہی لیا۔ اسے فاطمہ نے اسپیشل پنیر کیک کے لیے بلوایا تھا۔ کیونکہ فیملی میں وہ سب سے اچھا پنیر کیک بناتی تھی۔

اس کی بات پر حیا ذرا سی چونکی، پھر نفی میں سر ہلایا۔

"آرڈر تو دے دیا تھا مگر ابھی پک نہیں کیا۔"

"ہاں ویسے کافی لکی ہو تم۔ ہے نا؟" ارم نے چمچہ گول گول ہلاتے ہوئے کہا۔ "کتنی آسانی سے بیٹھے بٹھائے اتنا ہینڈسم شوہر تمہیں مل گیا۔"

"بیٹھے بٹھائے؟" حیا نے تعجب سے سوچا پھر دھیرے سے نفی میں سر ہلایا۔ اس کے پاؤں پہ زخموں کے نشان ابھی موجود تھے۔ بیٹھے بٹھائے تو کچھ بھی نہیں ملتا۔ ارم نہیں جانتی تھی کہ اس خوشی کو پانے سے پہلے وہ کتنے صحرا ننگے پاؤں آبلہ پا چلی تھی۔ وہ کتنا جلی تھی۔ کیا کچھ سہا تھا اس نے۔ ارم تو کچھ بھی نہیں جانتی تھی مگر اسے بتانا بے کار تھا۔

جہان کا کمرا سیڑھیوں سے اوپر راہداری میں ایک کونے پہ تھا تو روحیل کا دوسرے کونے پہ۔ وہ آخری زینہ چڑھ کے اوپر آئی تو دیکھا جہان اور نتاشا روحیل کے کمرے کے سامنے کھڑے ہنستے ہوئے کچھ بات کر رہے تھے۔ نتاشا کے ہاتھ میں تین چار بڑے بڑے شاپنگ بیگز تھے اور وہ ہاتھ ہلا ہلا کر خالص امریکی انداز میں تیز تیز بولتی کچھ بتا رہی تھی۔ اتنے فاصلے سے آواز تو نہیں آ رہی تھی۔ وہ کیا کہہ رہے تھے مگر خوش مزاجی عشنا سائی۔ اس کے ابرو تن گئے۔ اتنے ہنس کر کبھی مجھ سے تو بات نہیں کی۔

"نتاشا!" اس نے پکارا۔ دونوں نے بے اختیار اسے مڑ کر دیکھا۔ جہان استقبالیہ انداز میں ذرا سا مسکرایا مگر وہ ایک ناراض نگاہ اس پہ ڈال کر آگے آئی۔

"نتاشا! اماں بلا رہی ہیں۔ پھپھو کو کپڑے دکھا دو۔"

"اوکے۔" نتاشا نے ایک نظر جہان کو دیکھ کر اثبات میں سر ہلایا اور نیچے چلی گئی۔ وہ چبھتی ہوئی نگاہوں سے نتاشا کو دیکھتی ہوئی جہان کی طرف پلٹی۔

"کیا بات ہو رہی تھی اپنی بچپن کی سہیلی سے؟" وہ ذرا سا ہنس دیا۔

"نہیں بھئی، میں تو تمہاری وجہ سے اتنا خوش اخلاق ہو رہا تھا۔ تمہاری بھابھی ہے نا۔"

"میری وجہ سے تم کچھ نہیں کرتے اور اگر کچھ کرنا ہے تو شام میرے ساتھ فنکشن کے کپڑے لینے چلو۔ اگر تمہیں نہیں پسند ہوئے تو بدل لیں گے۔" نتاشا کو بھول کر اسے کپڑوں کی بات یاد آ گئی تھی۔

"نہیں شام میں ذرا بزی ہوں۔ کل چلوں گا۔ پرامس۔" وہ نیچے آئی تو پھپھو اکیلی بیٹھی تھیں۔ اماں وہاں نہیں تھیں، نہ ہی نتاشا تھی۔

"نتاشا صائمہ بھابھی کی طرف گئی ہے انہیں شاپنگ دکھانے۔ تمہاری اماں لان میں ہیں۔" اس کے پوچھنے پہ پھپھو نے بتایا تھا۔ "اوکے" اس نے سر پہ دوپٹا لیا اور پورچ کی طرف کھلتے دروازے کی طرف آئی۔ پٹ ذرا سا کھولا تو برآمدے میں فاطمہ اور روحیل روبرو کھڑے نظر آئے۔ فاطمہ غصے اور خفگی سے روحیل سے کچھ بحث کر رہی تھیں اور وہ آگے سے کچھ کہنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

"یہ پہن کر جائے گی وہ ولیمے میں؟ حد ہوتی ہے روحیل! وہ گھر میں کیا کیا پہنے نہیں پھرتی میں خاموش ہو جاتی ہوں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مجھے اور تمہارے ابا کو برا نہیں لگتا مگر اس فنکشن میں ہزاروں لوگ ہوں گے روحیل! کچھ احساس ہے تمہیں؟"

"مگر اماں ایسا کیا۔۔۔" مگر اماں اس کی نہیں سن رہی تھیں۔

"شلوار قمیص، لہنگا کچھ لے لیتی۔ بھلے سر پہ دوپٹا نہ لیتی، تب بھی خیر تھی۔ مگر یہ سلیولیس، بیک لیس بےہودہ سی ساڑھی اٹھا کر لے آئی ہے تمہاری بیوی۔ ہمارے خاندان میں کبھی ایسا لباس پہنا ہے کسی نے؟"

"اماں کیا ہو گیا ہے۔ حیا بھی تو سلیولیس پہن لیتی تھی۔" اور اماں کے تو مانو سر پہ لگی، تلووں پہ بجھی۔

"میری بیٹی کا نام مت لو!" وہ ایک دم غصے میں آ گئی تھیں۔ "میری بیٹی جب گھر سے نکلتی ہے تو عبایا پہن کر، چہرہ ڈھانپ کر نکلتی ہے۔ خاندان میں کوئی نہیں ہے جو میری بیٹی کے برابر کا ہو۔"

"مگر اماں پہلے تو حیا بھی۔۔۔"

"پہلے کی بات مت کرو روحیل! ہم حیا کی بات کر بھی نہیں رہے۔ ہم تمہاری بیوی کی بات کر رہے ہیں!"

"اچھا ٹھیک ہے۔ میں بات کروں گا اس سے۔" وہ جیسے جان چھڑانے والے انداز میں بولا تھا۔ مگر اماں قائل نہیں ہوئی تھیں۔ وہ اور بھی کچھ کہنے کا ارادہ رکھتی تھیں مگر حیا دبے قدموں واپس پلٹ گئی۔ اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔ دل بھر آیا تھا۔

ابھی کل ہی تو جب وہ شاپنگ پہ جانے کے لیے دھلے کپڑوں میں سے عبایا ڈھونڈ رہی تھی تو اماں جھنجلا کر کہہ رہی تھیں کہ "ہر وقت اتنا برقع کانشس ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی۔" لیکن اس کی غیر موجودگی میں اماں اس کے بارے میں کچھ اور کہہ رہی تھیں۔

دل سے تسلیم کر لینے اور زبان سے اعتراف کر لینے میں فرق ہوتا ہے اور وہ فرق فاطمہ پاٹ نہیں پا رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

حیا نے کاؤنٹر پہ رکھے ڈبے کے ڈھکن کو بند کرنے سے پہلے ایک دفعہ جوڑے کو دیکھا اور پھر جہان کے چہرے کو۔

"کیسا لگا تمہیں؟" اس نے ذرا اشتیاق، ذرا فکر مندی سے پوچھا۔

"ہاں اچھا ہے۔۔۔" وہ شاپ میں شاید اس سے زیادہ تبصرہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بس ذرا سے شانے اچکائے۔

حیا نے ایک دفعہ پھر اس تہہ شدہ جوڑے کو دیکھا۔ حالانکہ منگنی اور نکاح جیسے موقعوں پہ لڑکیاں لائٹ پنک، پستہ گرین یا ہلکا نیلا پہننا پسند کرتی تھیں۔ پھر بھی اس نے یہ رنگ منتخب کیا تھا۔ وہ لمبا گھیر دار پاؤں تک آتا فراک تھا، ساتھ چوڑی دار پاجاما، سارا لباس ایک ہی رنگ میں تھا۔ گرے کلر اور گرے کا بھی درمیانہ سا شیڈ۔ نہ بہت ہلکا نہ بہت گہرا۔ پورے فراک پر نگینوں اور سفید موتیوں کا کام تھا۔ گرے اور سلور کا امتزاج۔ پھپھو اس کو وائٹ گولڈ اور ڈائمنڈ کا سیٹ دے رہی تھیں اور اس کی مناسبت سے اس کو یہ رنگ سب سے بہترین لگا تھا۔

حیا نے ڈبا بند کیا اور اسے شاپنگ بیگ میں ڈالتے

ہوئے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ جہان اس کے پیچھے چلتا ہوا باہر آیا۔

"کیا تمہیں واقعی پسند آیا ہے۔ تمہارے چہرے سے تو نہیں لگ رہا تھا؟" گاڑی میں بیٹھتے ہی وہ ذرا متفکر سی بولی۔

"نہیں مجھے واقعی پسند آیا۔ بہت اچھا کلر تھا لیکن..." اگنیشن میں چابی ڈالتے ہوئے جہان نے ذرا سے شانے اچکائے۔

"لیکن کیا؟" وہ جانتی تھی کہ وہ بات کو کس طرف لے کے جا رہا ہے پھر بھی اس نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

"یہی کہ تم اس لباس کے ساتھ... میرا مطلب ہے تم پردہ کیسے کرو گی دلہن بن کر۔" وہ شاید کافی دیر سے یہی سوچ رہا تھا۔ حیا کے لبوں پر ایک ہلکی سی اسرار بھری مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہوئی۔ "کر لوں گی۔" گاڑی اب سڑک پہ دوڑ رہی تھی اور وہ ذرا سا مسکراتے ہوئی ونڈ اسکرین کے پار دیکھ رہی تھی۔

"کیا تم اس کام دار لباس کے اوپر برقع لو گی یا چادر وغیرہ؟"

"جہان! کچھ باتوں میں میں تم سے زیادہ اسمارٹ ہوں۔ تم ہی نے تو کہا تھا نا کہ رستہ ہوتا ہے۔ میں نے بھی رستہ نکال لیا ہے۔"

"اچھا چلو دیکھتے ہیں تم کیا کرتی ہو!" وہ اس کی بات پر محظوظ ہو کر ذرا سا مسکرایا۔

تھوڑی ہی دیر بعد اسے محسوس ہوا کہ گاڑی گھر کے بجائے کسی اور جانب جا رہی ہے۔

"کیا ہم گھر نہیں جا رہے؟" اس نے ذرا تذبذب سے پوچھا۔

"پہلے ہمیں کچھ اٹھانا ہے۔ میں نے ایک بیکری پہ کچھ آرڈر کیا تھا۔" وہ اسٹیئرنگ وہیل گھماتے ہوئے موڑ کاٹ رہا تھا۔ حیا کو اچنبھا ہوا۔ رات ہو چکی تھی اور ان لوگوں نے ڈنر پر گھر پہنچنا تھا۔

"ایسا کیا آرڈر کیا تھا تم نے؟"

"شاید تمہیں یاد ہو میں نے تمہارا ایک جنجر بریڈ ہاؤس توڑا تھا۔" اور حیا کا سانس لمحے بھر کے لیے تھما۔

"کیا تم نے میرے لیے جنجر بریڈ ہاؤس بنایا ہے؟" وہ حیرت زدہ ہی تو رہ گئی تھی۔

"تمہیں لگتا ہے میں اتنا فارغ ہوں؟ میں نے صرف ایک بیکری پر آرڈر دیا ہے اور اب ہم نے اسے پک کرنا ہے۔ کل ہماری منگنی تیسری دفعہ ہو رہی ہے سو اس سے پہلے مجھے یہ حساب برابر کرنا ہے۔" مسکراہٹ دباتے ہوئے وہ بولا تھا۔

"لیکن تم نے خود تو نہیں بنایا نا!"

"مگر پیسے تو میں ہی دے رہا ہوں نا۔" اور یہ بات کرتے ہوئے اس غریب آدمی کے چہرے پہ خفگی سی آئی۔ حیا بے ساختہ گردن موڑ کر شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ جہان اس کی آنکھوں میں آتی مسکراہٹ کو دیکھ پائے۔

اس بیکر نے بہت محنت سے جنجر بریڈ ہاؤس بنایا تھا۔ وہ اتنا ہی پیارا تھا جتنا حیا کا اپنا جنجر بریڈ ہاؤس۔ یا پتا نہیں کیوں اسے لگا کہ یہ والا ہاؤس زیادہ پیارا تھا۔ گتے کی ٹرے میں رکھا وہ خوب صورت سا ہاؤس، جس کے اوپر الابلا کینڈیز، جیلی سے ڈریسنگ کی گئی تھی۔

"نہیں، اس کو پیک نہ کریں، یہ ٹوٹ جائے گا۔ بہت نازک ہے۔ میں اس کو یونہی اٹھاؤں گی۔" حیا نے احتیاط سے جنجر بریڈ ہاؤس والی ٹرے اٹھالی۔

"اگر اس دفعہ یہ ٹوٹا تو یہ تمہاری غلطی ہو گی۔" جہان نے باہر نکل کر اسے تنبیہہ کی تھی۔ وہ جواب دیے بنا سہج سہج چلتی گاڑی تک آئی۔

پھر سارا رستہ وہ ٹرے ہاتھوں میں اٹھائے رہی تھی۔ ہاتھ دُکھنے لگے تھے مگر اس نے ذرا بھی بد احتیاطی نہیں کی تھی۔ یہ جنجر بریڈ ہاؤس اسے اپنے والے سے زیادہ پیارا تھا۔

گاڑی گھر کے پورچ میں رکی تو جہان جلدی سے باہر نکلا اور اس کی طرف کا دروازہ کھولا۔ "یقیناً" یہ عنایت اس جنجر بریڈ ہاؤس کے لیے تھی ورنہ اس کے لیے تو اس نے کبھی دروازہ نہیں کھولا۔

وہ ٹرے اٹھائے باہر نکلی۔ جہان نے پچھلی سیٹ پہ پڑا اس کا شاپر اٹھالیا۔

"چلیے مادام! آپ کے کپڑے ڈرائیور لے آئے گا۔" وہ مصنوعی بے چارگی سے کہتے ہوئے راستہ چھوڑ کر اسے آگے جانے کا اشارہ کر رہا تھا۔ حیا کے لبوں پر مسکراہٹ امڈ آئی۔ ابھی وہ چند قدم ہی چل پائی تھی کہ جہان کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"شاید کوئی مہمان آیا ہے۔" اس بات پہ حیا نے گردن موڑ کے دیکھا۔ پورچ میں کھڑی اس کی گاڑی کے آگے کھڑی گاڑی... اور پیروں کے نیچے سے زمین سرکنے لگی تھی۔

اس سیاہ گاڑی کو وہ ہزاروں گاڑیوں میں بھی پہچان سکتی تھی۔

"پپ... پتا نہیں۔" اس کی آواز لڑکھڑا گئی۔ ٹرے پہ جمے اس کے ہاتھ مزید سخت ہوئے۔

جہان کچھ کہے بنا شاپنگ بیگ پکڑے اس کے آگے آگے اندر آیا۔ وہ جہان کے پیچھے اندر آئی۔ ایک ایک قدم بہت بھاری ہو رہا تھا۔

لاؤنج کے دہانے پہ ہی اندر کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے قدم چوکھٹ سے ذرا پیچھے جم گئے۔ وہ تاریک گوشے میں کھڑی تھی۔ اندر والے لوگ اس کی طرف متوجہ نہیں تھے۔

وہاں ولید ایک صوفے پہ ٹانگ پہ ٹانگ رکھے بیٹھا تھا۔ سامنے ابا، اماں، تایا، صائمہ تائی، روحیل، نتاشا، پھپھو، داور بھائی، سونیا۔ سب ہی تھے۔ سونیا تو چلو شادی شدہ تھی، سو خاندان کی روایت کے مطابق اس کا پردہ نہیں تھا مگر اچنبھے کی بات یہ تھی کہ ارم بھی وہیں کونے میں کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی۔ جیسے شاید وہ کچھ سرو کرنے کے بہانے اندر آئی ہو اور پھر وہیں کھڑی ہو گئی ہو۔ جہان آگے آیا، ایک نظر ان سب کو دیکھا اور پھر ایک منٹ کہہ کر شاپنگ بیگ کی طرف اشارہ کیا جیسے انہیں رکھنا ہے اور سیڑھیاں چڑھتا گیا۔ وہ وہیں اکیلی کھڑی رہ گئی۔ ٹرے کو پکڑے اس کے ہاتھ پسینے میں بھیگ گئے تھے۔

ولید نے جہان کو دیکھا تو گردن اس طرف موڑی۔ حیا کو دیکھتے ہوئے ایک زہریلی مسکراہٹ اس کے منہ پہ امڈ آئی۔ وہ کچھ مسرور سا واپس ان سب کی طرف مڑا، جو ابھی تک الجھی نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"جی سلیمان انکل! تو میں کہہ رہا تھا کہ ہمیں اس معاملے پہ آرام سے بات کرنی چاہیے اور مس حیا... سوری مسز حیا! تو یہ جانتی ہیں کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں۔" اس نے بات کرکے پھر سے گردن موڑ کر ایک فاتحانہ نظر حیا پہ ڈالی تھی۔ ابا نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں حیا کو دیکھا اور پھر ان ہی الجھی نگاہوں سے ولید کو۔

"ولید! یہ میرا گھر ہے۔ یہاں اس طرح کے معاملے ڈسکس کرنے کا کیا مطلب ہے؟" ابا کو جیسے اس کا آنا اور یہ سب کہنا بالکل بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ روحیل تایا ابا سب کے ماتھے پہ بل تھے جیسے کسی کو یہ سب پسند نہیں آ رہا۔

"بات گھر کی تھی اسی لیے میں نے سوچا گھر میں کر لی جائے۔ جو چیز میرے پاس ہے، اسے دیکھ کر آپ کو اندازہ ہو گا کہ آپ لوگ اتنی آسانی سے میرے شیئرز سیل نہیں کر سکتے۔"

"ولید! یہ کوئی طریقہ نہیں ہے۔" داور بھائی ناگواری سے کہتے اٹھنے لگے۔ روحیل بھی برہمی سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ ارم اسی طرح کونے میں کھڑی تھی۔ شاید اسے کسی نے جانے کے لیے نہیں کہا تھا یا شاید کہا ہو تب بھی وہ کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ غالباً "سارا تماشا دیکھنا چاہتی تھی۔

اس سارے میں اگر کوئی بڑے مزے سے بیٹھی کوک کے کین سے گھونٹ گھونٹ بھر رہی تھی تو وہ نتاشا تھی۔ ہر فکر سے بے نیاز، ہر صورت حال سے لطف اندوز ہوتی۔

"داور! تم اسے ضرور دیکھنا چاہو گے۔ آخر اس کا تعلق تمہاری ہی شادی کے فنکشن سے تو ہے۔" وہ کہتے ہوئے کھڑا ہوا اور حیا کی طرف دیکھ کر اپنی جیب

سے ایک پلاسٹک ریپر نکالا جس میں رکھی سی ڈی صاف نظر آرہی تھی۔

"کیا میں اس کو چلادوں؟" اس نے سی ڈی حیا کو دکھاتے ہوئے پوچھا۔ سب لوگ اس بات پر مڑ کر حیا کو دیکھنے لگے تھے۔ وہ جو ساکت سی کھڑی بنا پلک جھپکے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس بات پر بے اختیار اس کے قدم پیچھے ہٹے۔ کمر دیوار سے جا لگی۔ ہاتھ میں پکڑی ٹرے بہت وزنی ہو گئی تھی۔

اسی لمحے جہان خالی سیڑھیاں اترتا دکھائی دیا۔

"جو بات کرنی ہے، مجھ سے کرو۔ ہاں بولو، کیا مسئلہ ہے؟" وہ جیسے اب فارغ ہو کر بہت سنجیدگی سے کہتا ولید کے سامنے آکر کھڑا ہوا۔

حیا نے امید سے جہان کی طرف دیکھا۔ وہ یقیناً سمجھ جائے گا کہ یہ وہی ویڈیو ہے۔ وہ ابھی ولید کو کچھ دے مارے گا، یا سی ڈی کے ٹکڑے ٹکڑے کردے گا، اس کی بات پہ ولید کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔

"یہ شو ٹائم ہے اور تم تو اس شو کو ضرور دیکھنا چاہو گے۔" بات کے اختتام پہ ولید نے پھر حیا کو دیکھا۔ اس کا بار بار حیا کو دیکھنا سب کو الجھن اور عجیب سی کیفیت میں مبتلا کررہا تھا۔

"کیا ہے اس سی ڈی میں؟" جہان نے سنجیدگی سے اس سے پوچھا۔ البتہ آنکھوں میں ذرا سی الجھن تھی۔

وہ نہیں سمجھا تھا۔ اللہ اللہ! اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ وہ کہنا چاہتی تھی، جہان اس سے مت پوچھو، پلیز جہان! اسے گھر سے نکال دو۔ اسے کچھ دے مارو مگر اسے یہاں سے بھیج دو۔ مگر سارے الفاظ حلق میں دم توڑ گئے۔

"آپ کے گھر کی چیز ہے تو آپ ضرور دیکھنا چاہیں گے اور اس کے بعد آپ فیصلہ کریں کہ آپ مجھے اپنی کمپنی میں کس حیثیت سے کام کرنے دیں گے۔"

لاؤنج میں خاموشی تھی۔ سب سن رہے تھے، بس وہی دونوں بول رہے تھے۔

حیا کا سانس آہستہ آہستہ رکنے لگا۔ دم گھٹ رہا تھا۔ فضا میں آکسیجن کم ہو گئی تھی۔

"وہ رباٹی وی اور وہ اس کے نیچے ڈی وی ڈی رکھا ہے۔ اس کو لگا کر خود دیکھ لو بہت انجوائے کرو گے۔" اس نے سی ڈی جہان کی طرف بڑھائی۔ حیا کے نتھنوں سے آکسیجن کا کوئی جھونکا ٹکرایا تھا۔ امید کی ایک کرن سی نظر آئی تھی کہ جہان سی ڈی ہاتھ میں لیتے ہی توڑ دے گا اور ولید کو دے مارے گا۔

جہان نے ذرا تذبذب سے سی ڈی کو دیکھا اور پھر اسے تھام لیا۔ مگر اس نے اسے نہیں توڑا۔ اس نے سی ڈی کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر سر اٹھا کر ولید کی طرف متوجہ ہوا۔

"آر یو شیور کہ اس میں کچھ ایسا نہیں جو کسی کی ذلت کا باعث بنے۔ کیا میں اسے واقعی سب کے سامنے چلادوں؟"

"اس میں جو ہے وہ سب سچ ہے۔ کوئی فکشن نہیں ہے۔ چلاؤ، ضرور چلاؤ۔"

جہان نے مڑ کر ارم کو دیکھا۔ "کیا میں اسے چلادوں؟" ارم نے بہت ہی بے نیازی سے شانے اچکائے جیسے کہہ رہی ہو میری بلا سے۔ البتہ اس کی آنکھوں میں مسکراہٹ سی تھی۔

جہان نے ایک سپاٹ سی نگاہ اس پہ ڈالی اور پھر او کے کہتے ہوئے ٹی وی کی طرف مڑا۔

حیا کے ہاتھ سے جنجر بریڈ ہاؤس کی ٹرے گری اور ——— ٹھن کی آواز کے ساتھ ٹرے اوندھے منہ زمین بوس ہوئی۔ کوئی اس کی طرف متوجہ نہیں ہوا تھا۔ سب حیرانی سے سی ڈی کو دیکھ رہے تھے۔

"اللہ تعالیٰ!" اس نے زور سے پکارا تھا۔ "اللہ تعالیٰ میں بہت اکیلی ہوں، میرے پاس اس وقت کوئی نہیں ہے جسے میں پکار سکوں۔ صرف آپ ہیں جو میری مدد کرسکتے ہیں، آپ دے دیں تو کوئی چھین نہیں سکتا۔"

جہان نے ٹی وی کا بٹن آن کیا اور پھر ریموٹ سے ڈی وی ڈی چلایا۔ اب ٹی وی اسکرین نیلی آرہی تھی۔

"آپ چھین لیں تو کوئی دے نہیں سکتا!" وہ گڑگڑائی۔

"میری مدد کریں۔ مجھے اکیلا مت چھوڑیں!" اس کا سانس رکنے لگا تھا۔

"مجھے ان لوگوں کے سامنے رسوا نہ کریں۔"

حیا نے آنکھیں بند کرلیں۔ چند ہی لمحوں بعد اسے گانے کی ٹون سنائی دی تھی۔ شیلا کی موسیقی۔ اس کے قدموں تلے سے زمین سرکنے لگی تھی۔ سر سے آسمان ہٹنے لگا۔ اسے لگا وہ ابھی گر جائے گی۔ وہ ابھی مر جائے گی۔

ویڈیو لگ چکی تھی۔ سب دیکھ رہے تھے۔ وہ خواب نہیں تھا۔ وہ حقیقت تھی۔ وہ ایک دفعہ پھر رسوا ہونے جارہی تھی۔ ساری ریاضت، ساری اطاعت، سب بے کار گیا تھا۔ رسوائی، گناہ، وہ اس کا پیچھا کبھی نہیں چھوڑیں گے۔ وہ قبر تک اس کے پیچھے آئیں گے۔ اس نے اپنی سرخ ہوتی بند آنکھیں کھولیں۔ لاؤنج کا منظر دھندلا رہا تھا۔ تایا ابا کا غیظ و غضب، غصہ، پیشانی کی تنی نسیں، سرخ پڑتا چہرہ۔ اس نے صائمہ تائی اور اماں کے چہروں کو دیکھا۔ ہکا بکا گانا اسی طرح چل رہا تھا۔

اس نے نتاشا کے چہرے کو دیکھا۔ وہ بڑے ستائشی انداز میں اسکرین کو دیکھتی ایکسائیٹڈ سی آگے ہو کر بیٹھی تھی۔ کوک کا کین ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس کی نگاہیں نتاشا سے ہوتی ہوئی سامنے جہان کے چہرے پہ پڑیں۔ وہ چبھتی ہوئی نگاہوں سے ولید کو دیکھ رہا تھا۔ اور ولید۔ اس نے دیکھا۔ ولید کا چہرہ سفید پڑا ہوا تھا۔ اتنا سفید جیسے کسی نے پینٹ کردیا ہو۔ اسے پل اس نے ارم کو دیکھا۔ اس کا چہرہ بھی اتنا ہی سفید۔ یہ کیا؟ ایک دم سے حیا نے گردن گھما کر اسکرین کو دیکھا۔

نقاب تلے اس کے ہونٹ ذرا سے کھلے۔ آنکھوں کی پتلیاں بے یقینی سے پھیلیں۔ اسے لگا، وہ کبھی سانس نہیں لے سکے گی۔

گانا بھی وہی تھا، میوزک بھی وہی تھا، سی ڈی بھی وہی تھی مگر منظر۔ نہیں یہ شریفوں کا مجرا نہیں تھا۔ نہیں یہ اس کی ویڈیو نہیں تھی۔ یہ تو ارم اور ولید۔۔۔

وہ تصاویر کا ایک سلائیڈ شو تھا۔ ایک ایک کرکے بڑی بڑی تصاویر اسکرین پہ ابھرتیں اور چلی جاتیں۔ ارم اور ولید کی تصاویر اکٹھے کسی ریسٹورنٹ میں، کسی شاپنگ ایریا، کسی پارک میں، ساری فوٹوز سیلف فوٹوز تھیں۔ جیسے ولید کے ساتھ ہو کر ارم نے بازو بڑھا کر خود ہی موبائل سے کھینچی ہوں۔ اور اس لحاظ سے وہ دونوں بہت قریب قریب کھڑے تھے۔

ہر دو تین تصاویر کے بعد اسکین شدہ ای میلز اسکرین پہ ابھرتیں۔ ان میں سے کچھ فقرے ہائی لائٹ تھے۔ وہ تصویر اتنی دیر تک اسکرین پہ رہتی کہ وہ سب ان ہائی لائٹ فقروں کو پڑھ لیتے۔ پھر اگلی تصویر آجاتی۔

ارم اور ولید کی ذاتی ای میلز۔

"یہ۔۔۔ یہ کیا؟" ولید ایک دم آگے بڑھنے لگا۔

"ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو ان ٹانگوں سے اپنے گھر نہیں جاسکو گے۔ وہیں کھڑے رہو۔" جہان کا وہ الجھن بھرا چہرہ، وہ تذبذب سب غائب ہو گیا تھا۔ وہ اتنے سرد اور کٹیلے انداز میں بولا کہ ولید کے بڑھتے قدم وہیں رک گئے۔ اس نے ششدر سی نگاہوں سے جہان کو دیکھا۔

"یہ شو ٹائم ہے نا ولید اور تم نے کہا تھا اس شو کو میں بہت انجوائے کروں گا۔ میں کررہا ہوں۔ تم بھی کرو مگر شاید تم کوئی غلط سی ڈی اٹھالائے ہو۔"

"یہ۔۔۔ یہ غلط ہے۔ یہ سچ نہیں ہے۔" ولید لغاری ہکلا گیا۔ کبھی وہ صوفوں پہ بیٹھے نفوس کو دیکھتا، کبھی جہان کو۔ حیا کو دیکھنا تو اسے یاد ہی نہیں رہا تھا۔

"ابھی تم نے خود کہا تھا کہ یہ حقیقت ہے۔ تمہارے کون سے بیان پہ یقین کروں میں؟" وہ درشتی سے بولا مگر اسی اثنا میں داور بھائی غصے سے اٹھے تھے۔

"گھٹیا انسان! میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں۔"

"پلیز!" جہان نے ہاتھ اٹھا کر انہیں اس کے قریب آنے سے روکا۔ "ہاتھ کا استعمال مجھے بھی آتا ہے مگر یہاں خواتین بیٹھی ہیں، اس لیے اس آدمی سے میں خود نبٹ لوں گا بعد میں اور ابھی۔۔۔" اس نے انگشت

شہادت اٹھا کر قہر آلود نگاہوں سے ولید کو دیکھتے تنبیہہ کی۔

"ابھی تم یہاں سے اپنی شکل گم کر لو۔ تم سے میں بعد میں ملوں گا۔ کیونکہ یہ سی ڈی اب میرے پاس ہے اور تم نہیں چاہو گے کہ تمہارا ہونے والا سسر اپنی بیٹی یہ سب دیکھے۔ سینیٹر عبدالولی کی بیٹی سے رشتہ ہو رہا ہے نا تمہارا؟"

ولید لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا۔ تایا ابا، ابا، روحیل، سب اپنی جگہوں سے کھڑے ہو چکے تھے۔ بس نہیں چل رہا تھا، اس آدمی کو گولی مار دیں۔

"آؤٹ!" سلیمان صاحب ضبط سے بہ زور بولے تھے۔ ولید اپنی اڑی رنگت اور بدحواس قدموں سے پلٹا۔ سامنے دیوار کے ساتھ حیا کھڑی تھی۔ اس کی نقاب سے جھلکتی سیاہ آنکھوں میں بھی سکتہ طاری تھا۔ ولید ان آنکھوں میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ تیزی سے باہر نکلا۔

"ٹی وی اسکرین پہ وہ سلائیڈ شو ابھی تک چل رہا تھا۔ ارم سفید چہرے کے ساتھ وہ دیکھ رہی تھی۔

تصویریں تھیں کہ ختم ہی نہیں ہو رہی تھیں۔

"یہ سب فوٹو فکسنگ ہو گی۔" پھپھو رنجیدگی سے بولی تھیں۔ حالانکہ تصاویر بہت کلیئر تھیں، مگر تایا ابا اور داور کے سرخ چہرے..... وہ ارم کو کسی طوفان سے بچانا چاہتی تھیں۔

تیز بارش تھم چکی تھی۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی جاری تھی۔ کھڑکیوں کے شیشوں پہ گرتی ٹپ ٹپ کی آواز مسلسل آرہی تھی۔

پھپھو کی بات پہ صائمہ تائی کو تقویت ملی تھی۔

"یہ سب جھوٹ ہے۔ الزام ہے میری بچی پہ۔ یہ سب ارم اور حیا کی تصویریں تھیں، یہ لڑکا کہاں سے آ گیا ان میں؟" وہ اپنی بات منوانے کے لیے زور سے بولی تھیں۔ "اور یہ ساری تصویریں حیا کے پاس تھیں اسی نے دی ہوں گی اس لڑکے کو اور نام میری بیٹی کا لگا دیا۔"

"گھر چلو تم لوگ!" تایا فرقان قہر برساتی نگاہوں سے ... کو دیکھتے ہوئے بولے تھے۔

"میری بات سنیں! میری بیوی کا نام مت لیں ..." ابا صائمہ تائی کی بات پہ ناگواری سے احتجاج کرنے ہی لگے تھے کہ وہ جیسے ضبط کھو کر ان کے سامنے اکڑ ... ہوا تھا۔

"یہ تصویریں شاید آپ کو اپنی بیٹی کے لیپ ٹاپ سے بھی مل جائیں۔ مگر میری بیوی کا نام اگر کسی نے لیا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔" وہ اتنی سختی سے انگلی اٹھا کر بولا تھا کہ صائمہ تائی کچھ کہہ نہ سکیں۔ فاطمہ اور سبین پھپھو نے افسوس سے ایک دوسرے کو بے بسی سے دیکھا۔

"گھر چلو تم لوگ!" تایا ابا نے بہت ضبط سے سرخ پڑتی نگاہوں کے ساتھ بیوی اور بیٹی کو اشارہ کیا اور لمبے ڈگ بھرتے باہر نکل گئے۔ داور بھائی فوراً باپ کے پیچھے لپکے۔

"ابا..... یہ سب میں نے نہیں یہ حیا نے....." ارم نے ان کو آواز دینا چاہی۔

"ارم!" جہان نے حیرت اور غصے سے اسے دیکھا۔ "تم میری بیوی کا نام اس سب میں کیسے لے سکتی ہو؟" تایا جا چکے تھے۔ ارم نے بے بسی سے جہان کو دیکھا۔

"تم لڑکیوں کو کیا لگتا ہے، تم موبائل سے میسج مٹا دو گی، کال ریکارڈ حذف کر دو گی تو وہ ختم ہو جائے گا؟ ایسا نہیں ہوتا ارم بی بی! ہر ایس ایم ایس ریکارڈ ہوتا ہے، ہر کال ریکارڈ ہوتی ہے۔ ایک دفعہ پھر لو میری بیوی کا نام پھر میں تمہیں اپنی ایجنسی سے ولید کے فون پہ کی گئی ہر کال کی آڈیو ریکارڈنگ نکلوا کر دکھاؤں گا۔ میرے لیے یہ بہت آسان ہے۔"

ارم نے خشک لبوں پہ زبان پھیری اور اپنی ماں کو دیکھا مگر وہ پہلے ہی باہر جا رہی تھیں۔ وہ تیزی سے ان کی طرف لپکی۔ چوکھٹ میں کھڑی حیا اور اس کے قدموں میں گرے ملبے کو اس نے دیکھا بھی نہیں۔

لاؤنج میں پھر سے خاموشی چھا گئی تھی۔ سب جیسے ایک دوسرے سے شرمندہ تھے، سوائے نتاشا کے۔ وہ بڑے مزے سے ہاتھ جھاڑتے ہوئے اٹھی، کین سائیڈ ٹیبل پہ رکھا اور روحیل کو مخاطب کیا۔

"Honestly Rohail you have a very interesting Family"

(حقیقت یہ ہے روحیل تمہاری فیملی بہت دلچسپ ہے)

روحیل نے "اونہوں!" کہتے ہوئے اسے گھورا پھر معذرت خواہانہ انداز میں باقیوں کو دیکھا۔ نتاشا جہان کے سائیڈ سے گزر کر سیڑھیوں کی طرف چلی گئی۔

شو ٹائم ختم ہو چکا تھا۔

البتہ جانے سے قبل نتاشا نے جہان کی طرف جو مسکراہٹ اچھالی تھی کونے میں کھڑی حیا کے ذہن میں وہ اٹک کر رہ گئی۔

یہ سب کیسے ہوا؟ وہ ابھی تک دم بخود تھی، مگر نتاشا کی مسکراہٹ ________ اس کا اور جہان کا باتیں کرنا، پھر اس کا اتنے بڑے بڑے شاپنگ بیگ اٹھا کر صائمہ تائی کی طرف جانا اور پھر اوپر واپس جانا۔ وہ صائمہ تائی کو شاپنگ دکھانے نہیں، ارم کا لیپ ٹاپ اڑانے گئی تھی۔ ورنہ جہان کو کیسے پتا کہ یہ تصاویر ارم کے لیپ ٹاپ میں تھیں؟ وہ بھی اوپر کمرے میں حیا کے کپڑے رکھنے نہیں، وہی سی ڈی لینے گیا تھا، ریموٹ گراتے ہوئے جھک کر اس نے سی ڈیز swap کی تھیں۔ اوہ جہان.....!

ایک ایک کر کے سب لاؤنج سے چلے گئے تھے۔ پھپھو نے البتہ جاتے ہوئے افسردہ نگاہوں سے جہان کو دیکھا تھا۔

"یہ سب کیا تھا جہان!"

"وہ شاید کوئی غلط سی ڈی اٹھا لایا تھا۔" اس نے شانے اچکائے۔

"جیسے میں تمہیں جانتی ہی نہیں۔ تمہارا ہاتھ ہے اس میں، پتا ہے مجھے۔" وہ جھڑک کر کہتی ہوئی خفگی سے باہر نکل گئیں۔

اس سارے میں وہ پہلی بار حیا کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ اسی طرح دیوار سے لگی کھڑی تھی۔ جہان کو اپنی طرف دیکھتے پا کر اس نے نقاب کھینچ کر اتارا۔ اس کا چہرہ لٹھے کی مانند سفید پڑ رہا تھا اور تب ہی جہان نے دیکھا۔

"یہ تم نے کیسے کیا جہان؟" ایک دم آنسو ٹوٹ کر اس کی آنکھوں سے گرنے لگے۔ وہ پریشانی سے جنجر بریڈ کے ملبے کو دیکھتا اس تک آیا۔

"میرے سارے پیسے برباد کر دیے تم نے۔ یہ کیوں توڑا؟"

"جہان!" حیا نے لبوں پہ ہاتھ رکھ کر خود کو رونے سے روکا، مگر آنسو بہتے جا رہے تھے۔ "میں بہت ڈر گئی تھی۔ تم جانتے تھے نا..... کہ وہ ویڈیو ولید کے پاس ہے۔"

ملبے سے نگاہ ہٹا کر جہان نے گہری سانس لیتے ہوئے حیا کو دیکھا۔

"ویرین کیو میں تم نے دو دفعہ کہا تھا کہ اگر کوئی تمہیں گاڑی تلے کچل دے تو؟ دو دفعہ کہی گئی بات کی کوئی وجہ ہوتی ہے۔ میں نے یہاں آتے ہی معلوم کر لیا تھا سب۔ تم نے مجھ پہ بھروسا نہیں کیا سو میں نے بھی تمہیں نہیں بتایا۔"

"میں تمہیں پریشان نہیں....." اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔

"حیا! آپ کے اپنے اور کس لیے ہوتے ہیں؟ اگلی دفعہ مجھ پہ بھروسا کر کے دیکھنا۔"

"مگر..... ارم اس کی تو بہت۔"

جہان کے جبڑے کی رگیں تن گئیں۔

"اس کا ذکر مت کرو۔ جب انسان کچھ غلط کرتا ہے تو اس کا نتیجہ اس کو بھگتنا پڑتا ہے۔ آج کسی ایک نے تو رسوا ہونا تھا، مگر میں نے ایک لڑکی سے وعدہ کیا تھا کہ جنت کے پتے تھامنے والوں کو اللہ رسوا نہیں کرتا۔ مجھے اپنا وعدہ نبھانا تھا۔"

پھر اس نے ٹوٹے ہوئے جنجر بریڈ ہاؤس کو دیکھا۔

"کب تم جذبات میں آکر چیزیں پھینکنا چھوڑو گی لڑکی؟" ساتھ ہی وہ نور بانو کو آواز دینے لگا تاکہ وہ جگہ صاف کی جاسکے۔

"آئی لو یو جہان! آئی ریئلی لو یو۔" وہ رندھی ہوئی آواز اور فرطِ مسرت سے رونے اور مسکرانے کے درمیان بولی تھی۔ جہان نے چونک کر اسے دیکھا اور پھر دائیں بائیں۔

"میری بچپن کی سہیلی ٹھیک کہتی ہے۔ اس گھر میں سب بہت انٹرسٹنگ ہیں۔" وہ جھرجھری لے کر آگے بڑھ گیا۔ نور بانو اسی طرف آرہی تھی۔

حیا یونہی عبایا میں ملبوس لاؤنج کے صوفے کے ہتھے پہ بیٹھی اور موبائل نکال کر ایک نمبر ملایا۔ ہتھیلی سے آنسو پونچھتے ہوئے اس نے فون کان سے لگایا۔

"ڈاکٹر ابراہیم ـــــ میں نے وہ پہیلی حل کرلی۔" وہ چوکھٹ پہ پنجوں کے بل جھکے بیٹھے جہان کو دیکھتے ہوئے بولی جو نور بانو کے ساتھ جنجر بریڈ کے ٹکڑے اٹھا رہا تھا۔

"اچھا، کیا ملا آپ کو پھر؟" دوسری جانب جیسے وہ مسکرائے تھے۔

"آیت حجاب سورۂ احزاب میں نازل ہوئی ہے۔

میں بتاتی ہوں آپ کو حجاب اور جنگ احزاب کی مماثلت۔" وہ رندھی ہوئی آواز میں کہہ رہی تھی۔ "جنگ احزاب میں گروہ بھی ہیں، بنو قریظہ بھی، خندق بھی، سردی اور بھوک کی تنگی بھی۔ تین طرف خندق تو ایک طرف گھنے درختوں کا سایہ اور مضبوط چٹان بھی جو خاموشی سے آپ کو سپورٹ کرتے ہیں۔"

اس نے جہان کی پشت کو دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ افسوس سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے ٹکڑے پلیٹ میں ڈال رہا تھا۔ اس کی جینز کی جیب میں ایک سی ڈی جھلک رہی تھی۔

"لیکن اگر جنگ احزاب میں کچھ نہیں ہے تو وہ 'جنگ' نہیں ہے۔ یہ وہ جنگ ہے جس میں جنگ ہوتی ہی نہیں۔ اکا دکا انفرادی لڑائیوں کو چھوڑ کر، اصل جنگ، ہتھیاروں سے لڑی جانے والی جنگ سے قبل ہی ایک رات طوفان آتا ہے اور دشمنوں کے خیموں کی ہوا اکھڑ جاتی ہے۔ ان کی ہانڈیاں ان پہ الٹ جاتی ہیں اور وہ میدان چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں۔ مجھے میری ایک چھوٹی دوست نے یہی بات کہی تھی کہ یہ جنگ جیتا کون تھا؟ تب نہیں سمجھی میں۔ اب سمجھی ہوں۔ 'جنگ' نہیں، وہ لڑائی کی بات کررہی تھی۔ لڑائی جو اس جنگ میں ہوتی بھی نہیں۔ آپ کو صبر اور انتظار کرنا ہوتا ہے۔ کسی کو ایک دن، کسی کو ایک ماہ اور کسی کو کئی سال اور پھر ایک دن، آپ بغیر کچھ کھوئے، بغیر کسی محاذ پہ لڑے، اچانک جیت جاتے ہیں۔ یہی بات تھی نا؟"

"میرے ذہین بچے! مجھے آپ پہ فخر ہے۔" وہ بہت خوش ہوئے تھے۔

حیا نے ڈبڈباتی آنکھوں سے اس غریب آدمی کو دیکھا جو ابھی تک اپنے پیسے ضائع ہونے پہ افسوس کر رہا تھا۔ چیزیں وقتی ہوتی ہیں، ٹوٹ جاتی ہیں، بکھر جاتی ہیں، ان کا کیا افسوس کرنا؟ اب ان دونوں کو جنجر بریڈ کے گھروں کو بھول کر رشتوں اور اعتماد سے بنا گھر قائم کرنا تھا۔

صبح قریب تھی۔ ان کی صبح۔

☼ ☼ ☼

وہ پارلر کے ڈریسنگ مرر کے سامنے کرسی پہ بیٹھی تھی اور بیوٹیشن لڑکی مہارت سے اس کا آئی شیڈو لگا رہی تھی۔ اس نے گرے اور سلور فراک پہن رکھا تھا۔ بال وغیرہ ابھی بنانے تھے۔

"اونچا جوڑا بنائیں گی کیا؟" بیوٹیشن نے آئی شیڈو کو آخری ٹچ دیتے ہوئے پوچھا تھا۔ حیا نے آئینے میں چہرہ دائیں بائیں کرکے آنکھیں دیکھیں۔ اچھی لگ رہی تھی۔

"اونہوں۔ فرنچ ناٹ بنا دو۔ اونچے جوڑے میں تو نماز نہیں ہوگی اور دو تین نمازیں تو فنکشن کے دوران آجائیں گی۔"

"آج نہ پڑھیں تو خیر ہے۔" لڑکی اکتائی تھی۔

"اپنی خوشی میں اللہ کو ناراض کردوں؟ اونہوں!" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"اچھا نیل پالش لگانی ہے یا نقلی نیلز؟"

"کچھ بھی نہیں۔ بار بار وضو کے لیے اتاروں گی کیسے؟" اس نے سادگی سے الٹا سوال کیا۔

"اوہو ـــــ اچھا نقلی پلکیں تو لگا دوں نا؟"

"اللہ تعالیٰ کو برا لگے گا۔"

"آپ نے آئی بروز بھی نہیں بنائیں۔ تھوڑا سا سیٹ ہی کردوں!"

"اللہ تعالیٰ کو اور بھی برا لگے گا۔"

لڑکی کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ وہ گھوم کر اس کے سامنے آئی۔

"آپ کہیں الہدیٰ کی تو نہیں ہیں؟"

حیا ہنس دی۔

"نہیں، میں بس ایک مسلمان لڑکی ہوں۔"

اور جب حیا نے اسے دوپٹا اپنی مرضی کے مطابق سیٹ کرنے کو کہا تو اس کا منہ کھل گیا۔

"گھونگھٹ؟ کون نکالتا ہے گھونگھٹ؟ آپ کیا بات کررہی ہیں؟"

"میں یہ تو نہیں کہہ رہی کہ بہت نیچے تک نکالو، بس ٹھوڑی تک آئے۔ نیچے ویسے ہی بند گلا ہے۔" اس نے آئینے میں خود کو دیکھتے ہوئے لاپروائی سے کہا تھا۔

اس نے ابا سے بہت کہا تھا کہ مکسڈ گیدرنگ نہ رکھیں۔ فوٹوگرافر نہ ہوں، مگر ابا اور اماں نے ایک نہ سنی۔

"حیا! میں تمہارے پردے کا پھر کوئی ایشو نہیں سننا چاہتی۔" اماں تو باقاعدہ بے زار ہوگئی تھیں۔ حیا جانتی تھی کہ اس کے سامنے وہ کبھی اعتراف نہیں کریں گی کہ وہ اس کے پردے سے دل سے راضی تھیں۔

میرج ہال میں جب اسے برائیڈل روم سے لا کر اسٹیج پہ بٹھایا گیا تو ثنا اس کے ایک طرف آ بیٹھی تھی۔ آج کے لیے ثنا اس کی اسسٹنٹ تھی۔ اپنی طرف سے تصاویر کھینچنے والوں کو وہ مسلسل منع کررہی تھی۔

"حیا آپا پردہ کرتی ہیں پلیز فوٹو مت کھینچیں۔" یا اگر کوئی اس کے گھونگھٹ پہ کچھ بولتا تو وہ جواب بھی دے رہی تھی۔

"آپا کلاسیکل دلہن بنی ہیں اور وہ گھونگھٹ نہیں اٹھائیں گی۔" کوئی چاچی، مامی، خالہ ساتھ آکر بیٹھتی، پھر ذرا سا گھونگھٹ اٹھا کر چہرہ دیکھتی، سلامی دیتی، تعریف کرتی یا جو بھی، سب ایسے تھا جیسے عموماً مہندی کی دلہن کا ہوتا ہے۔

اس کا گرے فراک پیروں تک آتا تھا۔ گھیر پہ کافی کام تھا۔ گھونگھٹ ٹھوڑی تک گرتا تھا، نیچے دوپٹہ "یو" کی شکل میں پھیلا کر سامنے ڈالا تھا۔ آستین پوری تھیں اور وہ سر جھکا کر نہیں بیٹھی تھی، وہ گردن اٹھا کر پورے اعتماد کے ساتھ بیٹھی، ہر پاس آکر بیٹھنے والی آنٹی سے بڑے آرام سے باتیں کررہی تھی۔

جہان اس کے ساتھ آکر بیٹھا تو بہت دھیرے سے بولا تھا۔

"ثابت ہوا کہ تم کچھ چیزوں میں واقعی بہت اسمارٹ ہو۔" بس یہی ایک فقرہ کہا اس نے پھر وہ جلد ہی اٹھ گیا۔ اسے یوں مرکز نگاہ بن کر بیٹھنا قبول نہیں تھا۔ بدتمیز نہ ہو تو۔

وہ پھر خود بھی زیادہ دیر اسٹیج پہ نہیں بیٹھی اور واپس برائیڈل روم واپس آگئی۔ یہ نتاشا کا دن تھا، اب اس کو پوری توجہ ملنی چاہیے تھی۔ خیر وہ پوری توجہ لے بھی رہی تھی۔ ساڑھی کی پشت پہ زبردستی اس نے پلو ڈالا ہوا تھا، مگر وہ روحیل کا بازو تھامے مہمانوں کے درمیان ہنستی بولتی گھوم رہی تھی۔ اور فاطمہ کو ہول اٹھ رہے تھے۔

اس نے کلائی گھما کر دیکھی۔ بہارے کا نیکلس بریسلٹ کی صورت اس نے پہنا تھا اور اس کی سائیڈ پہ خالی کنڈے میں اب ایک موتی جھول رہا تھا۔

سیاہ موتی۔

وہ سفید موتی نہیں بن سکی تو کیا ہوا۔ سیاہ موتی بننے میں بھی کوئی حرج نہیں تھا کہ پھر موتی تو وہ ہوتا ہے، جس کی کالک بھی چمکتی ہے۔

☼ ☼ ☼

صبح کا دودھیا پن اسلام آباد کی پہاڑیوں پہ چھایا ہوا تھا۔ گزشتہ رات کی بارش کے باعث سرمئی سڑکیں ابھی تک گیلی تھیں۔

اس نے کچن کی کھڑکی کا پردہ ہٹایا۔ جالی سے روشنی اور ہوا اندر جھانکنے لگی۔ تازگی کا احساس۔ تب ہی دیوار میں نصب اوون کھانا پکنے کی گھنٹی بجانے لگا۔ وہ آگے آئی اور اوون کا دروازہ کھولا، پھر دستانے والے ہاتھ سے ٹرے باہر نکالی۔

پگھلے ہوئے پنیر سے سجا گرم گرم پزا تیار تھا۔ خستہ، اشتہا انگیز خوشبو جہان کو پسند آئے گا۔ تعریف نہیں کرے گا البتہ تھوڑا کھائے گا اور اس پہ بھی کئی دن ایکسرسائز کا دورانیہ بڑھا کر ان کیلوریز کو برن کرنے کی کوشش کرتا رہے گا۔ اپنی فٹنس اور صحت کے بارے میں وہ آج بھی اتنا ہی کانشس تھا جتنا چار سال قبل ان کی شادی کے وقت تھا۔

اس نے ٹرے اندر دھکیلی اور اوون کا ڈھکن بند کیا۔ اب جہان آفس سے آجائے گا تب ہی وہ اسے نکالے گی۔ ساتھ ہی اس نے پلٹ کر گھڑی دیکھی۔ ابھی اس کے آنے میں کافی وقت تھا۔ وہ اپنے کمرے میں آگئی۔

جہان اور اس کا بیڈ روم بہت نفاست مگر سادگی سے سجا تھا۔ وہ تو اتنی آرگنائزڈ نہیں تھی، مگر جہان ...... وہ خراب، بے ترتیب چیزیں کبھی برداشت نہیں کرتا تھا۔

خدیجہ کا کمرا گو کہ ساتھ والا تھا، مگر وہ ابھی اتنی چھوٹی تھی، بس تین سال کی کہ یہ کمرا اس کا بھی تھا۔

اس وقت وہ کارپٹ پہ بیٹھی بلاکس کو توڑ کر پھر سے جوڑنے میں لگی تھی۔ ٹوٹے بلاکس ایک طرف تھے، جڑے ہوئے ایک طرف۔

"خدیجہ گل کیا بنا رہی ہے؟" وہ الماری کی طرف بڑھتے ہوئے اسے مخاطب کرکے بولی تھی۔ پٹ کھول کر اس نے لیپ ٹاپ کا بیگ نکالا، اور پلٹ کر اپنی بچی کو دیکھا، جو اس کے سوال پہ سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگی تھی۔

وہ سلیولیس سرخ فراک میں ملبوس تھی مگر نیچے اس نے کہنی تک آتی۔ پنک شرٹ پہن رکھی تھی۔ جرابیں بھی پنک نرم گھرے بھورے بال پونی میں بندھے تھے۔ جہان اس کے بال کٹوانے نہیں دیتا تھا۔ اسے لمبے بال پسند تھے۔ مگر صرف خدیجہ کی ماں کے بالوں کے بارے میں وہ رائے نہیں دیا کرتا تھا۔

گوری، گلابی رنگت، اٹھی ہوئی ناک اور جہان جیسی آنکھیں۔ وہ جہان کی ہی بیٹی تھی اور جہان کو لوگوں کا خدیجہ کو اس سے ملانا بہت پسند تھا۔ اس نے حیا سے صرف اچھا قد لیا تھا، مگر۔

"میں تم سے زیادہ لمبا ہوں، اس کا قد بھی مجھ پہ گیا ہے۔" وہ شانے اچکا کر بے نیازی سے کہتا تھا۔

"نتھنگ!" خدیجہ گل نے ذرا سے شانے اچکا کر نفی میں سر ہلایا اور واپس کام میں مگن ہو گئی۔ حیا نے جب اس کا نام خدیجہ گل رکھا تھا تو جہان نے اعتراض نہیں کیا تھا۔

"تم اپنی پسند کا نام رکھ لو، میں تو جو نام بھی بتاؤں گا، آگے سے کہو گی، اب اس نام کی اپنی پرانی دوست کا حلیہ بھی بتاؤ جس کی یاد میں یہ رکھنا چاہتے ہو؟"

——— سو اس نے اپنی بیٹی کا نام خدیجہ گل رکھا تھا۔

"میری تین بہترین دوستوں کی یاد میں!"

خدیجہ ایک پری میچور بچی تھی، مگر صد شکر کہ وہ ہمیشہ صحت مند رہی تھی۔ سو ان کے لیے وہ واقعی خدیجہ گل تھی (یعنی وقت سے پہلے پیدا ہو جانے والا گلاب۔)

اپنے گلاب کو مسکرا کر دیکھتے ہوئے وہ الماری کا پٹ بند کرنے لگی، پھر یکایک ٹھہر گئی۔ جس خانے سے لیپ ٹاپ بیگ نکالا تھا، اس کے پیچھے لکڑی کی دیوار کا رنگ باقی الماری سے ذرا ہلکا لگ رہا تھا۔ اس نے الجھنے سے اسے دیکھتے بیگ نیچے رکھا اور ہاتھ بڑھا کر پیچھے لکڑی کو چھوا۔ کارڈ بورڈ تھا وہ۔ اف اس نے دبے دبے غصے سے کارڈ بورڈ کے ٹکڑے کو دائیں بائیں کرنے کی کوشش کی اور ذرا سی محنت سے وہ ایک طرف سلائیڈ کر گیا۔

پیچھے ایک لاکر تھا۔ چند لمحے وہ خفگی سے اس بند تجوری کو دیکھتی رہی جس میں پتا نہیں کیا تھا اور پھر کارڈ بورڈ کی سلائیڈ واپس جگہ پہ کرکے الماری بند کر دی۔

اس گھر میں پچھلے چار سالوں میں کوئی چار سو خفیہ خانے تو وہ ڈھونڈ چکی تھی، پتا نہیں اب کتنے تلاشنا باقی تھے۔ جہان سے پوچھنا بے کار تھا۔ وہ بہت حیران ہو کر آگے سے کہتا "اچھا؟ ویری اسٹرینج۔ پتا نہیں مالک مکان نے اتنے لاکرز کیوں رکھے ہیں۔ کبھی بات کروں گا اس سے۔"

ہاں جیسے وہ تو اپنے شوہر کو جانتی ہی نہیں تھی نا۔

خدیجہ اسی محویت کے ساتھ بلاکس اوپر رکھ نیچے جوڑ رہی تھی۔ وہ لیپ ٹاپ کھولے بیڈ پہ آبیٹھی اور ای میلز چیک کرنے لگی۔ ساتھ ساتھ وہ خدیجہ پہ گاہے بگاہے نظر بھی ڈال لیتی تھی۔

ابھی یہی فراک، پنک شرٹ کے ساتھ پہنا کر پچھلے ہی ہفتے وہ اماں کی طرف گئی تو اماں حسب عادت خفا ہونے لگی تھیں۔

"اتنی سی بچی پہ تو پردہ نہیں واجب۔ تم سلیولیس پہنا دو گی تو کیا ہو جائے گا حیا؟"

"آف کورس ماں، اس پہ پردہ لاگو نہیں ہوتا، مگر میں اسے کوئی زبردستی کا اسکارف تو نہیں اوڑھا رہی نا، صرف آستین پوری پہناتی ہوں۔ اماں میں نہیں

چاہتی کہ اس کی حیا مرجائے اور وہ ان چیزوں کی عادی ہو جائے جو..." اور اس سے آگے اماں نہیں سنا کرتی تھیں۔

وہ بہت توجہ سے اپنی ای میلز دیکھ رہی تھی۔ لمبے بال آدھے کیچر میں بندھے آدھے پیچھے کھلے کمر پہ پڑے تھے' چہرہ ویسا ہی تھا' ملائی جیسا اسے لگتا تھا وہ ان چار سالوں میں پہلے سے زیادہ خوب صورت ہو گئی ہے مگر.....

"خوب صورت کے بجائے تین چار اور الفاظ ہیں میری لغت میں مگر میں کہوں گا تو تمہیں برا لگے گا۔" ڈائننگ ٹیبل پہ ہی ایک رات اس کے پوچھنے پہ کھانا کھاتے ہوئے جہان نے بے نیازی سے کہا تھا۔ وہ سلگ کر رہ گئی۔

"اگر تمہاری یہ لغت کتابی شکل میں دستیاب ہوتی تو میں اسے واقعی تمہیں دے مارتی جہان!" وہ بہت خفگی سے بولی تھی' مگر اس بات پہ اس کے ساتھ کرسی پہ بیٹھی خدیجہ نے ابرو تان کر ناراضی سے بولی۔

"نو' حیا!" وہ اس کے آئیڈیل باپ کو کچھ دے مارنے کی بات کر رہی تھی وہ کیسے برداشت کرتی۔ اور بس اس کی یہ عادت خود بخود دم توڑ گئی۔

ایک کلک کے بعد اگلا صفحہ کھلا تو وہ ٹھہر سی گئی۔ آنکھوں میں پہلے حیرت ابھری اور پھر اچنبھا۔

وہ مصر کی ایک یونیورسٹی کا رپیکٹس تھا جو اس کی درخواست پہ اسے بھیجا گیا تھا۔ مگر یہ درخواست تو اس نے دی ہی نہیں تھی۔ کیا جہان نے اس کی طرف سے اپلائی کیا تھا؟

وہ الجھن بھری نگاہوں سے اس پراسپیکٹس کو پڑھنے لگی۔

"بس کرو خدیجہ اب کچھ کھالو!" وہ لیپ ٹاپ بند کر کے اٹھی اور بیٹی کے سامنے سے بلا کس سمیٹنے لگی۔ خدیجہ کھانے کے معاملے میں ذرا چور تھی' بعض دفعہ زبردستی کرنی پڑتی تھی۔ ایسے ہی ایک دفعہ خدیجہ بہت بیمار تھی اور حیا اسے کچھ کھلانا چاہ رہی تھی' مگر خدیجہ نے ہاتھ مار کر پیالہ گرا دیا تو اس نے بہت غصے سے کہا تھا۔

"اللہ اللہ' بات کیوں نہیں مانتی ہو؟ میں کدھر جاؤں؟"

اور خدیجہ نے سرخ چہرے اور ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ غصے سے کہا تھا "جہنم میں جاؤ!"

اور وہ بالکل شل رہ گئی۔ بس وہ آخری دن تھا' پھر اس نے اپنا تکیہ کلام ترک کر دیا تھا۔ بس' اب اور نہیں۔ بری عادتیں' ہمیں خود بدلنی پڑتی ہیں۔

خدیجہ کو کچن کاؤنٹر پہ بٹھا کر اس نے فریج کا دروازہ کھولا تاکہ اندر سے کھیر نکالے مگر۔

دروازے کے اندرونی طرف' انڈوں کے خانے میں ایک "پوسٹ اٹ نوٹ" چپکا تھا۔ اس نے نوٹ اتارا اور سیدھے ہوتے ہوئے پڑھا۔

"لنچ ٹائم پہ کبوتروں کو یاد کرنے میں کوئی حرج تو نہیں ہے؟"

لنچ ٹائم؟ اس نے بے ساختہ گھڑی دیکھی۔ لنچ ٹائم تو ہونے والا تھا۔ اللہ' اللہ' یہ آدمی بھی نا۔

"چلو خدیجہ! بابا کے پاس جانا ہے۔" اس نے جلدی سے بچی کو کاؤنٹر ٹاپ سے اتارا۔ بابا سن کر اس کے چہرے پہ سارے جہان کی خوشی امڈ آئی۔ وہ فوراً" اندر کی طرف دوڑی۔ جب تک حیا دروازے' کھڑکیاں بند کر کے آئی' وہ حیا کا بڑا سا پرس کندھے پہ لٹکائے' اس کا عبایا گھسیٹتی (فرش پہ جھاڑو دیتی) لا رہی تھی۔

"تھینکس۔ اپنے جوتے پہنو اب۔" اس نے جلدی سے عبایا اور پرس اس سے لے لیا۔

مان سن کے کبوتروں کا ذکر پہلی دفعہ جہان نے ایک اطالوی ریسٹورنٹ میں کیا تھا۔ اس کے بعد سے اس ریسٹورنٹ کو وہ "کبوتروں" کے کوڈ نیم کے ساتھ یاد کرتے تھے۔ لیکن کیا تھا اگر وہ صبح ناشتے پہ کہہ جاتا کہ ہم لنچ باہر کریں گے' مگر نہیں' وہ انسانوں کی زبان میں

[با]ت ہی کب کرتا تھا؟ صبح سے اتنی دفعہ فریج کھولا' پتا نہیں کیوں نظر نہیں پڑی۔ اف!

آدھے گھنٹے بعد' وہ اپنے حریر کے سیاہ عبایا میں ملبوس' خدیجہ کی انگلی تھامے' ریسٹورنٹ کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ اوپر آکر دیکھا' کونے والی میز خالی تھا۔ وہ وہاں کہیں ہو گا' مگر جب تک وہ بیٹھ نہیں جائے گی' وہ نہیں آئے گا۔ ویسے وہ اس طرح باہر کم ہی بلاتا تھا' یقیناً" اب کوئی ایسی بات تھی جو وہ گھر میں نہیں کرنا چاہتا تھا۔

خدیجہ کو مخصوص کرسی پہ بٹھا کر' وہ جیسے ہی بیٹھی' اسے وہ سامنے سے آتا دکھائی دیا۔ گرے کوٹ بازو پہ ڈالے' کف موڑے' ٹائی ڈھیلی' سنجیدہ چہرہ اور ہمیشہ کی طرح ہینڈسم۔ اس کے سامنے کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہی وہ بولا تھا۔

"مرحبا۔ کیا حال ہے؟" پھر موبائل والٹ میز پہ رکھتے ہوئے اس نے جھک کر خدیجہ کے دونوں گال باری باری چومے۔ اپنی بہت سی ترک عادات کو وہ ترک نہیں کر سکے تھے۔

"بابا' یو نو واٹ؟" خدیجہ چہک کر جلدی جلدی اسے کچھ بتانے لگی تھی اور وہ توجہ سے مسکراتے ہوئے سن رہا تھا۔ آدھی تو یقیناً" "حیا" کی شکایات تھیں۔ نہیں وہ ماما کہنے کا تکلف نہیں کیا کرتی تھی۔ وہ وہی کہتی تھی جو اس کا باپ کہتا تھا۔

جب آرڈر سرو ہو چکا تو وہ اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔

"اور سب ٹھیک ہے؟"

"تمہید چھوڑو جہان اور اب بتا بھی چکو کہ کیا بات ہے؟"

"نہیں' اتنا کچھ خاص نہیں ہے' بس ایسے ہی۔" وہ چھری کانٹے کی مدد سے اسٹیک کا ٹکڑا توڑتے ہوئے لاپروائی سے بولا تھا۔

(بہت خاص بات ہے' اور گھر پہ نہیں ہو سکتی تھی) یہ فقرہ اس نے کہا نہیں تھا۔ مگر حیا توجہ سے سرہلاتی' اس کو سنتے ہوئے خود ہی ذہن میں اس کے الفاظ ڈی کوڈ کر رہی تھی۔

"اصل میں' میں کچھ آگے کا سوچ رہا تھا۔"

(مجھے آگے کا اسائنمنٹ مل گیا ہے اور اوپر سے حکم آیا ہے)

"کہ کچھ دن کے لیے تھوڑا سا گھومنے پھرنے باہر چلا جاؤں۔"

(یعنی کہ ایک دو سال تو کہیں نہیں گئے۔)

"ہوں؟" حیا نے سمجھ کر سرہلا کر اسے مزید بولنے دیا۔

"زیادہ دور نہیں' بس قریب ہی۔ میل چیک کی تم نے آج؟"

حیا نے بس ہاں میں گردن ہلائی۔ بولی کچھ نہیں۔

(قریب یعنی کہ مصر۔ وہیں سے میل آئی ہے نا تمہیں)

"تو... تمہارا کیا خیال ہے؟" وہ سنجیدگی سے اس کو دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

(تم رہ لوگی اتنا عرصہ؟)

حیا نے شانے ذرا سے اچکائے۔ "جیسے تمہاری مرضی۔" دل البتہ بہت اداس ہو گیا تھا۔ تو بالآخر وہ لمحہ آن پہنچا تھا جب اسے ایک فوجی کی بیوی کا کردار کرنا ہو گا۔ گھر پہ رہ کر برسوں انتظار کرنے والی بیوی کا۔ خدیجہ بڑی ہو جائے گی اور پھر پتا نہیں وہ کب اپنے باپ کو دوبارہ دیکھ پائے گی۔ زندگی بھی بہت غیر یقینی چیز تھی۔

"خدیجہ تو میرے بغیر رہ لے گی۔ ممی کے ساتھ اس کی بہت بنتی ہے۔" وہ بھی حیا کی طرح شاید اس کی سوچ کو ڈی کوڈ کر کے بولا تھا۔ "مگر' تمہارے لیے مشکل ہو گا' جانتا ہوں۔ تم مجھے مس کرو گی۔" وہ ذرا سا مسکرایا۔

(میں تمہیں مس کروں گا مگر قیامت تک اس بات کا اقرار نہیں کروں گا۔)

(اچھا تو پھر؟)

"پھر یہ کہ..." اس نے پلیٹ پرے کرتے ہوئے

حیا کو دیکھا۔

"میں ایک ایسا کور بنانا چاہ رہا ہوں جس میں مجھے شاید کسی یونیورسٹی میں کچھ عرصے کے لیے پڑھانا پڑے۔ تمہیں بھی آگے پڑھنے کا شوق ہے' تو کیوں نہ ہم یوں کریں کہ خدیجہ کو ممی کے پاس چھوڑ دیں اور تم میری اسٹوڈنٹ بن کر میری کلاس میں ان رول ہو جاؤ۔" یہاں پہ آکر اس نے مسکراہٹ دبائی۔ "ہاں لیکن میں اس بات کی یقین دہانی کراؤں گا کہ تم میری سب سے زیادہ ڈانٹ کھانے والی اسٹوڈنٹ ہو گی۔"

"اچھا اور تمہیں لگتا ہے کہ میں مان جاؤں گی؟" وہ ذرا توقف کے بعد بولی تھی۔ "ترکی کے ان پانچ ماہ کی طرح ایک دفعہ پھر تم ڈرائیونگ سیٹ پہ ہو اور ہر چیز کنٹرول کرو گے؟"

"ہاں تو؟"

"تو میرا خیال ہے کہ یہ ایک اچھا آئیڈیا ہے' مگر تھوڑی سی تبدیلی کی گنجائش ہے۔" اس سارے میں وہ پہلی دفعہ مسکرائی تھی۔ ہتھیلی ٹھوڑی تلے رکھے' وہ بہت مطمئن سی اسے دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "ہم اپنی جگہیں تبدیل کر لیتے ہیں۔"

"مطلب؟" وہ الجھا۔

"مطلب کہ میں ٹیچر ہوں گی اور تم میرے اسٹوڈنٹ ہو گے اور ہاں میں اس بات کی یقین دہانی کراؤں گی کہ تم میرے سب زیادہ ڈانٹ کھانے والے اسٹوڈنٹ ہو گے۔"

"اور تمہیں لگتا ہے کہ مان جاؤں گا؟"

"ہاں' کیونکہ اس دفعہ میں ڈرائیونگ سیٹ پہ ہونا چاہتی ہوں۔ اور تمہارے پاس فیصلہ کرنے کے لیے دس سیکنڈ ہیں۔" اس نے ساتھ ہی گھڑی دیکھی۔

"حیا!" وہ جھنجلایا تھا۔ خدیجہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور پھر حیا کو اور پھر سے جہان کی پلیٹ سے اسٹیک کے ٹکڑے اٹھانے لگی۔ وہ ہمیشہ اس کی پلیٹ سے کھاتی تھی۔

"ڈیل؟" حیا نے ابرو اٹھا کر پوچھا اور دوبارہ گھڑی دیکھی۔ وہ ذرا ناخوش سا لگ رہا تھا' چند لمحے کے لیے کچھ سوچا' اور پھر شاید اسے اپنا کوئی فائدہ نظر آیا تھا تب ہی بولا۔

"او کے ڈیل مگر۔۔۔" اس نے نیپکن سے ہونٹ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "مگر یہ یاد رکھنا کہ تم ہمیشہ مجھ سے دو قدم پیچھے رہو گی۔"

حیا جانتی تھی وہ صحیح کہہ رہا ہے مگر وہ بولی تو کیا۔

"دیکھتے ہیں۔ مگر تم یہ یاد رکھنا کہ کچھ دن بعد تم مجھے میڈم کہو گے۔"

جواب میں وہ دھیمی آواز میں خفگی سے کچھ بڑبڑا کر والٹ کھولنے لگا۔ حیا نے مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا۔ خدیجہ ابھی تک اس کی پلیٹ سے کھا رہی تھی۔

مصر۔۔۔ قاہرہ یونیورسٹی۔

کون جانے کہ اس نئے سفر پہ اسے اس کی بچھڑی ہوئی دوستیں واپس مل جائیں؟ کون جانے کہ عائشے اور بہارے بھی مصر میں رہتی ہوں؟ کون جانے کہ عائشے اب بھی ویسی ہی سادہ اور مذہبی سی ہو جبکہ بہارے ایک خوب صورت ٹین ایج لڑکی میں بدل گئی ہو؟

جہان کو جاب کی وجہ سے ان سے رابطہ کرنے کی اجازت نہ تھی مگر۔۔۔ حیا نے اپنے سامنے موجود دو نفوس کو دیکھتے ہوئے زیر لب مسکراتے ہوئے سوچا۔

مگر کون جانے کہ حیا نے ان سے رابطہ کبھی ترک ہی نہ کیا ہو؟

کیونکہ چیزیں جتنی ناممکن ہوتی ہیں۔
وہ اتنی ہی ممکن بھی تو ہوتی ہیں نا۔
مگر۔۔۔ کون جانے!

نئے ملال کا سامان کرنے نکلے ہیں
ہم اپنے آپ کو ہلکان کرنے نکلے ہیں

اسی کی وعدہ فراموشیوں نے دل توڑا
اسی سے اک نیا پیمان کرنے نکلے ہیں

یہ اور بات نئے زخم بخش دے دنیا
گھروں سے مشکلیں آسان کرنے نکلے ہیں

وہ کربلا کے تسلسل میں دیکھنا ہو گا
جو فیصلہ سر میدان کرنے نکلے ہیں

یہ کار عشق ہے ٹکڑوں میں بٹ نہیں سکتا
دل و دماغ کو یک جان کرنے نکلے ہیں

پھر اک مہیب فضا میں شکستہ پر خالد
ہم اپنے آپ کو حیران کرنے نکلے ہیں

خالد معین

ترے خیال کی لو تن سے جب اترتی ہے
بڑی خموشی سے آنگن میں شب اترتی ہے

تمہارا ساتھ تسلسل سے چاہیے مجھ کو
تھکن زمانوں کی لمحوں میں کب اترتی ہے

تجھے میں جانتا ہوں چھاؤں کے حوالے سے
یہ مجھ میں دھوپ سی کس کے سبب اترتی ہے

دیے کی لو تو ہواؤں سے بجھ گئی عرفان
یہ کیسی روشنی آنکھوں میں اب اترتی ہے

عرفان صادق

تنہائی جب تجھ سے لپٹ کر سونے لگتی ہے
رات گئے کمرے میں بارش ہونے لگتی ہے

ابھی تو گھر میں اُس سے بڑی بہنیں بھی بیٹھی ہیں
کبھی کبھی وہ باپ کو دیکھ کے رونے لگتی ہے

مہماں پھر سے آس کی شمع گُل کر جاتے ہیں
پھر وہ کچن میں جھوٹے برتن دھونے لگتی ہے

وہ کیا جانے بے تعبیری کا جان لیوا کرب
وہ تو مالا میں ہر خواب پرونے لگتی ہے

لوگوں کو روداد سنا کر اک ناداں لڑکی
اپنے ہی رستے میں کانٹے بونے لگتی ہے

طوفانوں سے لڑنے والے کون تھے جانِ انیسؔ
ہمیں تو ہر چھوٹی سی نہر ڈبونے لگتی ہے

محمد انیس انصاری

امکاں صورت

زیست سفر میں
لاکھ کدورت
لیکن تم ہی
روزِ ازل سے امکاں صورت
کٹھن مراحل کب رہتے ہیں
رستے سارے کٹ جاتے ہیں
سفر کی مشکل ہنس کر جھیلو
آبلہ پائی ایک حقیقت
سر کا سودا رہے سلامت
آئے نہ جنبش پائے جنوں میں
زنداں میں، ظریفؔ احسن
رقص ہمارا جاری ہے
زنجیر کا نغمہ جاری ہے

ظریف احسن

صبا سحر

قانونی مشورہ

ایک خاتون اپنے شوہر سے طلاق لینا چاہتی تھیں۔ وہ قانونی مشورے کے لیے ایک وکیل کے پاس پہنچیں اور وکیل کو اپنے شوہر کے مظالم کی ایسی دردناک داستان سنائی کہ وکیل بھی آبدیدہ ہوگیا۔ جذباتی لہجے میں بولا۔
”معلوم ہوتا ہے۔ آپ کا شوہر انسان نہیں، درندہ تھا۔“
”میں یہاں قانونی مشورے کے لیے آئی ہوں۔ اپنے شوہر کے خلاف ایسی باتیں برداشت نہیں کرسکتی۔“ خاتون نے ڈپٹ کر وکیل کو جواب دیا۔
(شائستہ جاوید۔ ایف بی ایریا)

جھوٹ

”ممی! وہ کہتا ہے میں اس شہر کی سب سے خوب صورت لڑکی ہوں۔“
”تو تم اس مکار سے شادی کرنا چاہتی ہو جو شروع ہی سے جھوٹ بول رہا ہو۔“ ماں نے جواب دیا۔
(شمع مسکان۔ جام پور)

بہانہ

جنرل منیجر نے ایک روز اپنے ملازم کو بلایا اور سخت لہجے میں کہا۔
”میں نے پچھلے دو سال میں یہ بات خاص طور پہ نوٹ کی ہے کہ جب تم اپنی خالہ کی بیماری کا کہہ کر دفتر سے چھٹی لے کر جاتے ہو‘ اس روز ضرور کوئی کرکٹ میچ ہوتا ہے۔“ ملازم سر کھجاتے ہوئے بولا۔
”سر جی! آپ کے کہنے کا مطلب ہے کہ میری خالہ بیماری کا بہانہ کرتی ہیں۔“
(آمنہ اجالا۔ ڈہرکی)

حفظ ماتقدم

نرس نے مریض کی دونوں کلائیاں پکڑی ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر کمرے میں داخل ہوا تو خوب صورت نرس کو اس طرح نبض چیک کرتے دیکھ کر بولا۔
”نبض دیکھنے کے لیے مریض کی دونوں کلائیاں پکڑنے کی ضرورت نہیں۔“
”دوسرا ہاتھ تو میں نے اپنے بچاؤ کے لیے پکڑا ہوا ہے سر!“ نرس نے جواب دیا۔
(فوزیہ ثمرٹ۔ گجرات)

مشورہ

”دیکھیں جناب! پورا ایک ہفتہ ہوگیا ہے۔ میرے شوہر آلو خریدنے گئے تھے۔ ابھی تک نہیں آئے۔“ ایک خاتون نے انتہائی پریشانی سے پولیس آفیسر سے کہا۔
”تو محترمہ! آپ نے ضرور آلو ہی پکانے ہیں۔ کوئی اور سبزی پکالیں۔“ انسپکٹر نے اطمینان سے جواب دیا۔
(ہانیہ عمران۔ گجرات)

کنجوسی

اکبر صاحب دولت مند مگر نہایت کنجوس آدمی تھے۔ اس لیے ہمیشہ بوسیدہ اور بے ڈھنگے لباس میں نظر آتے۔ آخر ایک روز ان کا دوست کہنے لگا۔

"اکبر صاحب! خدا کے لیے ڈھنگ کا لباس پہنا کریں۔ کچھ نہیں تو اپنے والد مرحوم کا خیال کریں۔ وہ تو بڑے خوش لباس تھے۔" اکبر صاحب نے ناراضی سے پوچھا۔

"آپ پھر مجھ پر خفا کیوں ہیں؟ میں ہمیشہ ان ہی کے تو کپڑے پہنتا ہوں۔"

(حرا قریشی۔ بلال کالونی، ملتان)

مصروفیت

لڑکا "ہیلو! کیا کر رہی ہو؟"

لڑکی "میں بہت تھکی ہوئی ہوں آج گھر کا بہت کام کیا ہے۔ نماز پڑھ کے سونے جا رہی ہوں اور تم کیا کر رہے ہو؟"

لڑکا "میں ابھی سینما میں فلم دیکھ رہا ہوں اور تمہاری پیچھے والی سیٹ پہ بیٹھا ہوں۔"

(نائلہ، شمائلہ۔ اللہ آباد)

جواز

"کیا تم بتا سکتے ہو کہ بلی اپنے آپ کو کیوں کھجاتی ہے؟"

"نہیں؟"

"کیوں؟"

"کیونکہ صرف بلی کو ہی معلوم ہوتا ہے کہ اسے کہاں خارش ہو رہی ہے۔"

(نسیم اختر۔۔۔ گلشن اقبال)

میرا کتا

دو انگریز ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ایک نے کہا۔

"میرا کتا بہت ہوشیار ہے، جب میں اسے دکان سے انڈا لانے کو کہتا ہوں تو وہ صرف تازہ انڈا ہی لاتا ہے۔ اگر دکان دار خراب دے تو نہیں لاتا۔ کیا بات ہے میرے کتے کی۔"

دوسرے نے کہا۔ "یہ تو کوئی بات ہی نہیں۔ میرا کتا ہمیشہ میری پسند کا برانڈ ہی لاتا ہے اور جب تک میں اپنے ہاتھ سے اسے سگریٹ نہ دوں، وہ نہیں پیتا۔" یہ کہہ کر ان دونوں نے دوسری ٹیبل پر بیٹھے شخص کو مخاطب کیا۔

"کیا آپ نے کبھی ایسے کتے کے بارے میں سنا ہے جو ہمارے کتوں کی طرح ہوشیار ہو؟"

"مجھے صرف ایک کتے کے بارے میں معلوم ہے۔" اس شخص نے جواب دیا۔ "وہ میرا کتا ہے اور وہ اس دکان کو چلاتا ہے، جس سے تمہارے کتے خریداری کرتے ہیں۔"

(یاسمین ظفر۔۔ لاہور)

شکر کا مقام

بیٹے کا رزلٹ دیکھ کر باپ نے غصے سے گرجتے ہوئے کہا۔

"غضب خدا کا! یہ تمہارا رزلٹ ہے۔ بیس بچوں کی کلاس میں تم آخری نمبر پر آئے ہو۔ اس سے برا رزلٹ میں نے آج تک نہیں دیکھا۔"

"ابو! کیا ہمیں شکر نہیں کرنا چاہیے کہ کلاس میں بیس سے زیادہ بچے نہیں تھے؟" بیٹے نے معصومیت سے کہا۔

(بینا عابد۔۔۔ کورنگی)

تجزیہ

ایک خاتون کا ڈرائیونگ سیکھنے کا پہلا دن تھا۔ وہ گاڑی میں بیٹھنے کے بعد تمام چیزوں کا جائزہ لے چکیں تو بیک ویو مرر کا رخ اپنی جانب کرتے ہوئے بولیں۔

"یہ آئینہ ٹھیک زاویے پر نہیں لگا ہوا۔ اس میں تو پیچھے آنے والی گاڑیوں کے علاوہ کچھ نظر ہی نہیں آ رہا۔"

(جویریہ وہاب۔۔۔ ملتان)

مایوسی

اسٹیڈیم اس دن خالی پڑا تھا۔ میچ کا منتظم اس صورت حال سے سخت پریشان تھا۔ کیونکہ تماشائی نہ ہونے کا مطلب یہ تھا کہ آمدنی بھی نہ ہوگی۔ اسی اثناء میں کرکٹ کے ایک شائق نے اس کو فون کیا اور کہا۔

"محترم! یہ بتائیے اگر میچ شروع ہونے سے پانچ منٹ قبل آجاؤں تو کیا مجھے ٹکٹ مل جائے گا۔"

منتظم نے تلخی سے جواب دیا۔ "اگر آپ دس منٹ پہلے آجائیں تو ٹیم میں بھی شامل کر لیے جائیں گے۔"

(امبر گل۔۔۔ جھڈو)

پرسکون مقام

ایک خاتون نے ٹریول ایجنٹ کو فون کر کے کہا۔

"اس سال ہم کسی پرسکون اور دور دراز مقام پر چھٹیاں گزارنا چاہتے ہیں۔ کوئی ایسی جگہ بتائیے جہاں شہر کے ہنگامے، شور شرابے، ٹریفک، موبائل اور کیبل نشریات وغیرہ نہ ہوں۔"

"یس میڈم! میں آپ کو ایسی جگہ بتاتا ہوں۔۔۔" ایجنٹ نے کہنا چاہا۔

"ہاں۔۔۔ مگر ایک بات کا ضرور خیال رکھیے گا۔" خاتون نے ایجنٹ کی بات کاٹی۔ "کوئی بڑا اور جدید قسم کا شاپنگ مال ضرور ہو وہاں۔"

(پروین اختر۔۔۔ گلستان جوہر)

بہ سبب قحط

بلیوں کی ریس میں مختلف ممالک کی بہت صحت مند اور تندرست بلیوں نے حصہ لیا۔ اس میں صومالیہ کی ایک لاغر بلی بھی شریک تھی۔ مقابلہ شروع ہوا تو بلیاں تیزی سے دوڑنے لگیں۔ مگر صومالیہ کی کمزور سی بلی سب کو پیچھے چھوڑتے ہوئے آگے نکل گئی اور مقابلہ جیت گئی۔

اخباری نمائندوں نے بلی کے مالک سے پوچھا۔

"جناب! صومالیہ میں تو قحط پڑا ہوا ہے اور بلی کی صحت سے بھی صاف نظر آ رہا ہے، پھر یہ کیسے مقابلہ جیت گئی؟"

"جناب! یہ ہمارے ملک کی بلی نہیں۔۔۔ شیر ہے۔" بلی کے مالک نے متانت سے جواب دیا۔

(کومل عدنان۔۔۔ ملیر)

اصل خطرہ

بیٹے کی درخواست پر باپ نے اسے خود حفاظتی کے سارے گر سکھا دیے۔ مکے بازی کی ہفتہ بھر کی مشق کے بعد باپ نے بیٹے سے کہا۔

"اب تم اسکول میں کسی لڑکے سے دب کر نہیں رہو گے۔"

"مجھے لڑکوں کا ڈر ہی کب تھا ابا!" بیٹے نے جواب دیا۔

"دراصل مجھے تو ماسٹر صاحب سے خطرہ تھا۔"

(مدیحہ احمد۔۔۔ گلشن اقبال)

نصیحت

بیٹی کو رخصت کرتے وقت ماں نے نم دیدہ ہو کر کہا۔

"بیٹی! شادی کچھ دو اور کچھ لو کے اصول کے تحت گزارنے کا نام ہے۔ یعنی اگر تمہارا شوہر تمہیں اپنا سب کچھ دے دے تو ٹھیک ہے۔ ورنہ آگے بڑھ کر خود ہی لے لینا۔"

(افشاں فرقان۔۔۔ سخی حسن)

شگفتہ جاہ

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت ابو شریح خویلد بن عمرو خزاعی سے روایت ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اے اللہ! میں لوگوں کو دو ضعیفوں کے حق سے بہت ڈراتا ہوں (کہ ان میں کوتاہی مت کرنا) ایک یتیم اور دوسرا عورت۔"

فائدہ:۔ انسانی معاشروں میں کمزور طبقات کے ساتھ عام طور پر ظلم روا رکھا جاتا ہے۔ بالخصوص عورتیں اور یتیم اس کا خاص نشانہ بنتے ہیں۔ ان کو جائیدادوں میں ان کے شرعی حق سے محروم رکھا جاتا ہے بلکہ ان کی جائیدادوں کو ہتھیا لیا جاتا ہے اور ان سے ہر طرح کے بدسلوکی روا رکھی جاتی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے لوگوں کے لیے سخت وعید فرما کر ان کی حق تلفی اور ان کے ساتھ ظلم و زیادتی کرنے سے روکا ہے۔ (ریاض الصالحین)

جانوروں پر رحم،

ابو نعیم اصبہانی زید بن ارقم سے بیان کرتے ہیں کہ میں مدینہ کے ایک محلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا۔

ہمارا گزر ایک اعرابی کے خیمہ کے پاس سے ہوا۔ وہاں خیمہ میں ایک ہرنی بندھی ہوئی تھی۔ اس نے کہا۔ "اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! اس اعرابی نے مجھے پہلے میرا شکار کیا اور میرے نوزائیدہ بچے صحرا میں ہیں اور میرے تھن میں یہ دودھ جم گیا ہے۔ یہ آدمی نہ تو مجھے ذبح کر رہا ہے تاکہ میں آرام پا جاؤں اور نہ ہی مجھے چھوڑ رہا ہے تاکہ میں صحرا میں اپنے نوزائیدہ بچوں کے پاس چلی جاؤں۔

یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہرنی سے کہا۔ "اگر میں تجھے چھوڑ دوں تو تو واپس آجائے گی؟"

اس نے کہا۔ "ہاں، ورنہ اللہ تعالیٰ مجھے سخت عذاب دے گا۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے کھول دیا۔ وہ تھوڑی دیر۔ بعد اپنی زبان چاٹتے ہوئے واپس آگئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے خیمے میں باندھ دیا اتنے میں ایک اعرابی آیا اور اس کے پاس ایک مشق بھی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے کہا۔

"کیا تم اس ہرنی کو مجھے بیچو گے؟"

اعرابی نے عرض کیا۔ "اے اللہ کے رسول! یہ تو آپ ہی کے لیے ہے۔"

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ہرنی کو چھوڑ دیا۔

زید بن ارقم کہتے ہیں، اللہ کی قسم! میں نے اس ہرنی کو زمین پر جاتے ہوئے دیکھا اور وہ یہ کہہ رہی تھی۔ "میں گواہی دیتی ہوں کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود حقیقی نہیں اور بے شک محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔"

واصف علی واصف،

- جاگنے والے زندہ ہوں تو سونے والوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ جاگنے والے نہ رہیں تو سونے والے بھی نہ رہیں گے۔ گڈریا سو جائے تو بھیڑیے ریوڑ کھا جاتے ہیں۔
- لوگ فوری نتیجوں پر غور کرتے ہیں اور اس طرح انتہائی نتائج سے بے خبر رہتے ہیں۔
- ہم شاید جانتے نہیں کہ ہمارے فیصلوں کے اوپر ایک اور فیصلہ نافذ ہو جایا کرتا ہے۔ یہ وقت کا فیصلہ ہوتا ہے۔
- تذبذب اس مقام کو کہتے ہیں جہاں آگے جانے کی ہمت نہ ہو اور واپس جانا ممکن نہ ہو۔
- جب زمانہ امن کا ہو اور حالات جنگ جیسے ہوں تو عذاب ہے۔
- منافق وہ ہے جو اسلام سے محبت کرے اور مسلمانوں سے نفرت۔
- ہم جسے تاریکی سمجھ رہے ہیں، یہ ہی صبح کاذب تو صبح صادق کا آغاز ہے۔
- وہ وقت دور نہیں جب یہ وقت ختم ہو جائے گا۔

نوال افضل گھمن۔ گجرات

خوشبو جیسی بات،

- دعا بے کار نہیں جاتی، البتہ قبول ہونے کی صورتیں مختلف ہوتی ہیں۔
- رشتے اور سودے میں بہت فرق ہوتا ہے، رشتے قائم کیے جاتے ہیں جبکہ سودے طے کیے جاتے ہیں۔
- کمزور لمحے ہر انسان پر آتے ہیں۔ اگر ہم ان کمزور لمحوں کی گرفت سے نکل جائیں تو انسانیت کی معراج کو چھو لیتے ہیں۔
- جس کو اللہ تعالیٰ مقبول کرتا ہے اس پر ظالم مسلط کیا جاتا ہے جو اس کو رنج دیتا ہے۔
- یہ عجیب بات ہے کہ بعض لوگ دن میں پانچ دفعہ منہ دھوتے ہیں مگر دل کو پانچ سال میں ایک دفعہ بھی نہیں دھوتے۔
- جو اپنی نظر کو کھلا چھوڑ دیتا ہے اس کا غم طویل ہو جاتا ہے۔ جو اپنی امید کو کھلا چھوڑ دیتا ہے اس کا عمل برابر ہو جاتا ہے اور جو اپنی زبان کو کھلا چھوڑ دیتا ہے، وہ اپنے آپ کو ہلاک کر لیتا ہے۔

نوشین اقبال نوشی۔ گاؤں بدو مرجان

اُمت کا بہتر شخص،

عمر بن عبدالعزیز نے سلیمان بن عبدالملک کے بعد ڈھائی سال تک حکومت کی۔ اس دوران زمین عدل و انصاف سے بھر گئی اور مال اس کثرت سے ہو گیا کہ لوگوں کو فکر دامن گیر ہو گئی کہ ہم اپنا صدقہ کس کو دیں۔

نیز امام بیہقی عمر بن عبدالعزیز سے روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ مکہ جاتے وقت ان کا گزر ایک صحرا سے ہوا جہاں ایک مرے ہوئے سانپ کو دیکھ کر کہا۔

"قبر کھود کر اس سانپ کو دفن کروں گا۔"

لوگوں نے کہا۔ "اللہ آپ کی حفاظت فرمائے۔ ہم آپ کا یہ کام انجام دینے کے لیے کافی ہیں۔"

عمر بن عبدالعزیز نے کہا۔ "نہیں۔"

پھر انہوں نے سانپ کو ایک چیتھڑے میں لپیٹ کر دفن کر دیا۔ اتنے میں ایک آواز دینے والے نے آواز دی۔

"اے سُرق! تم پر اللہ کی رحمت ہو۔"

عمر بن عبدالعزیز نے یہ سن کر کہا۔ "اللہ تم پر رحم کرے، آخر تم ہو کون؟"

"میں جنوں کا ایک فرد ہوں اور یہ سُرق (جس کو آپ نے دفن کیا ہے)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کرنے والے جنوں میں سے اب میرے اور اس کے علاوہ کوئی جن باقی نہیں رہا۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے۔

"اے سرق! تو ایک صحرا میں مرے گا اور تجھے میری اُمت کا بہتر شخص دفن کرے گا۔"

علاوہ ازیں ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ عمر بن عبدالعزیز نے اس جن کو قسم کھلائی، جب اس نے قسم کھائی تو عمر بن عبدالعزیز رونے لگے۔ امام بیہقی نے اس روایت کو ترجیح دی ہے اور اسے حسن قرار دیا ہے۔ واللہ اعلم۔

موتی مالا،

- تصوف اپنی پسند کو ترک کر دینے کا نام ہے۔ (حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ)
- کوئی شخص بھی اللہ تک اس کی توفیق کے بغیر نہیں

پہنچا اور اللہ تک پہنچنے کا راستہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا اور اتباع ہے۔
(حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ)

☾ عبادت کی بنیاد تین چیزیں ہیں۔
آنکھ، دل، زبان۔
آنکھ عبرت کے لیے، دل غور و فکر کے لیے اور زبان سچائی کا گہوارہ اور ذکر و تسبیح کے لیے ہو۔
(حضرت ابوالحسن زنجانی)
(کتاب۔ مکاشفۃ القلوب)
ماریہ سندس۔ چکوال

انسان،

انسان دولت کمانے کے لیے اپنی صحت کھو دیتا ہے پھر صحت کو واپس لانے کے لیے اپنی دولت کھو دیتا ہے۔ مستقبل کو سوچ کر اپنا حال ضائع کرتا ہے پھر مستقبل میں اپنا ماضی یاد کر کے روتا ہے۔ جیتا ایسے ہے جیسے کبھی مرے گا نہیں پھر مر ایسے جاتا ہے جیسے کبھی جیا ہی نہیں۔

عائشہ خان۔ ٹنڈو محمد خان

واحد منزل،

انسان ہمیشہ تبدیلی کی خواہش رکھتا ہے۔ اس دنیا میں کچھ بھی اچھا نہیں جو ہمیشہ رہ سکے۔ تعلیم، ملازم، بیوی، بچہ، گھر۔ ہم ان منزلوں کے سہارے زندہ رہتے ہوئے بھی تبدیلی کے خواہاں رہتے ہیں اور بڑھاپے کو جا پکڑتے ہیں۔ جہاں پہنچ کر آخری ایک ہی منزل رہ جاتی ہے۔ موت ساری منزلوں کی واحد منزل۔
(بانو قدسیہ کی مرد ابریشم سے اقتباس)
فوزیہ ثمر بٹ۔ گجرات

گناہ،

ادب کی دنیا میں اگر مصنف ایسی کتاب تحریر کرے جس کے قاری میں گناہ کی رغبت یا میلان پیدا ہو جائے تو ایسی تخلیق گناہ ہی کہلائے گی۔ اسے گناہ سے توبہ کرنا لازم ہے۔ مصنف کا عمل تصنیف ہے اور یہ عمل خیر یا شر کے باب میں اپنا انجام ضرور دیکھے گا۔ گناہوں پر اکسانے والے کا انجام گنہگار کے انجام سے زیادہ خطرناک ہوگا۔ نیکی پر گامزن کرنے کا عمل نیک اعمال میں سب سے زیادہ مستحسن عمل ہے۔ ادیب مر جاتا ہے، ادب زندہ رہتا ہے اور ادب اپنی تاثیر پیدا کرتا رہتا ہے۔
(واصف علی واصف۔ قطرہ قطرہ قلزم)

عالم کون،

ایک بادشاہ نے ایک بزرگ سے سوال کیا۔
"عالم کی پہچان کیا ہے؟"
"فرمایا۔" اس میں طمع نہ ہو۔"
اس نے پوچھا۔" طمع دنیا کب پیدا ہوتی ہے؟"
انہوں نے کہا۔" جب علم گھٹ جائے۔"
اس نے عرض کیا۔" علم کب گھٹتا ہے؟"
انہوں نے کہا۔" جب درویش سوال کرے، شاعر غرض رکھے، دیوانہ ہوش مند ہو جائے، عالم تاجر بن جائے، دانش مند منافع کمائے تب علم گھٹ جاتا ہے۔"

علم بکاؤ چیز نہیں،

آج سے کئی سو سال پہلے شیخ ابوالعباسؒ بہت بڑے عالم گزرے ہیں۔ ایک دفعہ وہ ایک دکان پر اخروٹ خریدنے گئے۔ دکان دار نے اپنے ملازم سے کہا۔" اچھے اچھے اخروٹ چن کر دینا۔"
شیخ ابوالعباس نے دکان دار سے پوچھا۔" کوئی شخص اخروٹ خریدنے آتا ہے تو کیا تم اپنے ملازم کو ہمیشہ یہی حکم دیتے ہو کہ اچھے ۔۔۔ اچھے اخروٹ چن کر دینا؟"
دکان نے کہا۔" نہیں، یہ حکم تو میں نے اسے آپ کے علم کی وجہ سے دیا ہے۔"
شیخ ابوالعباسؒ نے یہ سن کر فرمایا۔
" بھائی میں چند اخروٹوں کے بدلے میں اپنا علم نہیں بیچ سکتا۔" یہ فرما کر وہ اخروٹ خریدے بغیر چلے گئے۔
مسرت الطاف احمد۔ کراچی

خالدہ جیلانی

شفق طاہر ———— گوجرہ

یہ دن یہ رات یہ لمحے مجھے اچھے۔۔ لگتے ہیں
تمہیں سوچوں تو سارے سلسلے اچھے۔ لگتے ہیں
بہت دور تک چلنا مگر پھر بھی وہیں رہنا
مجھے تم سے تمہی تک فاصلے اچھے۔ لگتے ہیں

ساجی عاصم ———— ٹنڈو آدم

گلی میں ٹوٹی ہوئی چوڑیاں دیکھی ہیں میں نے
ضرور کسی معصوم کی محبت پہ زوال آیا ہوگا

نوال افضل گھمن ———— گجرات

خود کو بکھرتے دیکھتے ہیں کچھ کر نہیں پاتے ہیں
پھر بھی لوگ خداؤں جیسی باتیں کرتے ہیں
اک ذرا سی جوت کے بل پر اندھیاروں سے بیر
پاگل دیے ہواؤں جیسی باتیں کرتے ہیں

عنا سلیم اعوان ———— آخون باندی ہری پور

چاند کی فصلیں تھیں اور مکان شیشے کا
میں نے خواب میں دیکھا تھا سائبان شیشے کا
کیسے بچا لیتی خود کو تیز سورج سے
موم سے بنی تھی میں اور مکان شیشے کا

کنزیٰ شاہین اعوان ———— آخون باندی

چند خوابوں کے عطا کر کے اجالے مجھ کو
کر دیا دنیا نے وقت کے حوالے مجھ کو
جن کو سورج میری چوکھٹ سے ملا کرتا تھا
اب وہ خیرات میں دیتے ہیں اجالے مجھ کو

ثمرہ، اقرأ ———— کراچی

خدا گواہ ہے بڑی مشکل سے ملتا ہے
وہ اک دل جو محبتیں نبھانے والا ہو

آسیہ جاوید ———— گجرات

عمر رفتہ پھر نہیں مسکراتی بچپن کی طرح
میں نے گڑیا بھی خریدی، جھولے بھی لے کر دیے

عاصمہ رمضان ———— سوک کلاں گجرات

حق خود اداوت بھی ہے حق بڑے بھی میرے پاس
مگر مجھے سچ کہنے کی اجازت نہیں ہے

اقرأ عروج ———— نیو پور

وہ اور وعدہ وفا کرے
تم بھی نا محسن کمال کرتے ہو

فارحہ اقبال ———— کراچی

خلقت شہر میں جس ہار کے چرچے ہیں
میں وہ بازی کبھی کھیلا بھی نہیں تھا شاید
ایک بادل کہ میرے نام سے منسوب ہوا
میرے صحرا میں تو برسا بھی نہیں تھا شاید

سدرہ سجاد ———— کراچی

بات یہ ہے کہ کوئی ٹوٹ کے چاہے تو سہی
ہر کسی سے تو محبت نہیں کی جا سکتی

ثمرہ قاضی ———— پتوکی

ٹوٹی منڈیر پہ چھوٹا سا اک دیا
طوفاں سے کہہ رہا ہے کہ آندھی چلا کے دیکھ

فریحہ شبیر ———— شاہ نکدر

پلکوں میں آنسو اور دل میں درد سویا ہے
ہنسنے والوں کو کیا پتا رونے والا کتنا رویا ہے
یہ تو بس وہی جان سکتا ہے میرے دوست
جس نے زندگی میں کسی کو پانے سے پہلے کھویا ہے

فوزیہ ثمر بٹ ———— گجرات

ہمیں بھی شوق نہیں ہے داستان سنانے کا
پوچھا تھا اس نے بھی حال ویسے ہی!
ذکر چل رہا تھا زمانے کی بے وفائی کا
آ گیا تمہارا خیال ویسے ہی

تبصیر نشاط

تیر بہ ہدف نسخہ) گزشتہ دنوں اداکارہ لیلیٰ نے اعلان کیا تھا کہ وہ اس مرتبہ انتخابات میں حصہ لے رہی ہیں۔ ایک معروف سیاست دان کی بہو کے انتخاب میں کامیاب ہونے کا دعوا تو وہ کر ہی چکی تھیں۔ لیکن اس سیاست دان نے جب لیلیٰ کے اس بیان کو سراسر جھوٹ قرار دیا تو انہوں نے انتخابات میں حصہ لینے کا اعلان کر دیا تاکہ خود کو سیاست کا اہل ثابت کر کے اس سیاست دان کو پچھتانے پر مجبور کر دیں کہ ہائے! کیسا ہیرا ہاتھ سے گنوا دیا۔

تاہم یہ اعلان کرتے وقت لیلیٰ غالباً" یہ بھول گئی تھیں کہ انتخابات میں حصہ لینے کے لیے کچھ تعلیم یافتہ ہونا بھی ضروری ہوتا ہے۔ ان کے بیان کے بعد شاید ان کے کسی بہی خواہ نے ان کی توجہ اس طرف دلا دی ہو۔ تب ہی اس بیان کے بعد لیلیٰ نے چپ سادھ لی۔ پھر سب کے کاغذات نامزدگی جمع ہونے کے مرحلے کے اختتام کے بعد انہوں نے یہ چپ توڑی اور ایک نیا بیان داغ دیا کہ وہ کاغذات نامزدگی تو داخل نہیں کرا سکیں۔ تاہم اب وہ خواتین کی مخصوص نشستوں میں سے ایک نشست اپنے نام کرانے کا ارادہ رکھتی ہیں۔

(سیاست میں حصہ لینے کا اعلان انہوں نے اس سیاست دان کو نیچا دکھانے کے لیے کیا۔ جس نے انہیں اپنی بہو نہیں بنایا تھا یا میرا کی والدہ محترمہ کے مقابلے پر کیا۔۔۔۔ ہو سکتا ہے ہماری بعض خواتین سیاست دانوں کے ملبوسات، میک اپ و زیورات اور فیشن آئی کون کا خطاب پانے سے متاثر ہو کر کیا ہو، یہ تو

انتظار

مرزا غالب نے کہا تھا:

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا

مگر جناب! ہماری اداکارائیں مرزا غالب کے اس بیان سے بالکل بھی متفق نہیں ہیں۔ جب ہی تو وہ مشکل سے مشکل تر اور پیچیدہ تر سے پیچیدہ ترین کام کرنے کا یوں اعلان کرتی ہیں۔ گویا یہ ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہو۔ اداکارہ لیلیٰ اداکاری کے میدان میں تو ناکام رہیں، تاہم "وکھری ٹائپ" کے بیان دینے میں اپنا ثانی نہیں رکھتیں۔ (میڈیا کی توجہ حاصل کرنے کا

لیلیٰ ہی جانیں۔ ہم تو ان کے ایک بیان کے بعد دوسرا بیان آنے کا انتظار ہی کرسکتے ہیں۔)

بالآخر

ٹی وی کمرشل ماڈلنگ سے شوبز میں قدم رکھنے والی خوشبو کا کمرشل اتنا ہٹ ہوا کہ وہ کمرشل سے براہ راست فلموں کی طرف چلی گئیں۔ تاہم ان کا کمرشل جتنا ہٹ ہوا تھا۔ فلموں میں وہ خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ کرسکیں۔ ہاں! فلموں میں کام کرنے کا انہیں اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ وہاں انہیں ارباز خان کی صورت میں اپنا شریک حیات مل گیا۔

ارباز سے شادی ہونے کے بعد ایک عام خیال یہ تھا کہ شاید اب خوشبو اداکاری سے کنارہ کشی اختیار کرلیں۔ مگر جناب! کوئی خوشبو کو بھی قید کرسکا ہے بھلا۔ سو وہ فلموں میں بدستور کام کرتی رہیں۔ بچوں کی پیدائش کے بعد خوشبو کے وزن میں بے تحاشا اضافہ ہوگیا۔ لوگوں نے ایک بار پھر سوچا کہ شاید اب.... مگر نہ جی.... خوشبو فلموں میں کام کرتی ہی رہیں۔ پھر فلمی صنعت پر زوال آگیا۔ (وہ تو آنا ہی تھا' جب.....)

تاہم پھر بھی خوشبو نے فن سے اپنا ناتا نہ توڑا اور وہ اسٹیج کی طرف چلی گئیں۔ تب سے اب تک وہ اسٹیج ہی سے وابستہ ہیں۔ (اسٹیج اتنے مضبوط ہیں کیا؟)

لیکن جناب! اب خبر آئی ہے کہ بالآخر خوشبو فن کی دنیا کو خیرباد کہہ ہی رہی ہیں۔ کیونکہ ان کے بچے اب بڑے ہو رہے ہیں۔ لہٰذا ارباز خان کو ان کے اسٹیج پر رقص کرنے پر اعتراض ہونے لگا تھا۔ (بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے) خوشبو شوبز سے کنارہ کشی کے بعد دیگر اداکاراؤں کی طرح بیوٹی پارلر کھولنے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ (وہی بات کہ خوشبو کو کون قید کرسکا ہے بھلا۔)

یہ ادا' یہ ناز' یہ انداز.....

شاعروں کو محبوب کے ناز' انداز اور ادائیں بہت بھاتی ہیں۔ بلکہ ان کے نزدیک محبوب کا تصور ناز نخروں کے بغیر ادھورا ہی ہے۔ یہ بات اکثر خواتین نے کچھ ایسے پلے باندھی ہے کہ انہوں نے اسے اپنی شخصیت کا لازمی حصہ ہی بنالیا ہے۔ خاص طور پر ہماری فنکاراؤں نے تو ناز و انداز کو ایسا اوڑھنا بچھونا بنایا ہے کہ وہ یہ تک بھول بیٹھی ہیں کہ کج ادائیاں کچی عمر ہی میں سجتی ہیں۔ عمر زیادہ ہوجائے تو لوگ آپ سے وقار و متانت کی توقع رکھتے ہیں۔

ثمینہ احمد ہماری خاصی سینئر اداکارہ ہیں۔ اتنی سینئر کہ ان کو پسند کرنے والوں کے اب بچوں کے بھی بچے ہوچکے ہیں۔ گزشتہ سال ایک معروف نجی چینل نے انہیں اپنے ایک سیریل میں کام کرنے کی پیش کش کی۔ ثمینہ نے ہامی بھرلی۔ تاہم معاوضے کے علاوہ لاہور سے کراچی آنے جانے کا ٹکٹ بھی طلب کیا۔ چینل والوں نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ سو انہیں معاوضہ اور ٹکٹ ایڈوانس میں بھیج دیا گیا۔ ثمینہ کو پہلے دن بارہ بجے شوٹ پر آنا تھا۔ وہ دو بجے تشریف لائیں اور لوگوں سے ملنے ملانے اور خوش گپیوں میں مصروف ہوگئیں۔ اسسٹنٹ ڈائریکٹر نے ریکارڈنگ شروع کرنے کی درخواستیں کیں تو آخر کار میک اپ روم میں چلی ہی گئیں۔ وہاں پہنچ کر اسکرپٹ مانگا کہ میں اپنا سین دیکھ لوں۔ اسکرپٹ ملا تو دیکھتے ہی چراغ پا ہوگئیں کہ "اسکرپٹ کمپوز کیوں نہیں ہے؟ میں یہ اسکرپٹ نہیں پڑھ سکتی۔" اسکرپٹ پٹخا اور واپس چلی گئیں۔

(اسکرپٹ کسی ڈاکٹر سے لکھوالیا تھا کیا؟ ویسے ثمینہ جی اداکارہ ہیں۔ ٹیچر تو ہیں نہیں کہ ہر طرح کی لکھائی پڑھ لیتیں۔) اگلے دن انہیں کمپوزڈ اسکرپٹ مہیا کردیا گیا۔ ثمینہ نے میک اپ کرالیا تو تبدیل کرنے کے لیے لباس مانگا۔ انچارج نے کہا کہ "لباس تو آپ کو ہی لانا تھا۔" ثمینہ بولیں۔

"یہ غریب عورت کا کردار ہے۔ میرے پاس ایسے کپڑے نہیں ہیں۔ میں تو ٹراؤزر' جینز اور شرٹس پہنتی ہوں۔" (لندن پلٹ ہیں کیا؟) سو اس دن بھی ریکارڈنگ کرائے بغیر چلی گئیں۔

کپڑوں کا انتظام کرکے اگلے دن انہیں بلایا گیا۔ اس دن ثمینہ نے تیز میک اپ تھوپ لیا۔ اسسٹنٹ ڈائریکٹر نے توجہ دلائی کہ "غریب عورت اتنا تیز میک اپ نہیں کرتی۔" تو ثمینہ نے اسے ڈانٹ دیا کہ "میں تم سے زیادہ سینئر ہوں۔ مجھے علم ہے کہ کس کردار کے لیے کس طرح کا میک اپ مناسب ہے۔" وہ بے چارہ خاموش ہوگیا۔ تاہم جب ڈائریکٹر نے ریکارڈنگ دیکھی تو انہوں نے محسوس کیا کہ ثمینہ ایک غریب عورت کے بجائے بنی سنوری خاتون لگ رہی ہیں۔ ڈائریکٹر کو اپنے سیریل میں حقیقت کا رنگ بھرنا تھا۔ لہٰذا وہ ساری ریکارڈنگ ضائع ہوگئی۔ سارے سین دوبارہ شوٹ ہوئے۔

کچھ دن خیر و عافیت سے گزرے ہی تھے کہ ثمینہ نے اپنے بالوں کا رنگ تبدیل کرلیا۔ جب ان کی توجہ دلائی گئی تو کہنے لگیں کہ "کل ڈائی کرکے آجاؤں گی۔" اگلے کئی دنوں تک ثمینہ کا انتظار کرکرکے شوٹنگ ملتوی ہوتی رہی۔ یوں خاصا نقصان اٹھانا پڑا۔

کچھ دن بعد ثمینہ شریف لائیں تو ساتھ دو ہزار کا بل بھی تھا۔ جو انہوں نے بال ڈائی کرانے کی مد میں خرچ کیے تھے۔ سیریل کی خاصی ریکارڈنگ ہوچکی تھی۔ لہٰذا ثمینہ کو اس مرحلے پر الگ بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ سو "مرتا کیا نہ کرتا" کے مصداق یہ بل بھی چینل والوں ہی کو ادا کرنا پڑا۔

(اف! اتنے نخرے تو کوئی شوہر اپنی نئی نویلی بیوی کے بھی برداشت نہیں کرتا۔ آپ کی ہمت کو سلام ہے چینل والو!)

کچھ ادھر ادھر سے

☆ اپنے نو سالہ عہد حکمرانی میں سرکش اور خود پرست ڈکٹیٹر مشرف نے ملک کو عالمی اوباشوں کے قدموں میں ڈال دیا۔ "سب سے پہلے پاکستان" کا پرفریب نعرہ لگاتے ہوئے اس نے اپنی بندرگاہیں' اپنے ہوائی اڈے' اپنی فضائیں' اپنی دفاعی تنصیبات اور اپنی انٹیلی جنس سب امریکا کی جھولی میں ڈال دیا۔ وہ جب تک پاکستان میں رہا' ایک بے حمیت امریکی ایجنٹ کا کردار کرتا رہا۔

(عرفان صدیقی۔ نقش خیال)

☆ نواز شریف یا کوئی دوسرا وزیراعظم آگیا تو ڈرون کی پالیسی تبدیل ہونے کا امکان ہے۔ نواز شریف وزیراعظم بن گئے تو امریکا کو مذاکرات کرنا ہوں گے اور امریکا کو مشکل کا سامنا ہوگا۔

(امریکی تھنک ٹینک کے ماہرین کی رپورٹ)

خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع - 37 - اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
shuaamonthly@yahoo.com

آپ کے خط اور ان کے جوابات لیے حاضر ہیں۔
اللہ تعالیٰ سے آپ کی عافیت، سلامتی اور خوشیوں کے لیے دعائیں۔
اللہ تعالیٰ آپ کو ہم کو اور ہمارے پیارے وطن کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ (آمین)

پہلا خط کوٹ مومن سے نیلم شہزادی کا ہے، لکھتی ہیں

ٹائٹل پہ نظر پڑی.... اور ہم دل تھام کے رہ گئے، اتنے پیارے پھول۔ جویا کی صحت یابی کے لیے دعائیں کر کر کے.... مگر؟ انتظار لاحاصل رہا۔ جی ٹھیک سمجھے۔ ہم "دیوار شب" کے لیے آہ و زاری کر رہے ہیں۔
سید کی تحریر "حرف سادہ کو عنایت ہوا اعجاز کا رنگ" شائع کریں۔ ساریہ چوہدری کا انتخاب بھی اچھا لگا۔ ہائے.... رخسانہ جی آپ نے عاصمہ کو تپتے صحرا میں لا کھڑا کیا ہے۔ آپ کا تو ہر ناول ہی بہت دلچسپ ہوتا ہے۔ شاہ جہاں گل کی طرح ہمیں بھی سعدیٰ حمید کی غیر حاضری بہت گراں گزر رہی ہے۔ کنیز نبوی صاحبہ جی آپ کی تعریف کیا کروں اپنے جذبات کیسے بیان کروں؟ میرا بہت دل چاہتا ہے کہ "شعاع کے ساتھ" میں شرکت کروں۔

ج پیاری نیلم! طویل غیر حاضری کے بعد آپ کی آمد بہت اچھی لگی۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہ دل سے شکریہ۔ نیلم! عنیزہ سید کے جس ناول کی آپ نے فرمائش کی ہے اس کی اشاعت کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ ہماری بہت سی قارئین کو یہ ناول ابھی یاد ہوگا۔ کچھ عرصہ اور گزر جانے دیں، پھر آپ کی درخواست پر غور کریں گے۔ فی الحال آپ عنیزہ کا نیا ناول پڑھیں جو اس شمارے میں شامل ہے۔

انعم ملک نے گڑھا موڑ وہاڑی سے لکھا ہے

نمرہ آپی کی "جنت کے پتے" بہت زبردست کہانی ہے۔ کہانی کی بُنت بہت خوب صورت ہے۔ مجھے یقین ہے کہ نمرہ آپی یقیناً "حیا سلمان" کی طرح خوب صورت ہوں گی۔ رخسانہ نگار عدنان کی تعریف کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ رخسانہ آپی جب بھی قلم اٹھاتی ہیں حق ادا کر دیتی ہیں۔ "ایک تھی مثال" ان میں سے ایک ہے۔ محترمہ انیسہ سلیم کہاں غائب ہیں؟ پلیز انیسہ آپی زید اور عظمیٰ کے ساتھ واپس آجائیں۔ سائرہ رضا ایک بہت اچھا اضافہ ہیں۔ بہت اچھا لکھتی ہیں۔ اب تک یہ کہاں تھیں؟ تنزیلہ ریاض سے مرگ برگ جیسا ناول لکھوائیں۔ اور نئی رائٹرز زیادہ مت شامل کیا کریں اور آخر میں میری سب سے ضروری فرمائش، اور حسب حال کے اینکر جنید سلیم کا انٹرویو ضرور، ضرور، ضرور شائع کریں۔

ج پیاری انعم! شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔ انیسہ سلیم نے کافی عرصہ سے نہیں لکھا، ہم بھی ان کی تحریر کے منتظر ہیں۔ تنزیلہ ریاض تو شادی کے بعد جیسے ہمیں بھول ہی گئی ہیں۔ ہر بار وعدہ کرتی ہیں لیکن وہ وعدہ ہی کیا جو ایفا ہو گیا۔ نمرہ احمد کو تو ہم نے نہیں دیکھا، لیکن یہ ہمیں بھی یقین ہے کہ وہ حیا سلیمان کی طرح خوب صورت ہوں گی۔

حیا اور خوب صورتی تو لازم و ملزوم ہیں۔ جنید سلیم کے انٹرویو کی فرمائش شاہین رشید تک پہنچا رہے ہیں۔

راحیلہ نواز اعوان گاؤں قاضیاں ہری پور ہزارہ سے تشریف لائی ہیں، لکھا ہے

شعاع کی تمام نظمیں، غزلیں اور اسٹوری بہت اچھی ہوتی ہیں۔ نمرہ احمد کا ناول "جنت کے پتے" زبردست، آؤٹ کلاس، واؤ، جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ اس دفعہ کا ٹائٹل بہت اچھا لگا۔ ماڈل گرل کا میک اپ بہت پسند آیا۔

ج راحیلہ شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہ دل سے شکریہ۔

اسما مشتاق خانقاہ ڈوگراں سے لکھا ہے

"دیوار شب" کی قسط نہ پا کر سچ مچ سنسناہٹ سی سارے جسم میں پھیلی۔ "ایک تھی مثال" میں عاصمہ اور اس کے بچوں کا جو حال ہے۔ اگر کوئی چور، ڈاکو یا قاتل دل سے پڑھے تو وہ ضرور توبہ کرے گا، کیونکہ یہ کہانی نہیں، یہ بالکل حقیقت ہے۔

اپنی لکھاری بہنوں سے گزارش کرتی ہے کہ عقیدہ توحید پہ بھی مفصل لکھیں کہ جو لوگ مزاروں پر منتیں مانگنے جاتے ہیں وہ بھی اس کے ذریعے صراط مستقیم پر چلیں، کیونکہ جس طرح ہم نے بڑوں کا ادب اور حالات کے مطابق اولاد کا کہنا ماننا، ان رسالوں سے سیکھا ہے آخرت بھی ان ہی کے وسیلے سے سنوار لیں تو مصنفین کو اس کا اجر مل جائے گا۔ جیسے صائمہ اکرم چوہدری ایک ان پڑھ مائی جمیلہ کے اللہ کے بارے میں خیالات بیان کر رہی ہیں۔ بڑے بڑے عالم بھی شاید اس طرح نہ ڈریں، کیونکہ وہ تو ایک لفظ بھی منہ سے نکالنے سے پہلے سوچتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ناراض نہ ہو جائیں، کوئی بڑا کلمہ نہ منہ سے نکل جائے۔ مکمل ناول بھی سبق دیتا ہوا نظر آیا۔ افسانے بھی سب اپنی جگہ اچھے تھے۔ "ذرا سی" سب سے اچھا لگا۔ راشدہ رفعت کی کاوش بہت اچھی تھی۔

ج پیاری اسما! "دیوار شب" کی قسط نہ پا کر ہماری بہت سی قارئین کو کوفت ہوئی۔ ہم اپنی قارئین سے معذرت خواہ ہیں۔ اس ماہ قسط شامل ہے۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ قبول کریں۔ ہماری کوشش یہی ہوتی ہے کہ شعاع کے ذریعے تفریح کے ساتھ ساتھ زندگی کی مثبت قدروں کی طرف بھی رہنمائی کی جائے۔ اگر ہماری قارئین اس سے کچھ سیکھتی ہیں تو یہ ہماری خوش نصیبی اور کامیابی ہے۔

کراچی سے انعم علی لکھتی ہیں

صائمہ اکرم کا "دیمک زدہ محبت" بہت اچھا جا رہا ہے۔ "ایک تھی مثال" بھی انٹرسٹنگ ہے۔ مثال کا اب تک کردار کچھ جان دار نہیں ہے۔ لیکن رخسانہ جی آپ فیورٹ ہیں۔ نمرہ احمد کے ہر ناول کی طرح "جنت کے پتے" نے بھی کمال کر دیا۔ باقی سلسلوں میں شرکت کا کیا طریقہ کار ہے مثلاً "شعاع کے ساتھ ساتھ" "شاعری سچ بولتی ہے" وغیرہ میں؟ شعاع بے شک دور جدید کا منفرد اور بہترین ڈائجسٹ ہے۔

ج انعم! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ شعاع کے کسی بھی سلسلے میں شرکت کرنے کا طریقہ وہی ہے جس طرح آپ نے خط لکھا ہے۔ خط کے ساتھ آپ ہر سلسلے کے لیے ایک ہی لفافہ میں انتخاب بھجوا سکتی ہیں۔ ہر سلسلے لیے علیحدہ علیحدہ صفحہ پر لکھیں۔

میمونہ ریاض نے گوجرانوالہ سے لکھا ہے

پہلے دنوں ہم دونوں بہنیں کہانیوں کے سحر سے نہیں نکلتی تھیں۔ برتن دھوتے، صفائی کرتے، کھانا پکاتے، صرف کہانیوں کو ڈسکس کرتے، مگر ہائے یہ بے رحم وقت، سب بدل گیا میرے بابل کے آنگن کی دونوں چڑیاں اڑ گئیں اور اپنی اپنی زندگی میں مصروف ہو گئیں۔ اب نہ اسے گھر اور بچوں سے فرصت ہے اور نہ مجھے کہ پہروں بیٹھ کر کہانیوں پر تبصرے کریں۔ اب تو وہ سحر طاری ہی نہیں ہوتا دل جانے کیوں بدل گیا ہے۔ سب رنگ کھو گئے ہیں۔ اگرچہ سب بہت چاہت کرتے ہیں، مگر پہلے جیسا دل نہیں ہے۔
اب بھی اتنی مصروف زندگی میں بھی انتظار رہتا ہے۔ شعاع، خواتین آتے اور دو دن میں ختم، مگر تبصرے ختم ہو گئے ہیں۔ شعاع اور خواتین کو پڑھتے ہوئے تقریباً پندرہ سال کا عرصہ تو بیت چکا ہے۔ مگر خط لکھنے کی سستی اگر کبھی لکھا تو پوسٹ کرنے کی سستی۔

ج پیاری میمونہ! زندگی کا حسن اور خوب صورتی یہی ہے

کہ یہ ہر پل آگے بڑھتی رہتی ہے۔ پرانے رشتے قائم رہتے ہیں۔ نئے لوگ بھی آکر اس میں رنگ بھرتے ہیں۔ نئے رشتے بنتے ہیں تو مصروفیتیں بڑھ جاتی ہیں۔ پرانے رشتے دور رہ جاتے ہیں۔ کچھ وقت گزرے گا۔ آپ شعاع اور خواتین پڑھ کر اپنی بیٹی کے ساتھ کہانیوں پر تبصرہ کریں گی۔ یہ جوش و خروش پھر لوٹ آئے گا۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہ دل سے شکریہ۔ اب سستی کو خیرباد کہہ کر ہر ماہ ہمیں اپنی رائے سے آگاہ کیجیے گا۔

تنزیل زہرہ نے شہدادپور سے شرکت کی، لکھتی ہیں

سرورق نے دل پر خوشگوار تاثر چھوڑا۔ عادت کے مطابق پہلے انٹرویوز پڑھے۔

عفت جی کا مکمل ناول "زندگی خاک نہ تھی" بھی اچھا رہا۔ کومل کے ایثار نے اسے روشنیوں کے شہر کا حصہ بنا دیا۔ "جنت کے پتے" اس بار بھی عمدہ رہی۔ جہان کی سرجری بھی کامیابی سے ہوگئی۔ اب نہ جانے نمرہ جی کون سا دھما کا کرنے والی ہیں۔ لیکن خیر ہے، ہمارے دماغ کی چولیں اب مضبوط ہوگئی ہیں۔ "ایک تھی مثال" خوب صورتی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ بالآخر زاہدہ بیگم اور ظہیر اپنے خول سے باہر نکل آئے۔ عاصمہ کے ساتھ بہت برا ہوا۔ واثق کی سمجھ داری نے متاثر کردیا۔ افسانے تمام کے تمام اچھے رہے۔ "بابا کی رانی" نے دکھی کردیا۔ عالیہ جی! ہم نے آپ کو بہت مس کیا اور کنیز نبوی جی! ہم نے تو آپ سے ناول کی فرمائش کی تھی۔ آپ نے تو ہمیں اپنے افسانوں سے بھی محروم کردیا۔ پلیز اپنی مصروف زندگی کا تھوڑا سا وقت ہمارے نام بھی کردیجیے۔

ج پیاری تنزیل! کنیز نبوی تک آپ کا پیغام پہنچا رہے ہیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہ دل سے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جارہی ہے۔

ارم احمد لاوہ سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے

اپریل کا شمارہ مجھے اتنی جلدی مل گیا کہ مجھے خود یقین نہ آیا۔ سب سے پہلے "جنت کے پتے" کی تلاش میں دوڑ لگائی۔ بہت ہی شان دار قسط تھی۔ جہان کے برجستہ جملے اور حیا کا ردعمل دیکھ کر بہت مزا آیا۔ دونوں ہی ہار ماننے سے انکاری اور اچھے بچوں کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ محبت کیے جارہے ہیں۔ "ایک تھی مثال" میں عاصمہ کے ساتھ ہونے والا حادثہ بے حد دکھی کر گیا۔ مجھے اندازہ تو تھا کہ کوئی انہونی ہونے والی ہے، مگر تیسری ہی قسط میں عاصمہ کا بیوہ ہوجانا بہت دکھ دے گیا۔ "دیمک زدہ محبت" ایک بہت ہی فلمی کہانی ہے۔ معذرت کے ساتھ، حقیقت سے کافی دور لگتا ہے یہ ناولٹ مجھے۔ راشدہ رفعت نے بہت اچھا لکھا۔ مگر یہاں بھی بے تحاشا حسن کے قصیدے تھے۔ ہیرو اور ہیروئن عام لوگ نہیں ہوسکتے؟ بہت ہی دیومالائی حسن اور بے تحاشا دولت ہی آج کل کی کہانیوں کا موضوع کیوں ہے؟

ج پیاری ارم! شعاع میں جو کہانیاں شائع ہوتی ہیں۔ ان میں ہر کہانی میں ہیرو، ہیروئن حسن کا مجسمہ نہیں ہوتے۔ بیشتر کہانیوں میں عام سی شکل و صورت کے لوگ ہوتے ہیں۔ صائمہ اکرم کی کہانی میں بھی سب کردار حسن کا مجسمہ نہیں ہیں۔ رخسانہ نگار کا ناول ابھی تعارف کے مراحل میں ہے۔ کہانی آگے چل کر واضح ہوگی تو مثال کا ذکر بھی آئے گا۔ عاصمہ احمد علی نئی مصنفہ ہیں۔ ان کا افسانہ "بابا کی رانی" واقعی بہت اچھا تھا۔ ہمیں بھی بے حد پسند آیا۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

اقراء عروج فتح پور ضلع لیہ سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے

السلام علیکم! ٹائٹل خوب صورت تھا۔ ٹائٹل دیکھ کر ایسا لگا جیسے ڈائجسٹ پر بھی بہار آگئی۔ "جنت کے پتے" بڑا زبردست جارہا ہے۔ "دیمک زدہ محبت" بہت ہی اچھا ناولٹ ہے۔ خاص کر اس کے دو کردار تو بہت ہی خاص لگے۔ "نرالی بی" افسانے نے تو دھوم مچادی۔ مالا نام کی طرح ہی تھیں۔ اتنی سی بات، بابا کی رانی بھی اچھی تھیں۔ "زندگی خاک نہ تھی" بس ٹھیک ہی تھا۔ مگر فیصلے بڑے اچھے کیے سب نے۔ حمزہ، تاشی، پھوپھی اماں، روحان۔ ڈائجسٹ پورے کا پورا بڑا پیارا تھا۔ مگر اگلی بار ماڈل پورے لباس کے ساتھ ٹائٹل پر ہو، صرف خالی چہرہ نہ ہو۔

ج پیاری اقرا! شعاع کی پسندیدگی کا شکریہ، اس بار ماڈل ہم نے لباس کے ساتھ دی ہے۔ امید ہے کہ آپ کو پسند آئے گی۔

فوزیہ سلطانہ نے تونسہ شریف سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

عموماً" کہا جاتا ہے، کہانی کی ہیروئن میں دراصل رائٹر خود بھی ہوتی ہیں۔ مگر نمرہ جی! آپ تو ہمیں جہان سکندر میں نظر آتی ہیں۔ آپ کی تاریخ اتنی زبردست ہے۔ ارم کی چالاکی پڑھ کر حیرت، دکھ اور غصے کے ملے جلے تاثر سے دوچار ہوگئے۔ ہم نے کہانی بھیجی تھی "سہارا" اس کے بارے میں بھی مطلع کیجیے۔

ج فوزیہ! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ آپ کی کہانی ابھی پڑھی نہیں گئی۔ اس لیے کچھ بتانے سے قاصر ہیں۔

لاہور سے صبا رانا نے لکھا ہے

یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ میری کہانی شامل نہیں کی گئی۔ آپ کہیں گی کہ کہانی اچھی نہیں تھی، مگر کیوں بھئی؟ آپ وہ کہانیاں بھی تو شائع کرتے ہیں جن پر قارئین اپنے کمنٹس دیتے ہیں کہ بالکل اچھی نہیں لگی۔ مزا نہیں آیا۔ آپ نے تو اچھا کرکے چھاپا تو اب یہ ضروری تو نہیں جو آپ کو قابل اشاعت نہ لگے وہ قارئین بھی پسند نہ کریں۔ پڑھنے والوں کی رائے اہم ہے۔

ج پیاری صبا! کہانیوں کا انتخاب اور ان کے قابل اشاعت یا ناقابل ہونے کا فیصلہ کرنا ہماری ذمہ داری ہے۔ جسے ہم پوری دیانت داری سے سب انجام دیتے ہیں۔ قارئین کو ہمارا انتخاب پسند آتا ہے اور وہ ہمارے انتخاب سے مطمئن ہیں۔ ہم پر اعتماد کرتی ہیں۔ تب ہی میگزین خریدتی ہیں پڑھتی ہیں اور پسند کرتی ہیں۔ اب جس تحریر سے خود ہی مطمئن نہیں، ہم اسے کیسے شائع کرسکتے ہیں۔ آپ کی کہانی میرا گھر، میرا سائیں قابل اشاعت نہیں، آپ میں صلاحیت ہے۔ تھوڑی محنت کریں۔ ان شاء اللہ کامیابی ہوگی۔

مسرت الطاف احمد نے کراچی سے لکھا ہے

اس بار شعاع کی فہرست پر نظر پڑی تو چار، چار ناولٹ اور دو مکمل ناول دیکھ کر دل جھوم اٹھا۔ "دیوار شب" کو نہ پاکر مایوسی تو ہوئی۔ پر۔ خیر ہے۔ آسیہ رزاقی کا ناولٹ موضوع شان دار تھا۔ حقیقت کے قریب تر محسوس ہوا انور کا کردار بہت کمزور اور بزدل دکھایا گیا۔ البتہ اختر کا اسٹرونگ کردار پسند آیا۔ "دیمک زدہ محبت" کی دوسری قسط بھی بہت اثر انگیز تھی۔ "یہ پاگل دل میرا" فرحانہ جی نے تو کمال کردیا۔ ہلکی پھلکی سوفٹ سی اسٹوری پڑھ کر میرا دل اندر تک خوش ہوگیا۔ افسانے بھی سب ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ "پت جھڑ کے بعد" بہت ہی متاثر کن تحریر تھی۔ خاص طور پر طرز تحریر دل میں اترتا ہوا محسوس ہوا۔ نرالی بی زبردست تحریر تھی البتہ اینڈ سمجھ میں نہیں آیا۔ مالا کا احمر کے لیے رونا.... اتنا سب کچھ دیکھنے اور سننے کے بعد بھی۔ کیا مالا کے ماموں کے بیٹے کا نام بھی احمر ہی تھا۔ اس کی وضاحت نہیں کی گئی۔ اپریل کا شمارہ "اے ون" تھا۔ مکمل ناول، ناولٹ، ہر سلسلہ قابل تعریف تھا۔ ڈیر آپی آپ سے ایک ریکویسٹ ہے نبیلہ عزیز سے پلیز صرف ایک مکمل ناول لکھوائیں۔ ڈیر آپی مئی میں میرا برتھ ڈے ہے۔ اگر ہوسکے تو مجھے وش کردیں، مجھے بہت خوشی ہوگی۔

ج پیاری مسرت! سب سے پہلے تو سالگرہ کی مبارک باد۔ اللہ تعالیٰ آپ کی زندگی کا ہر پل خوشیوں سے بھردے۔ (آمین) مالا کے ماموں کے بیٹے کا نام احمد تھا۔ سہوا" احمر شائع ہوگیا۔ اس لیے آپ کو اینڈ سمجھنے میں دشواری ہوئی۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہ دل سے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف و تنقید ان سطور کے ذریعے پہنچائی جارہی ہے۔

مہوش شبیر لکھتی ہیں

خواتین اور شعاع دونوں کو میں نے ایک ساتھ پڑھنا شروع کیا۔ میرا سب سے پسندیدہ ناول "جنت کے پتے" ہے۔ نمرہ احمد بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ لیکن ایک شکایت ہے کہ قسط کے آخر میں لکھا ہوتا ہے کہ "آئندہ ماہ آخری قسط" لیکن پھر اگلے ماہ آخری نہیں ہوتی۔ "دیوار شب" کو نہ پاکر بہت دکھ ہوا۔ "ایک تھی مثال" بس ایسے ہی ہے ناولٹ میں۔ "دیمک زدہ محبت" بہت اچھا لگا اور فرحانہ ناز ملک نے "یہ دل یہ پاگل" کا اینڈ بہت اچھا کیا۔ افسانوں میں "پت جھڑ" کی تو سمجھ ہی نہیں آئی۔ "بابا کی رانی" بہت اچھا لگا، رونا آگیا، سسرال میں لڑکی کا سارا مان اس کا میکہ ہوتا ہے۔ سلسلوں میں "بندھن" بہت پسند ہے۔ "شعاع کے ساتھ ساتھ" پسند ہے۔ مجھے نہیں

معلوم کہ کس طرح اس سلسلے میں شرکت کی جاتی ہے۔

ج مہوش! شعاع اور خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ شعاع کے ساتھ ساتھ میں شرکت کرنے کے لیے آپ خط والے لفافہ میں ہی اپنا تعارف علیحدہ کاغذ پر لکھ کر ڈال دیں۔

آخری قسط لکھنے کے باوجود آخری نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مصنف کا ارادہ ہوتا ہے کہ وہ ایک قسط میں تمام واقعات اور کہانی کو سمیٹ کر اختتام کردیں گی۔ لیکن لکھتے ہوئے اور کہانی کے تمام کرداروں کے ساتھ انصاف کرتے ہوئے کہانی کے صفحات اتنے زیادہ ہوجاتے ہیں کہ ایک ہی قسط میں شائع ہونا ممکن نہیں ہوتا۔ تب مجبوراً" اختتام اگلے ماہ پر چلا جاتا ہے۔

فوزیہ ثمروٹ اور طیبہ عمران نے گجرات سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

اپریل کا ٹائٹل خوب صورت لگ رہا تھا، کیا ہی اچھا ہوتا ہے اگر ماڈل کے ہاتھوں میں بھی سفید گلاب ہوتے۔ سب سے پہلے اپنا فیورٹ ناول "دیمک زدہ محبت" پڑھا۔ صائمہ اکرم ایک طرف تو بے تحاشا حسن کی تعریف لکھتی ہیں۔ ماہم اور رامس کی صورت اور دوسری جانب سکینہ کی بدصورتی دکھاتی ہیں۔ اب اور نیا کردار ثنائلہ کی صورت۔ کیا ثنائلہ کو سکندر شاہ رامس کی صورت نظر آیا ہے۔ مجھے ماہم کا موحد سے پیچھے ہٹنا اچھا نہیں لگا۔ کیا محبت صرف ظاہری صورت سے ہوتی ہے اور ہاں کیا صائمہ اکرم سکینہ کو ڈاکٹر خاور سے ملادیں گی۔ ویسے یہ ایک معجزہ ہی ہوسکتا ہے۔ بہرحال کہانی بہت دلچسپ ہے۔ "اتنی سی بات" پڑھ کر مزا آگیا۔ آسیہ رزاقی کی تحریر ہو اور اس میں علم و فہم و ذہانت نہ ہو ایسا ممکن ہی نہیں۔ کتنے بڑے مسئلے کو انہوں نے ایک چھوٹے سے کوزے میں بند کردیا۔

خوب صورت بھی ہوسکتی ہے۔ افسانوں میں "بابا کی رانی" عاصمہ رانی آپ کی ککی تو تھوڑا ہی روئی ہوگی۔ مگر ککی کی ہر ہر سطر پر میں نے بے تحاشا آنسو بہائے ہیں

مکمل ناول "ایک تھی مثال" معذرت کے ساتھ۔ رخسانہ جی یہ تحریر آپ کی نہیں لگتی، پتا نہیں کیوں تھوڑا تھوڑا بورنگ لگ رہا ہے۔ کیا کہانی دوسری نسل مطلب مثال سے شروع ہوگی۔ بہرحال میں نے اس بار نہیں پڑھی اور ہاں شعاع کا موسٹ فیورٹ ناول "جنت کے پتے" اپنے آخری مرحلے میں ہے۔ معذرت کے ساتھ میں نے شروع سے اس ناول کو پڑھا ہے۔ پتا نہیں کچھ خاص نہیں لگا۔ پتا نہیں کیوں خلقت اتنی تعریف کررہی ہے۔ "بند حسن" میں اگر آپ فواد خان کا فیملی انٹرویو کرتے اچھا لگتا۔ شاعری میں سارہ یہ چوہدری نمبرون رہی۔ بلھے شاہ کا کلام میرا فیورٹ ہے۔ شعاع کے ساتھ۔ مجھے ثانیہ کا طرز بیان پسند آیا۔

ثمینہ صائم سے پوچھنا تھا۔ 23 سال ہوگئے ہیں آپ کو ڈائجسٹ پڑھتے ہوئے، ایک ناول تھا "اک داغ ندامت" جس میں ہیرو، ہیروئن کو اغوا کرتا ہے۔ بوجہ مجبوری عشق کے۔ مجھے یہ پتا کرنا ہے یہ ناول کس ڈائجسٹ اور کس سن میں شائع ہوا تھا۔

ج فوزیہ اور طیبہ! تفصیلی تبصرے کے لیے بہت شکریہ۔ آپ کی تعریف اور تنقید متعلقہ مصنفین تک پہنچائی جارہی ہے۔ "شاعری سچ بولتی ہے" میں ڈاکٹر خوشنود کا کلام بلھے شاہ کے نام سے شائع ہوگیا ہماری ایک قاری بہن نے اس کی تصحیح کی ہے۔ "ایک داغ ندامت" عمیرہ احمد کا ناول تھا جو اپریل 99ء میں شعاع میں شائع ہوا تھا۔

سرورق کی شخصیت

ماڈل	فرینہ
فوٹوگرافر	موسیٰ رضا
میک اپ	روز بیوٹی پارلر

سلطان محمد فاتح کا عظیم تاریخی فیصلہ

مسلمانوں کی تاریخ میں ترکی کو اپنے ثقافتی اور سیاسی حوالے سے خاصی اہمیت حاصل رہی ہے۔ یہ کبھی اسلامی جاہ و جلال کا مرکز تھا تو کبھی مرد بیمار بن کر ترس کی علامت بن کر دنیا کے نقشے پر ابھرا' لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اس بیماری کو ایک ایسے انقلاب نے نگلا جس نے آج اسے ترقی کی شاہراہوں کا مسافر بنا دیا۔

مصطفیٰ کمال اتاترک نے اسلام سے نجات حاصل کرنے میں جس شدت سے کام لیا' اس نے بجا طور پر ترکی کو دنیا میں اعلیٰ مقام تو دلا دیا' لیکن ایک ایسی نسل بھی تحفے میں دی' جو اسلامی اقدار اور شعائر سے بے بہرہ تھی' لیکن اب اللہ کا شکر ہے کہ وہاں کی آب و ہوا میں دین اسلامی کی خوشبو بھی پھوٹتی ہے۔

رومی بادشاہ قسطنطین نے عیسائی مذہب قبول کر کے جس شہر کو پایہ تخت بنایا' اس کا نام قسطنطنیہ ہو گیا۔ تاریخ میں ترکی کا یہ شہر اس لحاظ سے بھی اہمیت رکھتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شہر پر جہاد کرنے والے لشکر کو مغفرت کی بشارت دی تھی۔ یہ شہر عیسائیت اور بازنطینی سلطنت کا اہم مرکز تھا۔

حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن دوپہر کو اپنی رضاعی رشتہ دار ام حرام رضی اللہ تعالیٰ عنہا بنت ملحان کے گھر سو رہے تھے' جو حضرت انس کی خالہ بھی تھیں کہ اچانک بیدار ہوئے۔ اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے پر تبسم تھا۔ ام حرام رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اس تبسم کی وجہ پوچھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ۔

"مجھے خواب میں اپنی امت کے لوگ دکھائے گئے جو جہاد کے لیے سمندر کی موجوں پر اس طرح سفر کریں گے جیسے تخت پر بادشاہ بیٹھے ہوں۔"

حضرت ام حرام رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے عرض کی کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعا فرمادیجئے۔ اللہ تعالیٰ مجھے بھی شامل فرمائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرما دی اور دوبارہ محو خواب ہو گئے تھوڑی دیر بعد پھر بیدار ہوئے تو چہرہ مبارک تبسم سے تابناک تھا۔ حضرت ام حرام رضی اللہ عنہا نے دوبارہ وجہ پوچھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ۔

"میری امت کا پہلا لشکر جو قیصر (روم) کے شہر (قسطنطنیہ) پر جہاد کرے گا' اس کی مغفرت کی بشارت دی گئی ہے۔"

حضرت ام حرام رضی اللہ عنہا نے دوبارہ دعا کی درخواست کی کہ اللہ تعالیٰ اس لشکر میں مجھے بھی شامل فرمائے۔

لیکن اس بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ۔ "نہیں' تم پہلے لشکر میں شامل ہو۔" آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دونوں بشارتیں پوری ہوئیں۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد خلافت میں حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قبرص پر حملہ کیا تاریخ اسلام میں یہ پہلی بحری مہم تھی اور اس میں حضرت ام حرام رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اپنے شوہر حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ شرکت کی۔ جس میں اہل قبرص نے مسلمانوں سے صلح کرلی۔ یوں یہ مہم کامیاب رہی۔ حضرت ام حرام رضی اللہ تعالیٰ عنہا گھوڑے کے سرکنے سے زمین پر گر گئیں اور اس طرح یہ زخم ان کی شہادت ثابت ہوا۔

اس کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفہ بنے۔

مسلمانوں نے قسطنطنیہ کا محاصرہ کیا' جو کافی مدت تک جاری رہا۔ اسی دوران حضرت ابو ایوب رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیمار پڑے اور وفات پا گئے۔ آپ قسطنطنیہ کی دیوار کے نیچے مدفون ہیں۔ بہرحال شہر تو نہ فتح ہو سکا اور لشکر لوٹ آیا۔

بالآخر آل عثمان کے ساتویں نوجوان خلیفہ سلطان محمد فاتح نے کم عمری میں ہی یہ معرکہ سر کرلیا۔ سلطان محمد فاتح نے اپنی جنگی تدابیر میں ایسی ذہانت دکھائی کہ جسے سوچ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

قسطنطنیہ کی دیوار کو توڑنے کے لیے ایسی توپ تیار کی کہ جس کے برابر کا اس وقت پوری دنیا میں اتنا وزنی گولہ پھینکنے والا کوئی اور عجوبہ نہ تھا۔ گولے کا قطر ڈھائی فٹ اور آٹھ من وزنی گولہ ایک میل دور تک پھینکا جا سکتا تھا۔ جب اس کا تجربہ کیا گیا تھا تو گولہ زمین میں ایک میل دور گرنے کے بعد چھ فٹ تک دھنس گیا تھا۔

قسطنطنیہ تین سمندروں یعنی باسفورس' بحر صرصرا اور شاخ زرین (گولڈن ہارن) نامی سمندروں سے گھرا ہے۔ گولڈن ہارن کے صرف ایک جانب مشرق میں خشکی ہے۔ سورج کی روشنی میں یہ ہارن دور سے سینگ کی مانند چمکتا نظر آتا ہے۔ اسی لیے اسے گولڈن ہارن کہا جاتا ہے۔

کامیاب حملے کے لیے ضروری تھا کہ مضبوط بحری بیڑا ہو۔ سلطان نے ایک سو چالیس جنگی کشتیوں پر مشتمل ایک مضبوط بحری بیڑا تیار کرلیا۔

سلطان چاہتا تھا کہ آبنائے باسفورس کے راستے سے کچھ جہاز گولڈن ہارن میں داخل ہو جائیں تاکہ بندرگاہ کی سمت سے بھی شہر پر حملہ کیا جائے۔ لیکن گولڈن ہارن پر لوہے کا زنجیر نصب تھا۔ جس کے آس پاس حملے کے لیے توپیں گولہ باری کے لیے تیار کھڑی تھیں۔ جبکہ اندر سے مداخلت کے لیے بڑے بڑے بحری جہاز کھڑے تھے۔ گویا کامیابی کے تمام راستے مسدود نظر آتے تھے۔ گولڈن ہارن تک رسائی ناممکن تھی۔

سلطان محمد فاتح نے ایک یادگار تاریخی فیصلہ کیا۔

اس نے جہازوں کو گولڈن ہارن تک پہنچانے کے لیے دس میل تک خشکی پر چلا کر لے جانے کا فیصلہ کیا۔ خشکی کا راستہ ناہموار پہاڑی علاقہ تھا۔ لیکن اس مرد مجاہد نے بڑی نرالی ترکیب نکالی۔ راتوں رات اس راستے پر لکڑی کے تختے بچھوائے اور انہیں چربی سے چکنا کیا گیا۔ پھر ستر جہاز نما کشتیوں کو ایک کے بعد ایک ان تختوں پر چڑھا دیا۔ ہر کشتی پر دو ملاح سوار تھے۔

ستر کشتیوں کا یہ سفر مشعلوں کی روشنی میں محو سفر رہا۔ صبح کے سویرے نے اس راز سے پردہ اٹھایا۔ لیکن اس وقت تک سلطان محمد فاتح کی ستر بحری کشتیاں اور افواج گولڈن ہارن کے علاقے میں داخل ہو چکی تھیں۔

مشہور مغربی مورخ ایڈورڈ گبن نے اس واقعے کو معجزے سے تعبیر کیا ہے۔ گولڈن ہارن کا پانی اتھلا تھا۔ جو دشمن فوجوں کے بڑے بحری جہازوں کی نقل و حمل کے لیے دشوار تھا۔ جبکہ سلطان کی بحری کشتیاں نسبتاً "چھوٹی" تھیں۔

یوں بندرگاہ کی جانب سے شہر کا بحری محاصرہ ہو گیا۔ سلطان نے گولڈن ہارن پر ایک پل تعمیر کیا اور اپنا توپ خانہ اس پر نصب کیا۔ خوب گولہ باری ہوئی۔ سلطان نے بازنطینی بادشاہ کو ہتھیار ڈالنے کا پیغام پہنچایا' لیکن وہ نہ مانا۔ سلطان کے جگری ساتھی فصیل پر چڑھ گئے اور جام شہادت نوش کیا۔ یوں عثمانی دستے چڑھتے گئے اور دیوار قسطنطنیہ پر اپنا پرچم لہرا دیا۔

مغربی مورخین کے مطابق قسطنطین جو عثمانی فوجوں کا بے جگری سے مقابلہ کر رہا تھا' اپنے بہادر ساتھیوں کے قدم اکھڑ جانے پر غمزدہ ہو گیا۔ اس نے اپنی شاہانہ پوشاک اتار پھینکی اور عثمانی فوجوں سے بے جگری سے لڑتا ہوا مارا گیا۔

یوں گیارہ سو سالہ بازنطینی سلطنت روما کی ابتدا قسطنطین سے ہوئی تھی اور انتہا بھی قسطنطین سے ہوئی۔

یوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں ارشاد پورے ہوئے کہ۔

"جب قیصر ہلاک ہو گیا تو پھر کوئی قیصر پیدا نہ ہو گا۔"

شعاع کے ساتھ

اِدارہ

کرن شبیر..... کراچی

1۔ شعاع سے وابستگی کب ہوئی؟اس کے لیے مجھے سوچنے کی ضرورت نہیں ہے میں اس وقت آٹھویں کلاس میں تھی 'جب میں نے فرسٹ ٹائم کوئی ڈائجسٹ پڑھا تھا۔اس سے پہلے فورتھ کلاس سے میں بچوں کے رسائل 'بچوں کا باغ 'بچوں کی دنیا اور نونہال وغیرہ پڑھا کرتی تھی۔ ہمارے گھر میں ہمیشہ ہی رسائل پڑھنے پر اعتراض ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے بچوں کے رسائل بھی بکس میں چھپا کر پڑھنے پڑتے تھے جس کا یقیناً"کوئی فائدہ نہیں ہوتا تھا کیونکہ میری امی کو اس بات پر تشویش ہونے لگتی تھی کہ میں دس منٹ سے زیادہ ٹک کر بیٹھی کیسے ہوں۔

میں نے آٹھویں کلاس سے ہی ڈائجسٹ پڑھنے شروع کردیے تھے۔

"امر بیل" کی آخری قسط پڑھنے کی جلدی میں کیمسٹری کی بک میں رکھا گیا وہ ڈائجسٹ تھوڑا سا اوپر ہوگیا'جسے میں عمر کے مرنے کے غم میں دیکھ نہ پائی۔ ابو دبے پاؤں کمرے میں آئے اور تھوڑی دیر کھڑے دیکھتے رہے۔ پھر انہوں نے مجھے مشورہ دینا ضروری سمجھا۔ "بیٹا جی !رسالہ بک میں ٹھیک طرح سے ایڈجسٹ کرلیں 'کوئی دیکھ لے گا۔"میں تو شرم سے وہ آب آب ہوئی کہ اس پانی میں آپ نہا بھی سکتے تھے۔

2۔ کام تو خیر میں کوئی نہیں نپٹاتی 'میرا مطلب ہے گھر کا۔ ہم دو بہنیں ہیں 'میرا نمبر دوسرا ہے 'مجھ سے بڑی بہن بی ایس سی میں ہے اور اسے گھر کا سارا کام آتا ہے سارے کھانے وہ بنا لیتی ہے اور مابدولت فری ہیں یہاں تک کہ میرا کھانا بھی میری بہن لاکر دیتی ہے اور برتن وہی اٹھاتی ہے۔ اگر کبھی غصے میں ہو تو مجبوراً" خود اٹھانا پڑتا ہے۔ میری امی "کیا میں تمہارے ساتھ نوکر بھیجوں گی"'کہہ کر مجھے شرم دلانے کی کوشش کرتی ہیں لیکن میں بھی ایک نمبر کی ڈھیٹ ہوں۔

مجھے زردہ اور گڑ والے چاول بہت پسند ہیں۔ ایک دفعہ میرا دل میٹھے چاول کھانے کے لیے تڑپنے لگا۔ میں نے امی سے کہا۔ مجھے میٹھے چاول پکا کردیں۔ امی نے صاف جواب دے دیا۔ "خود پکاؤ' تمہارے نوکر نہیں بیٹھے یہاں۔ مجھے اور بھی کام ہیں۔" تھک ہار کر ترکیب پوچھی اور خود ہی اس نیک کام کا آغاز کیا۔ بائے چانس وہ چاول اچھے پک گئے اور سارے حیران۔ اب میں جب بھی چاول پکاؤں 'اچھے پک جاتے ہیں۔ امی فٹ سے کہتی ہیں۔ "یہ تو اپنے شوہر کو زردہ کھلا کھلا کر اور چائے پلا پلا کر ہی بیزار کردے گی سبزی اور کوئی چیز اسے پکانی ہی نہیں آتی۔" اس بات پر مجھے غصہ بھی آتا ہے اور ہنسی بھی۔

میرے دن کا آغاز دس گیارہ بجے ہوتا ہے۔ صبح فجر کی نماز کے بعد میں سو جاتی ہوں اور گیارہ بارہ بجے اٹھتی ہوں۔ ناشتہ کرکے اخبار کا مطالعہ ہوتا ہے اور حالات حاضرہ پر امی کے ساتھ تبصرہ ہوتا ہے۔

3۔ پھر شعاع 'خواتین یا کرن پڑھتی ہوں۔ اکیڈمی جانے کے دو گھنٹے پہلے اکیڈمی کا کام کرتی ہوں۔ دس بجے کمپیوٹر آن کرلیتی ہوں۔ کانوں پر ہیڈ فون لگا ہوا ہے اور میرے پسندیدہ گلوکاروں کے گانے چل رہے ہیں۔ ایک ہاتھ میں چائے کا کپ ہے اور دوسرے ہاتھ میں شعاع ہے۔ گانا سننا اور شعاع پڑھنا مسلسل کام

ہوتا ہے۔ ایک بجے سے دو بجے تک نیٹ پر بیٹھتی پھر دو بجے سے فجر تک میری اسٹڈیز کا ٹائم ہوتا ہے اور اس وقت صرف پڑھائی ہوتی ہے یا کبھی اسٹڈیز کا موڈ نہ ہو تو کوئی افسانہ لکھنا یا آپ کو خط لکھنا بہت اچھا لگتا ہے۔ اس کے علاوہ فارغ وقت میں مجھے اپنی فیوچر پلاننگ کرنا بہت اچھا لگتا ہے۔

4۔ خامیوں اور خوبیوں کا امتزاج ہی اک انسان کو مکمل بناتا ہے۔ مجھ میں بھی کئی خامیاں اور خوبیاں ہیں میری نظر میں میری یہ خوبی ہے کہ میں اپنی خامیوں اور غلطیوں پر پردہ نہیں ڈالتی بلکہ انہیں ختم کرنے کی کوشش کرتی ہوں اور کافی حد تک کامیاب بھی رہتی ہوں۔

غصے کی کافی تیز ہوں 'میری صاف گوئی کو زبان درازی میں شمار کیا جاتا ہے۔ خود سے وابستہ لوگوں کا خیال رکھتی ہوں۔ شدت پسند ہوں 'کسی کام کا ارادہ کر لیتی ہوں تو پورا کرتی ہوں۔

اپنے متعلق تعریفی جملے تو بہت سنے ہیں۔ اپنی تعریف سن کر خوشی ہی ہوتی ہے۔

5۔ ساون مجھے بہت پسند ہے۔ میں ہمیشہ بارش انجوائے کرتی ہوں۔ ساون کے حوالے سے کوئی یادگار واقعہ نہیں ہے۔ البتہ جب ہم بچپن میں بارش میں نہایا کرتے تھے۔ امی سے خوب ڈانٹ پڑتی تھی۔ برسات تو اب بھی انجوائے کرتے ہیں 'پر بچپن والا مزا نہیں آتا۔

اگر ہلکی پھلکی بوندا باندی ہو رہی ہو'ہاتھ میں چائے کا مگ ہو' ساتھ سموسے ہوں تو بارش کا مزا آجاتا ہے۔

6۔ پسندیدہ اقتباس :

عمیرہ احمد کے ناول "بس اک داغ ندامت" سے حاضر ہے۔

"فرار اتنا آسان نہیں ہوتا' نہ زندگی سے 'نہ ہی قسمت 'نہ ان حرکتوں سے جو ہم خود کو بہت عقل کل سمجھ کر کرتے ہیں۔ ہر شخص کو گرنے کے لیے ٹھوکر کھانے کی ضرورت نہیں ہوتی 'بعض لوگ ٹھوکر لگے بغیر ہی گر جاتے ہیں 'پھر انہیں اٹھانے کے لیے کوئی ہاتھ بڑی مشکل ہی سے آگے بڑھتا ہے۔"

پسندیدہ شعر تو بہت سارے ہیں 'پر جگہ کم ہے 'اس لیے ایک ہی کا انتخاب کرنا پڑے گا۔

ہم سے اک بار نہ جیتا ہے نہ جیتے گا کوئی
وہ تو ہم جان کے کھا لیتے ہیں ماتیں اکثر
ہم نے ان تند ہواؤں میں جلائے ہیں چراغ
جن کی ہواؤں نے الٹ دی ہیں بساطیں اکثر

پسندیدہ کتابوں میں وصی شاہ کی "آنکھیں بھیگی جاتی ہیں" قدرت اللہ شہاب کی "شہاب نامہ" اور سیرت النبی پر لکھی مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری کی کتاب "الرحیق المختوم" شامل ہیں۔

مبارک باد

سمیرا عثمان گل کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ماں جیسے عظیم رتبے پر فائز ہونے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ گزشتہ دنوں سمیرا عثمان گل کے آنگن میں ایک ننھی پری آئی ہے۔ ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی جانب سے سمیرا عثمان گل کو مبارک باد۔

ہم سمیرا عثمان گل کی ننھی پری عنایہ عثمان کے اچھے نصیب 'کامیابی اور خوشیوں کے لیے دعا گو ہیں۔
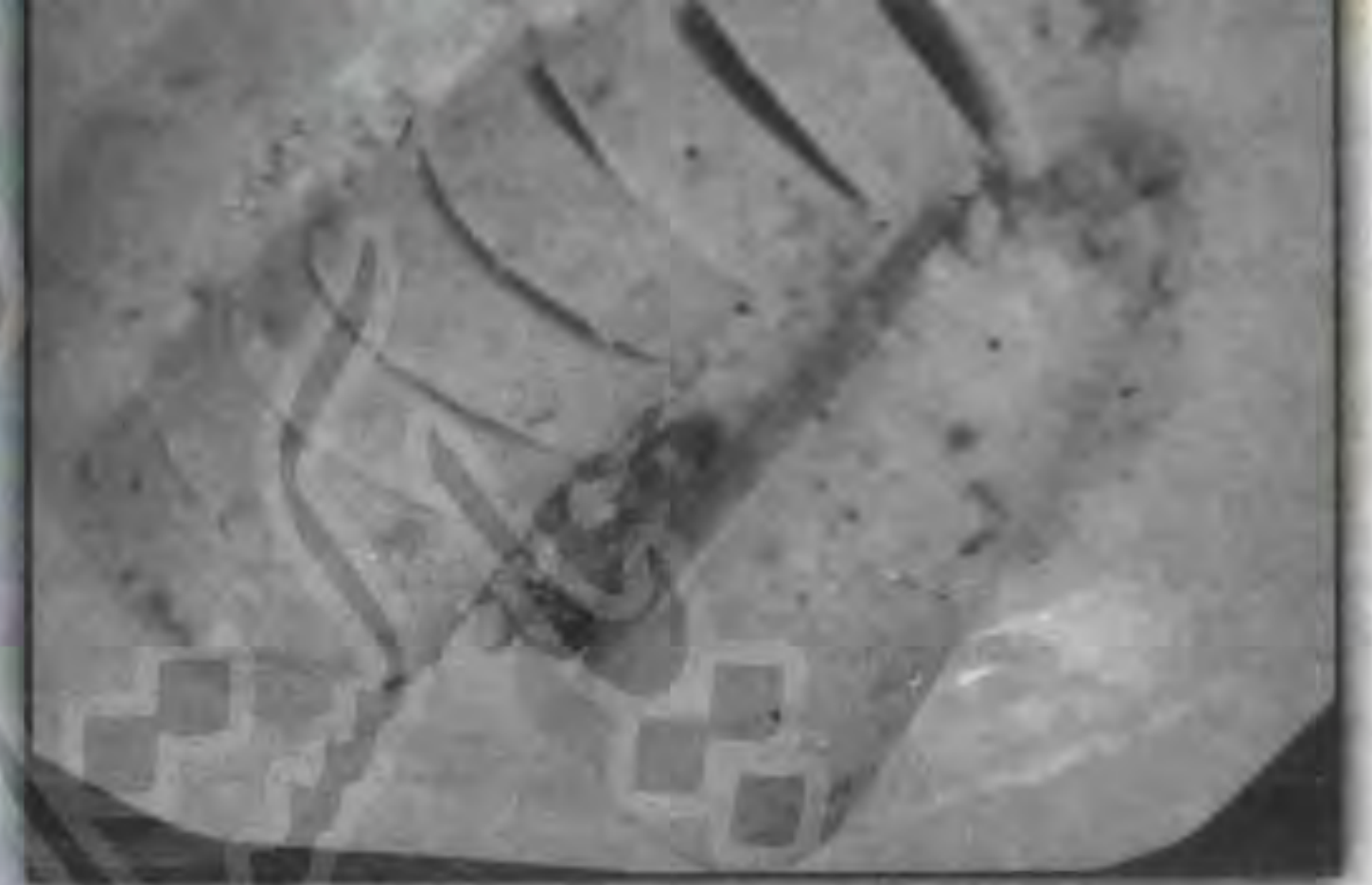
موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

قلفی

اجزا :

دودھ	دو کلو
سویاں	ایک پیالی
کارن فلور	دو کھانے کے چمچے
چاول کا آٹا	دو کھانے کے چمچے
فلاقند	آدھا کلو
پستے، بادام الائچی	دو کھانے کے چمچے
چینی	دو پیالی

ترکیب :

ایک پیالی دودھ نکال کر باقی دودھ ابال کر ہلکی آنچ پر چولہے پر ہی چھوڑ دیں۔ سویاں ایک پیالی پانی میں ابال کر باریک پیس لیں اور الائچی دانے اور بادام اور پستے باریک کتر کر چینی کے ساتھ دودھ میں ڈال دیں اور چمچہ ہلاتے رہیں۔ ٹھنڈے دودھ میں چاول کا آٹا اور کارن فلور گھول کر شامل کر دیں اور چولہا بند کر دیں۔ ٹھنڈا ہو جائے تو فلاقند کچل کر مکس کر دیں۔ سانچے میں ڈال کر خوب پھینٹیں پھر فریزر میں رکھ دیں۔ ایک گھنٹہ بعد نکال کر دوبارہ پھینٹیں پھر فریج میں رکھ دیں۔ ایسا دو تین مرتبہ کریں۔ اس سے قلفی میں برف نہیں جمے گی اور وہ نرم بھی رہے گی۔ تین گھنٹے بعد مزے دار قلفی تیار ہوگی۔

چکن اچاری

اجزا :

چکن	ایک کلو
میتھی دانے	چند عدد
ہلدی	آدھا چائے کا چمچہ
ٹماٹر	تین عدد
دہی	آدھی پیالی
سفید زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
رائی	ایک چٹکی
ثابت دھنیا	ایک چائے کا چمچہ
لال مرچ	ایک کھانے کا چمچہ
کلونجی	ایک چٹکی
ہری مرچ	چھ عدد
لہسن	چار جوے
ادرک	ایک بڑا ٹکڑا
لیموں	چار عدد
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

ایک کڑاہی میں تیل گرم کر کے میتھی دانے کڑکڑائیں۔ جب خوشبو آنے لگے تو اس میں چکن چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے ڈال دیں۔ اب اس میں نمک، ہلدی، ٹماٹر اور دہی ڈال دیں۔ جب ٹماٹر اور دہی کا پانی خشک ہونے لگے تو اس میں کٹی لال مرچ اور کلونجی اور زیرہ، رائی اور ثابت دھنیا پیس کر ڈال دیں۔ ہری مرچ، لہسن کے جوئے، ادرک کتر کر ڈالیں ساتھ ہی لیموں کا رس شامل کر کے پانچ سے دس منٹ کے لیے دم پر رکھ دیں۔ گرم گرم سادہ چاول یا چپاتی کے ساتھ پیش کریں۔

بلوچی دو گوشتہ بریانی

اجزا :

چاول	ایک کلو
گوشت	دو کلو
دہی	ایک پیالی
لہسن ادرک پیسٹ	دو کھانے کے چمچے
پیاز	دو عدد
پورا ثابت گرم مسالا	دو کھانے کے چمچے
پسا گرم مسالا	ایک چائے کا چمچہ
ہرا مسالا	حسب ضرورت
کیوڑا	دو کھانے کے چمچے
لیموں کا رس	چار کھانے کے چمچے
زردہ رنگ	ایک چٹکی
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

دہی میں لیموں کا رس، لہسن ادرک پیسٹ، نمک، سرخ مرچ اور پسا گرم مسالا مکس کر کے گوشت پر لگائیں اور ڈھک کر رکھ دیں۔ چاول کو ثابت گرم مسالے کے ساتھ دو تین ابال لیں۔ تین گھنٹے بعد گوشت کو پیاز براؤن کر کے گلنے کے لیے چولہے پر چڑھا دیں۔ گوشت گل جائے، تیل چھوڑ دے اور پانی خشک ہو جائے تو خوب اچھی طرح بھونیں اور آدھا قورمہ نکال کر سارے ابلے ہوئے چاول بچھا دیں۔ ہری مرچ، دھنیا اور پودینہ باریک کتر کر ڈال دیں۔ کیوڑے میں زردے کا رنگ گھول کر اوپر پھیلا دیں پھر بقیہ قورمہ اوپر ڈال کر ڈھکن بند کر دیں۔ ڈھکن کے کناروں کو گوندھے ہوئے آٹے سے اچھی طرح بند کر دیں اور دم پر رکھ دیں۔ آدھے گھنٹے بعد مکس کریں اور رائتے کے ساتھ پیش کریں۔

فولڈنگ سینڈوچ

اجزا :

چکن بون لیس	ڈیڑھ پاؤ
مکھن	چار کھانے کے چمچے
ادرک لہسن پیسٹ	ایک کھانے کا چمچہ
کیچپ	ایک پیالی
سرخ و سیاہ مرچ	ایک کھانے کا چمچہ
پسا زیرہ	آدھا چائے کا چمچہ
بڑی ڈبل روٹی	ایک عدد
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

چکن کے بہت زیادہ باریک ریشے کریں یا پیس لیں اور کیچپ اور مکھن کے علاوہ تمام اجزا اچھی طرح مکس کر کے ایک گھنٹے کے لیے رکھ دیں، پھر دو چمچے تیل میں اسے فرائی کر لیں۔ ڈبل روٹی کے کنارے کاٹ کر اسے بیل کر قدرے چپٹا کر لیں۔ تھوڑا سا مکھن لگا کر اس پر چکن والا آمیزہ رکھ کر تھوڑا سا فولڈ کریں، پھر ایک چمچہ کیچپ ڈال کر پورا فولڈ کر دیں۔ ہلکے ہاتھ سے دبائیں۔ اگر کھلنے لگے تو ٹوتھ پک سے بند کر دیں۔ تمام سلائسز کے فولڈ سینڈوچ بنانے کے بعد پیش کرتے وقت اسے بیچ میں سے کاٹ دیں۔ چلی ساس کے ساتھ شام کی چائے پر پیش کریں۔

ادارہ

گرمیوں میں جلدی مسائل دیگر موسموں کی نسبت زیادہ بڑھ جاتے ہیں۔ تیز دھوپ سے جلد کا سنولا جانا، مرجھانا، کیل مہاسے اور بلیک ہیڈز جیسے مسائل خواتین کو بے حد پریشان رکھتے ہیں۔ بلیک ہیڈز نکلنے سے جلد کی رنگت سیاہ دکھائی دینے لگتی ہے اور چہرے کا نکھار بھی متاثر ہوتا ہے۔ ان کے نکلنے کی وجہ جلد کے نیچے موجود غدود کا زیادہ مقدار میں چکنائی خارج کرنا ہے۔ بلیک ہیڈز سے نجات حاصل کرنے کے کئی طریقے ہیں۔

☆ چہرے کا اچھی طرح مساج کرنے اور پھر بھاپ دینے سے بلیک ہیڈز سے نجات خاصی حد تک ممکن ہے۔ چہرے پر کوئی بھی اچھا موئسچرائزر لگا کر دس منٹ تک اچھی طرح مساج کریں۔ اس کے بعد بھاپ لیں۔ بھاپ لینے کا طریقہ یہ ہے کہ کسی بھی دیگچی میں پانی کھولا کر اسے چولہے سے اتار لیں۔ پھر سر پر تولیہ پھیلا کر اپنا چہرہ دیگچی سے اٹھتی ہوئی بھاپ کے سامنے اس طرح کریں کہ ساری بھاپ چہرے پر آئے۔ پانچ منٹ بعد تولیہ نیم گرم پانی میں بھگو کر اس سے ہلکے ہاتھوں سے چہرہ رگڑیں۔ خاص طور پر وہ جگہیں جہاں بلیک ہیڈز موجود ہوں۔ ہلکے ہاتھوں سے بلیک ہیڈز دبائیں۔ وہ باہر نکل آئیں گے۔ پھر چہرہ تولیے سے صاف کر کے ٹھنڈے پانی سے دھولیں اور برف کا ایک ٹکڑا لے کر چہرے پر پھیر لیں۔ اس سے آپ کی جلد کے وہ مسام بند ہو جائیں گے، جو بھاپ لینے سے کھل گئے تھے۔ اس کے بعد چاہیں تو دس منٹ کے لیے کوئی اچھا سا ماسک لگالیں۔

☆ آپ کے پاس ماسک نہیں ہے تو چہرے پر ٹماٹر کا گودا لگالیں۔ دس منٹ بعد سادہ پانی سے چہرہ دھولیں۔

☆ منہ دھونے کے لیے کوئی معیاری فیس واش یا بیسن استعمال کریں۔

☆ تھوڑے سے دہی میں تھوڑا سا بیسن ملالیں۔ چہرے پر لیپ لیں۔ دس منٹ بعد سادہ پانی سے چہرہ دھولیں۔

☆ کھانے کا ایک چمچ سرکہ لے کر اس میں ایک لیموں کا رس نچوڑلیں۔ روئی کی مدد سے اسے چہرے پر وہاں وہاں لگائیں، جہاں جہاں بلیک ہیڈز موجود ہوں۔ دس منٹ بعد چہرہ سادہ پانی سے دھولیں۔

☆ چہرے کی صفائی کا خاص خیال رکھیں۔ دن میں پانچ، چھ مرتبہ چہرہ صرف سادہ پانی سے دھوئیں۔ دودھ یا بالائی میں چند قطرے لیموں کا رس ملا کر چہرے پر لگائیں۔ دس منٹ بعد ہلکے ہاتھوں سے چہرہ رگڑ کر صاف کرلیں۔ پھر سادہ پانی سے دھولیں۔

☆ چہرے پر شہد لگائیں۔ پندرہ منٹ بعد سادہ پانی سے دھولیں۔ شہد میں جراثیم کش خصوصیت پائی جاتی ہے۔ لہٰذا یہ بلیک ہیڈز کے لیے اکسیر ہے۔

☆ منہ دھوتے وقت ذرا سی چینی لے کر چہرے پر ہلکے ہاتھوں سے رگڑیں۔ پھر سادہ پانی سے دھولیں۔ اس سے بھی بلیک ہیڈز ختم ہو جاتے ہیں۔

☆ چیکو کا گودا ذرا سا لے کر اسے چہرے پر مل لیں۔ بیس منٹ بعد ہاتھ گیلا کر کے چہرے پر ہلکے ہلکے رگڑتے ہوئے چیکو کا گودا اتار لیں۔ پھر سادہ پانی سے منہ دھولیں۔ ہفتے میں ایک بار یہ عمل کرنے سے بلیک ہیڈز کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔